## ضمیمہ نمبر ۳

### میر صاحب کے فارسی اور اُردو مخطوطات سے متعلق ایک دستاویز

(۵۲۲ غیر مطبوعہ غزلیں)

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

# نقوش

## میر تقی میر نمبر ۳

شمارہ ۱۳۱
اگست ۱۹۸۳ء

مدیر
محمد طفیل

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

قیمت : ۹۰ روپے

# ترتیب

## اُردو



## فارسی



## اُردو





محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو لاہور سے شائع کیا۔

# نقوش ایوارڈ

## سنہ ۱۹۸۲ء

(جسے صدر پاکستان نے نقوش کی ادبی خدمات کے سلسلے میں جاری کیا)

جن کی خدمت میں ایوارڈ پیش کیا گیا

---

| | | | |
|---|---|---|---|
| (۱) | ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ | (تحقیق و تنقید) | دس ہزار روپے |
| (۲) | ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان | (سیرت) | دس ہزار روپے |
| (۳) | فیض احمد فیض | (نظم) | دس ہزار روپے |
| (۴) | ابو الفضل صدیقی | (افسانہ) | دس ہزار روپے |
| (۵) | صدیق سالک | (طنز و مزاح) | دس ہزار روپے |

کمیٹی، جس نے فیصلہ کیا:

(۱) جسٹس عطا اللہ سجاد
(۲) ڈاکٹر وحید قریشی
(۳) شیخ منظور الٰہی
(۴) شفیق الرحمٰن
(۵) محترمہ ادا جعفری
(۶) محمد طفیل، کنوینر

---

یہ انعام کسی ادیب یا شاعر کی خدمت میں دوبارہ پیش نہیں کیا جائے گا۔

# طلوع

جب میں سیر کو نکلوں گا اور میری ملاقات اسد اللہ خاں غالب، میر تقی میر اور میر ببر علی انیس سے ہوگی تو وہ مجھے خوب گھٹ کے گلے ملیں گے۔

"ارے طفیل صاحب!"

"قبلہ میر صاحب، قبلہ اسد اللہ خان صاحب، قبلہ میر انیس صاحب! ——— بندہ بھی ملاقات کا متمنی تھا۔"

"ہم بھی مشتاق تھے۔"

غالب کو ملاقات کا اشتیاق اس لیے تھا کہ میں نے اُن کی وہ بیاض ڈھونڈھ ڈھانڈھ کے چھاپ دی تھی، جو کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں گم ہو گئی تھی۔

میر تقی میر مجھے اس لیے یاد کرتے تھے کہ مَیں نے اُن کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام چھاپا جو کہ صدیوں سے اہلِ فکر کے سامنے نہ تھا۔ پھر میں نے اُن کی ۲۲۵ غیر مطبوعہ فارسی غزلیں اہلِ علم تک پہنچائیں۔

میر انیس کے دل میں میری چاہت اس لیے تھی کہ میں نے ان کے بہت سے مرثیے پہلی بار پیش کیے تھے۔

یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں ناخدائے سخن تھے۔ ایک ایک لفظ پر غور کرتے تھے۔ ایک ایک شعر پر جان دیتے تھے۔

مگر ہوا یہ کہ سبھوں کے ہزاروں اشعار آنکھوں سے اوجھل تھے۔ قسامِ ازل نے چھین رکھے تھے۔

میں جو ادب کا جویا ہوں، نگری نگری گھوما، راہِ طلب میں دوستوں نے دستگیری کی۔ غالب، میر اور انیس کے نوادرات جھولی میں ڈال دئے۔

لوگ صدیوں سے سو رہے تھے۔ مگر بعد میں آنے والا ایک شخص جاگ رہا تھا۔

بالآخر وہ ایک شخص بھی سو جائے گا۔

بے شک مقدر خود بنایا جاتا ہے۔ مگر مقدر کا ایک خانہ قدرت خود پُر کرتی ہے۔

محمد طفیل

○

# اس شمارے میں

رسولؐ نمبر چھاپنے کے بعد کسی دوسرے موضوع پر کچھ چھاپنے کو دل نہیں چاہتا مگر ادب جس کے ساتھ میری رفاقت تیس برس سے زاید کی ہے۔ اُسے کیسے چھوڑ سکتا ہُوں! نیکیاں دونوں، مدارج کا فرق ہوسکتا ہے۔

یہ تعلّی کی بات نہیں، حقیقت ہے کہ جو کچھ ادارۂ نقوش پیش کرسکتا ہے یا کرتا رہا ہے وہ کسی دُوسرے کے بس کی بات نہیں۔ مجھے دُوسروں کی صلاحیتوں پر شُبہ نہیں، بات توفیق کی ہے۔

یہ نمبر میرؔ کے غیر مطبوعہ فارسی کلام پر مشتمل ہے، جس کی اشاعت کو ادب کی تاریخ ایک بڑے واقعہ کے طور پر یاد رکھے گی۔ نسخۂ رضوی کو رام پور کے نسخہ سے تقابلی مطالعہ کے بعد پیش کیا جا رہا ہے اور نسخۂ حیدر آباد دکن کو عکسی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، یعنی یہ نمبر تین مخطوطات کا ماحصل ہے۔

یہ نمبر اس لیے بھی اہم گردانا جائے گا کہ اس میں میر تقی میرؔ کے تین دیگر (اردو کے) نادر مخطوطات کا بھی ذکر ملے گا۔ کلیاتِ میرؔ کے ایک مخطوطہ کا ذکر، دیوانِ میر سوم کے مخطوطہ کا ذکر، دیوانِ میر چہارم کے مخطوطہ کا ذکر، نہ صرف ذکر بلکہ سیر حاصل تبصرہ و تفصیل، ان کے علاوہ "ذکرِ میر" کے مخطوطہ کا احاطہ، غرض مخطوطاتِ میر کے تذکرے، یہ سب باتیں کوئی معمولی باتیں نہیں۔

یہ نمبر فارسی دان طبقہ کے علاوہ اردو دان طبقہ سے بھی خراج وصول کرے گا۔ کیونکہ اس نمبر میں بہ سلسلہ میر خاصے انکشافات ہیں پھر رالف رسل اور ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ مظفر علی سید کا مضمون "میر کی فارسی سخنگوئی" (ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نئے راستوں میں مشعل جلا دی گئی ہو۔) کسری منہاس کا مضمون "میر کی اصلاحیں" بھی خوب ہے جو میر کی نقادانہ صلاحیتوں کی گواہی دیتا ہے۔

اِن دنوں میرا بیشتر وقت رسولؐ نمبر کی بقایا جلدوں کی تیاری میں صرف ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں وسیع پیمانے پر اس نمبر کی اشاعت کا حق ادا نہ کرسکوں گا۔ بڑی تھوڑی تعداد میں چھاپا ہے، صرف مسودّاتی اشاعت کے طور پر۔ دعا کیجئے کہ ایسے دیگر نوادرات کو بھی منظرِ عام پر لاسکوں۔ زندگی کا کیا بھروسہ! پل پل کو دھیان میں رکھنے کے باوجود ابھی بہت کچھ میری تحویل میں ہے۔

بہرحال اس نمبر کی اشاعت سے "مطالعہ میر" کا ورق مکمل سمجھا جائے!

[محمد نقوش]

○

# کلیاتِ میر کا ایک نادر نسخہ

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

رضا لائبریری رام پور میں میر تقی میر کے کلیات کا ایک بہت اچھا نسخہ محفوظ ہے۔ اس میں نکات الشعراء کے علاوہ ان کی نظم و نثر کا سارا کام: دیوان اُردو ۱ تا ۶، دیوان فارسی، فیض میر اور ذکرِ میر شامل ہے۔

اس کی کتابت بھی اہتمام کے ساتھ کی گئی ہے۔ چنانچہ ذکرِ میر کو چھوڑ کر اور سب کتابوں کے شروع میں خوبصورت طلائی لوح اور پوری کتاب میں رنگین جدول کھینچی گئی ہے۔ پوری کتاب کے اوراق کی تعداد ۸۲۳ ہے اور فل سکیپ ناپ کا، ۱۷ سطری مسطر کام میں لایا گیا ہے۔

کتابی کیڑوں نے اسے پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر شاید میر کی قنوطیت نے ان کے کام و دہن پر اچھا اثر نہ کیا۔ اس لیے کتاب کے صفحے بدنمائی سے اور اشعار کے لفظ قطع و برید سے محفوظ رہ گئے۔

دیوانِ اوّل کے خاتمے (ورق ۲۴۷ ب) میں کاتب نے لکھا ہے:

"دیوان اوّل من تصنیف میر محمد تقی صاحب بتاریخ بیست و ہفتم شہر رمضان سنہ یکہزار و دوصد و چہل و پنج ہجری" بخط بد ربط نقیر حقیر پر تقصیر بندہ شیخ لطف علی حیدری حسب فرمایش مرزا صاحب کرم گستر مرزا قنبر علی صاحب دام اشفاقہ اختتام پذیرفت"

کلیات کے آخری ورق (۸۲۳ ب) میں لکھا ہے:

"الحمد للہ کہ بفضل ایزد منعان و عنایات ائمہ علیہ الصلوات والسلام کہ کلیاتِ میر محمد تقی صاحب غفراللہ ذنوبہ بتاریخ سلخ شہر رمضان المبارک سنہ یکہزار دوصد و چہل و شش ہجری بروز دوشنبہ یک پاس روز باقی ماندہ از خط بدربط احقر العباد شیخ لطف علی حیدری بپاس خاطر و فرمایش مرزا قنبر علی صاحب زاد اشفاقہ صورت اختتام پذیرفت"

ان دونوں تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ لطف علی حیدری (غالباً بمعنی شیعی) نے مرزا قنبر علی صاحب کے لیے ایک برس اور دو یا تین دن میں اسے لکھا۔ اور ۲۹ رمضان ۱۲۴۶ھ۔ (۱۲ مارچ ۱۸۳۱ء) اس کی تاریخ اختتام تھی۔

اس کلیات کے فارسی حصے (دیوان۔ فیض میر۔ ذکر میر) کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اس میں ذکرِ میر کا

پہلا ایڈیشن شامل ہے، جو میر صاحب نے پچاس سال کی عمر میں لکھا تھا اور نسخۂ مطبوعہ کے صفحہ ۱۲۸ کی سطر ۴ کے اس مصرع پر ختم ہوتا ہے :

این تمامت اعمال قیامت بسر آورد

ہمارے نسخے میں اس مصرع کے بعد حسب ذیل عبارت بھی پائی جاتی ہے جو دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دی گئی ہے۔

"و آنچہ ظاہر است حسام الدین خاں در حقیقت از میان رفت، چرا کہ بدست دشمنان جانی افتادہ است تا مقدور زندہ نخواہند گذاشت، بیشتر اختیار خداست کہ او بر ہمہ چیز تا در است۔

احوال فقیر از سہ سال آنکہ چون قدردانی درمیان نیست، و عرصۂ روزگار بسیار تنگ است، توکل بخدای کریم کہ او رزاق ذی القوۃ المتین است کردہ بخانہ نشستہ ام ظاہر اسباب با اعزہ چند مثل ابوالقاسم خاں برادر خورد عبدالاحد خاں مجدالدولہ و وجیہہ الدین خاں برادر حسام الدین خاں و بیرم خاں صاحب، خلف الصدق بیرام خاں کلاں کہ در آدمی روشی یکتائی روزگار خود اند و قطب الدین خاں پسر سعدالدین خاں خانساماں اگرچہ سنش کم است اما فہم درستی دارد و خالی از سعادت مندی نیست و تا اسی لطف علی خاں کہ او میانہ می زید، گاہ گاہ ملاقات کردہ می آید۔ خواہ از دست ایشاں انتفاعی برسد یا نرسد۔ مایۂ توکل ہمیں صاحبانند۔ و گاہی اینچنیں ہم اتفاق میشود کہ کسی فقیر و شاعر و متوکل دانستہ بطریق نذر چیزی میفرستند محل شکر است۔ اکثر قرضداری باشم و بعسرت تمام بسر میکنم۔"

(ورق ۸۱۵ ب و ۸۱۶ الف)

کسی صاحب ذوق نے اس نسخے کے ابتدائی تین دیوان (دیوان سوم کی ردیف لام تک) بغور پڑھے ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ بین السطور اور حاشیوں میں الفاظ و محاورات کے معنی، مصرعوں اور شعروں کی تشریح اور متبادل الفاظ درج کیے ہیں جن میں سے اکثر اختلاف نسخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز میر صاحب کے بہت سے لفظوں کے عیوب گنائے اور ان کی جگہ مناسب لفظ بھی اپنی طرف سے تجویز کیے ہیں۔

غالباً شعرائے اُردو کے کلام کے ساتھ یہ اعتنا اس دور میں تنہا اس شخص نے کی ہے اور یہ سب کچھ فارسی زبان میں کیا گیا ہے۔ جو اس وقت کی مدرسی اور کارِ درباری زبان تھی۔

ذیل میں اس شرح و نقد کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے :

(۱) تھا مستعار حسن سے اس کے جو نُور تھا     خورشید میں بھی اس ہی کا ذرّہ ظہور تھا

اس کے پہلے لفظ "تھا" کے نیچے لکھا ہے: "ہے باید" دوسرے مصرع کے الفاظ "اک ہی" پر لکھا ہے: "جدا نتوینند" اور "ذرہ ظہور" کی تشریح کی ہے: "ظہور اندک"

۲ - ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

"ہنگامہ" کے معنی "شور" لکھے ہیں۔ "گرم کن" کے نیچے "بمعنی کنندہ است" اور اوپر "خوب بست" لکھا ہے۔

۳ - آتش بلند دل کی نہ ہوئی، ورنہ اے نسیم
یک شعلہ، برقِ خرمنِ صد کوہ طور تھا

"نہوئی" کے نیچے لکھا ہے "عدم تلفظ واو و تخفیف ہمزہ شد" دوسرے مصرع کے نیچے اس کا مطلب تحریر کیا ہے۔ "یعنی اندک گرمی من سوزندۂ کوہست"

سردار جعفری صاحب کے نسخے میں "نہوئی" کی جگہ "نہ تھی" چھپا ہے، اور تمام مطبوعہ نسخوں میں "نسیم" کی جگہ "کلیم" ملتا ہے۔ جو سیاق کے زیادہ مناسب ہے۔

۴ - کل پانوں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

"کل" کے معنی "دیروز" لکھے ہیں، "آگیا" کے نیچے لکھا ہے "پڑ گیا باید" اور دوسرے مصرع کے معنی اس کے نیچے بتائے ہیں: "استخوانہائی کاسۂ سر ریزہ ریزہ بود"

۵ - کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پُر غرور تھا

پہلے مصرع کے لفظ "بےخبر" کے نیچے لکھا ہے "یعنی اے غافل" اور دوسرے مصرع کے الفاظ "کبھو" اور "کسو" کے نیچے بتایا ہے کہ "زبانِ دہلی بودند، حالا کبھی و کسی شدند"۔ اس عبارت سے مترشح ہے کہ شارح دہلی کے نہیں ہیں، بلکہ لکھنؤ اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔

۶ - جامۂ مستی عشق اپنا مگر کم گھیر تھا
دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا

پہلے مصرع کے نیچے لکھا ہے: "استفہام انکاریست: ای بسیار بود"۔

۷ - شاید کسو کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ
میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا

مصرع اوّل کا مطلب بتایا ہے "کسی بر یارِ من عاشق شد"۔ اور دوسرے مصرع کے نیچے تحریر کیا ہے کہ "بہ رشک غیرت و رقابت۔"

۸ - فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رکھ کے ڈالتا
پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

مصرع اوّل کے لفظ "رکھ" کی "ر" پر زبر اور پیش دونوں لگائے ہیں۔ دوسرے مصرع کے معنی بتائے ہیں: "برآوردن خود را از قید است یعنی عشق را دور میکرد تا کہ ہلاک نمی شد"۔ لفظ "رکھ" میری دانست میں کاتب نے سہواً "رک" کی جگہ لکھ دیا ہے۔ مصحح نے اس بات کو محسوس نہ کیا، ورنہ وہ اسے بفتح را کبھی نہ قرار دیتا۔

۹ - گلبرگ کا یہ رنگ ہے، مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعل ناب سا

مصرع اوّل کے آخر میں لکھا ہے: "استفہامست یعنی بہ بینید"۔ دوسرے مصرع کے لفظ "نہ جھمکے ہے" پر لفظ "بدلہ" لکھ کر حاشیے میں "جھمکتا ہے" درج کیا ہے، اور اس کے بعد لکھا ہے "برائے لعل چمکتا ہے باید"۔

۱۰ - مزا دکھا دیں گے بیرحمی کا تری صیاد
گر اضطراب اسیری نے زیر دام لیا

مصرع دوم کا مطلب لکھا ہے: "مارا کہ زیر دامیم، اگر بیقراری مارا گرفت دام ترا خواہیم شکست"۔

۱۱ - کو گل و لالہ، کہاں سنبل، سمن، ہم نسترن
خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

مصرع اوّل کے پہلے لفظ "کو" کے معنی "کجا" بتا کر لکھا ہے: "ایں زا دو ادیک جا و حذف در دیگر جا خوب نیست۔ بل یک طور باید"۔

۱۲ - کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

"کے تئیں" کے نیچے لکھا ہے: "کو باید" اور دوسرے مصرع کے "بھی" کو بتایا ہے کہ "زائد و لغو است"۔

۱۳ - منعم نے بنا ظلم کیا، گھر تو بنایا پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

مصرع اوّل کے لفظ" بنا" کے نیچے لکھا ہے" مونث است۔ مگر رعایت ظلم باید" اور" گھر تو بنایا" کے نیچے لکھا ہے" زائد است"

مطبوعہ نسخوں میں" بنا ظلم کی رکھ" ملتا ہے۔

۱۴ - صد موسمِ گل ہم کو تہِ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

مصرع ثانی کے نیچے لکھا ہے" مفلسی من گاہے توانگری نشد کہ بباغ میر فتم"

۱۵ - لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کار گہِ شیشہ گری کا

اس شعر کے دوسرے مصرع کا مطلب لکھا ہے" از دم شدید شیشہ ہنگام ساختن، می شکند۔ یعنی بسیار گفتگو موجب مُردنست"

۱۶ - داغ آنکھیں سی کھل رہے ہیں سب
ہاتھ دستہ ہوا ہے نرگس کا

مصرع اوّل کے لفظ" آنکھیں" پر بدلہ لکھ کر حاشیے میں" آنکھوں" درج کیا ہے۔ اور مصرع دوم کے نیچے لکھا ہے" بشکل و مانند چشمت"

نسخہ آسی میں" داغ آنکھوں سے کھل رہے ہیں سب" مندرج ہے۔ لیکن میری ناقص رائے میں یہاں" آنکھیں سی" ہی درست ہے۔

۱۷ - کبھو ہے چھیڑ، کبھو گالی ہے، کبھو چشمک
بیان کر لیے، جو ایک اس کی بے ادائی ہو

لفظ" کر لیے" کے نیچے لکھا ہے" کیجیے باید"

۱۸ - کس نے لی رخصتِ پرواز پس از مرگ نسیم
مشت پر باغ میں آتے ہیں پریشان ہوے

اس کا مطلب لکھا ہے" ای پر مارا اینقدر مہلت نشد کہ از گل باحکم پرواز کردن گیرند"

۱۹ - اے ہمصفیر، بے گل کس کو دماغ نالہ
مدت ہوئی ہماری منقار پر خبر ہے

مصحح نے قافیے پر لفظ بدلہ لکھ کر حاشیے میں تحریر کیا ہے "جگر" اور مطلب بتایا ہے "ای قریب بہلاک رسیدم"

## الف ۔ مثنوی در ہجو شاعراں

۲۰ ۔ مثنوی در ہجو شاعراں کا پہلا شعر ہے ۔

یہ موذی کئی نا خبردار فن
نئی ناگنیں جن کے ٹھینگوں پہ پھن

اس کے دوسرے مصرع پر لکھا ہے: "ای خلاف وضع اند" پھر لفظ "پھن" پر لکھا ہے: "بر دہن می مانند"
بعد ازاں لفظ "ٹھینگوں" پر حاشیے میں تحریر کیا ہے "انگشت نر بزبانِ دہقانی"
یہ آخری لفظ ایک پرانے ایڈیشن میں "ٹھینگوں" چھپا ہے لیکن بعد کی اشاعتوں میں "ٹھیکوں" ہو گیا ہے ۔

۲۱ ۔ سن اس ماجرے کو سبھوں نے کہا
کہاں کینچوے اور کہاں اژدہا

مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع اس طرح ہے: "کہاں کینچوے یہ، کہاں اژدہا"

۲۲ ۔

حکایت بعینہ یہ ویسی ہے میر
سرِ راہ کہتا جو تھا اک فقیر

اور سب نسخوں میں پہلا مصرع یوں ہے "حکایت بعینہ یہ دل سے سبے میر"

۲۳ ۔ گیا ہوں انھوں سے بہت دور میں
ہوں اپنی جگہ شاد و مسرور میں

مطبوعہ نسخوں میں پہلا مصرع اس طرح ہے: "تو گیا ہوں انھوں سے بہت دُور میں"

## ب ۔ مثنوی تنبیہ الجہال

اس مثنوی کا ایک شعر ہمارے نسخے میں یوں ہے:

کذب بس جاگہ ہو رونق بخشِ سمع
واں کی دینداری سے رکھو دل کو جمع

مطبوعہ نسخوں میں مصرع اوّل کے اندر بجای "جاگہ" کے "جای" ہے۔ اور دوسرا مصرع یوں لکھا ہے :

"واں کی دینداری رکھو اور دل کو جمع"

۲۵ - جھوٹ آوے اس قدر جب درمیاں
کر یقین ایمان کیسا، دیں کہاں

مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع ہے : "کو یقیں، ایمان کیسا، دیں کہاں"

۲۶ - وہ سراپا جہل ناآگاہِ کار
ہم سے تم سے کرنے لاگا اعتذار

مطبوعہ نسخوں میں پہلا مصرع ہے : "وہ سراپا جہل ناگہ وقتِ کار"

۲۷ - ہمارے نسخے میں :

اس قدر اس کا تنبّہ تھا ضرور — تا خبر یہ پہنچے نزدیک و دُور

کے بعد یہ شعر ہے :

قابلوں کی مار ناہموار کھائیں — تربیّت ہونے کو استادوں کنے جائیں

مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر اس طرح لکھا ہے :

جو سنے سو خودسری سے باز آئے — تربیّت ہونے کو استادوں کے جائے

۲۸ - ہمارے نسخے میں دو شعر یوں ہیں :

قصّہ کوتاہ تجھے ممیز درمیاں — کاہے کو تجھے گلہ گلہ شاعراں
اب جو دیکھو ہر طرف ہے اژدھام — تنگ ہے کرمِ مزابل پر بھی کام

مطبوعہ نسخوں میں ان دو کی جگہ یہ ایک شعر ملتا ہے :

قصّہ کوتاہ تجھے ممیز درمیاں — تنگ ہے کرمِ مزابل پر بھی یہاں

## ج ۔ مثنوی در ہجو نااہل

مطبوعہ نسخوں میں ایک مثنوی در ہجو نااہل مسمیٰ بہ زبان زد عالم" شروع ہوئی ہے۔ ہمارے نسخے میں اس کا عنوان ہے "مثنوی در ہجو محمد بقا"۔ شارح نے اس کے مقابل لکھا ہے "شاعر بود" اس سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ یہ مثنوی بقاءاللہ خاں بقاؔ کی ہجو میں ہوگی۔ بہرحال اس کا ایک شعر ہے :

۲۹ - ایک نے دیوان کی میرے نقل لی
مجھ دوانے کی کنھوں نے عقل لی

مطبوعہ میں دوسرا مصرع یوں ہے : اُس دوانے کی کنھوں الخ

۳۰ - مدعی میرا ہوا یہ بے ہُنر مردۂ صد سالہ سے بے نورتر

مطبوعہ میں دوسرا مصرع اس طرح ہے : " مردۂ صد سال سا بے نورتر"

۳۱ - باپ اس کا سخت ناداں نا درست
گھوڑے کی سی گندی کلّی قاق و سست

لفظ کلّی پر شارح نے لکھا ہے: " مرادف چچڑی است" اور "قاق" کے معنی " لاغر" ( دبلا) بتائے ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں دوسرا مصرع یوں ہے :" کوڑے کی سی گندی بلّی قاق و سست"

۳۲ - میں نے پاس اُس کا کیا حد سے زیاد
پر بکی کرتا ہے یہ ابنِ زیاد

ہمارے شارح نے لفظ " بکی" کی بے کو معروف بتاکر اس کے معنی " بیہودہ گوئی" کے لکھے ہیں۔ مطبوعہ نسخوں میں اس کی جگہ " بکی" ملتا ہے۔

## ۵ - مثنوی در ہجو آئینہ دار

اس مثنوی کا ایک شعر ہمارے نسخے میں اس طرح ہے :

۳۳ - سمجھے مرزا میر کو، مرزا کو میر نے وہ رگ زن جو نہ سمجھے شیر و شیر

دوسرے مصرع کے الفاظ " شیر و شیر" میں سے پہلے کے معنی شارح نے " اسد" بتائے ہیں، جس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرا لفظ دُودھ کا مترادف ہے۔

مطبوعہ نسخوں میں یہ لفظ " سیر شیر" چھپے ہیں۔

## ۶ - مثنوی در تعریف آغا عبدالرشید

اس مثنوی میں ایک شعر ہے :

۳۴ - ایسا لکھنا کسو کی طاقت ہے ہے جلی بھی تو ایک بابت ہے

"بابت" کے معنی شارح نے "شئی عمدہ" بتائے ہیں ۔

ہمارے اس شارح اور مصحح نے نسخۂ اصل کے حاشیوں میں وہ شعر بھی لکھ دیے ہیں جو اس کے کاتب سے یا سہواً چھوٹ گئے تھے ۔ یا منقول عنہ میں موجود نہ تھے ۔ ان میں کچھ یہ ہیں :۔

ہر ذرّہ خاک تیری گلی کی ہے بیقرار — یھاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں مل گیا

شانِ تغافل اپنے تو خط کی کیا کہیں ہم — قاصد موا تب اس کے منہ سے جواب نکلا

مرگیا میں، ملا نہ یار افسوس — آہ، افسوس، صد ہزار افسوس

یہ غزل پوری کی پوری حاشیے میں بڑھائی گئی ہے

جمشید جن نے وضع کیا جام کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں، کیدھر وہ ناؤ نوش

نہ سمجھوں گیا ابر کیا دیکھ کر — ہوا تھا مری چشمِ تر کی طرف

میں لہو پیوں ہوں غم میں عوضِ شراب، ساقی — شب تیغ ہو گئی ہے شبِ ماہتاب تجھ بن

مصحح نے اس کا التزام کیا ہے کہ متن کی معروف اور مجہول یاؤں کو ممتاز کرے ۔ اس کے لیے اس نے یائے معروف کے نیچے "ع" لکھا ہے جو معروف کا مخفف ہے ۔ یای مجہول کے نیچے یہ علامت (ف) بنائی ہے جو بظاہر "ف" معلوم ہوتی ہے اور لفظ خفیف کا مخفف ہے ۔

مصحح نے "شب تیغ" کے نیچے اس کے معنی "شبخون" بتائے ہیں ۔ مگر مطبوعہ نسخوں میں اس کی جگہ "شب میغ" ہے ۔

کیسے کیسے رُوٹھے پھرے تم پر ہم تم کو منائے گئے
تم تیغِ ناز اُٹھائے گئے ہم فرقِ نیاز جھکائے گئے

قیمہ ہو کر گرنے پہ میرے ایک نظر اُن کی نہ پڑی
سیل ستم تھا ان کو بہت وہ تیغ پہ تیغ چلائے گئے

یہ دونوں شعر مطبوعہ نسخوں میں نادر ہیں ۔ اس لیے اور بھی اہم ہیں ۔

لیکن مثنوی در ہجو نااہل کے ۲۵ شعر ہمارے نسخے میں نہیں ہیں ۔ نہ مصحح نے حاشیے میں ان کا اضافہ کیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر کلیاتِ میر کے ایک سے زائد نسخوں میں نہیں پائے جاتے ۔

ہمارے نسخے میں کچھ نظم و نثر مطبوعہ سے زائد بھی ہے ۔ میں نے اس ارادے سے مقابلہ نہیں کیا ۔ اس لیے صرف دو شعر اور ایک طویل فارسی نثر نقل کرتا ہوں ۔ جو مثنوی دریائے عشق سے پہلے بطور تمہید لکھی گئی ہے اور مثنوی کے قصّے کو فارسی نثر میں دہرا تی ہے ۔

مثنوی در ہجو شاعراں میں یہ شعر زائد ہے ؛

غضب ہے کہ کھینچا ہے ٹڈوں نے سر  نکالے ہیں دو چار بینٹوں نے سر

مثنوی در ہجو آئینہ دار میں یہ شعر زائد ہے :

چھیڑیں نہ مجھ خاطر افسردہ کو  مردہ ہلکا جھانٹ اکھاڑے سے نہ ہو

نثر فارسی حسب ذیل ہے[1] :

رب یسّر  بسم اللہ الرحمٰن الرحیم  وتمم بالخیر

# نثر مثنوی دریای عشق

عشق یعنی محبتِ مفرط ، در بیانِ این ملۂ فاضلہ کہ ہیچ موجودی ازاں خالی نیست ،، زبانِ درازِ قلم قاصراست ۔ اگرچہ ہر فرد کامل انسان دفترہا دارد ۔ حالاتِ عشق انواعست ۔ نظمًا ونثرًا پہانگاشتہ اند ۔ چون خوب تأمل کنی سرازین مضمون برآری کہ از ہزاریکی ہم نتواند کہ بزنگار دبیت ۔

جناب عشق را نازم کہ در ہر کشوری دیدم ۔ کتابی جبرئیلی منبری پیغمبری دارد عشق بے محابا چہ بزرگانرا شور سرگردیدو چہ جوانانرا جامہ درخون کشید ۔ دیدی کہ یعقوب چہ دید ۔ و بر سر شیخ صنعان چہ رسید ۔ یوسف را در زندان بگذاشت ۔ پردہ از روی کار زلیخا برداشت ۔ گوشہ گیراں رسوای بازار ۔ پہلوانان زار و نزار ۔ شبلی بادل پرخون رفت :: بایزید از صومعہ بیرون رفت :: آن یکی را بردار کشیدند :: دیگریرا پوست دربدید :: صدر الدین را بدریا انداختند :: نجم الدین را ہلاک ساختند :: یکی غرق و دیگری حرق :: یکی را تیغ تیز بر فرق :: عالمی برباد برفت :: جہانی ناشاد برفت :: خلق چنان گم شدند از یاد رفت :: کسی بہ بستر غم افتاد :: کسی بنومیدی جان داد :: مجنوں را بدشت دوانید :: فرہاد را برنگ نشانید :: وامق واسوختہ فتیلہ مو :: نل خراب شہر و کو بکو :: قمری طوق دار شد :: بلبل گرفتار شد :: کتان ہمہ تن چاک :: ذرہ یکسان بخاک :: حالات عشق را اختلاف :: میدانِ معرکہ اوصاف :: رخسارہ از و گرد پاک :: پہلو از و دردناک :: در دل از سوز تنگیش دودی :: در چشم نگاہ حسرت آلودی :: کسی را از عشق شور در سری :: کسی شکل صورت دیوار بر دری :: پروانہ از سوزِ عشق داغ :: کف خاکستر او پای چراغ :: جمعی مانند زلف پریشان :: جماعتی چون آئینہ حیران :: شخصے از وطن آوارہ :: شخصے دل پارہ پارہ :: یکی بر سر خاکی :: دیگری در جگر چاکی :: گریبانِ کسی یکسر دریدہ :: دامنِ کسی گرد کشیدہ ::

---

[1] یہاں حتی الامکان اس کی نقل میں اصل املا کی پابندی کی گئی ہے ۔

میر تا از پا نشستم رونق وادی نماند

باز چو من خوش جنوں، صحرا نوردے برنخاست

جان کسی موقوف آهی ؛ دیدهٔ کسی منتظر نگاهی ؛ بساکس بالبِ خاموش ؛ بسیاری از عشق بیهوش ؛ بسی را در دل مرض ؛ کسی را مُردن خودغرض ؛ بیدلی از عشق خمیازه کش ؛ ناتوانی از و درحالتِ غش ؛ کسی از عشق بکنجی مرده ؛ کسی برسراهی جان سپرده ؛ گروهی ازغم عشق دم بخود ؛ برسر گروهی قیامت شد ؛ عاشقی را از عشق برلب ناله ؛ والهی را جگر پرکاله ؛ عزلتی عشق نامدار ؛ ناکامِ او کامگار ؛ رفتهٔ عشق ناتوان ؛ بیمارِ او گران ؛ در دلی از و خواهش ؛ درجانی همه کاهش ؛ کسی را در عشق سفر درپیش ؛ کسی درخانهٔ خودسر درپیش ؛ شاهان درعشقِ فقیران ؛ بیگناهان این جا اسیران ؛ جائی از عشق ظالم تیز نگاه ؛ جائی بدگمان ناخون همراه ؛ عشق میسوزد، عشق میسازد ؛ عشق است که باخود عشق میبازد ؛ رنگِ رو از و شکسته ؛ مژگانِ چشم خون بسته ؛ جای که او شعبدهٔ انگیخته ؛ از خاکستر رنگِ تازه ریخته ؛ عشق مگر کیمیاساز است ؛ که عاشق از و در گداز است ؛ جمعی پریشان گفتند که آسمان هم دل باختهٔ عشق است ؛ ندانستند که آنهم ساخته و پرداختهٔ عشق است ؛ رباعی ؛

عشق را همسر و همتا عشق است
با خدا عشق و خدا با عشق است
کیست درخلوتِ وحدت گفتم
آمد آواز که تنها عشق است

حاصل که برقِ عالم سوزِ عشق خرمنِ عقل سوخت ؛ وجهانی از جهان جهان درد واندوه اندوخت ؛ رازِ عشق چون رسوا میشود ؛ جان عاشق مفت میرود ؛

## حکایت

درشهری ماهرُئی بود جوانِ رعنا ؛ درخوبی وتناسبِ اعضا یکتا ؛ گلبو و گل پیراهن ؛ افزاینده رشکِ چمن ؛ بخوبی و خوش اسلوبی آراسته ؛ چون سرو نوخاسته ؛ خوش چشم قامت بلندی ؛ معشوقِ عالم پسندی ؛ رنگین خرام رنگین ادا ؛ بهاری جلوه نما ؛ رنگش مهتابی ؛ لعلش عنابی ؛ طرزِ نگاه دلها کشیدی ؛ جنبشِ مژگان بجان خلیدی ؛ خودمعشوق قرار داده ؛ دل بربیقراری نهاده ؛ رفته تماشائی راه و روشِ دلبران ؛ عصر خوش ظاهرانِ فتنه درسران ؛ هرجا آهوی چشمی می دید ؛ عاشقانه چشمی می خرامید ؛ بیتاب ملاقات خوبان ؛ بیخواب از خیالاتِ محبوبان ؛ خودش طناز و پریرخسار ؛ از شوقِ خوبان چون پربدار ؛ پری دیوانهٔ پریرویان ؛ زنجیریِ اشتیاقِ سلسله مویان ؛ روزی بسبب وحشتِ مزاج گرفتگی برطبع نازکش کار مشکل کرده بود ؛ بسیرِ باغی رفت ؛ که شاید شگفتگی از دیدن گلها رو دهد ؛ سرو را در برکشید و زار گریست ؛ رو بر روی گل نهاد و بسیار گریست ؛ برلبِ جوئی ایستاد ؛ در سبزه زاری افتاد ؛ پیچ و تابِ سنبل را دید ؛ از دل بیتاب آهی کشید ؛ بهر نهالی که رسید ؛ نو باوه اشکی نمود ؛ درسایهٔ درختِ گز هزار نالی افزود ؛ از روشِ غنچه به بیتابی گذشت ؛ از بوی گلها بیدماغ گشت ؛ چون خاطرِ افسردهٔ او وانشد ؛ راهِ خانه

سرکرد ؛ در رفتنِ راه دیوانگی بیشتر کرد ؛ ناگاه بر سرِ کوچه از مه پارهٔ چار شد ؛ که از غرفه نظارهٔ عاشق روشنی میکرد ؛ نگاهش بیهوش داروی بود که بیخود گردانید ؛ یا ناوک جگر دوزی بود که بخاک غلطانید ؛ آن ازین سور و گرداند ؛ این آواره بر درِ او ماند ؛ بیت

عشقی که رفته رفته جنون آورد چه سود ؛ دیوانه گشتن از نگهِ اولین خوش است ؛

زیبائی او را چشمی رسید ؛ رعنائی او بخاکِ افتادگی کشید ؛ صبر و سکون از دلِ او رخت بست ؛ لباس دریده برخاک نشست ؛ چند روز بیخور و خواب افتاده ماند ؛ کس از رهِ رحم باد حرفی نراند ؛ رنگ رخساره زرد شد ؛ دل خونین همه درد شد ؛ مژگان نمناک ؛ بر بدن خاک ؛ نحافتِ جسم و آشفتگی مو ؛ سر بازی خاکِ آن سرکو ؛ نالیدی و نخفتی ؛ با نسیم سحر گفتی ؛ رباعی ،

ای باد سحرگه که شدی عنبر بار ؛ دانم که همی روی بسوی دلدار ؛

در کوچهٔ او دل است مارا زنهار ؛ آن سوخته را ز ما به پرسی بسیار ؛

دیگر بگو که ای تغافل کیش ؛ رحمی بر من دلریش ؛ هنگامه بر سرِ من برپاست ؛ دمی اگر بیائی، تماشاست ؛ کارِ من به رسوائی کشید ؛ کسی بدرِ من نرسید ؛ جای و آشنائی ندارم ؛ از لطفِ تو امید دارم ؛ چشمِ مشتاق سویِ تو بحسرت نگران است ؛ دل که رفته تست ، از دوریت بیجان است ؛ بیا بیا که رفتنی در پیش دارم ؛ که جانِ بے قرار و دل ریش دارم ؛ خرد مندانِ مرا دیوانه می شمارند ؛ من در راهِ توام ، بدراه می سازند ؛ از نگاه پی در پیش که سوی آن خانه می رفت پی بردند که این عاشقی است دیوانه نیست ؛ پدرِ آن دختر بدگمان شد ؛ در پی آزارِ این دل زده بیک پہلو افتادند و تہمت دیوانگی بر او کرده طفلانِ شهر و ساکنانِ آن کوچه را رخصتِ آزار رسانیش دادند ؛ شاید ازین جهت برخاسته بجائی رود ؛ و شورِ رسوائی که جهان جهانست برطرف شود ؛ یکی سنگ زنان ؛ یکی ملامت کنان ، طفلان دیوانه گویان ؛ هاں هاں برگشت بی غم و رو و توان ؛ قیامت بر سرِ آن رسوا ؛ و مستغنی و بے پروا ؛ شور و فتنه عجبی بر سر ؛ اما روی دلش جانبِ دلبر ؛ پروایش نه که جانِ من میرود ؛ تماشایش مگر به بینم چه میشود ؛ درین هنگامه یار هم می آید ؛ صورتِ خوب او رُو می نماید ؛ آزار بسیار از بسیار کشید ؛ خوبی در همان خاک نشینی دید ؛ این شعر میخواند ؛ بیت

هوش از سرتاب از دل، طاقت از پا رفته است ؛ حیف ها از یک نگاهِ یار بر ما رفته است ؛

حیف ها بر او رفت ؛ حرفِ حیف هم نگفت ؛ اذیت ها دادند، از انجا بر نخاست ؛ منتظر آن ماه و بود و بیکاست ؛ ازین قرارِ آن بیقرار ؛ پدرِ دخترِ ناچار ؛ تدبیری کرد و قرار داد که این ماه را ازین منزل بمنزلِ دیگر باید فرستاد ؛ چون آن پری از خانه نخواهد بود ؛ این دیوانه را کوچه بدر خواهد زد ؛ خانه آن روی آب که کنارِ شهر واقع بود ، مدِ نظر داشت ؛ محافه را درست کرده، وسال

خورده راهمراه او داده، همت بر فرستادن آنجا گماشت ؛ که چند روز رفته بماند ؛ هرگاه رفع رسوائی شود ؛ رونق افزای خانه بود ؛
هرگاه محافهٔ مطلوبه ازبرابر این گذشت، طپیدن دل ازینمعنی آگاه ساخت ؛ بهمان صورت بدنباله گروی پرداخت ؛ پس از طی
دوسه کوچه و بازار ؛ آن بیطاقت و بیقرار ؛ از سوختگی عشق چون سپند نالید و بآواز بلند گفت کای تمنای جان نیازمند ؛ وای
جملهٔ ناز و خود پسند ؛ براه دوستی نمیروی ؛ آشنای ترحم نمیشوی ؛ بالای دلکشی داری ؛ و برسر این خاک پست نیامدی ؛ من خراب
چشم تو بودم ؛ بلطف نگاه نکردی ؛ جسم زار من همه گداز گشت ؛ تو چون کیمیا بدست نیامدی ؛ من پامال راه تو گشتم ؛ تو این
طرف گذاری نکردی ؛ من برای تو بیمار شدم تو از لطف مرا ندیدی ؛ من از درد و محنت زار شدم ؛ تو بتکلیف هم نرسیدی ؛ من فریاد
زدم، در تو اثر نه ؛ من بیخبر شدم، ترا خبر نه ؛ لطفی نکردی که شاد از ان شوم ؛ رحمی نکردی که یاد از ان کنم ؛ بحال مرگ زنده ام ؛
از جان و دل شرمنده ام ؛ حیران کارم، چه سازم ؛ بیسر و پایم بچه سازم ایوای مهجوری و ناصبوری ؛ افسوس بدل نزدیکی و دوری ؛
سر دست من نگرفتی که افتاده (تو) ام ؛ دلدهی نکردی که دلدادهٔ توام ؛ آئینه ات فرصت نمیدهد، که روسوی من کنی ؛ مشاطات
نمیگذارد، که این سو نمائی ؛ دماغم همگی بتو رفت، تو دماغی نداری ؛ فراغت از خود کردم، تو فراغی نداری ؛ غرور حسنت کو چندا که
بمن پردازی ؛ نازت دل نمیدهد که باهمچو منی بسازی ؛ من از دست رفتم ؛ و دستم بتو نمیرسد ؛ من از پا افتادم ؛ کار پیش نمیرود ؛
چکنم که خود را بتو رسانم ؛ چه سازم که پیش تو بمانم ؛ دایهٔ غدار چون بیتابی او دید ؛ و حرف های درهم شنید ؛ بخود سنجید ؛ که این
بیتاب چون ماهی بی آب میطپد ؛ بآب زنده هلاکش نمایم ؛ و از دریای رسوائی بکنار برایم ؛ گفت که ای دیوانهٔ عشق بیا بیا که
خوش آمدی ؛ از حسن اتفاقات است ؛ این غیرت ماه منتظر بود ؛ دل جمع دار ؛ پریشان گوی مکن ؛ آنطرف آب فرودی
آئی ؛ واصل مطلوب میشوی ؛ همکنار محبوب میشوی ؛ داد عشق میدهی ؛ از غم و رنج وامیرهی ؛ شراب عشرت میکشی ؛ بکام
دل خود میرسی ؛ میت بجام است ؛ کامت بکام است ؛ حاجت رواست ؛ اضطراب چراست ؛ آن دل باختهٔ بسخن هائے
ساختهٔ اوگونه تسلی شده ؛ لب از فریاد و زاری بست ؛ و روی جبین را که بناخن میخست دست ازان کار باز داشت ؛ تا لب آب
خاموشش دنباله کرد ؛ محافهٔ آن غزاله سیاه چشم شد ؛ چون برکنار رتهٔ دار آسمان رنگ رسیدند ؛ کشتی چون هلال نمودار شد ؛ آوردند
محافه را درون بردند ؛ این دیوانه بر سر چون دریا جوشان و خروشان میدان کشید ؛ و بیک جست در سفینه رسید و نشست ؛
وقتیکه بقعر دریا کشتی رسید ؛ دایهٔ مکاره کفشی از پای آن گلرخسار پرده نشین برآورده بر سطح آب که چون آئینه بود، برتافت ؛
وگفت کای کشتهٔ عشق بی محابا ؛ وای دیوانهٔ پری رخساران رعنا ؛ پاپوش آن تمنای جان که تو رفتهٔ آنی، در آب افتاد ؛ و باموج
گوناگون دریا همکنار است ؛ غیرتت کجا رفت ؛ بگیر آخر پاپوش یار است ؛ برو و بیار ؛ و خود را معاف مدار ؛
پای نگارینش آلوده و برهنه خواهد ماند ؛ آنروی آب فرود آمدنست ؛ و دران نواح برای سیر شدنست ؛ مبادا بکف پایش
آسیب خاری رسد ؛ یا بآن رشک گلبرگ تر غباری رسد ؛ پای رنگینی که بر سرش باید داشت ؛ حیف است که باو گرد ناپاک

بوسه دهد ؛ و قدم حنائی که بچشم باید گذاشت ؛ افسوس که بخاک گرم راه رود ؛ چه بیسگالی ؛ و در چه خیالی ؛ آن عاشق ناشکیب بیتاب شده خود را بآب انداخت ؛ و بگلِ کفش آن سرمایهٔ جان چون جبلِ بیقرار، ربسده جان باخت ؛ امواج دریا آغوشها کرده و کشاده ببرش تنگ گرفتند ؛ و به ته آب بردند ؛ شوری شد که کسی غرق گشت ؛ سعی آشنایان فایده نداد ؛ آن گوهر تر رو بخاکِ ته دریا نهاد ؛ و دایهٔ حیله گر دل خوش شده ؛ کشتی را ازان دریای لنگر گیر از باد تیزتر روان ساخته آرزوی آب رفت ؛ و بخانهٔ آشنائی پدرِ دختر معطلهٔ اقامت کرد ؛ غافل ازین که جذبِ عشق در کمین است ؛ و دلِ آن ماه پاره بجا نیست ؛ هر روز از غم میکاهد ؛ و وحشت میفزاید ؛ تنها تنها میگشت ؛ در خیالِ آن غریقِ دریا از مردمانِ کناره دریا می بود ؛ گاهی از غم دم سرد میکشید ؛ گاهی از افسوس پشتِ دست میگزید ؛ بیت

بلاست عشق نهان کردن، این همان برق ست ؛ که سوخت خرمنِ مستوریِ زلیخا را ؛

چون هفته برین بگذشت ؛ بدایه از فریب حرف زن گشت ؛ که آن ننگِ عالم از میان رفت ؛ بلکه بیصبری کرد از جهان رفت ؛ حالی که مرا اینجا نگاهداشته اید، بهر که ؛ در خانه بیگانه تنها گذاشته اید، برای چه ؛ اکنون ناموس نمیرود ؛ ننگی عاید نمی شود ؛ مرا بخانه ببر ؛ مادر مهربان را به بینم ؛ با پدر مشفق ملاقات نمایم ؛ در کاشانه ببازی گرایم ؛ بهمدمان سرِ داستان کشایم ؛ در راه از دریا گذشتن است ؛ لجه و سطمه و امواج و تری آنرا تماشا خواهم کرد ؛ این سیر از اتفاق است ؛ در خانه کجا دست بهم میدهد چون نام هوا و فضا و دریا و صحرا میشنویم ؛ بحسرت می نگریم ؛ دایه از فریب عشق غافل بود ؛ ندانست که این ماه پاره ناشکیب است ؛ و سخنهای این پُر فریب است ؛ گفت که سرت گردم ؛ بلاگردانت شوم ؛ مانعِ رفتنِ خانه کیست ؛ فتنه خوابیده ؛ شورِ تهمت رفته ؛ برخیز و مهیای خانه شو ؛ بطوریکه خواسته باشی ؛ بطرفی برون رفت ؛ و محافه را تیار کرده آورد ؛ خود و آن مایهٔ جان سوار شده راه پیش گرفتند ؛ نزدیکِ آب از دوریٔ آن عاشق بیتاب ؛ حالِ دختر دگرگون شد ؛ دلش از جوشِ اندوه خون شد ؛ عشق در جگر آتشی برکرد ؛ بی اختیار گریه و زاری سر کرد ؛ نفسی چند حیران کار ایستاد ؛ باز در کشتی نشست و لب کشاد ؛ که آن فرومایه بیطاقتی کرده ؛ کجا در آب غرق گردید ؛ نشانِ آنجا را بمن بده ؛ من هم پر جوش و خروش آب ؛ و کثرتِ امواج و گردابِ حباب نظری افگنم ؛ دایهٔ مکارهٔ غافل از ته کار ؛ در وسطِ دریا رفته گفت ؛ آن آشفته طبع پریشان گو اینجا افتاد و در آب فرو رفت ؛ این بیتاب عشق کجا کجا کرده از محافه خود را بآب انداخت ؛ و چون بیک چشم زدن کارِ خود ساخت ؛ امواج زنجیر پای رنگین او شده بته کشیده بردند ؛ رفت و در کنار عاشق مرده بکام جان خوابید ؛ کشش عشق دیدی که چه کار کرد ؛ این ماجرا بسیار آب برد ؛ دایه دست و پا گم کرده ؛ افتان و خیزان رفته بوارثان او خبر داد ؛ که آن در مکنون بدریا افتاد ؛ جماعتی گریه کنان از دامداران ملتجی گشتند ؛ و دام ها انداختند ؛ بعد از تجسس و تلاشِ بسیار آن هر دو بیجانان را اسیرِ دام ساختند ؛ و وصل وار همه تن بهم چسپان اختلاطی از آب برآمدند ؛ که بنوشتن راست نمی آید ؛ بدشواری از هم جدا

کردند ؛ و برابر خاک در آوردند ؛ ہمہ حیرانِ کارِ عشق بودند ؛ و دستہا از افسوس میسودند ؛ میر اگر نوشتنِ حالاتِ عشق ہوس است؛ ہمیں قدر بس است ؛ بیا و ترکِ ہوس کن ؛ خامہ را بگذار و بس کن ؛ عشق شعبدہ باز یست معروف و مشہور ؛ تصرّفاتش برالسنہ مذکور ؛ چون شعبدہ سر میکند ؛ از آب آتشی بر میکند ؛ از عاشق مردہ کار میگیرد ؛ معشوق برای او می میرد ؛ بیت ۔

عشق از محیط شعبدہ چون سر بر آورد ؛ از پردۂ محیط سمندر بر آورد ؛

تمت بالخیر نثر دریای عشق

کلیاتِ میر کے اس ایک نسخے میں سے صرف دیوان اوّل کے چند اختلافات اور اضافے دیکھ کر آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ان میں سے کچھ نہ کچھ ضرور قابلِ غور ہیں۔ ساتھ ہی آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ میر جیسے اُستاد کا کلیات نہیں کوئی ایک دیوان بھی اس اہتمام سے شائع نہیں کیا گیا، جس کا وہ مستحق تھا۔ میر ان استادوں میں ملنے جاتے ہیں جن کا ایک ایک لفظ زبان کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ لغت اور قواعدِ اُردو کی کونسی معتبر کتاب ایسی ہو سکتی ہے جس میں ان کے کلام سے استشہاد نہ پایا جاتا ہو۔ پھر کیا بحالاتِ موجودہ یہ بات بآسانی ممکن نہیں کہ جس لفظ یا محاورے کو اہلِ لغت یا صاحبانِ قواعد میر کا جان کر نقل کر رہے ہوں وہ سرے سے میر کا رہینِ قلم ہی نہ ہو۔ بلکہ کاتب کا سہو یا اس کا تصرّف ہو۔ ایسی صورت میں لغت اور قواعد دونوں سنورنے کی جگہ اُلٹے بگڑ جائیں گے۔ اور اُردو پر یہ ظلم اُردو کے دوستوں کے ہاتھوں ہو گا۔

دُنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس کے اساتذہ کا کلام نظم و نثر اپنی صحیح ترین شکل میں شائع نہ ہو چکا ہو۔ اُردو باوجود ترقی یافتہ ہونے کے اس معاملے میں بڑی بدنصیب ہے اس کے دلدادہ اپنی آنکھوں کی خاطر تو دو چار خُوب صُورت کتابیں چھاپ چکے ہیں، لیکن خود زبان کی صحیح شکل کی بقا کے لیے کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔ ہند و پاک کی یونیورسٹیوں کے اُردو شعبے دیدہ ور اساتذہ کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ اگر وہ اِدھر توجہ کریں تو چند سال کے اندر میر اور سودا جیسے اساتذہ کا کلام خوب اور خوب تر نہیں، بلکہ خوب ترین صورت میں اربابِ علم کے ہاتھوں تک پہنچ سکتا ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ان مرکزوں کے اساتذہ مل کر ایک جامع اسکیم تیار کریں اور پھر تقسیمِ کار کر کے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے طلبہ سے ایک ایک دیوان ایڈٹ کرا کے ترقی اُردو سے متعلق اداروں کی مدد سے چھاپ دیں۔ اس کے بعد اہلِ مطابع اور تاجرانِ کتب جس کو مقبول دیکھیں گے از خود شائع کرتے رہیں گے۔

ابھی دس پانچ برس تک "وبائی تحقیق"، کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ وبا نہ پھیلی تو اربابِ نقد کے لیے صالح خام مواد ملنا دشوار ہو کر رہ جائے گا۔ ہم سب کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہوا میں محل ابھی تک بننا شروع نہیں ہوئے۔ نیز فلک بوس عمارتوں کے لیے اور زیادہ مضبوط زمین درکار ہوتی ہے۔

---

# میر کا دیوان فارسی۔ قلمی و غیر مطبوعہ — ایک تعارف

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

فارسی کے بلند پایہ شاعر، ممتاز ناقد اور ماہر لغات سراج الدین علی خان آرزو (متوفی ۱۱۶۹ھ) نے اپنے تذکرۂ شعرائے فارسی مجمع النفائس (سال تصنیف ۱۱۶۴ھ) میں میر کی فارسی شاعری کو درج ذیل الفاظ میں سراہا ہے :

" میر محمد تقی المتخلص بہ میر ..... در اوّل بہ مشق اشعار ریختہ، کہ بزبان اُردو شعریست بطرز شعر فارسی توغل بسیار نمودہ، چنانچہ شہرۂ آفاقست۔ بعد آں بگفتنِ اشعارِ فارسی بطرز خاص گرویدہ، قبولِ خاطر ارباب سخن، و دانایان ایں فن گشت۔ طبعش بہ مضامین تازہ و غیر مبتذل معنی پرداز است و اشعارِ او بہ لطافتِ ادا و انداز، ازبسکہ ذہن مناسب و طبع ثاقب یافتہ، در ابتدائے مشقِ شعر رتبۂ سخن را بہ پایۂ اشتہار رسانید ......... ہر چند میر دیوان مختصر دارد۔ اما غزلہائے دردمندانہ و عاشقانہ می گوید" [1]

آرزو کے بعد اکثر و بیشتر اُردو اور فارسی تذکرہ نگاروں نے میر کی فارسی شاعری کی تعریف کی ہے۔ قیام الدین حیرت نے ۱۱۷۴ھ میں ہندوستانی فارسی شعراء کا تذکرہ مقالات الشعراء کے نام سے مرتب کیا۔ میر نے انھیں کچھ فارسی اشعار اپنے ہاتھ سے لکھ کر تذکرے میں شامل کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ مؤلف تذکرہ کے الفاظ یہ ہیں :

" در شعر فارسی ہم مہارتے پیدا کردہ، چند شعر خود را بخطِ خود نگاشتہ برائے صاحب خداوندداد بود کہ داخل تذکرہ نمایند۔" [2]

جو شعر حیرت نے میر کے اپنے تذکرے میں درج کیے ہیں ان میں سے کچھ میر کے زیر نظر دیوان میں بھی موجود ہیں۔ کچھ شعر ذکرِ میر میں بھی ملتے ہیں۔

مصحفی میر کی فارسی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :-

" دعوے شعر فارسی چنداں نہ دارد۔ اگرچہ فارسی کم از ریختہ نمی گوید۔ می گفت کہ دو سال شغل ریختہ

---

[1] دستور الفصاحت صد ۲۳ مرتبہ مولانا امتیاز علی خان عرشی۔ [2] ایضاً صد ۲۳

موقوف کردہ بودم۔ درآں ایام قریب دو ہزار بیت فارسی صورت تدوین یافتہ۔"[1]

بہت سے لوگ میر کے فارسی کلام سے واقف نہیں ہیں۔ ان کی نظر سے نکات الشعراء، ذکرِ میر اور فیضِ میر گزری ہیں لیکن دیوانِ فارسی نہیں۔ یہ دیوان ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے چند مخطوطات ادبیات اُردو حیدرآباد، رضا لائبریری رامپور اور جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتاب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ایک بیاض قلمی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتاب خانے میں ہے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس میں اشعار کی تعداد ۲۹۴۰ ہے اور یہ ناقص الآخر ہے[2]۔ ایک نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانے میں بھی تھا۔ اس میں ۱۲۰۶ھ ہجری کی تاریخ بھی درج تھی۔ اس میں ۲۱۰ صفحات تھے ہر صفحے میں ۱۰ شعر، رباعیات و فردیات ۴ صفحات پر مشتمل تھیں۔ یہ دیوان کہاں ہے کچھ معلوم نہیں۔

متذکرۂ بالا مخطوطات میں نسخۂ ادبیات اُردو حیدرآباد بہت ہی پرانا ہے۔ یہ میر کی حیات میں نقل کیا گیا تھا۔ ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

"تمام شد دیوان فارسی از میر تقی میر بدست لالہ دولت رام بتاریخ چہارم ذی قعدہ ۱۱۹۲ھ موافق ۲۰ جلوس والا بحسب فرمایش شیخ محمد شکر اللہ تحریر پذیر رفت۔"[3]

راقم الحروف کو میر کے دیوان فارسی کے دو نسخے نظر سے گزرے ہیں۔ دونوں نسخے اس وقت جناب ڈاکٹر نیر مسعود کے پاس موجود ہیں۔ ایک نسخے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ یہ ڈاکٹر نثار فاروقی کا ہے جو انھوں نے رامپور سے نقل کر کے منگوایا تھا۔ اس کی ابتداء میں غالباً یادداشت کے طور پر فاروقی صاحب نے یہ عبارت بھی لکھی ہے۔

"نسخۂ ادارۂ ادبیات اُردو، ۹ ½ × ۵ ½، ۸۸ اوراق، ۱۷ اسطری۔ بدست لالہ دولت رائے ۴ ذی قعدہ ۱۱۹۲ھ ہجری۔"

نسخۂ رامپور کئی نسخوں سے مرتب کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا نسخہ بہت ہی پرانا اور مستند ہے۔ اندازِ خط اور کشمیری کاغذ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو برس پرانا ہے۔ میں نے دونوں نسخوں کو ملایا۔ دونوں میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ دونوں میں کہیں تاریخ کتابت بھی درج نہیں ہے۔ ڈاکٹر نیر کا نسخہ خطِ شکست میں ہے۔ اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے۔ میں نیر صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے دونوں نسخے عاریتاً مجھے مطالعہ کے لیے عنایت فرمائے تھے۔

میر کے دیوان فارسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مضامین انھوں نے اُردو میں باندھے ہیں وہی بے کم و کاست فارسی میں بھی ملتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی میر کی وارفتگی اور سوز و گداز کی مثالیں ملتی ہیں۔ ذیل میں اس قسم کے چند شعر درج

---

[1] عقد ثریا ص ۵۴

[2] اودھ کیٹلاگ ص ۱۰۹ مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۴ء

[3] نقوش میر تقی میر نمبر ۲ صفحہ ۵۱۵

کیے جاتے ہیں۔ پہلے فارسی اور پھر اُردو شعر ہیں :

(۱) این نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودگیست — مرگ ہم یک منزل است از راہ بے پایانِ ما
موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

(۲) سرکن اشعارِ ماتم دل میرؔ — برمخواں واقعاتِ مقبلؔ را
مرثیے میرے بھی دل کا رقت آور ہے بلا — محتشمؔ کو میرؔ میں کیا جانوں اور مقبل[1] ہے کیا

(۳) زباز پرسِ قیامت چہ غم کہ بس باشد — وسیلۂ سر زلفش سیاہ کاراں را
جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف — خدا نے حشر میں ہم سے اگر سوال کیا

(۴) دل کہ در سینہ می طپید مرا — این زماں از مژہ چکید مرا
یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا وہ دل غفراں پناہ کا

(۵) آں کہ شب دید آتشم بہ فلک — صبح در رنگِ خاک دید مرا
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

(۶) گردیدہ ایم کوئے بکوشہر ناز را — مطلق رواج نیست متاعِ نیاز را
شہر خوبی کو خوب دیکھا میرؔ — جنسِ دل کا کہیں رواج نہیں

(۷) دوش بر شعر ترے در رقص آمد جانِ ما — چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما
بر ہر غزل من اجتماع است — در مجلس صوفیاں سماع است
جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں — وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

(۸) ہمچو میرؔ آزردہ حالے دیر پیدا می شود — مغتنم دانید روزِ چند این دیندار را
مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں — تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے
برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں — تب کوئی ہم سا صاحب صاحب نظر بنے ہے

(۹) رفتۂ شوق شور دیر و حرم را بگذار — طوف کن میرؔ بہر در بسجود آمدہ را
دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا — ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

(۱۰) روزگارے شد کہ از دین قدیم خویشتن — میرؔ در عشقِ بتاں برگشتہ و زنار بست
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو — قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

---

[1] ایرانی مرثیہ گو تھے۔ اُردو میں بھی میرؔ کے ایک معاصر شاعر تھے وہ بھی مرثیہ کہتے تھے۔ (اکبر حیدری)

(۱۱) من چہ دانم راہ و رسمِ خانقاہ — عمرِ من در خدمتِ بت خانہ رفت

سر نشیں رہ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں — رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

(۱۲) بستۂ وہم است نقشِ زندگی — ورنہ ہستی اعتبارے بیش نیست

یہ توہم کا کارخانہ ہے — یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

(۱۳) نیست شورِ میر در بازار ہا — غالباً از شہر آں دیوانہ رفت

شہر میں حشر کیوں نہ برپا ہو — شور ہے میرے سر میں کیسا کچھ

(۱۴) نالۂ دل خراششِ میر آخر — خواب از چشم دوستاں برداشت

جو اس شور سے میر روتا رہے گا — تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

(۱۵) دمے چند با میرِ آوارہ بنشیں — عجائب مزاج پراگندہ دارد

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ — افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(۱۶) دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد — شوریست در سرِ من شاید بہار آمد

اک موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

(۱۷) نہ دیدم میر را در کوے او لیک — غبارِ ناتوانے با صبا بود

نہ دیکھا میر آوارہ کو لیکن — غبار اِک ناتواں سا کو بہ کو تھا

(۱۸) سحر گہ بر سرِ پروانہ رفتم — کفِ خاکستر گرمے بہ جا بود

پھر نہ دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب — شمع تک تو میں نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

(۱۹) شورشِ دل تا ثریا می رود — کارِ آہ و نالہ بالا می رود

نالہ تا آسمان جاتا ہے — شور سے جیسے بان جاتا ہے

(۲۰) از راہ طلب خبر نہ داریم — مائیم و ہمیں شکستہ پائی

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی — شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

متذکرہ بالا اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر نے اشعار فارسی کو اُردو منظوم کا لباس پہنایا ہے۔

دیوان میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں اور مختلف اشعار ہیں۔ پہلی غزل یہ ہے:

اے ز انعامِ تو واشد غنچۂ امکانِ ما — آب در جو دارد از لطفِ تو باغِ جانِ ما

باکرم گر کار افتد جرم ما را نیست قدر — یک پرِ کاہ است کوہِ شامخِ عصیانِ ما

دیدۂ تر، کے تسلّی بخشِ عاشق می شود　　منبعِ طوفاں شود یارب سرِ مژگانِ ما
ایں نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودنست　　مرگ ہم یک منزل است از راہِ بے پایانِ ما
میرؔ اگر ایں است جوشِ گریہ در ہجرانِ یار
ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریانِ ما

دیوان کی آخری غزل یہ ہے ؎

ہر زماں غم می خوری ہر دم ملامت می کشی　　اے سرت گردم نمی دانم چہ حالت می کشی
داشتن ہر دم زباں زیرِ زبانت خوب نیست　　یاد باشد حرفِ من آخر خجالت می کشی
رو بہ شخصے کن کہ زنگ از دل برد دریک دمت　　ورنہ چند آئینہ ساں رنجِ صفالت می کشی

غزلوں کے بعد رباعیاں ہیں چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں:

قصدے دارم کہ کربلا را بینم　　واں مرقدِ پورِ مرتضٰی را بینم
زانجا بہمیں چشم سر از عمرِ تو بود　　خاکِ تہِ پائے مصطفٰی را بینم

---

یارب بحقِ حسینؑ جرمم بگذار　　وزخاکِ سیاہِ ہند رو دم بگذار
آیم چو گدایانہ من اندر عرصات　　دستم بکفِ شاہِ شہیداں بگذار

---

خار و خس ایں چمن بہ مژگاں رفتم　　با ہر گل و غنچہ دردِ خود را گفتم
چوں عقدۂ دل ازیں بانہ کشود　　پا بر سرِ پا فگندہ آخر خفتم

رباعیوں کے بعد ۱۰۶ اشعار کی ایک مثنوی بغیر عنوان درج ہے۔ غالباً یہ ناتمام ہے۔ نسخۂ ادبیاتِ اُردو حیدر آباد میں اس کا نام "در فراقِ شہرِ ہند" درج ہے۔ یہ مثنوی بھی میرؔ کے قلبی واردات کی آئینہ دار ہے۔ چند شعر ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

اے صبا گر سوئے دہلی بگذری　　ہمچو صرصر آہ مگذر سرسری
بوسہ دہ ہر ہر قدم از سوئے من　　بود بر آں خاک عمرے روئے من
بر منا بر آیۂ رحمت بخواں　　در مساجد خدمتے از من رساں
ہم بکن پیدا جبین تازۂ　　سجدۂ سر ہر سرِ دروازۂ
وقف بر ہر سر کو ساعتے　　بر در و بامش نگاہِ حسرتے

سیر کن طفلاں نہ بازار را | اشتیاقم گو در و دیوار را
زرد گشتم زار گشتم دل گداخت | آب غربت بر مزاجِ من نساخت
سینہ را بخراش در اندوہِ شہر | گریۂ بسیار کن بر یادِ شہر
شہر از بس خوش عمارت بودہ است | ہر مکانش قصرِ جنت بودہ است
کوچہ اش دامانِ دل نہ گذاشتی | راستہ یک شہر رونق داشتی!
رونق و خوبی بہر سو دیدہ ام | صد در دولت بیک کو دیدہ ام
زاں بناہا مطلقاً آثار نیست | از عزیزاں ہیچ کس در یار نیست
بود در مغرب زمیں شہر خوشی | خوش سوادے خوش ہوائے دل کشی
ہر طرف عالی بنا کاشانۂ | دار بستی بود در ہر خانۂ
ساکنانش صرف رعنائی ہمہ | دلبرانش محوِ خود رائی ہمہ
زاہدے آنجا اقامت داشتی | بے عبادت وقت را نگذاشتی

دیوان ذیل کے بند پر ختم ہوتا ہے ؎

کوہِ وقار بود کہ ممنون ہر خسے است | بہر تلاشِ ناں بار بر ناکس و کسے است
ذلت پے تنبہ میرؔ ایں قدر بسے است | بخشائشے کہ بے دل و بے یار و بے بسے ست

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دستگیری و وقت عنایت است

ذیل میں غزلوں کا مختصر انتخاب دیا جاتا ہے ؎

کنوں حفظ کن آبروے مرا | بینداز بر خاک روے مرا
بجویم ترا ہر کجا تا کجا | بجاے رساں جستجوے مرا
چرا نہ شکند گر ازل بودہ است | سرے باشکستن سبوے مرا
مینداز گوشے بہر حرفِ من | ادا ہا بود گفتگوے مرا
خوش آں دم کہ بر سینہ زانو نہی | بُری تا بخوبی گلوے مرا
بعہدِ جنوں شورشی داشتم | تو نشنیدۂ ہاے و ہوے مرا

بمردن تسلی شدم ورنہ میرؔ
نہایت نہ بود آرزوے مرا

تاب کو رفتگان بے دل را     کہ بگیرند راہ قاتل را
از غریقے چو من چہ آگاہی     خاکِ افتادگانِ ساحل را
آہوانِ حرم چہ می دانند     ذوق زخم شکار بسمل را
شدہ تیغے بلند کشتہ شدیم     ما نہ دیدیم روئے قاتل را
از تپش جان من بلب آورد     چہ بلا زد نہ دانم ایں دل را
کس باں محملی ناز نہ گفت     مشکلِ ایں خرابہ منزل را
چہ بگویم ز فرطِ شوق بتے     بندہ ام آں خدائے باطل را
زانچہ در دشت رفت بر مجنوں     چہ خبر پردگیِ محمل را
چوں گہر می برم بخود زیں بحر     گرہِ سخت کارِ مشکل را
از دل و جانِ مہر ورزاں پرس     کینۂ آں جوانِ جاہل را

سر کن اشعارِ ماتمِ دل میرؔ
بر مخواں واقعاتِ مقبل را

---

دل کہ در سینہ می طپید مرا     ایں زماں از مژہ چکید مرا
از لب او بترس آہ بترس     کز غمش جاں بہ لب رسید مرا
آں کہ شب دید آتشم بہ فلک     صبح در رنگِ خاک دید مرا
زود باشد کہ دوستاں بینند     بر سرِ کوئے او شہید مرا
دست ہر دم بہ تیغ بُردن او     میرؔ در خاک و خوں کشید مرا

---

شد ز پہلو دلِ بیگانۂ ما     بے سبب نیست دردِ شانۂ ما
جز بدی از کسے نمی آید     رسم خوب ست در زمانۂ ما
گوئیا سرگذشت مجنوں است     می چکد درد از فسانۂ ما
نالۂ بلبلانِ تیز آہنگ     می دہد یاد از ترانۂ ما
عمرِ من بر درِ بتے بگذشت     کہ نیاید گہے بخانۂ ما

نیست مرغے کہ بر زبانش نیست　　بیتِ اندازِ عاشقانۂ ما

حیف در شورہ راز عالم میرؔ
سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

---

بشکستن رسید حالا شب　　باقیِ داستاں بہ فردا شب

بے تو می آورد بسر ہر روز　　صد بلائے سیاہ ما را شب

می زند نالہ تیغ و آہ سناں　　روز جنگ است و تاں با شب

ما کہ عادت پذیرِ لطفِ تو ایم　　بگذرانیم چند تنہا شب

کلبۂ میرؔ جائے بدہم نیست
می تواں روز کرد اینجا شب

---

بتِ بے مہرِ من ہمہ کین است　　دشمنِ جاں و رہزنِ دین است

جان تلخی کشیدہ می داند　　کہ گل دلبراں چہ شیرین است

از خرامش بہار می ریزد　　رفتنِ یار بسکہ رنگین است

قامتش را بخلق بنمودم　　کافتِ روزگار من این است

گاہ در مسجد است و گہ در دیر
میرؔ را تا چہ دین و آئین است

---

بگلشن ایں کہ گلِ نازاں رسیدہ است　　نظر گاہِ گریبانش نہ دیدہ ست

مترس امروز چنداں از قیامت　　بیا می خور کہ فردا را کہ دیدہ ست

چو گلبن پائے تا سر داغ گشتم　　ز باغش ایں چنیں گلہا کہ چیدہ ست

اگر خوں گشتہ در ہجراں عجب نیست　　کہ دل تصدیع بسیاری کشیدہ ست

بآں غیرت بعشق گل رخاں میرؔ
چہا از مردم بے تہ شنیدہ ست

میرؔ دنیا رہگذارے بیش نیست
آسماں گرد و غبارے بیش نیست

پاسِ جاں کن تن نہ دارد اعتبار
قالبِ خاکی مزارے بیش نیست

بستۂ وہم است نقشِ زندگی
ورنہ ہستی اعتبارے بیش نیست

در بر واعظ چہ زانو می زنی
پوچ گوئی ہرزہ کارے بیش نیست

غرقۂ وہم خودی از بے تہ میرؔ
ورنہ ایں دریا کنارے بیش نیست

---

آں جفا کیش چوں کماں برداشت
طائرِ سدرہ دل ز جاں برداشت

سستی عہد گل چو ثابت شد
بلبل از باغ آشیاں برداشت

نالۂ دل خراشِ میرؔ آخر
خواب از چشمِ دوستاں برداشت

---

دردِ عشقم بچشم یار آورد
گریہ آبے بروے کار آورد

نخلِ عشقت رسید چوں بمراد
صفہائے بریدہ بار آورد

تا رسیدم دریں خراب آباد
فتنہ بر فتنہ روزگار آورد

داغِ سودائے من کہ گشتہ سیاہ
ایں بلا بر سرم بہار آورد

میرؔ در انتظارِ گردِ رہش
چشمِ نمناکِ من غبار آورد

---

گریہ چوں شیشہ در گلو دارد
دل نہ دانم چہ آرزو دارد

گل و آئینہ و مہ و خورشید
ہر کسے رو بہ سوے او دارد

لعل بے تہ کہ می زند بر سنگ
پیشِ لب ہاے او چہ رو دارد

سایہ اش تا پری بہر گامے
از سرِ ناز گفتگو دارد

چوں زِیَد در زماں ز بے لطفی
آں کہ با التفاتِ خو دارد

چرخ یارب نمی رسد جاے　　از برلے کہ جستجو دارد
بگرہ بستہ است چوں گوہر　　ہر کہ یک قطرہ آبرو دارد
جرعہ برخاکِ میرؔ خواہی ریخت
یار ازاں مے کہ در سبو دارد

---

ہر کہ بر بسترِ فراق افتاد　　چشم او دیدہ ام بطاق افتاد
شد مرا قدرِ عافیت معلوم　　کار دل چوں باشتیاق افتاد
دوش از پرتوِ رخِ ساقی　　آتشے در مے رواق افتاد
میرؔ و من دیر دردِ دل کردیم
چوں ملاقات اتفاق افتاد

---

لالہ از خاک گل از شاخ بروں آید　　مژدہ اے عقل کہ ہنگامِ جنوں می آید

---

اے پرتوِ رخسارِ تو در جلوہ گری بود　　آئینۂ خورشید چراغِ سحری بود

---

از کعبہ میرؔ راہ بروں کس چرا برد　　لیکن تو قصدِ میکدہ داری خدا برد

---

بے تو دل دردناک شد آخر　　وز تپش سینہ چاک شد آخر
در غمِ آں جوانِ خوش پرکار　　کشتیِ بندہ پاک شد آخر
عشق یارب چہ داشت با فرہاد　　آں بلاکش خراب شد آخر
جستجو بیش ازیں نمی باشد
در رہش میرؔ خاک شد آخر

---

بہار آمد و گلفشاں شد و لے　　نیفتاد یک برگِ گل بر قفس

ازیں منزل رفتنی بار بند　　بیا حرف در رہ بگو چوں جرس
ز شوقِ گلم سینہ پُر داغ شد　　بدیں رنگ گل کرد آخر ہوس
چہ بر خوبیِ خویشتن غرّہٗ　　بدردِ دلِ غم کشاں ہم برس
چساں میر خواہی بسر کرد آہ
مزاجِ تو سازی نہ دارد بکس

---

بہ نہ گردد از دوا بیمارِ عشق　　می رود ہمراہِ جاں آزارِ عشق
جانِ خود را مفت از کف می دہند　　دل فروشانِ سرِ بازارِ عشق
موجبِ ایں نظمِ گل دانی کہ چیست　　گر شوی آگاہ از اسرارِ عشق
جاں کباب گل شد است از داغِ یاس　　داشتم در دل غم بسیارِ عشق
بس دارد سینۂ پر داغ من　　خوش شگفت ایں تختۂ گلزارِ عشق
یکیۂ ما میر خوش واقع شدہ است
بر لبِ دریاے لنگر دارِ عشق

---

بندہ بر آب گردیدم　　ذرّۂ آفتاب گردیدم
ایں چمن نیست جاے آسائش　　ہر طرف ہمچو آب گردیدم
بستہم شد بزلفِ او چو درست　　جملہ تن پیچ و تاب گردیدم
آدمی تاب خورد بادشمن　　من ز غیرت کباب گردیدم
عاقبت بر گناہِ پاس وفا　　قابلِ صد عتاب گردیدم
بزم امکان نہ داشت کیفیت　　من چو جامِ شراب گردیدم
بودہ ام میر شہرِ آبادی
رفتہ رفتہ خراب گردیدم

---

چشم از گریہ بر نمی دارم　　کہ ہمیں دیدۂ نمی دارم

تو بسر بر بخاطرِ شادی — من دلے دارم و غمی دارم
می روم چشم گرم ناکردہ — چوں شرر فرصت کمی دارم
گرچہ باتست عالمی بے من — بے تو من نیز عالمی دارم
چوں نیم خستۂ دل زاری — می کشم نالہ تا دمی دارم
سادگی ہائے من ببیں کہ ہنوز — چشم لطفے ازو ہمی دارم

دل بآں زلف میر خواہم بست
چہ کنم حالِ درہمی دارم

---

شد در قفسِ غمم رہائی — معشوقۂ روز بے نوائی
کے از نگہے شود تسلی — تصدیع کشیدۂ جدائی
از راہ طلب خبر نہ داریم — ماہیم و ہمیں شکستہ پائی
ایں مرتبہ زندہ گر بمانیم — دیگر نہ کنیم آشنائی
در عشق و ہوس تمیز سہل است — از خانہ اگر بروں نیائی
دوشم گزرے بہ کویش افتاد — آیا بہ بہانۂ گدائی

شد میر فقیر و از عزیزاں
ہرگز نہ کشید میرزائی

---

کردم از بادہ منع و نہ شنیدی — خواجہ آخر فقیر گردیدی
کوہ کن ہمتِ تو عشق است — ایں بلا را چہ سہل بر چیدی
دل عجائب رسالہ بود است — حیف اوقات گر نہ فہمیدی
گفتنِ غم دماغ مے خواہد — لطف کردی کہ حال پرسیدی

میر نے زور داشتی نے زر
بہ چہ سرمایہ عشق ورزیدی

---

اُوپر کے انتخاب میر سے ظاہر ہو گا کہ میرؔ فارسی ہم دینگا ہے بائستہ دانستہ [1] اس سے یہ بھی واضح ہو گا کہ میرؔ بھی ہندوستان کے ممتاز فارسی شعراء کی صف میں جگہ دینے کے حق دار ہیں۔ ان کے دیوان فارسی سے اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ انھیں اُردو کی طرح فارسی میں بھی ہر صنفِ سخن میں یکساں طور پر قدرت حاصل تھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ لوگوں نے ان کے فارسی کلام کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ جہاں تک معلوم ہو سکا عزیز لکھنوی نے ۱۹۲۰ء میں رامپور کے "نیرنگ خیال" "میر نمبر" میں "میر کا فارسی کلام" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ جس میں انھوں نے نسخہ علی گڑھ کو منظر عام پر لایا تھا۔ مضمون راقم کی نظر سے گزرا ہے اور اچھا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی صاحب نے معارف اعظم گڑھ مطبوعہ جون ۱۹۴۲ء میں "میر کا فارسی کلام" کے نام سے مضمون لکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی بیاض قلمی (نسخہ علی گڑھ) سے استفادہ کر کے مضمون میں بڑی محنت کا مظاہرہ کیا ہے۔ صدیقی صاحب کے بعد "میر بحیثیت فارسی شاعر" کے موضوع پر جناب محمود حسن قیصر امروہوی نے مضمون لکھا جو دلی کالج کے میر نمبر میں شائع ہوا۔ موصوف نے اس میں کچھ انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ قیصر صاحب نے بڑی عرق ریزی سے میر کی فارسی شاعری پر ایک مختصر مگر جامع تبصرہ بھی کیا ہے۔ اسی میر نمبر میں ایک اور مضمون "میر کا سبک فارسی" بھی شائع ہوا ہے۔ مضمون نگار ڈاکٹر عابدی صاحب ہیں۔ جو باتیں انھوں نے "خسرو شناسی" مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ میں خسرو کے سلسلے میں کتاب "سبک شناسی" مطبوعہ تہران کے حوالوں سے لکھی ہیں وہی میر والے مضمون میں بھی نظر آتی ہیں۔ کاش وہ فرصت نکال کر میر کا دیوان فارسی بھی ملاحظہ فرماتے۔ ہم جیسے کم سواد لوگوں کو عابدی صاحب سے عالمانہ اور فاضلانہ تحقیقی مضامین لکھنے کی توقع ہے۔ آخر میں علامہ اختر تلہری صاحب کے مضمون "میر کا فارسی کلام" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ مقالہ انھوں نے "حدیث میر" میں شائع کیا تھا مقالہ بڑا مفید اور میر کے بارے میں کار آمد اضافہ ہے۔ یہ بات افسوس سے کہنا پڑتی ہے کہ ملک کے ممتاز ترین محققین جناب قاضی عبدالودود صاحب، جناب سید مسعود حسن رضوی اور جناب مولانا عرشی صاحب نے میر کی فارسی شاعری کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اگر یہ اساتذہ میر کے دیوان فارسی کی طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً میر کے بارے میں بہت سے ایسے گوشے سامنے آجاتے جن پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جناب محمد طفیل صاحب جو عرصہ دراز سے اُردو ادب کی بقا و ترقی کے لیے خاموش جہاد کر رہے ہیں اور جن کو میں اُردو کا "مرد بے تیغ سپاہی" کہتا ہوں میر کا دیوان فارسی بھی شائع کرنے والے ہیں۔ اطلاع کے مطابق اسے اُردو اور فارسی کے ایک شریف النفس محقق جناب ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کئی نسخوں سے ایڈٹ کر رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان کا مرتب کیا ہوا دیوان ہر اعتبار سے "میریات" میں ایک قابل قدر اضافہ ہو گا۔ یہ بھی اُمید ہے کہ طفیل صاحب یہ دیوان بھی ایسا ہی صاف ستھرا اور خوبصورت شائع کریں گے جیسا کہ انھوں نے سال گزشتہ نقوش میر نمبر کے دو شمارے یکے بعد دیگرے شائع کیے۔

---

[1] نتائج الافکار ص۲۰۹ محمد قدرت اللہ گوپاموی۔

# دیوانِ میر

(فارسی)

[ترتیب ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی]

کیا آپ کو معلوم ہے؟

کہ

میر نمبر حصہ اول میں

میر تقی میر کی

۴۶۴۱ غزلوں اور مثنویوں کے علاوہ

۱۵ غزلیں

۱ مثنوی

۲ قصائد

اور متعدد اشعار غیر مطبوعہ تھے

جنھیں پہلی بار نقوش نے پیش کیا تھا۔

علاوہ ازیں

میر تقی میر کے چھ دیوانوں کا خوب صورت انتخاب!

# ابتدائیہ

سبط مسعود

(۱)

کوئی ساٹھ برس پہلے والدِ مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کو میر کی غیر مطبوعہ تحریروں کا ایک مجموعہ ملا تھا جس کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے :

"ایک زمانہ ہوا کہ اودھ کے شاہی کتب خانوں کی فہرست میں مَیں نے ذکرِ میر کا نام دیکھا۔ حضرت میر کی خود نوشتہ سوانح عمری کی زیارت کے لیے دل بے چین ہو گیا۔ میں ان دنوں قدیم اور کم یاب کتابوں کی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں ذکرِ میر کو ڈھونڈتی تھیں لیکن اس کا پتا کہیں نہ لگتا تھا۔ طلبِ صادق کی کشش دیکھیے کہ ایک مدت کے بعد مجھے میر کی غیر مطبوعہ اور نہایت کم یاب تصنیفوں کا ایک مجموعہ ہاتھ آگیا۔ اس مجموعے میں ذکرِ میر بھی تھی، میر کا فارسی دیوان بھی تھا اور رسالہ فیضِ میر بھی تھا۔" [۱]

ذکرِ میر اور فیضِ میر شائع ہو چکی ہیں۔ دیوانِ فارسیِ میر کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔

(۲)

تذکروں میں میر کی فارسی شاعری کے متعلق خود میر کے دو قول ملتے ہیں۔ مصحفی میر کے حالات کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"می گفت کہ دو سال شغلِ ریختہ موقوف کردہ بودم۔ درآں ایام قریب دو ہزار بیت صورتِ تدوین یافتہ۔" [۲]

دوسرا قول سعادت خاں ناصر نے نقل کیا ہے :

"اور میر صاحب یہ شعر فارسی پڑھتے تھے اور کہتے تھے :

---

[۱] "فیضِ میر"، مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب۔ ۱۹۲۹ء (مقدمۂ مرتب ص ۳)

[۲] "عقدِ ثریا"، مرتبہ مولوی عبدالحق۔ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد دکن ۱۹۳۴ء (ص ۵۴)

روئے ترا ننگاپ در[ے] گر نظارہ کرد
اے یار رشک ہیں کہ دلم پارہ پارہ کرد[1]

شیخ علی حزیں بیشتر یہ شعر مجھ سے پڑھواتے تھے اور وقتِ رخصت ایک اشرفی دیتے تھے اور یہ اتفاق ایک ہفتے میں دو روز ہوتا تھا۔"[2]

مصحفی کے بیان سے یہ خاص بات معلوم ہوتی ہے کہ میر دو سال تک اُردو کے بجائے فارسی میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ ناصر بہت غیر ذمہ دار تذکرہ نویس ہیں اس لیے اُن کی بات پر زیادہ اعتبار کرنا مناسب نہ ہوگا۔ میر کا حزیں سے صرف ایک مطلع پر فی ہفتہ دو اشرفیوں کی خطیر رقم وصول کرتے رہنا یوں بھی قرینِ قیاس نہیں ہے۔

مصحفی کے بیان کے مطابق میر اپنے فارسی شعروں کی تعداد دو ہزار کے قریب بتاتے ہیں، لیکن اُن کے فارسی دیوان میں شعروں کی تعداد پونے تین ہزار سے متجاوز ہے۔ اس فرق کی کئی توجیہیں ممکن ہیں: یا تو میر کی یادداشت نے دھوکا کھایا، یا مصحفی سے نقلِ قول میں غلطی ہوئی، یا میر دو سال کے اندر قریب دو ہزار شعر کا فارسی دیوان تیار کر لینے کے بعد بھی گاہے گاہے فارسی میں شعر کہتے رہے۔ دیوانِ میر کے مخطوطۂ ادیب میں جا بجا حاشیوں پر غزلیں بڑھائی گئی ہیں، ممکن ہے یہ غزلیں فارسی گوئی کے اس دو سالہ دَور کے بعد کہی گئی ہوں اور دیوان کی ترتیبِ اوّل میں شامل نہ ہوں۔

اس سوال کا تشفی بخش جواب ملنا مشکل ہے کہ میر کی فارسی گوئی کے وہ دو سال کون سے تھے۔ "فیضِ میر" میں میر کا کوئی فارسی شعر نظر نہیں آتا اگرچہ انھوں نے دوسروں کے شعر درج کیے ہیں، لیکن "ذکرِ میر" میں انھوں نے اپنے بھی فارسی شعر درج کیے ہیں۔ "فیضِ میر" کا زمانۂ تالیف معلوم نہیں، "ذکرِ میر" آصف الدولہ کے عہد میں تمام ہوئی اور اُس زمانہ میں میر دانتوں کی تکلیف سے عاجز آکر انھیں نکلوا چکے تھے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنا یہ شعر لکھا ہے:

روزیِ خود را بہ رنج از دردِ دنداں می خورم
تاں بہ خوں تر می شود چوں لقمۂ ناں می خورم

میر کا ایک فارسی مطلع ہے:

بسکہ در ہر کوچہ از جورِ کسے بیداد شد
عاقبت شہرِ جہان آباد جور آباد شد

---

[1] دیوان میں یہ شعر اس طرح ہے۔
چشمے بہ یک طرف کہ دلم رشک پارہ کرد
روئے ترا ننگاپ درے گر نظارہ کرد

[2] "خوش معرکۂ زیبا" مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۱ء (ص ۱۰۲، ۱۰۳)

یہ طلع بظاہر دہلی میں کہا گیا ہے، لیکن مثنوی " اے صبا گر سوے دہلی بگذری " کے ابتدائی شعروں میں میر نے اپنا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دہلی سے رخصت ہو کر کسی اور شہر کی سکونت اختیار کر چکے ہیں جہاں اُن کے استغنا اور بے دماغی کی شہرت ہے (" شہرۂ شہر است استغنائے من شور دارد بے دماغی ہائے من ) ، اس سے ذہن میر کی لکھنؤ میں سکونت کی طرف منتقل ہوتا ہے ۔

خانِ آرزو کے تذکرے " مجمع النفائس " میں میر کے حال میں یہ فقرہ ملتا ہے " ہر چند میر دیوانِ مختصر دارد اما غزل ہاے دردمندانہ و عاشقانہ می گوید " ۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ " مجمع النفائس " کی تالیف تک میر کا فارسی دیوان تیار ہو چکا تھا ۔ لیکن " مجمع النفائس " میں میر کے ذکر کے متعلق قریب بہ یقین شبہ ہے کہ یہ الحاقی ہے ، لہٰذا اس بیان سے میر کی فارسی گوئی کے زمانے کا تعین نہیں کیا جا سکتا ۔

( ۳ )

دیوانِ فارسیِ میر کا ایک مخطوطہ کتاب خانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ، ایک ادارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد میں ، ایک رضا لائبریری رامپور میں ، ایک کتاب خانۂ عمگین ، گوالیار میں اور ایک ذخیرۂ مسعود حسن رضوی ادیب میں موجود ہے ۔ ان کے علاوہ بھی کلیاتِ میر کے کسی کسی مخطوطے اور مختلف تذکروں میں میر کے فارسی شعر مل جاتے ہیں ۔ دیوانِ فارسیِ میر کی تحقیقی تدوین میں اِن سب مخطوطوں اور تذکروں کا پیشِ نظر رہنا ضروری ہے ۔ میرے شفیق بزرگ ڈاکٹر صفدر آہ مرحوم اکثر مجھ سے اسکی تدوین کی فرمائش کیا کرتے تھے لیکن تحقیق و ترتیبِ متن کے ہمت شکن مراحل کا تصور کر کے میں کتراتا رہا ۔ آخر محمد طفیل صاحب کی اس فرمائش نے میرے کام کو ہلکا کر دیا کہ میں دیوانِ میر کے صرف مخطوطۂ ادیب کا مبیضہ تیار کر کے ان کے حوالے کر دوں ۔ زیر نظر ایڈیشن اسی فرمائش کی تعمیل ہے ۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے بھی ایک زمانہ میں میر کے فارسی دیوان کو مرتب کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اس غرض سے مخطوطۂ رامپور کی نقل تیار کر کے کچھ دور تک ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے مخطوطے سے اس کا مقابلہ بھی کر لیا تھا ۔ اُن کو معلوم ہوا کہ میں میر کا فارسی دیوان مرتب کر رہا ہوں تو اُنھوں نے مخطوطۂ رام پور کی یہ نقل مجھے مرحمت فرما دی ۔ مخطوطۂ ادیب میں بیچ بیچ سے ورق غائب ہیں اور بہت جگہوں پر الفاظ اُڑ گئے ہیں یا حاشیے کی کٹائی میں آ گئے ہیں اور اس مخطوطے کا مطابق اصل مبیضہ بہت ناقص ہوتا ۔ نثار صاحب کی اس عنایت نے اسے تقریباً مکمل کر دیا ۔ اب یہ دیوان مخطوطۂ ادیب ، مخطوطۂ رام پور اور جزئی طور پر مخطوطۂ ادبیات

اُردو ران ۲ ، پر مبنی ہے اور اس کی ترتیب میں ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کو بھی شریک سمجھنا چاہیے -

(۴)

مخطوطہ ادیب پندرہ اور سولہ سطری مسطر کے ایک سو ترانوے صفحات پر مشتمل ہے ۔ ذخیرۂ ادیب میں "فیضِ میر" اور "ذکرِ میر" کے مخطوطوں اور دیوانِ فارسی کے کاغذ، تقطیع ، مسطر اور خط کی یکسانی سے خیال ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی کاتب کے لکھے ہوئے کلیاتِ نظم و نثرِ فارسی میر کے اجزا ہیں جن کی الگ الگ جلد بندی کرائی گئی ہے - تینوں مخطوطوں میں سے کسی پر بھی کاتب کا نام یا تاریخِ کتابت درج نہیں ہے - دیوان کے ابتدائی ورق پر " دیوانِ فارسی میر مرحوم و رسالۂ حکایات در فارسی" کا عنوان پڑا ہے - لیکن اس کا خط متن کے خط سے مختلف ہے اور یہ بظاہر بعد کی تحریر ہے ." رسالۂ حکایات در فارسی" سے رسالہ "فیضِ میر" مراد ہونا چاہیے جس میں میر نے درویشوں کے متعلق چشم دید حکایتیں لکھی ہیں - اور یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اس تحریر کے وقت دیوانِ فارسی اور "فیضِ میر" ایک ہی جلد میں تھے -

(۵)

اس ایڈیشن کی کتابت میں فارسی کے ایرانی املا کے بجائے برصغیر کے املا اور تلفظ کا لحاظ رکھا گیا ہے . مثلاً یائے معروف و مجہول اور نونِ منقوط و غیر منقوط میں فرق کیا گیا ہے - پیشِ نظر یہ مقصد ہے کہ متن کا پڑھنا زیادہ سے زیادہ آسان ہو جائے - اس سلسلے میں کسی سخت ضابطے یا اصول کی پابندی نہیں کی گئی ہے اور بعض بے اصولیاں روا رکھی گئی ہیں ، مثلاً :

(ا) "ممنون ام"، "کباب ام" بمعنی میں ممنون ہوں ، میں کباب ہوں میں آم کو الگ لکھا گیا ہے ( بجائے "ممنونم" ، "کبابم" ) لیکن اگر قافیے میں "خونم" ، "یابم" ( بہ معنی میرا خون ، میں پاؤں ) قسم کے بھی الفاظ ہیں تو سب قافیوں میں م کو ملا کر لکھا گیا ہے ، مثلاً :

ہزار افسوس اگر او را نہ یابم
زانداز نگہ در اضطرابم [ بجائے " در اضطراب ام" ]

(ب) " می ، نمی ، ہمی " کے سابقوں کا پرانا تلفظ یائے مجہول سے ہے (مے کند ، نمے آید ، ہمے دہد وغیرہ) ، لیکن اب ان میں یائے معروف کے تلفظ سے ذہن اتنے مانوس ہو چکے ہیں کہ اُن کو یائے مجہول سے لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوا البتہ جہاں یہ سابقے یائے مجہول والے قافیوں میں آئے ہیں وہاں ان کو بھی یائے مجہول سے لکھا گیا ہے ، مثلاً :

چشم از گریہ بر نمے دارم [ بجائے نمی دارم ]
کہ ہمیں دیدۂ نمے دارم

(ج) ہائے مختفی پر ختم ہونے والے لفظوں کے ساتھ یائے تنکیر اور واحد حاضر کی علامتِ فاعلی کو پہلے ہمزہ کے ذریعے ظاہر

کیا جاتا تھا، مثلاً " دلِ دیوانۂ دارم"، "مقابل نشستۂ"۔ اس ایڈیشن میں موجودہ روش کے مطابق ایسے موقعوں پر ہمزہ کے بجائے "ئے" اور "ای" لکھا گیا ہے (دیوانہ اے، نشستہ ای)، لیکن جہاں یہ لفظ ہائے مختفی کی ردیف والی غزلوں کے آخر میں آئے ہیں وہاں ان کا پرانا املا برقرار رکھا گیا ہے، مثلاً

" رنجش من فہمیدہ کن دارم دل آزردۂ " [ بجائے آزردہ اے ]

یا

" شاید قدم بہ راہِ محبت کشادۂ " [ بجائے کشادہ ای ]

یہ اس لیے ضروری تھا کہ بہ صورتِ دیگر ان غزلوں کو ردیف ہ سے ہٹا کر ردیف ی سے میں لے جانا پڑتا اور اس طرح دیوان میں غزلوں کی ترتیب بدل جاتی۔

(د) مرکب لفظوں کو زیادہ تر الگ الگ لکھا گیا ہے مثلاً "مے خانہ"، "صبح گاہ" وغیرہ، مگر جا بجا کسی معقول جواز کے بغیر اس اصول کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہے۔

(ہ) علاماتِ اوقاف لگانے سے گریز کیا گیا ہے اس لیے کہ اوقاف سے شعر کے لہجے کا تعین ہو جاتا ہے، درحالے کہ بعض صورتوں میں ایک شعر مختلف لہجوں میں پڑھا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اس کے مختلف معنی نکل سکتے ہیں مثلاً

" دل مگر مُردی زجورِ آسماں دادے بکن " کو دو صورتوں سے لکھا جا سکتا تھا :

(۱) " دل! مگر مُردی؟ زجورِ آسماں دادے بکن "

(۲) " دل! مگر مُردی زجورِ آسماں؟ دادے بکن "

اوقاف ان میں سے کسی ایک صورت کو قبول اور دوسری کو مسترد کرتے، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ خود اوقاف ہی کو مسترد کر دیا جائے۔

(۶)

"ذکرِ میر" میں میر نے اپنے جو شعر درج کیے ہیں ان میں بیشتر کے پہلے "لمصنفہ" لکھا ہے اور وہ دیوان میں موجود ہیں۔ لیکن مندرجۂ ذیل دو شعر دیوان میں نہیں ہیں نہ ان کا ہم زمین کوئی شعر موجود ہے :

۱ - فلک زین گونہ خوں بسیار کردہ ست
عـزیزاں را بسے آزار کردہ ست

---

۲ - از ہر کہ سخن کردم گفتند کہ ایں جا نیست
از ہر کہ نشاں جستم گفتند کہ پیدا نیست

(۷)

ہمارے یہاں فارسی کا رواج اتنا کم ہو چکا ہے کہ اب میرؔ کے فارسی کلام کی اشاعت کا بہ ظاہر امکان نہیں رہا تھا اور خیال تھا کہ میرؔ کے یہ قلمی آثار جن کا مطالعہ اُن کے اُردو کلام کے مطالعے کے لیے مفید اور بجائے خود بھی دلچسپ ہے، مخطوطوں ہی میں دبے پڑے رہ جائیں گے۔ محمد طفیل صاحب کی حوصلہ مندی نے ان کو اس طرف متوجہ کیا اور انھیں کی وجہ سے میرؔ کا یہ غیر مطبوعہ فارسی دیوان پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

نیرؔ مسعود

لکھنؤ ۲ راپریل ۱۹۸۱ء

---

# دیوانِ فارسی — نسخۂ رضوی

## میر تقی میر

## فہرست

| شمار | پہلا مصرع | تعدادِ اشعار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱۲۴ | نقاش نہ آساں رُخِ دلدار کشیدہ ست | ۱ | ۹۶ |
| ۱۲۵ | سخت بے باک و بلا عشق گزینے بودہ ست | ۲ | ۹۶ |
| ۱۲۶ | در چمن از روے خوبِ او ستم بر گُل گذشت | ۲ | ۹۶ |
| ۱۲۷ | می گفت میرؔ گریہ کناں چوں زہم گذشت | ۲ | ۹۶ |
| ۱۲۸ | مقصد از طوفِ حرم کے حاصل است | ۳ | ۹۶ |
| ۱۲۹ | ادراکِ خوبیِ تو ز ابصار مشکل است | ۴ | ۹۶ |
| ۱۳۰ | ستم زسادہ دلی ہاے من بہ جان من است | ۳ | ۹۷ |
| ۱۳۱ | مئے کہ بے تو دہد دست ناچشیدہ بہ است | ۳ | ۹۷ |
| ۱۳۲ | میرؔ آں کہ چشمِ شوق بہ ابروے یار داشت | ۲ | ۹۷ |
| ۱۳۳ | دیدہ درخوں ریزیِ من لے بہائی پیشہ چیست | ۱ | ۹۷ |
| ۱۳۴ | شب چشمک ستارہ حریفاں اشارہ اے ست | ۱ | ۹۷ |
| ۱۳۵ | ایں گل ابر کہ گریاں بہ کفِ خاکِ من است | ۱ | ۹۷ |
| ۱۳۶ | بعدِ مرگم از قفس چوں من اسیرے برنخاست | ۱ | ۹۸ |
| ۱۳۷ | بہ ہر غزلِ من اجتماع است | ۵ | ۹۸ |
| ۱۳۸ | باز دل بر سرِ کوے تو ز پا افتادہ ست | ۱ | ۹۸ |
| ۱۳۹ | بہ دستِ ستم کیشِ من ہر زمان است | ۱ | ۹۸ |
| ۱۴۰ | مباش از خویش غافل گر تمیز است | ۱ | ۹۸ |
| ۱۴۱ | ہر یک نزآہ و اشک پے جانِ عاشق است | ۱ | ۹۸ |
| ۱۴۲ | اگرچہ دستِ مرا با سرم سروکار است | ۱ | ۹۸ |
| | (ث) | | |
| ۱۴۳ | بر سرِ ما بہ دمِ نزع رسیدی بہ عبث | ۲ | ۹۸ |
| | (ج) | | |
| ۱۴۴ | ناساز بود عارضۂ عشق با علاج | ۱ | ۹۹ |
| | (چ) | | |
| ۱۴۵ | اسپ و فیل و علم و شوکت و نشان آخر ہیچ | ۲ | ۹۹ |
| | (ح) | | |
| ۱۴۶ | قدرِ جنسِ وفا نہ دارد شرح | ۱ | ۹۹ |
| | (خ) | | |
| ۱۴۷ | ہست بر ریشِ فش ملارِ شیخ | ۲ | ۹۹ |
| ۱۴۸ | بہاراں رنگ دارد شاخ در شاخ | ۲ | ۹۹ |
| | (د) | | |
| ۱۴۹ | دوش بے روے تو از غم کار بر دل تنگ بود | ۷ | ۹۹ |
| ۱۵۰ | سرو پیش سرد از آں قامتِ رعنا ایں می کند | ۷ | ۱۰۰ |
| ۱۵۱ | از رہے ناز کناں کآں بتِ عیار رود | ۷ | ۱۰۰ |
| ۱۵۲ | احوالِ دل مپرسید یک لخت چاک گردید | ۵ | ۱۰۱ |
| ۱۵۳ | دوش آہم زسینہ سرزدہ بود | ۵ | ۱۰۱ |
| ۱۵۴ | ابر و چو کنی کج بہ تو دیدن نہ توانند | ۹ | ۱۰۱ |
| ۱۵۵ | از دست و بازوے تو ضرر بر ضرر رسید | ۵ | ۱۰۲ |
| ۱۵۶ | چوں بہ کویش می روم ہنگامہ بر من می شود | ۵ | ۱۰۲ |
| ۱۵۷ | فتنہ و آفت و آشوب و بلا می گویند | ۱۰ | ۱۰۲ |
| ۱۵۸ | دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد | ۵ | ۱۰۳ |
| ۱۵۹ | آفت کجا ز شورِ تو برپا نمی شود | ۶ | ۱۰۳ |
| ۱۶۰ | دردِ عشقم بہ چشم یار آورد | ۵ | ۱۰۳ |
| ۱۶۱ | متصل بے تو خوں فشانی کرد | ۵ | ۱۰۴ |
| ۱۶۲ | یک لحظہ کاش سوے منِ خستہ رو کنند | ۷ | ۱۰۴ |
| ۱۶۳ | عاشق کہ دل سوختہ چوں آبلہ دارد | ۵ | ۱۰۴ |

| شمار | پہلا مصرع | تعداد اشعار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۳۰۰ | او چہ داند کہ گل داغ نہ پیداست ہنوز | ۷ | ۱۴۰ |
| ۳۰۱ | آماج تست قربت اہل وفا ہنوز | ۴ | ۱۴۰ |
| ۳۰۲ | باقی ست بعد مرگ ہم آثار ما ہنوز | ۲ | ۱۴۰ |
| ۳۰۳ | او چہ داند کہ دلش عشق نہ ورزیدہ ہنوز | ۱ | ۱۴۰ |
| | (س) | | |
| ۳۰۴ | نہ کردیم گشت چمن یک نفس | ۶ | ۱۴۱ |
| ۳۰۵ | آزردہ دل ہم چو منے را چہ کند کس | ۵ | ۱۴۱ |
| ۳۰۶ | در دہر چوں تو خلوتشعائے نہ دید کس | ۵ | ۱۴۱ |
| ۳۰۷ | ما ازاں بے مہر گل پیرا رکیں دیدیم بس | ۲ | ۱۴۱ |
| | (ش) | | |
| ۳۰۸ | دل کہ ہر لحظہ داشتم بہ برش | ۷ | ۱۴۲ |
| ۳۰۹ | دلا برخیز و آہے از جگر کش | ۶ | ۱۴۲ |
| ۳۱۰ | ہر کہ شد دیوانۂ او کس نگردد ہمدمش | ۵ | ۱۴۳ |
| ۳۱۱ | نہ دارد آرزوے دیدن فردوس گلزارش | ۵ | ۱۴۳ |
| ۳۱۲ | آں کہ جاں می رود بہ قربانش | ۶ | ۱۴۳ |
| ۳۱۳ | چہ گویم آہ من از خوے جور ایجادش | ۵ | ۱۴۳ |
| ۳۱۴ | دوش از لعل یار جانی خویش | ۳ | ۱۴۴ |
| ۳۱۵ | می گشت باد صبح گہی گرد خانہ اش | ۷ | ۱۴۴ |
| ۳۱۶ | چشم دارم ز دیدۂ تر خویش | ۵ | ۱۴۴ |
| ۳۱۷ | بود اگر جبرئیل شد رامش | ۱۰ | ۱۴۵ |
| ۳۱۸ | زخم بر زخم خورد نخچیرش | ۷ | ۱۴۵ |
| ۳۱۹ | چوں پردہ برافگند سحر از چہرۂ آتش | ۷ | ۱۴۶ |
| ۳۲۰ | داغ ایم ازیں باغ و ہم از رنگ تماشش | ۳ | ۱۴۶ |

| شمار | پہلا مصرع | تعداد اشعار | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۳۲۱ | برخود بہ تیر را خوانید و خوباں دل بجوئیدش | ۳ | ۱۴۶ |
| ۳۲۲ | مست غفلت چند باشی باخبر اے یار باش | ۲ | ۱۴۶ |
| ۳۲۳ | گرفتارم گوشۂ دامان خویش | ۲ | ۱۴۷ |
| | (ص) | | |
| ۳۲۴ | خصلت من شعار من اخلاص | ۳ | ۱۴۷ |
| | (ض) | | |
| ۳۲۵ | دیدمش پر ز بے وفا و خود غرض | ۲ | ۱۴۷ |
| | (ط) | | |
| ۳۲۶ | نیست تنہایان تو بابر نوع مردم اختلاط | ۱ | ۱۴۷ |
| ۳۲۷ | در دیار حسن خوبے نیست چناں اختلاط | ۱ | ۱۴۷ |
| | (ظ) | | |
| ۳۲۸ | دلا بے رخ یار جانی چہ حظ | ۲ | ۱۴۷ |
| | (ع) | | |
| ۳۲۹ | دیدن در انتظار تو شب داشت سوز شمع | ۱ | ۱۴۸ |
| ۳۳۰ | بے روے تست آہ بہ صد سوز ساز شمع | ۳ | ۱۴۸ |
| | (غ) | | |
| ۳۳۱ | من وز کوے تو عزم سفر دروغ دروغ | ۲ | ۱۴۸ |
| ۳۳۲ | در فضائے سینۂ من نیست اکنوں جاے داغ | ۱ | ۱۴۸ |
| | ف | | |
| ۳۳۳ | اے بے تو جوش سبزہ و باغ و بہار حیف | ۳ | ۱۴۸ |
| | ق | | |
| ۳۳۴ | بہ نہ گردد از دوا بیمار عشق | ۷ | ۱۴۸ |
| ۳۳۵ | می کشد آخر ببینم تا کجا ہا کار شوق | ۵ | ۱۴۹ |

(و)



(ہ)

## (۲) رباعیات[1]



---

[1] دیوان میں رُباعیاں مخطوطے کی ترتیب کے مطابق رکھی گئی ہیں۔ فہرست ردیف وار بنائی گئی ہے اور دیوان میں ہر رُباعی کا جو نمبر ہے وہ پہلے مصرعے کے آگے درج کر دیا گیا ہے۔ (زبیرؔ مسعود)

# غزلیات

## ردیف الف

(۱)

اے ز انعامِ تو واشد غنچۂ امکانِ ما — آب در جُو دارد از لطفِ تو باغِ جانِ ما
با کرم گر کار افتد جرمِ ما را نیست قدر — یک پرِ کاہ است کوہِ شامخِ عصیانِ ما
دیدۂ تر کے تسلی بخشِ عاشق می شود — منبعِ طوفاں شود یارب سرِ مژگانِ ما
این نہ پنداری کہ مردن موجبِ آسودن است — مرگ ہم یک منزل است از راہِ بے پایانِ ما

میر اگر این است جوشِ گریہ در ہجرانِ یار
ابر خواہد برد آب از دیدۂ گریانِ ما

(۲)

کنون حفظ کن آبروے مرا — مینداز بر خاک روے مرا
بجویم ترا ہر کجا تا کجا — بہ جائے رساں جستجوے مرا
چرانشک لند کز ازل بودہ است — سرے با شکستن سبوے مرا
ببیندا ز گوشے بہ ہر حرفِ من — ادا ہا بود گفتگوے مرا
خوشا آں دم کہ بر سینہ زانو نہی — بری تا بہ خوبی گلوے مرا
بہ عہدِ جنوں شورشے داشتم — تو نشنیدہ ای ہاے ہوے مرا

بہ مُردن تسلی شدم ورنہ میر
نہایت نہ بود آرزوے مرا

(۳)

چہ علم است از دہانِ تنگِ او مارو سیاہاں را ‌‌ نماید رد مگر با سبز خط گم کردہ راہاں را

زنی تا چشم برہم مہر رنگِ کینہ می گیرد ‌‌ مروّت آشنائی نیست ہرگز خوش نگاہاں را

جہانے گو بہ محشر بر سرِ خود خاک اندازد ‌‌ کہ می پُرسد بہ پیشِ خوبی او داد خواہاں را

مرا از سیرِ گلشن دل خوشی حاصل نمی گردد ‌‌ بہ یادم می دہد ہر غنچۂ گُل کج کلاہاں را

چہ بودم من کہ برتن جامۂ صد پارہ اے دارم ‌‌ بہ کویش در لباسِ فقر دیدم بادشاہاں را

کند خواہی نہ خواہی ہر سحر قتلِ وفا داراں ‌‌ بہ گردن بستہ شمشیرِ تو خونِ بے گناہاں را

بہ ایراں می روم دہ پانزدہ بیتم عنایت کُن

رہ آورد ے ست میرؔ اشعارِ تو اہلِ صفاہاں را

(۴)

میاور در سخن دل تفتگانِ شوقِ جاناں را ‌‌ کسے رو می دہد اے ہم نفس آتش زباناں را

پے خوش ابرواں باید بسا خونِ جگر خوردن ‌‌ بہ دست آوردن آساں نیست ایں ابرو کماناں را

چہ حظ از سیرِ گلزارم کہ یادم می دہد ہر دم ‌‌ قبائے چاک چاکِ گل لباسِ نوجواناں را

چہ کافر ساحری اے عشقِ بے پروا و دیں دشمن ‌‌ کہ بستی بر میاں زُنّار آخر سبحہ خواناں را

بیا اے میرؔ در راہِ محبت خویش را گُم کن

اگر خواہی کہ دریابی نشانِ بے نشاناں را

(۵)

نشمری سہل زغیب ایں بہ شہود آمدہ را ‌‌ رہ بسے طے شدہ باشد بہ وجود آمدہ را

اشکِ گرمم ہمہ درد است خدا را دریاب ‌‌ از رہِ دورِ دل ایں قاصدِ زود آمدہ را

گرچہ موجود نہ گشتیم ولے سہل مگیر ‌‌ ایں غلط کاریِ وہمِ بہ نمود آمدہ را

عجز را قدرِ بلندے ست نہ پنداری سہل ‌‌ ایں دل از منزلتِ خویش فرود آمدہ را

رفتۂ شوق شو و دیر و حرم را بگذار

طوف کُن میرؔ بہ ہر در بہ سجود آمدہ را

(۶)

شب شیخ دید گردشِ چشمِ پیالہ را ‏ بر باد داد زاہدیِ دیر سالہ را
از ما حکایتِ غمِ دل می تواں شنید ‏ ما خوب می کنیم بیاں ایں مقالہ را
یک رہ تو ہم بپرس از ادائے نسیم صبح ‏ من خود نہ یافتم سببِ داغِ لالہ را
غافل ز دل مشو کہ غنیمت شمردہ اند ‏ اہلِ نظر مطالعۂ ایں رسالہ را
شورِ تو عندلیب جگر چاک می کند
آموختی ز میرؔ مگر طرزِ نالہ را

(۷)

بسکہ خوش دارد دلِ من مشربِ رندانہ را ‏ بر سرِ بازار بر سر می کشم پیمانہ را
بود بر ہر پارۂ دل صد الف داغ از غمش ‏ خط کشی بعد از خرابی کرد عشق ایں خانہ را
قیس را آیا سگِ لیلیٰ ز صحرا جُستہ بود ‏ آدمی مطلق نمی دانست آں دیوانہ را
سینہ صافی ہائے من از گریۂ دیرینہ است ‏ سیل ہا جاروب کش بودہ ست ایں ویرانہ را
نیست برہم خوردنِ جمعیتِ ما ایں قدر ‏ اندکے در جنبش آر آں ابروئے مردانہ را
شمع بر پشتِ غبارِ گل غذائے خوش نماست ‏ بر فشاں بر خاکِ من خاکسترِ پروانہ را
من نمی گفتم فریبِ اختلاطِ او مخور
دیدی آخر میرؔ طورِ آں وفا بیگانہ را

(۸)

بے تو جائے کہ فتد دیدۂ نم ناک آں جا ‏ سبزہ تر شود از نو خس و خاشاک آں جا
طالع آں کہ بہ نخچیر گہِ عشق رسید ‏ سر ہر صید نہ بندند بہ فتراک آں جا
اے کہ داری سرِ آں کوچہ اگر خواہی رفت ‏ یادگارے ست ز ما ہم دلِ صد چاک آں جا
بر درِ پیرِ مغاں پیشتر از صبح برو ‏ فیض ہا می رسد از سلسلۂ تاک آں جا
میرؔ جائے کہ بہ نیرانِ محبت می سوخت
صبح دیدیم بہ جا ماندہ کفِ خاک آں جا

(۹)

ببیں کہ موسمِ گل شد سببِ خزانِ مرا
بہار آمد و آتش زد آشیانِ مرا

بہم رسید متاعِ وفا بہ صد محنت
ولے بہ پند نیفتاد دل ستانِ مرا

کماں بہ دست گرفتی بہ طفلی و گردوں
نشانِ تیرِ بلا کرد استخوانِ مرا

بہ جمعِ ماتمیاں حرفِ من اثر دارد
بہ بزمِ عیش نہ فہمد کسے زبانِ مرا

ز ضعف میرؔ بہ چشمِ کسے نمی آیم
لطافتے ست چو جاں جسمِ ناتوانِ مرا

(۱۰)

قرار نیست بہ تن جانِ بے قراراں را
وداعِ عمر قریب است بے تو یاراں را

شبے نہ شد کہ سپہرش نہ کرد روز ولے
سحر نہ کرد شبِ تیرہ روزگاراں را

بہ حقِ دیدۂ نم ناک ساغرِ مے ناب
ببخش بارِ خدایا شراب خواراں را

ز باز پرسِ قیامت چہ غم کہ بس باشد
وسیلۂ سرِ زلفش سیاہ کاراں را

ز جوشِ گریۂ ماتم کشاں مپرس کہ میرؔ
بنا بہ آب رسانداست کوہساراں را

(۱۱)

لختِ دل ہر شب بہ دامانم نمی دانم چرا
ہر سحر سر در گریبانم نمی دانم چرا

باب لطفش نیستم لیکن چو از رہ می رسم
بر درِ او دیر می مانم نمی دانم چرا

چارۂ من دل ربایاں جملہ می دانند لیک
کس نمی گوید کہ می دانم نمی دانم چرا

نے از آں سو ریختنے نے پیچشے نے کاوشے
خود بہ خود خاطر پریشانم نمی دانم چرا

باوجودِ ناامیدی گریہ چوں سر می کنم
می رسد دل تا بہ مژگانم نمی دانم چرا

او غرورِ حسن دارد زیں سبب پروائش نیست
من کہ ضبطِ خویش نتوانم نمی دانم چرا

گریۂ من گرچہ می دانم نہ دارد حاصلے
باز صبح و شام گریانم نمی دانم چرا

میلِ او امکاں نہ دارد سوئے عاشق لیک من
با ہزاراں نام می خوانم نمی دانم چرا

مدتے شد میرؔ مژگانش ز من برگشتہ است
خار خارے ہست با جانم نمی دانم چرا

(۱۲)

چوں بہ کف بینم کماں آں ترکِ سختی کیش را | دل شود بے تاب و از جا ہا نمایم خویش را
چشمِ خود پیش از سحر بکشا کہ شیرانِ خدا | در نظر دارند غافل وقت گرگ و میش را
پند با دیوانگاں ناصح نہ دارد حاصلے | شیوۂ رحمے بیاموز آں ستم اندیش را
بر نہ دارد از سرِ ما دستِ شفقت ہیچ گاہ | عشق می داند نمک خوارِ خود ایں دل ریش را

ہم چو میرؔ آزردہ جانے دیر پیدا می شود
مغتنم دانید روزے چند ایں درویش را

(۱۳)

دل کہ در سینہ می تپید مرا | ایں زماں از مژہ چکید مرا
از لبِ او مپرس آہ مپرس | کز غمش جاں بہ لب رسید مرا
آں کہ شب دید آتشم بہ فلک | صبح در رنگِ خاک دید مرا
زود باشد کہ دوستاں بینند | بر سرِ کوئے او شہید مرا

دست ہر دم بہ تیغ بردنِ او
میرؔ در خاک و خوں کشید مرا

(۱۴)

دارم چو جاں عزیز دلِ زارِ خویش را | خوں کردہ ام درا و غمِ بسیارِ خویش را
گہ گہ چو آفتاب بہ سر می رسیدہ باش | افتادگانِ سایۂ دیوارِ خویش را
تحقیق کن کز اوّلِ خلقت کسے ہنوز | زار ایں چنیں نہ کُشتہ گرفتارِ خویش را
میرم ز رشکِ آں کہ بہ وقتِ وداعِ جاں | چشمے کشود و دید بہ سر یارِ خویش را
جور و جفاست کارِ تو و من ز سادگی | موقوفِ رحم داشتہ ام کارِ خویش را
محرومِ یک نگاہ مکن رخصت از جہاں | وارفتگانِ حسرتِ دیدارِ خویش را

سودائے ماست میرؔ بہ عیّار پیشہ اے
کو بارہا فروخت خریدارِ خویش را

(۱۵)

با ما ہنوز بے مزگی ہاست یار را — بے وجہ رنجشے ست ہماں آں نگار را
ما تازہ واردانِ جہانِ کہن نہ ایم — پر دیدہ ایم گردشِ لیل و نہار را
گشتیم خاک و کینۂ دیرینہ ات بجاست — بیروں نمی کنی ز دلت ایں غبار را
برخاک ہم ز پہلوے ما کار تنگ شد — یا رب کجا بریم دلِ بے قرار را
از دل نہ رفت جنبشِ مژگانِ گل رخاں — با خود بہ خاک می برم ایں خار خار را
بر ہر سخن گریستنم مصلحت نہ بود — از دست داد بے تہیِ چشم کار را

برداشتن ز خاک بسے مشکل است میرؔ
مجروحِ بے حدِ ستمِ روزگار را

(۱۶)

اُنس امسال نہ ماندہ ست ز انساں مارا — می کشد دل ز جنوں سوے بیاباں مارا
بے تو شب باشیِ گل زار کجا خواہش بود — بہ زباں داشتہ بلبل بہ گلستاں مارا
اخگرے بود . . . . . . . . آمده[1] — آتش . . . . . . . . . ن مارا[2]
دل رُبایاں بہ سرِ زلف بہ ما حرف زدند — مگر ایں قوم [نہ کردند][7] پریشاں مارا
زیں . . . . . . . . . .[3] — بارہا دیدہ بہ گل دست و گریباں مارا
بس . . . . . . . . .[4] — انتفاعے نہ رسیدہ ست ز ایشاں مارا

. . . . . . . . . . . .[5]
کرد بسیاریِ غم رشتہ پیچاں مارا

(۱۷)

حالیا در دل نمی گنجد غمِ بسیارِ ما — یک دو روزے اے بے وفا کم کم بکن آزارِ ما
ما بہ یک دیدِ چمن از دور دل خوش می کنیم — بر نہ تابد منتِ گل گوشۂ دستارِ ما[8]

---

[1] [2] [3] [4] [5] مخطوطۂ ادیب میں یہ مصرعے کٹ گئے ہیں۔ نقل رام پور میں یہ غزل موجود نہیں ہے۔

[7] قیاسی [8] ماخوذ از عرفی شیرازی: "سایۂ گل بر نہ تابد گوشۂ دستارِ ما"
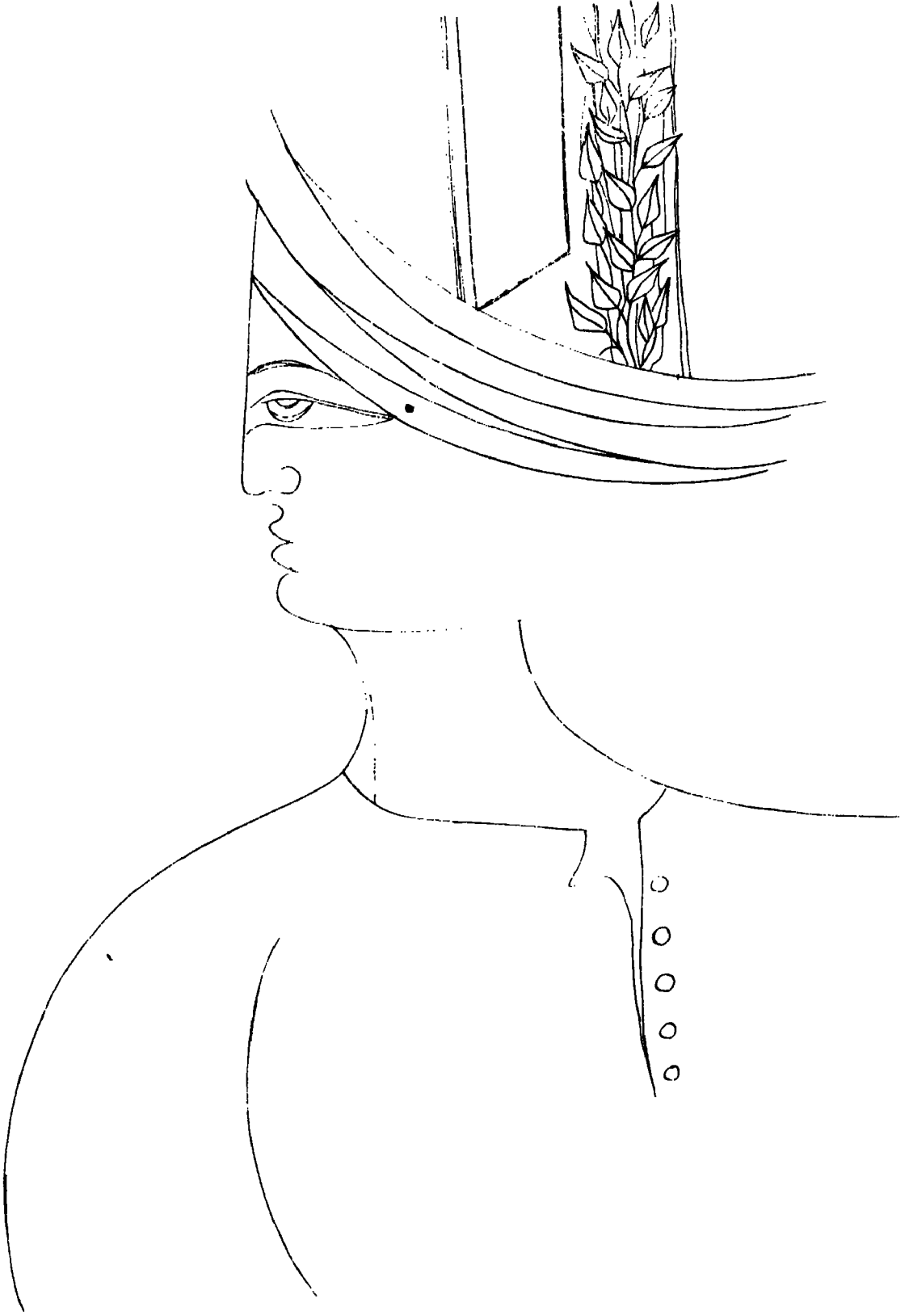
اس کا منہ دیکھ رہا ہوں، سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں، میری بھی حیرانی کا

کوچۂ او را چمن کردیم چوں رخصت شدیم  ریخت رنگِ تازہ صدجا دیدۂ خوں بارِ ما
ما خودائے صورت گراں بیش از خیالے نیستیم  شاید از دستِ شما صورت بگیرد کارِ ما
در بد آموزیِ او ہیچ احتیاجِ غیر نیست  خوب می داند رہ و رسم جفا را یارِ ما
من بہ خاکِ رہ برابر گشتم و یک رہ نہ گفت  بود خاک افتادہ اے در سایۂ دیوارِ ما
کاروانِ گریہ ایم و می رسیم از شہرِ دل  نیست چیزے میرؔ غیر از درد و غم در بارِ ما

(۱۸)

بیا بہ طرف شہیدِ نگاہِ خوباں را  ببیں مروّتِ چشمِ سیاہِ خوباں را
تو اے غزال چکارہ گرای کہ روح ہیں  کمینہ صید بود دام گاہ خوباں را
بہ یاد می دہدم غنچگیِ گل در باغ  شکستِ تازۂ طرفِ کلاہِ خوباں را
ملک اگر ہمہ بر عرش می برد لیکن  جگر کجا کہ نویسد گناہِ خوباں را
نظر بہ کحلِ جواہر نمی کند اے میرؔ
بہ دیدہ آں کہ کشد گردِ راہِ خوباں را

(۱۹)

شد ز پہلو دلِ یگانۂ ما  بے سبب نیست دردِ شانۂ ما
جز بدی از کسے نمی آید  رسم خوب است در زمانۂ ما
گوئیا سرگذشت مجنوں است  می چکد درد از فسانۂ ما
نالۂ بلبلانِ سیر آہنگ  می دہد یاد از ترانۂ ما
عمر من بر درِ کسے بگذشت  کہ نیامد یکے بہ خانۂ ما
نیست مرغے کہ بر زبانش نیست  بیتِ اندازِ عاشقانۂ ما
حیف در شورہ زارِ عالم میرؔ
سبز ناگشتہ سوخت دانۂ ما

(۲۰)

رو بہ گلشن کرد پائیز از شکستِ رنگِ ما  نوحہ گر شد از غمِ دل مرغِ سیر آہنگِ ما

ما کہ سیرِ عالمِ تنزیہ عمرے کردہ ایم — وسعتِ ایں جا نمی آید بہ چشمِ تنگِ ما

خوّ می معلوم شد لفظِ زبانِ دیگر است — ایں لغت جائے نمی یابند در فرہنگِ ما

گفتگوے سختِ ما ہم بے نزاکت نیست میرؔ

در بغل دارد چو سنگِ شیشہ مینا سنگِ ما

( ۲۱ )

بے تامل کے شناسی طرزِ گفتارِ مرا — دیدہ نازک کن کہ فہمی حرفِ تہ دارِ مرا

آں چناں می [ آئی ][۱] از تمکیں کہ گویا می [ رودی ][۲] — طرزِ رفتارِ تو باشد آمدِ کارِ مرا

تا ز چشمِ مستِ خود رطلِ گرانم دادہ است — باز وضعِ خویش بیروں است رفتارِ مرا

جوشِ اشکم دیدہ دریا آتش از جوشش پرید — پیشِ خدمت گشت آخر گریۂ زارِ مرا

کار بر کوہ و بیاباں از غمِ من تنگ شد — ظرف کم آمد جہاں اندوہِ بسیارِ مرا

سادگی ہیں کز طبیبِ بے تمکنے ہم چو عشق — آرزومندی بہبودی ست بیمارِ مرا

میرؔ پشتِ چشم نازک کردنِ گل خار کرد

کاش بنمایند او را یک نظر یارِ مرا

( ۲۲ )

بلند انداختم چوں خوش فغاں[۳] را — نمودم پست سروِ بوستاں را

چہ می پرسی کہ حالم گفتنی نیست — تو ہم بکشا سرِ ایں داستاں را

تو بے رنگی و گل کردی بہ رنگے — کہ گل گل بشگفانیدی جہاں را

وفاے گل اگر معلوم می شد — نمی بستم در ایں باغ آشیاں را

سرِ رہ میرؔ جاں دشوار می داد

چہ پیش آمد نہ دانم آں جواں را

( ۲۳ )

حیف بر حالِ دلِ خستہ نظر نیست ترا — ما بہ ایں حال رسیدیم و خبر نیست ترا

---

لہ ۲ہ قیاسی تصحیح ۔ مخطوطے میں "آید" اور "رود"

۳ہ از نقلِ رام پور مخطوطۂ ادیب "قدر آں"

بردہ تہ داریت اے دیدہ دل ازجا ما را — می زند بحرِ بلا جوشش و خطر نیست ترا

ایں چہ طوراست دلا کز غمِ ہجرِ آں ماہ — عمر . . . حا . . . . . . نیست ترا

داغم از گرم روی ہاے تو اے عمرِ عزیز — یک مژہ فرصتِ ماندن چو شرر نیست ترا

میرؔ مصروفِ بکا ایں ہمہ بودن ظالم
ہیچ اندوہِ دل و فکرِ جگر نیست ترا

(۲۴)

حرفِ بدگو نقشِ خاطر بود محبوب مرا — زد بہ فرقِ نامہ بر ناخواندہ مکتوب مرا

سعی اکنوں کن کہ بعد از من چہ حاصل اے فلک — شیوۂ رحمے اگر آموختنی خوب مرا

چشمِ ساقی ہر زماں بوسم کہ در بزمِ شراب — از دو ساغر بے تکلف کرد مجذوب مرا

طرفہ تر این است آں ہم داغِ حسرت وجہ بے او ست — در کنارِ ہر کہ جا کردہ ست مطلوب مرا

صبر کردن بر بلا اے میرؔ از[1] من یاد گیر
گرم ایں کار است از حد بیش ایوب مرا

(از نقل رام پور)

(۲۵)

لب را گہے بہ خندہ نیالودہ ایم ما — تا بودہ ایم گریہ کناں بودہ ایم ما

ما واکشانِ سایۂ آں قامتِ خوش ایم — ہرگز بہ پاے سرو نیا سودہ ایم ما

گر سجدہ گاہِ خلق شود خاکِ ما بجاست — عمرے بہ پاے یار جبیں سودہ ایم ما

با آں امیدواریِ لطفے کہ داشتیم — حرفِ عنایتے ز تو نشنودہ ایم ما

ایں عقدہ [در[3] دل است] کہ گاہے کامِ دل — بندِ قبائے ناز تو نکشودہ ایم ما

چوں سایہ با تو ایم و زبس شرمِ ناکسی — روئے سیاہِ خود بہ تو ننمودہ ایم ما

عالم بہ چشمِ ما ہمہ شد تیرہ و ہنوز
برگریہ میرؔ نالہ نیفزودہ ایم ما

(از نقل رام پور)

---

[1] مخطوطۂ ادیب میں غزل نمبر ۲۴ شعر نمبر ۱ کے بعد کچھ ورق غائب ہیں۔ اس شعر (۲) سے غزل ۳۶ شعر ۲ تک نقل رام پور سے منقول۔

[2] کذا "میرؔ از دلِ من ؟"

[3] از ن ۲۔ نقل رام پور میں "عقدہ ہاے درد"

(۲۶)

چسپیدہ بہ دل طورِ تو عاشق ہنراں را — چشمِ تو زخود ساختہ طالب نظراں را
یک بار سر از روزنۂ خانہ بروں کن — تنگ این ہمہ پسند دلِ در بہ دراں را

روسوے گل و لالہ بہ ایں حسن میاور — بر باد مدہ عزّتِ خونیں جگراں را
سازند اگر شیشہ بدیں شکل بسازند — یک رہ بنمائید دلم شیشہ گراں را
میرم پے یک دیدن [ودانستہ نہ بینند[1]] — عشق است بہ آزردنِ من خوش پسراں را
برآبِ رواں مے کشیِ ماکہ مدام است — خوش می گذرانیم جہانِ گذراں را
آدابِ جنوں یاد زمن گیر کہ بسیار — دریافتہ ام صحبتِ آشفتہ سراں را
آں ای تو کہ سرگرم رہِ عشق تو پابند — دامن بہ میاں برزدہ نازک کمراں را
آسودگیِ اہلِ [فنا[2]] بے سببے نیست — شاید خبرے می رسد ایں بے خبراں را

خواہم کہ نخستیں رسدم زخم رسائے
تاکشتۂ او میرؔ نہ بینم دگراں را

[ از نقلِ رام پور]

(۲۷)

یک غنچہ خوں نہ خوردہ چنیں پیشتر کہ ما — یک گل نہ داشت ایں ہمہ زخمِ جگر کہ ما
برقے نہ جَست خندہ زناں ایں چنیں کہ تو — ابرے نہ خاست گریہ کناں ایں قدر کہ ما
دعویٰ ضرور نیست ببینیم می ردی — زیں بزم اے چراغ تو پیش از سحر کہ ما
باز آمدہ بہ لالۂ ایں باغِ سبز ہیں — او کے چنیں نشستہ بہ خوں تا کمر کہ ما

کردیم صرفِ ناخنِ خود میرؔ جبہہ را
زیں ساں کشادہ است کہ دستِ ہنر کہ ما

[ از نقلِ رام پور]

---

[1] قیاسی تصحیح ۔ نقل رام پور "دیدن در سینہ بہ بیند"

[2] قیاسی تصحیح ۔ نقل رام پور "اہلِ حیا"

(۲۸)

بہ پیشِ روے خود چیزے نمی دانند گلشن را | چہ بارے در سر است این دلبران دوست دشمن را
بہ امیدے کہ عشق آتش زند این جان غم ناکم | بسانِ شمع یک جا کردہ ام رگ ہاے گردن را
بہ صحن این گلستاں ماندہ ام یک عمر زنجیری | مگر نشنیدہ اید اے ہم صفیراں شورِ شیون را
[تُنکِ[۱]] آبی دریا جاں بہ لب دارد مرا تا کے | فشارے می دہم چوں ابرِ تر یک بار دامن را

تعجب نیست گر اے میرؔ من قادر سخن گشتم
کہ خدمت کردہ [ام[۲]] بسیار [مشتاقانِ[۳]] این فن را

(از نقلِ رام پور)

(۲۹)

انداز دیدنِ او در خوں کشید مارا | از چشم یار آخر زخمے رسید مارا
شورِ محبتِ من از بس کہ در کشش افتاد | آمد براے دیدن ہر کس شنید مارا
محرومِ واشدِ دل زفتیم ماکہ دوراں | در غنچگی بہ ناگہ زیں باغ چید مارا
ہر کس بہ دلبر خود شد ہم کنار شاداں | حسرت فزود بے تو در روزِ عید مارا

میرؔ این ہمہ مروت آخر بہ کام چشمت
با خاکِ تیرہ یکساں چوں سرمہ دید مارا

(از نقلِ رام پور)

(۳۰)

گرچہ روکش نیستم در گریہ سامانِ ترا | یک روزے می کشم اے ابر دامانِ ترا
مہ کجا و چہرۂ مہتابئ تو از کجا | ننگ می آید از این نسبت غلامانِ ترا
باز از سر گرد غبار از [تربتم[۴]] خیزد چہ دور | چشم بر رہ داشتم سروِ خرامانِ ترا
تیغِ [نازت[۵]] را دمے بے قتلِ ما آرام نیست | خوں کہ شیریں است ظالم تلخ کامانِ ترا

---

۱ قیاسی تصحیح۔ نقل رام پور "بتنگ آبی" ۲ ۳ قیاسی تصحیح۔ نقل رام پور "کردہ ای" اور "مشتاقان"
۴ از ن ۲۔ نقل رام پور "ہر کسم خیزد" ۵ از ن ۲۔ نقل رام پور "یارم"

ذوقِ حرفت از کہ دریابم کہ در سر ہوش نیست          از شرابِ گفتگویت ہم کلامان ترا

ہیچ کس جز میرؔ تابِ چشم گرداندن نہ داشت
یک نظر دیدم سحر برگشتہ [کامانِ[1]] ترا

(از نقلِ رام پور)

(۳۱)

خطر در عشق ہر گام است جانِ بے قرارم را          عجب رہ آہ پیش آمد دلِ ناکردہ کارم را

نمودی صبحِ چشم و ہر طرف برخاست آشوبے          کشودی شامِ زلف و تیرہ کردی روزگارم را

بہ سویش می کشاید بالِ شوق از مرگ خود غافل          مگر مرغِ چمن ہم گل گماں بُردہ ست یارم را

چو آں دہقاں کہ کارد تخم و ناگہ خشک سال اُفتد          بغیر از ناامیدی نیست حاصل انتظارم را

من آں سوزاں دروں بودم کہ از بہرِ مرادِ خود          بہ شب شمعے بہ کف پروانہ می جوید مزارم را

نہ بستم غنچہ سے از من گلے بشگفت در ظاہر          ولیکن کے تواں پوشید چوں عنبر بہارم را

کند آزردہ جائے گاہ باشد گریہ بر خاکم          مکن آوارہ اے بادِ صبا مشتِ غبارم را

کشم اے بحرِ خوبی تا کجا خمیازہ از شوقت          لبالب کُن یکے مانندِ موج از خود کنارم را

چہ گویم میرؔ از آں سوزے کہ با خود داشتم پنہاں
چنار آسا تمامی سوخت آخر برگ و بارم را

(از نقلِ رام پور)

(۳۲)

ہر جا صیدے ست صیدِ دامت بادا          در طائرِ سدرہ است رامت بادا

ساقی بے خرمی بہ جامت بادا          گردیدنِ آسماں بہ کامت بادا

از لطف پیالۂ حبابم کردی          دوراں بہ مرادِ دل مدامت بادا

با روئے تو گر صبح مقابل گردد          خورشید گرفتار بہ شامت بادا

با غیر اگر وعدۂ فردا داری          فردائے تو فردائے قیامت بادا

---

[1] قیاسی تصحیح۔ نقلِ رام پور "برگشتہ مامان"

در منعِ شراب گر کنی کوتاہی ‏ ‏ واعظ خورش و خواب حرامت بادا
گر کفشِ تو اے شیخ بہ مسجد گم شد ‏ ‏ اندوہ مخور سرت سلامت بادا
در عہدِ تو گر میرؔ بہ کامے نہ رسید
ایام بہ کام مستدامت بادا

(از نقلِ رام پور)

**(۲۳)**

در [عشق][۱] کس نہ گشت حریفِ نبردِ ما ‏ ‏ بر روے ما نماندہ جز رنگِ زردِ ما
بے رحمیِ تو تا چہ مقام است خود ببیں ‏ ‏ مُردیم بے تو و نہ رسیدی بہ دردِ ما
گردیدہ ایم خاک و ہماں فتنہ در سر ایم ‏ ‏ سر می کشد بہ ناز از ایں دشت گردِ ما
کس خواہشِ ہنر نہ کند ورنہ ہست میرؔ
ایں جنس تودہ تودہ بہ بازارِ سردِ ما

(از نقلِ رام پور)

**(۲۴)**

دوش بر شعرِ ترے در رقص آمد جانِ ما ‏ ‏ چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما
ما ازیں دینِ کہن بسیار خجلت می کشیم ‏ ‏ تازہ سازد کاش عشقِ دلبرے ایمانِ ما
در خرامِ ناز پا را دیدہ دیدہ می گزار ‏ ‏ خار در راہت مبادا باشد از مژگانِ ما
طاقِ دل افتاد و تو گاہے قدم نگزاشتی ‏ ‏ خانہ بنشست و نہ گشتی زینتِ ایوانِ ما
باعثِ رسوائیِ ما گریۂ شب ہائے ماست ‏ ‏ روزِ خوش یارب نہ بیند دیدۂ گریانِ ما
از خیالِ چہرۂ آں ماہ طلعت ہر زماں ‏ ‏ یوسفے در جلوہ دارد کلبۂ احزانِ ما
نیستم اے میرؔ گم نام ایں ہمہ در عاشقی
شہرتے دارد در آں کو خانۂ ویرانِ ما

---

[۱] قیاسی تصحیح ۔ نقلِ رام پور "عنقا"

## (۴۵)

سال ہا بیمار ماندم بے تو کے دیدی مرا    مُردم از بے لطفیت آخر نہ پرسیدی مرا

رو بہ چوں من نا کسے یک بار آوردی مگر    کس نہ بود اے عشق در عالم کہ بگزیدی مرا

ایں قدر اے لالہ با من گرم جوشی خوب نیست    در چمن دیدی و ہم چوں داغ چسپیدی مرا

نیست چوں من نسخہ اے جامع ہزار افسوس میر

دیر پیشت ماندم و مطلق نہ فہمیدی مرا

(از نقل رام پور)

## (۴۶)

از خطِ پشتِ لبت در دل چہ با داریم ما    می کشیم آزار و بر رویت نمی آریم ما

می برد ہر دم بہ تیغِ جور بے باکانہ دست    کشتۂ اندازِ او باشانۂ یاریم ما

کو دماغ و دل کہ صرفِ سیرِ ایں گلشن کنیم    از غمِ مفرط بہ حالِ خود گرفتاریم ما

بعدِ مردن خاک گشتن آں گہے رفتن بہ باد    کار ہا بسیار در پیش است و بے کاریم ما

تا کجا در ہجرِ او با فتنہ کس گردد دچار    مصلحت در مرگ می بینیم ناچاریم ما

در امیدِ لطفِ خوباں صرف شد عمرِ عزیز

میر تا کے جانِ غم کش را بیازاریم ما

## (۴۷)

گردیدہ ایم کوے بہ کو شہرِ ناز را    مطلق رواج نیست متاعِ نیاز را

چیزے نمودہ طرح کہ او گرمِ ناز شد    آتش زنید خانۂ آئینہ ساز را

از اشک شیشہ بر سرِ مژگاں بہ ہر دم است    ماند بہ ہجر چشمِ ترم شیشہ باز را

آرامِ دل بہ بزمِ جہاں در خموشی است    چوں شمع می برند زبانِ دراز را

می بایدت گداختہ گشتن ز دردِ عشق    وقرے نمی نہند دلِ بے گداز را

از طورِ روزگار جواناں چہ آگہ اند    ایشاں نہ دیدہ اند نشیب و فراز را

در شہرہ خانہ میر مگر بود شب کہ صبح    دیدم بہ دستِ مُغبچہ مُہرِ نماز را

---

۱؎ ۲؎ منقول از نقلِ رام پور

(۳۸)

چساں از خود کنم زاں گو نہ شوخِ بدزبانے را ¹ کہ آتش می شود بے ہیچ و می سوزد جہانے را

ز اخلاصِ قوائے جانِ جہاں اندیشہ ہا دارم کہ می یابم بہ خود سرگرم کیں ہر مہربانے را

زقتلِ میرؔ آگہ نیستم یک ایں قدر دانم
کہ می بردند از کوئے تو نعشِ نوجوانے را

(۳۹)

شب از جگر کشیدم یک آہِ آتشیں را او آتشے دگر زد در دل من حزیں را

غیرت نمی گذارد اے پند گو وگرنہ یک لحظہ می نمودم آں سحر آفریں را

از نالہ میرؔ بس کن بے درد چند سازی
آزردہ رہ رواں را رنجیدہ ہم نشیں را

(۴۰)

نہ گفتم ہم چو شمعِ کشتہ سوزِ سینۂ خود را بہ خاموشی ادا کردم غمِ دیرینۂ خود را

نہ امروزی ست درمے خانہ ایں عاشق شرابی ہا
گرو صد بار کردم خرقۂ پشمینۂ خود را

(۴۱)

خود ستائی خود سری معیوب می دانیم ما ورنہ طرزِ شعر گفتن خوب می دانیم ما

انتظارِ خطِ او از بس بہ گلشن می کشم
غنچۂ نشگفتہ را مکتوب می دانیم ما

(۴۲)

بر مرادِ دل نہ دیدم لالہ روئے خویش را می برم در خاک با خود آرزوئے خویش را

بس کہ از بے اعتباری ہائے خود شرمندہ ام
بر درش خواہم بُرید آخر گلوئے خویش را

---

¹ از نقلِ رام پور ۔ مخطوطۂ اودیب "دہانے"

(۴۳)

آمد اجل بہ صورتِ خوبے بہ سر مرا   درخاک و خوں کشید مصوّر پسر مرا

(۴۴)

بہ ذکرِ مے بیالودیم لب را   دُعا گفتیم وِردِ نیمہ شب را
چو رہ درکعبۂ وصلش نہ یابی
مدہ از دست دامانِ ادب را

(۴۵)

کاہشے ہر سرِ شام است مرا   شوقِ آں ماہِ تمام است مرا
در بہ در کوے بہ کو می گردم
شوقِ او تا چہ مقام است مرا

(۴۶)

جاں را مدہ نسبت بہ او جاناں کجا و جاں کجا   لطفِ تنش را در نگر خود ایں کجا و آں کجا
درکوچۂ خود میرؔ را می دار چندے محترم
باز ایں مکان و جا کجا آں بے سر و ساماں کجا

(۴۷)

بہ شور آوردہ انداز تو مزاجِ کوہ و ہاموں را   بہ درد آمد سرِ تقلیدِ من فرہاد و مجنوں را

(۴۸)

نہ یافتم بہ جہاں بابِ منزلِ خود را   زدم دو رویہ گِل آخر درِ دلِ خود را

(۴۹)

بساز گرم سخن باز لعلِ نوشیں را   نشاندہ ای بہ سرِ سنگ لعلِ رنگیں را

(۵۰)

ربود دل زکف آں چشم نوعِ آدم را   نگاہِ بے خودشس از ہوش بُرد عالم را

(۵۱)

بے مروّت می نماید گل مرا   یاد خواہی کرد اے بلبل مرا

# ردیف ب

## (۵۲)

از تپیدن بُرد آرامم دلِ دیوانہ شب — غلط وا غلطے بکردم من ز دردِ شانہ شب
بر لبم اے کاش نگذشتے غمِ بسیارِ عشق — باعثِ بے خوابی جمعے شد ایں افسانہ شب
چرخ زن بر گردِ شمعے گشت و خود را پاک سوخت — داغ شد جان و دلم از جرأتِ پروانہ شب
تا کدا ایں تیرہ روزِ عشق گرمِ نالہ است — شعلہ اے سر می کشد ہر دم ازاں ویرانہ شب

در مے و شاہد پرستی رفتہ بود از کار میرؔ
مے کشاں کُشتندش آخر بر درِ مے خانہ شب

## (۵۳)

لطفے نما و پیش خودم از وفا طلب — یعنی مرا بہ بزم ز دشمن جدا طلب
فرسودہ گشت پائے تو یک سر بہ راہِ شوق — اے رفتۂ تلاشِ کسے تا کجا طلب
خواہی کہ صبح وا شودت دیدہ بر رُخش — برخیز و مثلِ آئنہ دستِ دعا طلب
اے ہم نشیں اگر بہ طبیبے شوی دُچار — ایں دردِ جاں گدازِ مرا ہم دوا طلب

تا چند میرؔ خاکِ در چوں خودے شدن
برخیز و ہر چہ می طلبی از خدا طلب

## (۵۴)

بہ شکستن رسید حالا شب — باقیِ داستاں بہ فردا شب
بے تو می آورد بہ سر ہر روز — صد بلائے سیاہ ما را شب
می زند نالہ تیغ و آہ سناں — روزِ جنگ است دوستاں با شب
ما کہ عادت پذیرِ لطفِ تو ایم — بگذرانیم چند تنہا شب

کلبۂ میرؔ جائے بد ہم نیست
می تواں کرد روز ایں جا شب

(۵۵)

تا کجا ایں بے قراری تا بہ کے ایں اضطراب  کرد رسوائے جہانم خانۂ خواہش خراب
کارِ خود پیش از جوانی کن کہ اے غفلت سرشت  چشم تا برہم زنی خوابے ست ایامِ شباب

شکر ایزد را کہ دیدم زیرِ شلاقِ مغاں
بر درِ مے خانہ شیخِ شہر را مستِ شراب

(۵۶)

چوں شمع چند گریم بے اختیار ہر شب  تا کے زنم بر آتش پروانہ وار ہر شب
بے آں دُرِ یگانہ از گریہ ام چہ پُرسی
دارد محیطِ اعظم سر در کنار ہر شب

(۵۷)

نمی آید بہ چشمم خواب امشب  بہ جانم از دلِ بے تاب امشب

## ردیف ت

(۵۸)

از دہانش کس چہ گوید آں دہاں معلوم نیست  حرف بسیار است اما ہیچ از آں معلوم نیست
طور وطرزِ رفتنِ اہلِ جہانم داغ کرد  عالمے بگذشت از ایں راہ و نشاں معلوم نیست
زاں کمر از من مپرس اے ہم نشیں ہر دم کہ او  فتنہ برپا کردہ وخود درمیاں معلوم نیست
حیف باشد جبہہ سائی گر نیفتد اتفاق  کز ہجومِ سجدہ ہا آں آستاں معلوم نیست
طرحِ عیش افگن کہ ابر زیر ہجوم آوردہ است  مانعے کم گشت یعنی آسماں معلوم نیست
می رود زیں خاک واں خلق ونمی آید بہ چشم  گرد بسیار است در رہ کارواں معلوم نیست

تا چہ پیش آمد نہ دانم میر را در راہِ عشق
روزگارے شد کہ حالِ آں جواں معلوم نیست

(۵۹)

دعویِ میر توش ئشۂ صاحب جگر است  عشق کفر است اگر صرفۂ جاں در نظر است

وقتِ فرصت خنک آں کس کہ نگہ می دارد — آہ ازایں عمر کہ چوں آبِ رواں در گذر است

صحبتِ شیخ و منِ رند چساں در گیرد — عشق راہِ دگر و عقل طریقِ دگر است

دیدی آخر کہ چہ ہشیار مراگشت آں طفل — ایں گمانِ غلطے بود کہ او بے خبر است

دارد امسال بداں گونہ نضارت کہ مگر — سبزۂ جوئے گلستاں مژۂ چشمِ تر است

نالۂ سینہ خراشے نہ شنیدم زیں باغ — مدتے شد سرِ مرغانِ چمن زیرِ پر است

می کنم یادِ بناگوشِ تو دمی گریم — دانۂ اشکِ منِ امشب بہ صفائے گہر است

میرؔ را من بہ سخن کاش نمی آوردم

دردِ دل کرد بہ حدے کہ مرادردِ سر است

(۶۰)

بتِ بے مہرِ من ہمہ کین است — دشمنِ جان و رہزنِ دین است

جانِ تلخی کشیدہ می داند — کہ گلِ دلبراں چہ شیرین است

از خرامش بہار می ریزد — رفتنِ یار بس کہ رنگین است

قامتت را بہ خلق بنمودم — کآفتِ روزگارِ من این است

گاہ در مسجد است وگہ در دیر

میرؔ را تا چہ دین و آئین است

(۶۱)

طورہا شد مختلف دورِ زمانِ دیگر است — آں زمیں بر باد رفت ایں آسمانِ دیگر است

مہر شد مفقود یا ایں جا محبت رسم نیست — یا مزاجِ ما دگر شد یا جہانِ دیگر است

کذبِ ہر کس راشعار و حرفِ ہر یک پیچ دار — ما نمی فہمیم گویا ایں زبانِ دیگر است

پُر در ایں ایام بے لطفی مکن کز چند روز — میلِ طبعم جانبِ نامہربانِ دیگر است

سرگذشتِ ما مصیبت دیدگانِ عشق را — قصۂ مجنوں مداں ایں داستانِ دیگر است

یک دو روزے کم نگاہی مصلحت دیدی ولیت — چشمِ من دنبالہ گردِ دل ستانِ دیگر است

از درت امروز و فردا می روم ہشیار باش — سجدۂ ما نہ بابِ آستانِ دیگر است

تہمت آلودِ وفائے دیگراں دارد مرا — من ہلاکم از پئش او در گمانِ دیگر است

بر نمی افتد از آں سرکوچہ رسمِ جورِ میرؔ — من اگر از جاں شدم یک نیم جانِ دیگر است

(۶۲)

آں ام کہ خوفِ جاں سببِ شادیِ من است — چشمانِ شیرِ شرزہ گُلِ وادیِ من است
ہر آفتے کہ تازہ نمودار می شود — از اختراعِ قوّتِ ایجادیِ من است
من خود بہ حالِ مرگم و دشمن گماں برد — کایں حالت از سلیقۂ استادیِ من است
از من نہ ماندہ غیرِ پرے چند در قفس — ویں دل اسیرِ خواہشِ آزادیِ من است

گر سر نہد بہ عالمِ امکاں قباحت است
سیلے کہ میرؔ خفتہ در آبادیِ من است

(۶۳)

زیں دلبرانِ سہل جہاں فتنہ در سر است — دل زیرِ مُہرِ داغ در ایں وقت بہتر است
خواہد شدن جراحتِ سر تا بہ پا الم — زخمِ جگر کہ بوزدۂ آں گُلِ تر است
حرفے مگو بہ زاہدِ مغرور و خود ستا — معقول را نمی شنود ایں خَرف خر است
می یابم از قدِ تو بہ ہر دم تمتعے — تنخواہِ من بہ عالمِ بالا مقرر است

دارد بہ روئے زرد عجب پر ملالتے
امروز میرؔ خستہ جگر پُر مکدر است

(۶۴)

عشق از روزے کہ ایں دیوانہ را بر کار بست — کوہ کن از کوہ و مجنوں از بیاباں بار بست
سوئے مژگانم نگر در گریۂ سرشارِ صبح — خوشہ خوشہ می چکد خونِ جگر زیں دار بست
شب ز پہلو دادنِ دل گریۂ بسیار کرد — طرفہ دریائے بہ سوئے خویش چشمِ زار بست
می رود از کوئے چوں فردوسِ او رو بر قفا — دل مگر خورشید با آں سایۂ دیوار بست
دست پُرخوں تیغ پُرخوں جامہ پُرخوں ہر دم است — خوش بہ خونِ ما وفاداراں کمر را یار بست
وائے بر حالِ کسے کو با ہزاراں درد و غم — بر جگر دنداں بیفشرد و لبِ اظہار بست

روزگارے شد کہ از دینِ قدیمِ خویشتن
میرؔ در عشقِ بتاں برگشتہ و زنار بست

(۶۵)

به گلشن این که گل نازاں رسیده ست | نظرگاهِ گریبانش نه دیده ست
مترس امروز چنداں از قیامت | بیا ئے خور که فردا را که دیده ست
چو گلبن پاے تا سر داغ گشتم | ز باغش این چنیں گل ها که چیده ست
اگر خوں گشته در ہجراں عجب نیست | که دل تصدیع بسیارے کشیده ست

به آں غیرت به عشقِ گل رُخاں میرؔ
چها از مردمِ بے ته شنیده ست

(۶۶)

آواره گردِ عشق تو چشمِ پُر آب داشت | هر جا که رفت گریه به رنگِ سحاب داشت
شب ها به ما نشست و سر حرف وا نه شد | آں ناز پیشه روے سخن در نقاب داشت
من در نفس شماری و آں سروِ خوش خرام | مستغنیانه رفت که با خود حساب داشت
زاں پیشتر که نرگسِ مستِ تو وا شود | احوالِ غم کشانِ محبت خراب داشت
دیشب به یادِ زُلفے که می سوختی دلا | دودِ جگر چو مارِ سیه پیچ و تاب داشت
بے پرده اش به جلوه تماشا نه کرده ایم | با ایں ظهورِ حسن قیامت حجاب داشت
کاغذ به پیشِ قاصدِ من سوختی مگر | پیغامِ سینه سوختگاں ایں جواب داشت
معلوم شد که منزلِ ما نیست ایں چمن | بر هر کسے که چشم فتاد اضطراب داشت
آبِ رواں و رنگِ گل و بادِ صبح گاه | هر یک چو بازمانده مسافر شتاب داشت

آیا چه شد که میرؔ گداے شراب شد
دیروز ایں جوانِ عزیز اجتناب[۱] داشت[۲]

(۶۷)

از تفتِ سوزِ درونم جگرِ خامه شق است | کاغذ از گرمیِ الفاظ کباب ورق است
گشته چوں روح و به کیفیتِ آں لب نه رسید | بادهٔ لعل[۱] از ایں شرم سراپا عرق است

---

[۱] ن ۲ "اجتناب"    [۲] از نقلِ رام پور، مخطوطهٔ ادیب" "لعلے"

سالہا بر سرِ کوے تو چمن سازی کرد | چشمِ بگداختۂ من کہ ہوا را شفق است
دارم اصرار کزیں در نہ روم تا دمِ مرگ | دوستاں ہر چہ در ایں باب بگوئید حق است
کارم امشب بہ سحرگاہ کشد یا نہ کشد | بر دل از دوریِ دلدار قیامت قلق است[1]
عشوہ و غمزہ و نازِ تو ہمہ غارت کرد | وائے بر شہرِ دلِ من کہ بسے بے نسق است

بافنِ عشق کسے را نہ بود ربط امروز
از نشِ میر فرا گیر کہ مشکل سبق است

(۶۸)

از دلِ من تا غمِ جانانہ رفت | رونقِ سر تا سرِ آں خانہ رفت
آخر آخر بر دکانِ مے فروش | آبرو یم ہر یک پیمانہ رفت
کشتۂ تیغِ توام نازم جگر | قیمہ شد استادہ و از جانہ رفت
من چہ دانم راہ و رسمِ خانقاہ | عمرِ من در خدمتِ مے خانہ رفت
بود در ہر گوشہ اش ہنگامہ اے | بعدِ مرگم رونقِ ویرانہ رفت
نے سرشکے نے چراغ نے گلے | از سرِ خاکم چہ بے رحمانہ رفت

نیست شورِ میر در بازار ہا
غالباً از شہر آں دیوانہ رفت

(۶۹)

مشنو سخنِ شیخ کہ از بے بصران است | او منکرِ دیدارِ رخِ خوش پسران است
صیاد چنیں دام گہِ دہر نہ دارد | آں کس کہ شکارِ تو نہ شد جیف بر آں است
ما لطفِ زبانی ہم از او گاہ نہ دیدیم | دیرے ست کہ رفتے سخنش بادگراں است
دامن بہ میاں بر زدہ چوں شمعِ سحر باش | کایں بزمِ دل افروز جہانِ گزراں است

آئینہ مگر دیدۂ میر است کہ ہر صبح
بر صورتِ خوبِ تو بہ حسرت نگراں است

---

[1] حاشیے پر "از غمِ ہجر بسے بر دلِ زارم قلق است" نیز نقلِ رام پور۔

(۷۰)

شبنم کہ بہ ہنگام سحر چشم ترے داشت
شاید کہ بہ رخسارۂ آں گل نظرے داشت

ایں خستہ از آں خیلِ طیور است کہ ہر یک
شایستۂ پرواز چمن بال و پرے داشت

مستانِ محبت ہمہ ہشیار سران اند
ہر بے خبر عشق تو با خود خبرے داشت

از دل چہ حکایت کنم اکنوں کہ بجا نیست
زیں پیشتر ایں قطرۂ خوں ہم جگرے داشت

مُردیم و مکاں ہم شدہ ویران و نہ گفتی
کایں راہ گزر تکیۂ دریوزہ گرے داشت

دل از پے او غرق بہ دریاے بلا بود
واں گوہر تر سر بہ کنارِ دگرے داشت

چوں رنگِ حنا میرؔ یکایک ز جہاں رفت
معلوم چو شد باکف پاے تو سرے داشت

(۷۱)

بہ یادِ ناوکِ مژگاں دلم ز جاں سیر است
شکارِ وحشی ام از مدتے سر تیر است

نہ صبر فائدہ می بخشدم نہ بے تابی
ہلاک می شوم اے ہم نشیں چہ تدبیر است

چہ شد کہ شعلہ نشاں نیست لیک می سوزد
نہالِ قامتِ من ہم چو شمع تصویر است

کنوں کہ تیغ بہ کف می رسی سرت گردم
دگر بہ قتلِ منِ بے گنہ چہ تاخیر است

بہ عشق سلسلہ مویاں خراب شہر شدم
ہنوز بر سر ہر کو چہ شورِ زنجیر است

دماغ بستنِ احرامِ کعبہ اش نہ بود
کسے کہ از غم کوے بتاں خدا گیر است

مکن بہ ابروے او چشم را سیہ زنہار
وگرنہ میرؔ میانِ من و تو شمشیر است

(۷۲)

مدتے باید ستادہ و زار می باید گریست
بر سرم اے ابرِ تر بسیار می باید گریست

حالِ زارِ خویشتن قاصد چساں انشا کنم
بر سرِ حرفے مراسد بار می باید گریست

گریہ را در یادِ رویش ضبط نتواں کرد میرؔ
ہم چو ابرِ قبلہ ام ناچار می باید گریست [1]

---

[1] مصرعِ ثانی مخطوطۂ ادیب میں غائب۔ منقول از نقل رام پور

## (۷۳)

اشک اکثر می فشاند آه برق حاصل است
من نمی دانم کہ از شوقش چہ آتش در دل است

آں کف نازک ببیں و ایں ہمہ ناحق کشی
بگذرد از حق اگر کس حق بہ دست قاتل است

کار چوں آئینہ بر من تنگ شد پایان کار
ہر کرا باشد حیائے[1] چشم او را مشکل است

گشتہ است از بس کہ حیرت کشتۂ اطوار یار
دیدۂ آئینہ پیش او چو چشم بسمل است

بالب و حرف کسے یاقوت و گوہر را مسنج
می زند بر سنگ لعل و گفتہ دُرّ باطل است

در چمن مست سرانداز آں سراپا ناز بود
قامتش را دیدہ ہر کس گفت سرو مائل است

راہبر چوں عجز سالک را نمی آید بہ دست
ہر کجا پایم بلغزد میرؔ آں جا منزل است[2]

## (۷۴)[3]

نگاہ مست او سرگرم کار است
رگ خواب جہاں در دست یار است

جگر تاب است ضبط آلا شود صبح
ازآں زلف سیہ بر سینہ مار است

توجہ کن کہ تا روزی بیابد
دل مسکیں غریب ایں دیار است

دمے صد بار سویت می کشد دل
نزخم گونہ اے بے اختیار است

بہ خوں تر دیدہ ام تا دیدہ ام من
خدنگش زخم پر درد شکار است

زوادی ایں کہ می خیزد غبارے
دلے در زیر خاکے بے قرار است

نہ دانم باکدام امید واری
درایں ایام دل امید وار است

شدم باخاک کوے او برابر
ہنوزش میرؔ در خاطر غبار است

(از نقل رام پور)

---

[1] نقل رام پور، "ضیائے چشم" [2] مصرع ثانی از نقل رام پور۔ مخطوطۂ ادیب میں غائب

[3] مخطوطۂ ادیب میں اس غزل [۷۴] سے غزل ۹، شعر ۲ تک ورق غائب۔ منقول از نقل رام پور۔

(۷۵)

از سختیِ ایام چنیں تنگ نہ بودہ ست　　زیں پیش دلے بود مرا سنگ نہ بودہ ست

از خشم بر افروختنہ تر زِ آتش گرمے　　با ما گلِ روئے تو بہ ایں رنگ نہ بودہ ست

از سازِ رقیب است کہ با تنگ مزاجی　　طرزِ تو شب و روز ہمیں جنگ نہ بودہ ست

شد تیرہ زِ عکسِ خط اُوصاف خود است ایں　　آئینۂ دل ورنہ تہِ زنگ نہ بودہ ست

عیبے شدہ در عہدِ کسے عشق وگرنہ
ایں رسم کہن تیر چنیں ننگ نہ بودہ ست

(از نقلِ رام پور)

(۷۶)

عمرہا بیمار سانم رنگِ زردے بودہ است　　دست بر دل ہر گہ و بے گہ زدردے بودہ است

سر زہجرانِ کسے می دارم در آستینے　　یادِ آیامے کہ بر لب آہِ سردے بودہ است

پشتۂ ریگے کہ بینی کار وانے بود میر
گرد بادِ ایں بیاباں رہ نوردے بودہ است

(از نقلِ رام پور)

(۷۷)

چوں غنچہ دل بہ پہلو پُر خوں زمہر یارے ست　　رنگِ شکستۂ من از عشق یادگارے ست

شبنم بہ چشمِ عبرت اشک است حسرت آلود　　ہم گل در ایں گلستاں چشمِ امیدوارے ست

ما چوں حنا در ایں غم خوں می خوریم ولیکن　　پابوسِ آں جفاجو از دست رفتہ کارے ست

غافل مشو زرفتن کایں طاقِ چرخ نیلی　　از گردِ راہِ یاراں برخاستہ غبارے ست

میر ایں ہمہ نہ دارد تغییر حال عاشق
وقتے ست اتفاقے ست عہدے ست روزگارے ست

(از نقلِ رام پور)

(۷۸)

آتشِ عشق کہ اوّل رہِ درمانم سوخت　　آخر الامر بہ یک لاٹحہ سامانم سوخت

قطرۂ اشک زسوزِ جگرم اخگر بود	از مژہ دوش بیفتاد و گریبانم سوخت
بے تو در شہر گہے داغ ام و گہ در صحرا	عاشقی سوخت مرا لیک پریشانم سوخت
در چمن رفتنم و بسیار پشیماں گشتم	بلبلے نالہ کشید و بہ گلستانم سوخت
تا در بت کدہ ام بود سرے با اسلام	صنمے چہرہ برافروختہ ایمانم[1] سوخت
داغِ ضبطِ دلِ خویش ام بہ کہ گویم ایں درد	بایدم سوخت جدا از تو و نتوانم سوخت

میر از سوزِ محبت چہ سخن آغازم
دل کباب است جگر داغ شد و جانم سوخت

(از نقلِ رام پور)

(۷۹)

ناشکیبا[2] غمِ نہاں شدہ است	کہ نفس بر لبم فغاں شدہ است
دو[3] سہ پر در چمن پریشان اند	مرغِ روحے کہ پرفشاں شدہ است
در بہاراں دلِ بری دارم	رنگِ گل برقِ آشیاں شدہ است

کس چہ داند غبارِ کیست کہ میر
گردِ دنبالِ کارواں شدہ است

(۸۰)

چہ ظلم ہا کہ نہ بر من در آرزوے تو رفت	دلے کہ رفتہ ایم بہ جستجوے تو رفت
نسیمِ صبح یکے برگِ گل بہ خود می داشت	مگر از اہلِ چمن نامہ اے بہ سوے تو رفت
بہ ہر گلے کہ رسیدم گریستم چوں ابر	بہ باغ رفتم و فرصت بہ یادِ روے تو رفت

ز چند روز دلے شب نمی کند فریاد
مگر کہ میر بہ تنگ آمد و ز کوے تو رفت

(۸۱)

از ما کہ خستہ ایم میر رسید سر گذشت	تیرے فگند عشق کسے کز جگر گذشت

---

[1] از ن ۲ - نقلِ رام پور "از جانم"    [2] و [3] نقلِ رام پور

آں غنچہ ام کہ آخرِ موسم رسیدہ ام      تا چشم وا کنم کہ بہار از نظر گذشت
تا شور بود یا کسے ہم نہ یافتم      سیلابِ عمرِ من چہ قدر تیز تر گذشت
زیں آمدن چہ لطف کہ آں بادہ خوارِ ناز      از حالِ مے کشانِ وفا بے خبر گذشت

می گفتمش کہ دردِ تو درماں پذیر نیست
دیدی کہ میرؔ آخر از آں درد در گذشت

(۸۲)

ایں زماں بر دلِ من از تو جفائے دگر است      خوں شود بے تو دگوئی کہ برائے دگر است
لطف از او چشم نہ داری کہ ز شوخی او را      دل بہ جائے دگر و چشم بہ جائے دگر است
سطحِ آئینہ بہ رخسارِ تو کے می ماند      آں بہ آئینِ دگر ایں بہ ادائے دگر است
گرچہ مژگانِ کسے طرفہ بلائے ست ولے      جنبشِ ابروئے خم دار بلائے دگر است

شوخیِ او بنگر میرؔ کہ با ہیچو منے
صبح طورِ دگر و شام ادائے دگر است

(۸۳)

بوسیدنِ دہانِ تو دل در خیال داشت      ایں سادہ لوح خواہشِ امرِ محال داشت
آزردہ نیستیم ز بد گوئیِ کساں      گر او نمی شنید کسے کے مجال داشت
دل را بہ راہِ ہیچو خودے باختی مگر      دیروز چہرۂ تو غبارِ ملال داشت

اے آں کہ از دیارِ غریباں رسیدہ ای
بارے بگو کہ میرؔ در آں جا چہ حال داشت

(۸۴)

دین و دل غارت شدہ جانم بہ یغما رفتہ است      حیف ہا از یک نگاہِ یار بر ما رفتہ است
در تماشائے خرامش ساکنانِ شہر را      ہوش از سر تاب از دل طاقت از پا رفتہ است
دور از آں سرمایۂ جاں ہیچ لطفِ زیست نیست      ہر کہ رفتہ ست از درش گوئی ز دنیا رفتہ است
کس نشانِ چشمِ ما شاید بہ آں بے تہ نہ داد      ابر بہرِ آب آوردن بہ دریا رفتہ است
سال ہا بر یادِ آں قامت بکائے کردہ ایم      تا بہ ایں اندازہ کارِ گریہ بالا رفتہ است

از محبت چشم آسائش نہ باید داشتن — آں بلاے است ایں کہ در خوابِ زلیخا رفتہ است
ما مجنوں مدتے در شہر یک جا ماندہ ایم — چند روزے شد کہ آں وحشی بہ صحرا رفتہ است
در فراقش جاے او محسوس غیر از درد نیست — دل درونِ سینہ ام چوں عضو از جا رفتہ است

ظاہر است از نا اُمیدی ہاے میرِ خرقہ پوش
کایں فقیر امروز اگر ایں جاست فردا رفتہ است

(۸۵)

کم کم مژہ بر ہم زدنش تازہ جفائے ست — دُز دیدہ نگہ کردنِ او طرفہ بلائے ست
آرائشِ تن می کنی از غفلت اگر نہ — ہر لوحِ مزار آئنہ جامہ نمائے ست
مذکورِ خرابیِ دلِ من نہ تواں کرد — ہر خشت از ایں منزلِ امید بہ جائے ست
گو لائقِ خوں ریزیِ تیغِ تو نہ بودم — ہر کس کہ مرا دید چنیں گفت سزائے ست

شائستۂ لطفِ تو اگر نیست نہ باشد
آزارِ دلِ میر براے چہ گدائے ست

(۸۶)

عرصۂ گیتی اگر وحشت کنم بسیار نیست — دامنِ صحرا بہ ایں وسعت گریباں وار نیست
وعدۂ دورِ قیامت ہم پےِ تکمیل ماست — ذوق تا حاصل نہ گردد لذّتِ دیدار نیست
ایں جفاے تازہ تر بنگر کہ از جورش مرا — صد شکایت در دل است و رخصتِ گفتار نیست
چوں بروں آرد سر از جیبِ خجالت روزِ حشر — ہر کرا بر سینہ از وے زخمِ دامن دار نیست

تا کجا شد میرِ خاک افتادہ از کوے تو آہ
خشتِ بالیں است و او در سایۂ دیوار نیست

(۸۷)

وقتِ آں کس خوش کہ گلزارِ جہاں را دید و رفت — ہم چو گُل بر بے ثباتی ہاے خود خندید و رفت
یاد ایامے کہ راہم در حریمِ وصل بود — ایں زماں می بایدم در کوے او نالید و رفت
داغِ جانِ آں غیورم من کہ با صد آرزو — جاے گل چیدن از ایں گلزار دامن چید و رفت
ایں سلوکِ طالعِ برگشتۂ من سیر کن — کز قریبِ منزلم آں ماہ بر گردید و رفت

اے کہ راہے می بری در بزمِ او از ما بگو　　بے کسے آزردہ جانے آستاں بوسیدہ رفت

این ادائے او فراموشم نہ خواہد گشت میرؔ
چوں سرِ زلفش گرفتم دستِ من پیچیدہ رفت

(۸۸)

بہ وعدہ‌ات نہ دہم دل کہ اعتبارِ تو نیست　　وفاست رسمِ قدیمے کہ در دیارِ تو نیست

کدام دل کہ در ایامِ تو نہ دارد داغ　　کدام دیدہ کہ پُر خوں بہ روزگارِ تو نیست

ز آہ و نالۂ زارت دلا نمی رنجم　　کہ بے قراری و ایں ہا بہ اختیارِ تو نیست

مگر خدنگِ تو غمزہ بال کرد صحرا را　　شکار نیست کہ مجروحِ بے شمارِ تو نیست

ہزار سرو بہ جنبش در ایں چمن دیدم　　یکے بہ دل کشیِ آہِ بے قرارِ تو نیست

بیا کہ رفتنِ جاں ہم قریب می بینم　　ز فرطِ شوق مرا تابِ انتظارِ تو نیست

برو کہ بہرِ محبت بلا کشے باید
تو ناز پروری اے میرؔ عشق کارِ تو نیست

(۸۹)

غرض آلودگی محنتارِ ما نیست　　برائے خویش بودن خوش نما نیست

چہ گویم آہ کز فرطِ تپیدن　　چو عضوِ رفتہ از جا دل بہ جا نیست

بہ رویت تا نگاہ گرم کردہ ست　　میانِ ما و آئینہ صفا نیست

ز بس حرفِ جنونِ من شد اکنوں　　بہ گلشن چوبِ گل بہرِ دوا نیست

مسلّم ایں کہ دارد عیب ہا میرؔ
بحمد اللہ کہ چوں تو بے وفا نیست

(۹۰)

شنیختنا ایں ہمہ سامانِ تو بے چیزے نیست　　دست گاہے شدہ ای شانِ تو بے چیزے نیست

شاید اے مرغِ چمن تو گلِ مارا دیدی　　متصل نالہ و افغانِ تو بے چیزے نیست

تا بہ گوشت چہ سخن گفت نسیم اے گلِ تر　　ہر سحر گہ لبِ خندانِ تو بے چیزے نیست

غالبًا از سرِ نو کُشتہ گذشتی امروز　　رنگِ خوں بر زہِ دامانِ تو بے چیزے نیست

میرؔ از طورِ تو پیداست کہ سودا داری
ایں ہمہ حرفِ پریشانِ تو بے چیزے نیست

(۹۱)

جاں بہ لب آمدہ در ہجر و تمنائے ہست　　دل نہ ماندہ ست بہ جا لیک در او جائے ہست
قامتِ او ز کجا آں قد و بالا ز کجا　　سروِ خوش قطع در ایں باغچہ رعنائے ہست
عمر را بہرِ چہ در دل تنگ بسر باید کرد　　شہر اگر خوش نہ بود گوشۂ صحرائے ہست
پیش از ایں در ستم ایں گونہ دلیریش نہ بود　　مدّعی را مگر از سوے تو ایمائے ہست
چشم بر کحلِ جواہر نہ دود ہیچ گہش　　ہر کرا مدِّ نظر خاکِ تہِ پائے ہست
تا کجا حالِ دلِ زار بہ ہر کس گویم　　غرض از پہلوے ایں غم زدہ ایذائے ہست

آگہ از آمدنِ میرؔ در ایں شہر نیم
ایں قدر ہست کہ در کوے تو غوغائے ہست

(۹۲)

حالیا زندگیِ من سنگے ست　　چہ بگویم چہ حالتِ تنگے ست
سختیِ غم بلاے جاں گردید　　دل ز فرطِ گرفتگی سنگے ست
از غمِ رو نہ دادنِ خوباں　　دل چو آئینہ ام تہِ زنگے ست
نیست بے لطف گریۂ فرہاد　　آب بالاے سنگ ہم رنگے ست

از غم و غصہ اش چہ می پرسی
ہر زماں میرؔ را بہ خود جنگے ست

(۹۲)

بے حجابانہ یارِ من برخاست　　پردہ از روے کارِ من برخاست
کس بہ کس نیست آشنا گوئی　　رسمِ مہر از دیارِ من برخاست
یک زماں او نشست و از ہر سو　　فتنہ در روزگارِ من برخاست
مُردم و پاسِ رازِ عشق نہ رفت　　بعدِ عمرے غبارِ من برخاست

خواریم نیست ہیچ امروزہ
[illegible]

(۹۴)

این کہ گردِ شہر در ہر جا مزارے ماندہ است | مشتِ خاکے از عزیزاں یادگارے ماندہ است
بے تو می مانم بداں مے خوارہ کش پایانِ کار | نشہ از سر رفتہ و رنجِ خمارے ماندہ است
در خزاں می گفت بلبل با ہزاراں غم کہ آہ | گل ز گلشن رفت و در دل زخمِ خارے ماندہ است
گردِ راہش سر کشید و در بیاباں محو شد | یادگارِ او بہ چشمِ من غبارے ماندہ است
اے بہ قربانت رَوَم بسیار رنگیں می روی | از خرامِ تو بہ ہر گامے بہارے ماندہ است
رفت آں ہنگامہ پردازیِ افغانِ دلم | ایں زماں از ہستیِ من نالہ دارے ماندہ است
لطفِ حسنِ او نہ ماند و پیچشِ زلفش بہ جاست | ایں بداں ماند کہ گنجے رفت و مارے ماندہ است
در حسابِ خاک ہم ننوشت چرخِ دوں مرا | کارِ من موقوف بر روزِ شمارے ماندہ است

ابتدائے عشق را دیدم بہ چندیں رنگ میر
آخر آخر گریۂ بے اختیارے ماندہ است

(۹۵)

من خود اسیر گشتم [و] ہر دم ملالت است | اے اشتیاقِ سیرِ گلستاں چہ حالت است
افراطِ شوق بیں کہ زمانے ہزار بار | دل سوے او روانہ بہ رسمِ رسالت است
یک رہ ترا بہ باغ گل از دور دیدہ بود | از روے دل کشِ تو ہنوزش خجالت است
خسرو ببیں کہ در سرِ خارا شگاف رفت | خوش باد عہدِ عشق کہ یکسر عدالت است

عمداً کمر بہ مُردنِ خود میر بستہ ای
در طبعِ نازکِ تو قیامت جہالت است

(۹۶)

کبر بایم ہمہ از ہمتِ درویشاں است | شاہ اندازیِ من از نظرِ ایشاں است
صحبتِ ما و نکورو پسراں آہ مپرس | تختۂ قیمہ جگر زیں ستم اندیشاں است

گاہ گاہی نگہِ لطف بہ حالش می کن
عاقبت میر بلاکش ز وفا کیشاں است

(۹۷)

از داغِ گل بہ سینۂ من دستہ دستہ است | وز اشکِ لالہ گوں مژہ ام غنچہ بستہ است
تنہا نیامدہ ست بہ شور از تو عندلیب | گل ہم بہ روزگارِ تو در خوں نشستہ است

یک چند میرؔ را بہ زباں داشتن خوش است
بے چارہ از جفائے تو پُر دل شکستہ است

(۹۸)

بے تو طوفانِ چشم تر ایں جاست | کشتیِ چرخ در خطر ایں جاست
دیدہ سوزاں تراست از اشکم | کاسہ از آتش گرم تر ایں جاست
لالہ و گل بہ باغ خواہد بود | لختِ دل پارۂ جگر ایں جاست

بے رُخت از فغان و نالۂ میرؔ
طرفہ ہنگامہ ہر سحر ایں جاست

(۹۹)

خوشا کسے کہ چو برقِ جہاں[1] بجست و برفت | بہ یک تپیدن از ایں دام گہ برست و برفت
بہ پُرسہ گاہِ جہاں رسم دیر ماندن نیست | کسے کہ آمدہ ایں جا دمے نشست و برفت
سراغِ دل چو نمودم بہ سینہ شُد معلوم | کہ آں غریب از ایں خانہ بار بست و برفت
ہجوم بود بہ یوسف کہ ماہِ من آمد | نمودِ چہرہ و بازار او شکست و برفت

نصیبِ میرؔ نہ شد چوں سجودِ حضرتِ او
جبیں ز غصّہ بہ ناخن تمام خست و برفت

(۱۰۰)

بوالہوس را بہ بزمِ ما جا نیست | عاشقی ہاست ایں تماشا نیست
آہ از ایں خود نمائیِ پنہاں | ہمہ جائی و ہیچ پیدا نیست
شیخ پر غافلی ز مُغ بچگاں | چشم پوشیدی و مصلیٰ نیست

---

[1] نقلِ رام پور "برق از جہاں"

سخت معذورِ حُسنِ خویشتنی　　　ہیچت از مرگِ خلق پروا نیست

ما رضامند تا بہ مرگِ خودیم　　　کوتہی در محبّت از ما نیست

گریہ در شہر دیدہ دیدہ کنیم　　　آخر آبادی است صحرا نیست

حرف ہا دارد از خط و خالش

میرؔ را از کجا کہ سودا نیست

(۱۰۱)

نزاکت لبِ یار را در خور است　　　کہ صد پردہ از وَرد نازک تر است

چہ شد گر قدِ چوں کماں شیخ راست　　　کہ ایں پیر کے سخت تیر آور است

سرشکم بہ رنگ دگر می چکد　　　جگر غالباً صرفِ چشمِ تر است

بجز مرگ اے میرؔ آرام نیست

کہ دور از کسے زیست دُشوار است

(۱۰۲)

میرؔ دنیا رہ گذارے بیش نیست　　　آسماں گرد و غبارے بیش نیست

پاس جاں کن تن نہ دارد اعتبار　　　قالبِ خاکی مزارے بیش نیست

بستہ وہم است نقشِ زندگی　　　ورنہ ہستی اعتبارے بیش نیست

در برِ واعظ چہ زانو می زنی　　　پوچ گوئے ہرزہ کارے بیش نیست

غرقۂ وہمِ خودی از بے تہی

ورنہ ایں دریا کنارے بیش نیست

(۱۰۳)

ریش و مندیل و پیرہن نذر است　　　شانہ کاری شیخ مشہور است

بحث با منکرانِ رویت نیست　　　ہر کرا چشم نیست معذور است

کے بہ احوال کس بپردازد　　　آں ہمہ ناز سخت مغرور است

تا برابر بہ خاکِ رہ نہ شوی　　　راہِ نزدیکِ دوستی دور است

مدّتے شد کہ داد جان و ہنوز

ہر طرف حالِ میرؔ مذکور است

(۱۰۴)

آتش افشاں نالۂ من از رُخِ رخشانِ اوست    دودِ آہم پیچ دار از کاکلِ پیچانِ اوست
قیس را با چشمِ کم زنہار در صحرا مبیں    شہرہا برہم زنے چوں نالہ در فرمانِ اوست
ایں کہ می اُفتد بہ وقتِ نزع ہر سو چشمِ میرؔ
خواہشِ دیدارِ معشوقے مگر با جانِ اوست

(۱۰۵)

آں جفا کیش چوں کماں برداشت    طائرِ سدرہ دل ز جاں برداشت
سستیِ عہدِ گُل چو ثابت شد    بلبل از باغ آشیاں برداشت
نالۂ دل خراشِ میرؔ آخر
خواب از چشمِ دوستاں برداشت

(۱۰۶)

نالہ است و غم است و چشمِ تر است    کشورِ عاشقی چہ خوش سحراست
در خرابات صرف کن اوقات    کہ بہ ہر گوشہ عالمِ دگر است
نرگس آں چشم را ہمی خوانند    می نہ دانند کاندریں نظر است
دل بچسپاں بہ صندلی رنگے    زندگی بے علاقہ دردِ سر است
گریہ بے صرفہ میرؔ نتواں کرد
عاقبت اشک پارۂ جگر است

(۱۰۷)

وصفِ حسنِ تو از محالات است    نظم و نثر ایں ہمہ خیالات است
کارِ واعظ فقط نہ ترخانی ست    ایں لچر مجمعِ کمالات است
بے تو باغ و بہار و گل ہیچ است    کے بہ ایں ہا مرا مبالات است
زرد رخسار و گریہ ناک و نزار
میرؔ را در فراق حالات است

(۱۰۸)

نے فقط کوہکن از عشق بہ تنگ آمدہ است  ‏ پا سے بسیار وفا پیشہ بہ سنگ آمدہ است
بہ جہاں آمدن تست گذشتن ز جہاں  ‏ ہر کہ پیدا شدہ در کامِ نہنگ آمدہ است
بارے یک گونہ از ایں دیدۂ خونابہ فشاں  ‏ بر رُخِ زردِ منِ غم زدہ رنگ آمدہ است
می تراود ہمہ کیں از روشِ رفتارش  ‏ غالباً یارِ من امروز بہ جنگ آمدہ است
جاں دہم لیک ز دستش نہ دہم تا مقدور  ‏ کہ مرا دامنِ او دیر بہ چنگ آمدہ است
آں چہ از مردمِ چشمِ تو دلم دیدہ و رفت  ‏ کے چنیں جور ز کفّارِ فرنگ آمدہ است

طوطیِ چند مگر زائرِ خاکِ میرؔ اند
کہ بگوشم ہمہ شب شورِ تلنگ آمدہ است

(۱۰۹)

تا بہ دامن پا کشیدم اہلِ دردے بر نخاست  ‏ خوں دلے مژگاں ترے رُخسار زردے بر نخاست
نے مراقب گشتنے نے آستیں افشاندنے  ‏ مدتے شد زیں رباطِ کہنہ مردے بر نخاست
آگہ از ویرانیِ کاشانۂ دل کس نہ شُد  ‏ آہ اُفتاد ایں چنیں قصرے و گردے بر نخاست
ہر زماں در آتش و آبم ولے گاہے ز دل  ‏ نالۂ گرمے نیامد آہِ سردے بر نخاست

میرؔ تا از پا نشستم رونقِ وادی نہ ماند
باز چو من خوش جنوں صحرا نوردے بر نخاست

(۱۱۰)

از دل مگو کہ تیرِ بلا را نشانہ است  ‏ در سینہ ام مپرس کہ زنبور خانہ است
دل می کشد بہ نالۂ مرغِ چمن بسے  ‏ ایں مشتِ بال و پر چہ قدر خوش ترانہ است
چندیں ہزار چوں تو تلف کرد روزگار  ‏ غافل ز طورِ ایں نہ شنوی ایں زمانہ است
آہ مرا ببین و ببر پے بہ سوزِ دل  ‏ در سینہ آتشے ست کہ اینش زبانہ است
تا کے کسے ز دینِ کہن قصہ بشنود  ‏ اقوالِ شیخ گوش مکن ہرزہ چانہ است

پیداست کز برائے چہ ایں جا نشستہ ای
اظہارِ ضعفِ میرؔ بہ کوشش بہانہ است

(۱۱۱)

طرزِ تنہا گردیِ مجنوں بہ دل پیچیدنی ست — ایں نمد موے بیابانِ محبت دیدنی ست

ہست ثابت سستیِ بنیادِ قصرِ آسماں

یعنی ایں طاقِ مقرنس میر درگردیدنی ست

(۱۱۲)

دل برائے تو جستجوئے داشت — جملہ خوں بود و آرزوئے داشت

طرزِ گفتارِ میر را دیدم

بے دماغانہ گفتگوئے داشت

(۱۱۳)

از آہ و نالۂ شب ہمہ شب تازہ آفتے ست — ہر روز بر سرِ دلِ من طرفہ صحبتے ست

شورِ جنونم اسے کہ در اوّل شنیدہ ای

اکنوں ببیں سکوتِ مرا کایں نہایتے ست

(۱۱۴)

خلقے بر اہلِ مدرسہ زاں یک نگاہ رفت — صوفی ز پا در آمد و ملا ز راہ رفت

یوسف نہ یک ز عشق بہ سر فتنہ اش دوید

خلقے بہ ریسمانِ محبت بہ چاہ رفت

(۱۱۵)

دور از او جانِ مرا عہدِ سفر نزدیک است — وز تپش پارہ شدن ہاے جگر نزدیک است

با خبر از روشِ اہلِ چمن باید بود

رفتنِ رنگِ گل و بادِ سحر نزدیک است

(۱۱۶)

نالہ ام از کوہسار و اشکم از ہاموں گذشت — حیف بر فرہاد رفت و ظلم بر مجنوں گذشت

ہر کہ شد غرقِ ہوس با ما شہیدانش مسنج

کز سرش بگذشت آب از سرِ ما خوں گذشت

(۱۱۷)

چشم در آئینہ اش ہردم بہ گیسوے خود است  آں پری رو غالباً زنجیری موے خود است

کاش یک رہ بگذرد از طرفِ گلشن بے نقاب

لالہ وگل را غرورِ خوبی روے خود است

(۱۱۸)

تنم ز فرطِ غم و درد زرد و لاغر گشت  زیمنِ عشق کفِ خاکِ من ہمہ زر گشت

شدی چو پیر کتب را بہ طاقِ نسیاں نہ

حصول نیست ز تحصیل چوں ورق بر گشت

(۱۱۹)

دوستاں یادِ سر زلفش بلاے دل شدہ ست  شانہ خالی می کنم چندے کہ پر مشکل شدہ ست

ہیچ در ضبطم نہ شد از کوششِ بسیار میرؔ

آخر از اشکِ دمادم راہِ کویش گِل شدہ ست

(۱۲۰)

وقتِ رحیل آہ بہ خوابِ گراں گذشت  تا چشم وا کنم ز نظر کارواں گذشت

رفتم قرار مرگ بہ خود دادہ از درت

یعنی کہ بے تو از سرِ جاں می تواں گذشت

(۱۲۱)

در نقشِ پاے یار چہ دستے کشادہ است  نقاش اگر سرے نہ کشد سخت سادہ است

(۱۲۲)

تصویرِ گردنِ تو بلا حیرت اقتضاست  گردن کشی مصوّر اگر می کند بجاست

(۱۲۳)

نقاشِ نقشِ زلفِ گرہ گیر ساختہ ست  دیوانہ [میرؔ] بود کہ زنجیر ساختہ ست

---

ؔ قیاسی، مخطوطۂ ادیب میں مصرعِ اولیٰ اس طرح ہے "نقاش نقشِ زلفِ گرہ گیر کشیدہ است" ناموزوں نقل رام پور میں "نقاشِ نقشِ زلف کہ بنگر کشیدہ است" ناموزوں۔ مصرعِ ثانی مخطوطۂ ادیب میں کٹا ہوا۔ نقل رام پور میں "دیوانہ مگر بود کہ زنجیر کشیدہ ست" ناموزوں۔

(۱۲۴)

نقاش نہ آساں رُخِ دلدار کشیدہ ست　　　یک ماہ [بسڑ] کردہ کہ رخسار کشیدہ ست

(۱۲۵)

سخت بے باک و بلا عشق گزینے بودہ ست　　　دل کہ خوں گشتہ عجب آفتِ دینے بودہ ست

تکیۂ اوست بہ دروازۂ مے خانہ ہنوز

میر درویشِ خرابات نشینے بودہ ست

(۱۲۶)

در چمن از روے خوبِ او ستم بر گل گذشت　　　وز سرِ زُلفش قیامت بر سرِ سنبل گذشت

سال ہا شد کز قفس آزردہ جانے بر نخاست

نالۂ وقتِ سحر فہر است تا بلبل گذشت

(۱۲۷)

می گفت میر، گریہ کناں چوں زہم گذشت　　　کایں پنج روزہ عمر بہ صد درد و غم گذشت

خواہید دید حالتِ کاغذ بہ چشمِ خویش

گر سرگذشتِ من بہ زبانِ قلم گذشت

(۱۲۸)

مقصد از طوفِ حرم کے حاصل است　　　کعبہ از راہش نختیں منزل است

خوش نزاست ار جاں بآسانی رود　　　بے تو اکنوں زندگانی مشکل است

شور در سر چرخ را از مدتے ست

آسماں پیر است لیکن جاہل است

(۱۲۹)

ادراکِ خوبیِ تو ز ابصار مشکل است　　　پرداختن دل از غمِ دیدار مشکل است

مارا کہ چوں غبارِ ضعیفیم جز و خاک　　　برخاستن زکوے تو بسیار مشکل است

---

[۱] قیاسی، مخطوطۂ ادیب نیز نقلِ رام پور میں یہ شعر اس طرح ہے: "نقاش نہ آساں رُخِ دلدار ساختہ ست　یک ماہ صرف کردہ کہ رخسار ساختہ ست" مصرعِ اولیٰ ناموزوں۔ بہ ظاہر شعر ۱۲۳ اور ۱۲۴ کی ردیفیں بدل گئی ہیں۔

خو کردنم بہ ہجرِ تو بے مصلحت نہ بود　　برداشتن دل از تو بہ یک بار مشکل است

ہر لحظہ ام ز جا دلِ بے تاب می رود
گاہے شکیب اگر نہ کند کار مشکل است

(۱۳۰)

ستم زسادہ دلی ہائے من بہ جانِ من است　　وفا زہم چو تو بے مہر در گمانِ من است

رسیدہ ام زرہِ دور و تا جسرِ عشقم　　متاعِ درد و الم بارِ کاروانِ من است

نشود زیادہ اگر وحشتم بہ دشت برید
غزالِ وادیِ مجنوں مزاج دانِ من است

(۱۳۱)

تمنّے کہ بے تو دہد دست ناچشیدہ بہ است　　دماغ رفتۂ مہجور نارسیدہ بہ است

مباد چشم چرانی کند کسے بہ خطت　　بہ گردِ روئے تو ایں سبزہ نادمیدہ بہ است

رہِ حدیث مدہ ورنہ رنجہ خواہی شد
فسانۂ منِ غم دیدہ ناشنیدہ بہ است

(۱۳۲)

میرؔ آں کہ چشمِ شوق بہ ابروئے یار داشت　　ہر دم جگر فگار بہ شمشیر کار داشت

گر قدرِ گردِ راہِ تو نشناخت بد مبر　　معذور بود شیخ کہ چشمش غبار داشت

ہر ذرّہ خاکِ بادیہ سر می زند بہ سنگ
مجنوں چو من مگر دلکِ بے قرار داشت

(۱۳۳)

دیر در خوں ریزیِ من اے سپاہی پیشہ چیست　　باز خواہِ خوں نہ دارم ایں ہمہ اندیشہ چیست

(۱۳۴)

شب چشمکِ ستارہ حریفاں اشارہ اے ست　　یعنی در ایں رواق عجب ماہ پارہ اے ست

(۱۳۵)

ایں گلِ ابر کہ گریاں بہ کفِ خاکِ من است　　تربیت یافتۂ دیدہ نم ناکِ من است

(۱۳۶)

بعدِ مرگم از قفس چوں من اسیرے بر نخاست دل بہ درد آور فغاں از ہم صفیرے بر نخاست

(۱۳۷)

بر ہر غزلِ من اجتماع است در مجلسِ صوفیاں سماع است

ناچار بہ مرگ دل نہادم اے جانِ غمیں بزو وداع است

خوباں ہرگز نمی خرندش باآں کہ وفا عجب متاع است

دامن مفشاں زحرفِ کساراں خوبی و تقدس اختراع است

تا کے شنوم غمِ دلت میرؔ

اکنوں خاموش کن صداع است

(۱۳۸)

بانہ دل بر سرِ کوے تو زپا افتادہ است آہ ازایں خستۂ ہجراں کہ بجا افتادہ است

(۱۳۹)

بہ دستِ ستم کیشِ من ہر زماں است نہ دانم چہ در سرنوشتِ کماں است

(۱۴۰)

مباش از خویش غافل گر تمیز است کہ جاں اے میرؔ مہماں عزیز است

(۱۴۱)

ہر یک ز آہ و اشک پے جانِ عاشق است آب و ہواے شہرِ وفا ناموافق است

(۱۴۲)

اگرچہ دستِ مرا با سرم سروکار است ولے بہ حشر ہمیں دست و دامنِ یار است

## ردیف ث

(۱۴۳)

بر سرِ ما بہ دمِ نزع رسیدی بہ عبث ما کجا ایم تو تصدیع کشیدی بہ عبث

حاصلے بود ہمیں بود کہ پامال شدی

در رہِ حادثہ چوں سبزہ دمیدی بہ عبث

## ردیف ج

(۱۴۴)

ناساز بود عارضۂ عشق با علاج　　مُردم بہ یادِ عارضِ خوبِ تو لا علاج

## ردیف چ

(۱۴۵)

اسپ و فیل و عَلَم و شوکت و شاں آخر ہیچ　　گشتہ بالفرض از آنِ تو جہاں آخر ہیچ

منعم اے خانہ خراب ایں ہمہ شوقِ تعمیر
سال ہا ساختہ ای جا و مکاں آخر ہیچ

## ردیف ح

(۱۴۶)

قدرِ جنسِ وفا نہ دارد شرح　　دل بہ طفلانِ شہر دادم طرح

## ردیف خ

(۱۴۷)

ہست بر ریشِ فش مدارِ شیخ　　شانہ کاری ست روزگارِ شیخ

رفت در وجہ بادہ سجّادہ
رونقِ خوش گرفت کارِ شیخ

(۱۴۸)

بہاراں رنگ دارد شاخ در شاخ　　گلِ تر می زند چشمک ز ہر شاخ

نہ دارد ہر کہ فکرِ برگِ عشرت
بر آرد از ندامت چوں شجر شاخ

## ردیف د

(۱۴۹)

دوش بے روے تو از غم کار بر دل تنگ بود　　شورشِ فریادِ من فرسنگ در فرسنگ بود

با رُخِ زردم سرشکِ سرخ ربطے داشتہ ست　　پیش از ایں اے ہم نشیں بر چہرۂ من رنگ بود

بے تأمل از نہالانِ چمن بگذشتہ ای — ورنہ در ہر سایۂ برگے تہِ نیرنگ بود

خوب شد مجنوں بہ صحرا رفت و نامش محو شد — در محبت پیشگاں آں ناخلف بے ننگ بود

کردہ ام عمرے بہ کوے عشق خواب راحتے — بسترِ من خاک بود و بالشِ من سنگ بود

سینۂ صافی روشناسِ خوب زشتم کردہ است — یادِ آں عہدے کہ ایں آئینہ زیرِ زنگ بود

غالباً آویزشے با غیر کرد و کشتہ شد
دیدہ بودم میر را شب مستعدِ جنگ بود

## (۱۵۰)

سرو پیشِ سرو از آں قامت روایت می کند — گل بہ گل از خوبیِ رویش حکایت می کند

مصلحت جز بستنِ لب نیست اکنوں ورنہ من — نالہ ے دارم کہ در دل ہا سرایت می کند

دل ہمہ خوں گشتہ و پامالِ شوقِ وصلِ تست — دیدہ اکثر آرزوے خاکِ پا بیت می کند

بر سخن ہاے دروغش راہ رفتن سادگی ست — ایں کہ می گوید کہ می آیم عنایت می کند

نے سناں می بایدش نے خنجر و نے تیغِ تیز — بہرِ قتلم جنبشِ مژگاں کفایت می کند

بندۂ اقبالِ تو گردم کہ با ایں ظلم و جور — بر سرِ ہر کوچہ درویشے دعایت می کند

ہم چو میر آزردہ جانے در جہاں امروز نیست
می چکد خوں از سخن ہر گہ شکایت می کند

## (۱۵۱)

از رہے ناز کناں کاں بتِ عیار رود — فتنہ زاں راہ بہ اندیشۂ بسیار رود

از تماشاے رخت حور برد در ماند — ور پری چشمِ تو بیند دلش از کار رود

سوے من آمدنِ اوست بداں ساں کہ طبیب — از سرِ ناز پے دیدنِ بیمار رود

یک نگاہ پسِ مژگاں و دو صد نومیدی — جان قربانِ اندازِ تو دشوار رود

تا قیامت نگراں زیرِ زمیں خواہد بود — چشمِ عاشق کہ بہ ایں حسرتِ دیدار رود

مالکِ مصر بہ بیعانہ دہد جانِ عزیز — . . . . . . . . . . [۱]

عشق یارب چہ بلاے ست کہ پیشش بے جرم — . . . . . . . . . . [۲]

---

[۱] [۲] مخطوطۂ ادبیب میں یہ دونوں مصرعے حاشیے میں کٹ گئے ہیں۔ نقلِ رام پور میں دونوں شعروں کے پہلے مصرعے مندرجۂ ذیل تغیر کے ساتھ ایک شعر کی صورت میں درج ہیں:

مالکِ مصر بہ بیعانہ دہد جانِ عزیز — عشق یارب چہ متاع است بہ بازار رود

(۱۵۲)

احوالِ دل میر رسید یک لخت چاک گردید | بیمارِ ما گراں بود آخر ہلاک گردید
بزمِ خوشِ جہاں را چوں شب شکست دیدم | شد دود شمعِ محفل پروانہ خاک گردید
از پوچ گوئی او ہر دل کدورتے داشت | از ہم گذشت واعظ محراب پاک گردید
بودہ ست خوش نصیبے ہم عاقبت بخیرے | آں کس کہ مضجعِ او در پائے تاک گردید

پایانِ کار اے میر در عشقِ نوجواناں
دل چاک چاک گردید جاں دردناک گردید

(۱۵۳)

دوش آہم ز سینہ سرزدہ بود | آتشے در سپہر درزدہ بود
دل ز باغِ زمانہ رنگ داشت | گلِ داغے مگر بہ سرزدہ بود
شد مبدل بہ شام صبحِ چمن | یک نفس مرغِ نالہ پرزدہ بود
تا من از جیب سر بروں آرم | دامن آں شوخ چینم برزدہ بود

آخر کار شد جراحت میر
عشق زخمے کہ بر جگر زدہ بود

(۱۵۴)

ابرو چو کنی کج بہ تو دیدن نہ توانند | برخود شکناں غیرِ خمیدن نہ توانند
بالقوہ خصمانہ ایں تاز کہ دارد | آں امی کہ کمانِ تو کشیدن نہ توانند
مرغانِ سحر در چمن از حیرت حُسنت | چوں طائرِ تصویر پریدن نہ توانند
عُشاق بہ تسلیم رضا دادۂ عشق اند | ایشاں تہِ تیغِ تو تپیدن نہ توانند
در بزمِ خوشت بہ کہ لبم بستہ بماند | گر سر کنم افسانہ شنیدن نہ توانند
تا کے دو سہ اشک از خطرِ شہرتِ عشقم | آیند بہ مژگان و چکیدن نہ توانند
در شہر کنم قدغن اگر دست بیابم | تا بوالہوساں جیب دریدن نہ توانند
بے تاب و نوانانِ وفا آہ چہ سازند | از دامنِ او دست کشیدن نہ توانند

ایں یک دو سخن نشنو گم کردہ رہ شعر
آں جا کہ من امم میر رسیدن نہ توانند

(۱۵۵)

از دست و بازوے تو ضرر بر ضرر رسید — تیرِ تو سینہ کردہ ز دل بر جگر رسید
اکنوں بہ دست آمدنِ دل چہ ممکن است — آں قطرہ خوں بہ ناحیۂ چشمِ تر رسید
در حالِ نزع گوش زدم شد رسید نش — وقتے کہ بے خبر شدم اینم خبر رسید
رفتی ز چشم و دل تہ و بالا شد از تپش — از رفتنِ تو آہ قیامت بہ سر رسید

امروز میرؔ خندہ زناں حرف می زند
از یارِ او کتابتِ شوقے مگر رسید

(۱۵۶)

چوں بہ کویش می روم ہنگامہ بر من می شود — یار ہم از بہرِ پاسِ خلق دشمن می شود
سیرِ ما اندوہگیناں یک قلم بے لطف نیست — تو گلے ہم گاہ ایں جا نرگسی زن می شود
در غمِ دل تکیۂ ما طرفہ ماتم خانہ ایست — جمع می آیند درویشاں و شیون می شود
گل چو می بینم بہ یادِ روے او غش می کنم — حال اگر این است ترکِ سیرِ گلشن می شود

با بتاں از اختلاطِ میرؔ می دانیم ما
کایں جواں امروز یا فردا برہمن می شود

(۱۵۷)

فتنہ و آفت و آشوب و بلا می گویند — چشمِ بیمارِ ترا شوخ چہ ہا می گویند
پردہ بردار کہ در شوقِ تو ہر شام و سحر — جانِ خود را دو سہ درویش بما می گویند
گر جگر نیست بروں رو ز دیارِ عشاق — درد را مردمِ ایں شہر [دوا][1] می گویند
ما ز جورِ تو بہ جاں آمدہ بودیم چہ شد — گر بگفتیم کہ ایں را چہ ادا می گویند
نیست جائے کہ در او رخنۂ اندازِ تو نیست — ہر چہ در وصفِ تو گویند بجا می گویند
مدتے شد کہ اسیرانِ محبت ہر صبح — داستاں ہا ز غمِ دل بہ صبا می گویند
بے قباحت نہ بُوَد شیخ نمازِ معکوس — لوطیاں جملہ ترا پا بہ ہوا می گویند

---

[1] قیاسی تصحیح۔ مخطوطۂ ادیب اور نقلِ رام پور میں "دعا"

بوئے اُنس از گلِ ایں باغ نیامد بہ مشام ماچہ دانیم کہ از مہر و وفا می گویند
کس کماہی بہ جہاں ذاتِ علیؑ را نہ شناخت شیعہ مولیٰ و نُصیریش خدا می گویند
میرؔ بر شعرِ ترِ خویش مکن ایں ہمہ ناز
دیگراں نیز غزل را بہ صفا می گویند

(۱۵۸)

دل می کشد بہ صحرا ہنگامِ کار آمد شورے ست در سرِ من شاید بہار آمد
بے اختیار از خاک خواہیم قد کشیدن آں پارۂ قیامت گر بر مزار آمد
چوں سُرمہ گشت باعث افزونیٔ بصر را گردے اگر بہ سویم زاں رہ گذار آمد
بالذّتِ وصالش من آشنا نہ گشتم کز خویش رفتہ بودم ہر گاہ یار آمد
میرؔ از جفائے خوباں دیروز کشتہ افتاد
ایں نوجوانِ ناکام آخر بہ کار آمد

(۱۵۹)

آفت کجا ز شورِ تو برپا نمی شود کے جلوہ می کنی تو کہ غوغا نمی شود
یارب بہ کوچۂ کہ فتادہ ست راہِ دل دیرے ست در تلاشم و پیدا نمی شود
دل غنچۂ کدام گلِ غیر موسم است ہر چند می کشیم ولے وا نمی شود
اے دل چہ حظ زیاریٔ شہر آشنا بُتے کاو لحظہ اے بہ کامِ تو تنہا نمی شود
گو شمع ساں بہ بزمِ خوشت سرِ دِہ بہ باد ترکِ وفا و مہرِ تو از ما نمی شود
ہر چند گفتہ اند کہ اے میرؔ روزِ حشر
دیدار عام می شود امّا نمی شود

(۱۶۰)

دردِ عشقم بہ چشمِ یار آورد گریہ آبے بہ روے کار آورد
نخلِ عشقت رسید چوں بہ مراد حلق ہائے بریدہ بار آورد
تا رسیدم در ایں خراب آباد فتنہ بر فتنہ روزگار آورد
داغِ سودائے من کہ گشتہ سیاہ ایں بلا بر سرم بہار آورد
میرؔ در انتظارِ گردِ رہش
چشمِ نم ناکِ من غبار آورد

(۱۶۱)

متصل بے تو خوں فشانی کرد      چشم بے تہ چہ راز بانی کرد
عشق آخر مرا بہ کشتن داد      دوستی دشمنیِ جانی کرد

بر بلائے فراقِ او اے دل      صبر خوب است اگر توانی کرد
دل منہ بر سلوکِ ظاہرِ او      لطف اگر کرد مہربانی کرد

میر گویند در فراق بمرد
تا چساں بے تو زندگانی کرد

(۱۶۲)

یک لحظہ کاش سوئے منِ خستہ رو کنند      آناں کہ چاکِ سینہ بہ مژگاں رفو کنند
صحبت چگونہ گیرم تواں کرد با گلے      کافسردہ می شود ز نزاکت چو بو کنند

بارے تو خود بگو کہ چہ خواہی جواب گفت      گر روزِ حشر با تو مرا رو بہ رو کنند
من عینِ دوست گشتم و ترسم کہ دشمناں      برمن نظر کنند و تماشائے او کنند

یک چند مہربانیِ ظاہر ضرورت است      تا خوگرانِ مہر بہ جورِ تو خو کنند
ہر چند کامِ اہلِ طلب حاصل است لیک      شرطِ محبت است کہ شاں جستجو کنند

دارند غم کشاں دلِ بے خواہش ارنہ میر
خود حاضر است یار اگر آرزو کنند

(۱۶۳)

عاشق کہ دلِ سوختہ چوں آبلہ دارد      آزردۂ عشق است ز خود ہم گلہ دارد
یک لحظہ فراغت نہ دہد دستِ تشویش      صد پارہ شود دل کہ مرا دہ دلہ دارد

دیرے ست کہ از یوسفِ ما نیست نشانے      خوبی ست نہ آں جنس کہ ہر قافلہ دارد
دارم سرِ پُر شور ز سودا و خموشم      عشق است کسے را کہ چو من حوصلہ دارد

میر از دل و جاں معتقدِ پیرِ مغاں است
او دستِ ارادت بہ ہمیں سلسلہ دارد

(۱۶۴)

دیدار بعدِ مدّتِ بسیار عام شُد — تا من بہ کوے او برسم از دہام شُد
در راہِ او قدم نہ گذاری کہ پیش ازایں — خاصِ نقیر بود سلوکے کہ عام شُد
فیروزۂ حبابِ گردوں چہ فائدہ — در دستِ ما دو روز اگر بہر نام شُد
من بندۂ قدِ تو فقط نیستم بہ جاں — آزادہ اے چو سروِ گلستاں غلام شُد
تا رو بہ روے او نہ شود صرفہ مراست — ہرگاہ شد مقابلہ کارشس تمام شُد
بر چہرہ زلف کردہ پراگندہ واکشید — مطلب ازایں اداکہ بہ روزے دو شام شد

اظہارِ عجز کردم و نادم شدم کہ میرؔ
من بعد ترکِ رسمِ دعا و سلام شد

(۱۶۵)

بہ امیدِ وصلش آں کس کہ بہ جاں رسیدہ باشد — چہ ستم کشیدہ باشد چہ عذاب دیدہ باشد
زسلوکِ آں جفاجو من امیدِ آں نہ دارم — کہ بمیرم و بہ حسرت لبِ خود گزیدہ باشد
نہ عنایتے نہ لطفے نہ ترحمے نہ مہرے — بہ کدام امیدداری دلم آرمیدہ باشد
دلِ چاک چاک دارد گلِ ایں حدیقہ آیا — زنسیمِ صبح گاہی چہ خبر شنیدہ باشد

زتو میرؔ رنجہ باشد چہ خیالِ باطل است ایں
مگر آں کہ خاطرِ او زکسے کبیدہ باشد

(۱۶۶)

[بہ خوش رُویاں[1]] نمایندت کہ خوش رو ایں چنیں باید — [بہ دل[2] دارے کہ] باید داد دل او ایں چنیں باید
گل و سنبل بدانند از بہ باغ آئی کہ جاناں را — بہ تن بو ایں چنیں، رو ایں چنیں، مو ایں چنیں باید
بیا اے کج ادا با من کہ بنمایم بہ خوبانت — کہ خال و خط بہ ایں خوبی و ابرو ایں چنیں باید
محبت پیشۂ خود کن کہ مشہورِ جہاں گردد — کہ آئیں ایں چنیں، خوبی چنیں، خو ایں چنیں باید

بہ درویشاں اگر داری سرے با میرؔ اُلفت کن
کہ بر درچوں تو خوبے را دعا گو ایں چنیں باید

---

[1]، [2] قیاسی۔ نقلِ رام پور میں بھی ابتدائی الفاظ غائب۔

(۱۶۷)

افسوس آں شکار کزو جاں ببرد و مُرد | وز جوئے تیغ او دم آبے نہ خورد و مُرد
مُردم ز رشکِ آں کہ غمِ بے شمارِ خویش | در اختصارِ پیشِ تو یک یک شمرد و مُرد

از صبح شورِ میرؔ بہ گوشم نمی رسد
شاید کہ عہدِ نالہ بہ بلبل سپرد و مُرد

(۱۶۸)

آسمانم غم ز مجنوں کم نہ داد | یک بجنتِ شہرتِ عالم نہ داد
پنجہ آخر برد در خونم فرو | آں کہ گاہے دست در دستم نہ داد
حیف گل رفت و دماغ رفتہ ام | رخصتِ یک سیر ایں موسم نہ داد
چوں زبید اندو گہینے کش سپہر | داد غم انواع و چشم نم نہ داد
چوں گُلم دوراں بہ باغِ کائنات | فرصتِ یک آب خوردن ہم نہ داد

داغِ بے پروائیِ عشق ام کہ میرؔ
صد جراحت داد و یک مرہم نہ داد

(۱۶۹)

منِ ناکام را در عشقِ او کامے نمی باید | مرا بے طاقتی بس باشد آرامے نمی باید
من از بے لطفیِ خود رفتنے مدِ نظر دارم | خشونت ہا ضرورت نیست دشنامے نمی باید
رود از عرش آں سوتر بہ یک دم جانِ مشتاقم | پئے ایں مرغ در رہ گوشۂ بامے نمی باید
بیا در مسلخِ عشق و ببیں تاں جانِ شیریں را | ترا اے طائرِ قدسی مگر نامے نمی باید

اگر ایں است شوق اے میرؔ خواہی رفت در کویش
کتابت احتیاجے نیست پیغامے نمی باید

(۱۷۰)

برائے سیر چو آں مہ ز خانہ برخیزد | بہ شہر محشرے از ہر کرانہ برخیزد
رمیدنم ز سرِ کوئے او بداں ساں شد | کہ نو دمیدہ پرے ز آشیانہ برخیزد
دلے برائے جفا ہر دم از کجا آرم | خدا کند کہ وفا از میانہ برخیزد

خواب و دربہ درم روزِ حشر باید دید　　کہ خاکِ من ز کدام آستانہ برخیزد
حدیثِ غیر بہ بسترِ فتادہ گوش کند　　ز غم چو برلبم آید فسانہ برخیزد
مگر فریفتۂ آئینہ اش کہ در برِ او　　نشید آہ کشد عاشقانہ برخیزد
دمے نمی شودم فرصت از کشیدنِ جور　　چو یار رحم نماید زمانہ برخیزد
برآورد نگہش گرد از دلم آرے　　رسد چو تیر غبار از نشانہ برخیزد
یکے بہ عجز برو پیشِ میرؔ و ہمت خواہ
بہ وقتِ صبح چو بہرِ دوگانہ برخیزد

(۱۷۱)

جلوہ اش چوں ابتدا در ناز کرد　　بادلِ عاشق عجب انداز کرد
شد کباب از آتشِ غیرت دلم　　گر بہ کویش طائرے پرواز کرد
در چمن رفتی و بہرِ دیدنت　　گلبن از ہر شاخ چشمے باز کرد
وقتِ آں کس خوش کہ چوں گل در بہار　　برگِ عیشے برلبِ جو ساز کرد
بردماغم خورد از بس ضعفِ دل　　بلبلے گر از چمن آواز کرد
چشمِ تر ناگشتۂ من بے رخش　　گریہ ہائے دردِ دل پرداز کرد
خواب امشب ہم بہ یاراں شد حرام
قصۂ غم میرؔ باز آغاز کرد

(۱۷۲)

دردے کہ مرا دوش از او حال دگر بود　　پروردۂ نان و نمکِ داغِ جگر بود
ایں دل کہ ہمہ خوں شد و از دیدہ فرو ریخت　　عمرے بہ سرِ راہ بہ امیدِ خبر بود
آں جذب نماندہ ست کہ از پہلوئے او میرؔ
در دستِ دعا گوشۂ دامانِ اثر بود

(۱۷۳)

ابرِ تر شوقِ مے فزوں تر کرد　　ایں ہوا آتشِ مرا بر کرد
پیکرم جملہ زرد شد یعنی　　عشق ایں مشتِ خاک را زر کرد

دردمندِ غمِ تو آخرِ کار مردنِ خویشتن مقرر کرد
عشق می داشتم نہاں لیکن خشکیِ ہر دو لب مرا تر کرد
تا چہ اندوہ میرؔ در دل داشت
گریہ سر کرد چوں سخن سر کرد

(۱۷۴)

رفتہ رفتہ در برِ من خوں دلِ صد چاک شد کار آخر بر مرادِ دیدۂ نم ناک شد
بر حذر می باش در وقتِ طلوعِ آفتاب عالمے از چشمِ شورِ آسماں در خاک شد
قطرہ از مژگاں فتاد و موج زن گردید بحر سر کشید از دل غبار و طرحِ نُہ افلاک شد
من خود از بس لاغری مُردم بہ کنجِ صیدگاہ وقتِ صیدے خوش کہ خونش زیبِ آں فتراک شد
مست بودن میرؔ در مے خانۂ عالم خوش است
طالعِ رندے کہ تزویجش بہ دخترِ تاک شد

(۱۷۵)

تا قیامت دلِ تپاں دارد کُشتۂ تیغِ او نشاں دارد
گلِ کفشِ تو بلبلے باشد کہ بہ پاسے گل آشیاں دارد
بہ سخن میرؔ را مَپیار کہ او
زیرِ لب نالہ و فغاں دارد

(۱۷۶)

چند پُرسی کہ محبت بہ منِ زار چہ کرد چہ بگوئیم کہ سیلاب بہ دیوار چہ کرد
جاں بہ خواری شد و لے وائے نہ پُرسید کسے کایں بہ انواعِ عقوبات سزاوار چہ کرد
عائدِ خلقِ جہاں گشتہ زیانِ جاں ہا آں کہ آورد ترا بر سرِ بازار چہ کرد
نے تہِ تیغِ کسے رفت و نہ گردید کباب کس چہ پرداز دراز او مرغِ گرفتار چہ کرد
در جگر قطرۂ خوں نیست کہ اشکش سازم ہائے بے صرفگیِ دیدۂ خوں بار چہ کرد
سینہ ام چاک کن و سوئے دلِ خستہ ببیں تا بدانی مژہ برہم زدنِ یار چہ کرد
سینہ از کثرتِ داغم ہمگی گشت سیاہ چہ دہم شرح کہ محرومیِ گلزار چہ کرد
بر سرِ رہ گزرش می شنوم خود را گشت لائقِ میرؔ نہ بودہ ست چنیں کار چہ کرد

(۱۷۷)

شورشِ دل تا ثریا می رود	کارِ آہ و نالہ بالا می رود
دردمے صد بار آید جاں بلب	کس چہ داند آں چہ برما می رود
کے بہ حرفش می رسد سحرِ حلال	بحث در اعجازِ عیسیٰ می رود

ایں چنیں تا چند خواہد ماند میرؔ
از درت امروز و فردا می رود

(۱۷۸)

سحر ہر روز خورشید از سرِ کویت گذر دارد	نمی داند مگر آں سادہ کایں رہ صد خطر دارد
نہ دارد طاقتِ صبر بلا جانِ المناکم	محبت چند روزے کاش از من دست بردارد
توائے بے رحم ہر شب واکشی بر بستر نازے	چہ دانی حالِ غمگینے کہ سنگے زیرِ سر دارد
بجو من یک لحظہ میلِ خوابِ راحت نیست نرگس را	مگر چشمِ ترا اے شوخ آں ہم در نظر دارد
نمی دانم چہ دارد آہ عشقِ فتنہ گر یا رب	کہ با ما غم کشاں ہر لحظہ اندازِ دگر دارد
بہ وقتِ رخت بستن دیدنِ یاراں بود لازم	تو ہم یک دم ببیں ما را کہ جاں عزمِ سفر دارد

من اے ہمدم مصیبت دیدہ اے چوں میرؔ کم دیدم
سخن از محنتِ خود تا بگوید چشم تر دارد

(۱۷۹)

تنہا نہ در برِ من دل اضطراب دارد	در راہِ اشتیاقش جاں ہم شتاب دارد
ہم چوں حبابِ غافل یک چشم دیدہ واکن	زلفے ست موجِ دریا کو پیچ و تاب دارد
یک صبح دیدہ بودم آں چشمِ پرخمر را	کیفیتِ نگاہش عالم خراب دارد
از سوزِ سینہ آخر خود را زدم بہ دریا	چند آتشِ جدائی جانم کباب دارد
از جا مرو بہ حرفِ بے مغزِ واعظِ شہر	عمامہ اے کہ دارد رہنِ شراب دارد

تا چند زندہ ماند میرؔ ایں چنیں بہ ہجراں
زودش بکش کہ قاتل ایں خوں ثواب دارد

(۱۸۰)

این بے کسی نگر کہ کسے چشم تر نہ کرد | یک ابر ہم بہ خاکِ غریباں گذر نہ کرد
نازم بہ کینہ جوئیِ دربانِ سنگ دل | مردم بر آستانۂ یار و خبر نہ کرد
زخمے بہ من رسید کہ خود ہم[1] ستود و گفت | صد آفریں ترا کہ کسے ایں جگر نہ کرد
زیں غم چہ خوں کہ در جگرِ پارہ پارہ نیست | کاں نازنیں ز شرم بہ حالم نظر نہ کرد
زاں نالہ ہا کہ از جگرِ سنگ بگذرند | محرومی ام ببیں کہ یکے ہم اثر نہ کرد
مانندِ شمع کشتۂ بے دردیِ ویم | با من چہ دشمنی کہ نسیم سحر نہ کرد

خارے بہ پائے من نہ خلیدہ ست در رہش
کاو رفتہ رفتہ میرؔ سر از دل بدر نہ کرد

(۱۸۱)

می سزد گر ز بتاں چشم وفائے دارد | ہر کہ آئینہ صفت دستِ دعائے دارد
غیرتِ عشق چساں در دلم آتش نہ زند | ہر خس و خار بہ او ربطِ جدائے دارد
پے تواں برد بہ کویش ز نگاہِ عشاق | شوقِ دل گم شدگاں راہ بہ جائے دارد
ہر طرف آہ و ہمیں اشکِ دما دم دیدم | کوچۂ یار عجب آب ہوائے دارد

ماہ و خورشید و گل و لالہ نمی دانم میرؔ
دلبر آن است کہ آنے و ادائے دارد

(۱۸۲)

سلوک و خوبیِ خوباں کہ ظلم کیشانند | کساں کہ اہلِ وفاے اند خوب می دانند
ز دلبراں مگر ایں چشم داشتم کہ زناز | بہ خونِ ناحقِ من تیغ را بجا بانند
بہ ہجر زیستنے جانِ سخت می خواہد | فدائیانِ تو بیش از دمے نمی مانند
رہِ سلوک درایں کارواں سراسر کن | غنیمت اند عزیزاں کہ جملہ مہمانند
تو در نہ یافتہ ای ذوقِ عشق را ناصح | بتاں کہ دشمنِ جان اند خوش ترا زجانند

---

[1] قیاسی تصحیح۔ مخطوطۂ ادیب نیز نقل رام پور میں "ستاد"

قدم دریغ مدار از مزارِ غم کیشاں | کہ از برائے تو با خاکِ تیرہ یکسا نند
ز فرطِ شوق بسے گشتہ ام کنوں کاش | مرا بہ گردِ سرِ دلبراں بگرد انند
بہ خدمتِ صنم اے راہباں نہ شد تقصیر | ز اہلِ صومعہ پرسید شاں مسلمانند

گذشت نوبتِ قدسی و صائب و طغرا
دریں زماں ہمہ دیوانِ میر می خوانند

(۱۸۳)

ہوش از خرامِ ناز بہ یک بار می برد | و آں چشمِ نیم مست دل از کار می برد
من بے دماغ و ہر سحر آوازِ عندلیب | دامانِ دل کشیدہ بہ گلزار می برد
با ایں متاع اگر سوئے بازار می رود | دل را بہ یک نگہ ز خریدار می برد
دامن کشاں گذشتنش از اہلِ خانقاہ | چندیں ہزار خرقہ بہ بازار می برد
یک چند زندہ اش دگراز دور می شنو | کے خضر جاں ز دستِ غمِ یار می برد
یا رب جہاں چہ جاست کزیں منزل آدمی | با خود بہ خاک حسرتِ بسیار می برد

قطعہ: روزے ہزار بار ز شوقِ درِ کسے | ایں پا شکستہ دست بہ دیوار می برد
اما نمی رود قدمم پیشتر یکے | ہر بار ضعف دست و دل از کار می برد

جانش بہ لب رسید و نہ گشتی دچار میر
رختِ سفر ز کوئے تو ناچار می برد

(۱۸۴)

گریہ چوں شیشہ در گلو دارد | دل نہ دانم چہ آرزو دارد
گل و آئینہ و مہ و خورشید | ہر کسے رو بہ سوئے او دارد
لعل بے تہ کہ می زند برنگ | پیشِ لب ہائے او چہ رو دارد
سایہ اش با پری بہ ہر گامے | از سرِ ناز گفتگو دارد
چوں زئید در زمانِ بے لطفی | آں کہ با التفات خو دارد
چرخ یا رب نمی رسد جائے | از برائے کہ جستجو دارد

به گره بسته است چوں گوہر ہر که یک قطره آبرو دارد
جرعه بر خاکِ میر آخواہد[1] ریخت
یار از آں مے که در سبو دارد

(۱۸۵)

نگاہم با تہِ کار آشنا بود به ہر مشتِ غبارے کبریا بود
چه می پرسی که ہر روزِ جوانی نگارے بود لیکن بے وفا بود
ز بلبل در گلستاں یادگارے پرِ چندے نسیمے در قفا بود
سحرگه بر سرِ پروانه رفتم کفِ خاکستر گرمے به جا بود
به صد خونِ جگر من پیش بُردم وگر نه شہرتِ مجنوں بلا بود
غلط کردم که وا بوسیدم از خود نه دانستم در ایں قالب خدا بود
مگر در خانقه دستے فشاندی که صد پیراہن نیکاں قبا بود
توائے سرمایهٔ ہستی چه ہستی که خلقے گشت از بہرِ تو نابود
نه دیدم میر را در کوئے او لیک
غبارِ ناتوانے با صبا بود

(۱۸۶)

دوشم چو بید لرزه به جسمِ نزار بود خود جسم من نه بود دلِ بے قرار بود
بشکست خورد عشق زبردست عافیت بازوئے من که بالشِ نازِ نگار بود
بہر کسے که مشتِ غبارم به باد رفت او زیرِ لب نه گفت که ایں جا مزار بود
روزے ہزار مرتبه از جاں گذشته ام راہِ جدائی تو چه مشکل گذار بود
بارے رُخم نمودی و آسوده ساختی جانِ به لب رسیده در ایں انتظار بود
تا بوده ام ز وقتِ خود آگاه بوده ام دستم به کار بود و دلِ من به یار بود
جائے که خار زار نمو وا گشته است دیروز اے ستم زده ایں جا بہار بود

---

[1] قیاسی تصحیح ۔ مخطوطهٔ ادیب نیز نقل رام پور "خواہی ریخت"۔

نرگس آں چشم را ہمی خوانند
می ندانند کاندر ایں نظر است

تا چشمِ خویش باز نمایم خراب گشت　　بنیادِ قصرِ عمر چہ ناپائدار بود
کردی جفا و جور بہ طرحے کہ شد ہلاک
ہر چند میرؔ طرح کشِ روزگار بود

(۱۸۷)

مستمندِ عشق می داند کہ سودا می کند　　دیدنِ طفلانِ نہ بازار رسوا می کند
کعبہ خود دارد طلب کاندر بیابان واقع است　　کام می جوید دل از وے سعیِ بے جا می کند
دل اگر این است کار از دست خواہد رفت میرؔ
از تپیدن ہر نفس ہنگامہ برپا می کند

(۱۸۸)

از سرِ مژگاں، نہ تنہا در غمت خوں می رود　　آں چہ در دل داشتم از دیدہ بیروں می رود
گریۂ ہر لحظۂ من شکوۂ دیرینہ ایست　　نیم جانے دارم آں ہم بے تو اکنوں می رود
آہ از آں عاشق ستم آخر چہ می خواہد کہ میرؔ
می کشد آزارِ بسیارے و ممنوں می رود

(۱۸۹)

زندگانی کہ اعتبارے بود　　در فراقش بہ دوش بارے بود
شد بہ ہر شاخ ماتمِ بلبل　　باغ گوئی کہ سبزوارے بود
کوہکن مفت جانِ شیریں داد　　سخت ناآزمودہ کارے بود
کرد یکساں بہ خاکِ گور مرا　　آں کفِ خاک یادگارے بود
نے تپیدے و نے گرفتہ شدے　　پیش ازیں دل عزیز یارے بود
ساعدِ آں نہالِ گلشنِ حسن　　گوئیا سیم شاخ وارے بود
زندگی عاجزانہ کرد و بمرد
میرؔ درویشِ خاکسارے بود

(۱۹۰)

راہِ دل ہر کہ کند سر جگرش باید کرد — درنخستیں قدمے ترکِ سرش باید کرد
گرچہ تدبیرِ شکستِ دل از او ہم نہ شود — لیکن از حالِ خرابم خبرش باید کرد
حیف باشد کہ رود دل پے لعل و یاقوت — سیرِ خوش رنگیِ گل برگِ ترش باید کرد
قابلِ صحبتِ آں مُغبچہ ہر کس نہ بود — شیخ را حلقۂ بیرونِ درش باید کرد
چند چوں موے شب و روز بہ خود پیچیدن — دست اگر دست دہد در کمرش باید کرد
ہر کہ چشمانِ ترا مائلِ خود می خواہد — اوّلاً از ہمہ قطعِ نظرش باید کرد

ہر کرا میرؔ بود قصد بہ چشم آمدنے
تابِ دل صرف بہ کسبِ ہنرش باید کرد

(۱۹۱)

دردمندے کہ عشق خو اُفتاد — باغم و دردِ کارِ او اُفتاد
رشتۂ اُلفتِ بُت آخر کار — ہم چو زنّار در گلو اُفتاد
دیدن او بہ حشر ہم مرے ست — طبع شوخش بہانہ جو اُفتاد
زلف بکشود فتنہ لے برخاست — چشم بنمود ہاے دہو اُفتاد
قد برافراشتے قیامت شد — گام برداشتے غلو اُفتاد
نامہ ام چوں پرِ فتادہ بہ راہ — در دیارِ تو کو بہ کو اُفتاد
جملہ تن گوش شو کہ واعظِ شہر — بر زباں ہا زگفتگو اُفتاد
سینہ معلوم می شود خالی ست — تا چہ از دیدہ ام فرو اُفتاد

پہلوان ام بہ فنِ شعر اے میرؔ
ہر کہ شد رو کشم بہ رو اُفتاد

(۱۹۲)

موذنِ سحر گہ اذاں می دہد — عجائب اذیت از آں می دہد
چرا گم نہ گردم کہ ہر سالکے — بجاے من او را نشاں می دہد
بہ آں نخلِ امید بر می خورم — اگر مرگ چندے اماں می دہد

مگیرید نامِ بُتے پیشِ من ‏ ‏ ‏ پےِ خوش بتاں بندہ جاں می دہد

بہ ایں کم زبانی بسیار میرؔ

زباں آوراں را زباں می دہد

(۱۹۳)

در ملکِ دل زکثرتِ شوقش فتور شد ‏ ‏ ‏ چشمِ ترم بجیبرۂ عسر العبور شد

دارد نظر بہ سُرمۂ بُتِ شوخ چشمِ من ‏ ‏ ‏ یکساں شدن بہ خاکِ سیاہم ضرور شد

واشد گرہ زگیسوے او فتنہ سر کشید ‏ ‏ ‏ در جنبش آمد آں لبِ شیریں و شور شد

افگند پردہ از رُخ و نورے نمود کرد ‏ ‏ ‏ مژگاں بہم زد از رہِ شوخی ظہور شد

کارم خراب کردۂ بے تابیِ دل است ‏ ‏ ‏ ہر دم سماجت از حد و شرمِ حضور شد

مقصود بود خدمتِ معقولِ شیخ لیک ‏ ‏ ‏ از من نیامد آہ چہ سازم[1] قصور شد

در کینِ میرؔ صرفۂ یارانِ عہد نیست

ہر کس کہ تیز جانبِ او دید کور شد

(۱۹۴)

گردشِ نرگسِ مستِ تو شب آزارم کرد ‏ ‏ ‏ تا سحر ہم نفسِ گریۂ سرشارم کرد

موجبِ خواہشِ بسیار نہ دل گشت و نہ چشم ‏ ‏ ‏ دیدنِ گرمِ تو اے شوخ طلبگارم کرد

ناتواں گشتم و بر بسترِ غم افتادم ‏ ‏ ‏ آرزومندیِ دیدارِ تو بیمارم کرد

رفتم از خویش و فراغت ز دو عالم کردم ‏ ‏ ‏ بے خبر بودن از آرام خبردارم کرد

کاش می داشتم اے میرؔ زباں را درکام

آخر ایں زمزمۂ صبح گرفتارم کرد

(۱۹۵)

خوش باشد اگر قصدِ جفا داشتہ باشد ‏ ‏ ‏ آں رفت کہ سر بر سرِ ما داشتہ باشد

من ہم جگرے داشتم از سنگ کہ خوں شد ‏ ‏ ‏ عشق است کسے را کہ وفا داشتہ باشد

---

[1] نسخہ بدل "قیامت قصور"

راہے نہ تواں برد بہ سرِ کوچۂ زلفش — ایں بخت مگر بادِ صبا داشتہ باشد
از نعشِ شہیدے کہ رہ و دیر تواں یافت — کایں کشتہ بہ دل از توجہ ہا داشتہ باشد
ہر وقت سجودے بہ درِ او نہ تواں برد — ایں نیست نمازے کہ قضا داشتہ باشد
دادے کنم اے لالہ رُخاں با دلِ پُر داغ — انصاف اگر شہرِ شما داشتہ باشد

با خاک برابر شدنِ میرؔ دلیل است
اغلب کہ سرِ آں کفِ پا داشتہ باشد

(۱۹۶)

سرگذشتِ من ادا از ہر زبانے، می شود — ایں حکایت رفتہ رفتہ داستانے می شود
گر بہ ایں انداز خود را می نماید چند روز — خالِ رخسارِ تو اے مہ داغِ جانے می شود
ایں نہ پنداری کہ خواہی شد بہ پیری ناتواں — قامتِ خم گشتہ ہم بارِ گرانے می شود
ذرہ ذرہ خاکِ من لبریزِ شورِ عشقِ اوست — چوں بہم می آید ایں اجزا جہانے می شود
در نظر قدرِ بلندے دارم از عجز و نیاز — ایں زمینِ پست روزے آسمانے می شود
دل قوی دارید رنداں شیخ شاہد باز شد — عاقبت ایں بے حقیقت قلتبانے می شود

از نیازِ ہر زمانِ میرؔ می دانیم ما
کایں جوانِ رفتہ خاکِ آستانے می شود

(۱۹۷)

شیوہ ات در سادگی جز ناز و استغنا نہ بود — عالمے بر باد می رفت و ترا پروا نہ بود
عہدِ خلقت خوش کہ با رحم آشنایت کردہ است — گفتگوے لطف آمیز ایں چنیں با ما نہ بود
آں چناں گشتم کہ گم گشتم وے سوے نداد — گوہرِ نایابِ مطلب ہیچ جا پیدا نہ بود
تاب ہا خوردم کہ دستم داد مقبولِ خلق — ورنہ رہ چوں رشتۂ تسبیح در دل ہا نہ بود
کرد از چشمم تراوش آں چہ در دل داشتم — جوے خشک افتادہ من پیشتر دریا نہ بود
آسماں از سفلگی گم کرد مارا ناگہاں — جاے ما پیدا در ایں جا بود و مارا جا نہ بود

ایں چہ واقع شد کہ از دامن گذشتش چاکِ جیب
در [بہارِ] رفتہ خود میرؔ ایں قدر رسوا نہ بود[1]

---

[1] مصرعِ ثانی از نقلِ رام پور۔ مخطوطۂ ادیب میں کٹ گیا ہے۔ نقلِ رام پور میں "نہادِ رفتہ" بجائے "بہارِ رفتہ"

(۱۹۸)

دو روزے شد کہ دل از غم قیامت در جہاں دارد  فغان و نالہ و شور از زمیں تا آسماں دارد

کرا راہ است در بزم خوش کز من بہ او گوید  فقیرے جملہ تن آزردہ سر بر آستاں دارد

بہ دوش غیر دست افگندہ دیر استادہ می باشد  نشیند چوں بہ من شمشیر و خنجر درمیاں دارد

دل استقلال ظاہر می کند در عین بے تابی  ہمانا اضطراب خویش را از من نہاں دارد

بہ عہد سست گل دل را چہ بندد کس دریں گلشن  کہ ایں محبوب کم گو خود زباں زیر زباں دارد

نہ خواہد لرزہ رفت از مضجع او تا دم محشر  شہید زخم تیر ایں جفا کاراں نشاں دارد

ز ضعف و ناتوانی بار خاطر نیستم ہرگز  نہ دانم آں ستم گر از چہ بر من سرگراں دارد

نمی دانم کہ در شہر نکو رویاں چہ رسم است ایں  کہ گر کس نام مہر ایں جا بگیرد ترجماں دارد

بیا اے ہم نشیں گر دیدن میرؔ آرزو داری
ہنوز آں رفتنی در جسم غم فرسود جاں دارد

(۱۹۹)

برگ گلے بہ دست ز گلشن صبا رسید  یعنی خطے ز کوچۂ آں بے وفا رسید

گل گل شگفتہ است چمن موسم گل است  ساقی تو ہم بیا کہ دماغ ہوا رسید

پُر کاری اش ببیں بہ قراول زدہ ست حرف  تا آں زماں کہ زخم تفنگے بہ ما رسید

حیران داغ لالہ ام ایں خام دست را  میراث سینہ سوختگاں از کجا رسید

درویشم و دلم بہ نیازے خوش است میرؔ
قربان آں سرم کہ کسے را بہ پا رسید

(۲۰۰)

یا رحم در دل تو خدائے جہاں دہد  یا طاقت شکیب بہ ایں ناتواں دہد

دل رفت و ہیچ جائے سراغش نہ یافتم  یا رب کسے ز گم شدۂ من نشاں دہد

صد سال می تواں بہ امید وصال زیست  گر بے قراری شب ہجراں اماں دہد

مُردن بہ دوری تو دہد جان تازہ اے
میرم ز رشک آں کہ جدا از تو جاں دہد

(۲۰۱)

از معارض خطِ خوبِ تو فراغے دارد | خطِ خوبانِ دگر پاے کلاغے دارد
آتشم زد به دل اے لالۂ تنک آبیِ تو | ورنه هر سوخته جاں یک دو سه داغے دارد
خاکِ دلِ خوں شدۂ داغِ وفا خواهد بود | تربتے کاو به سراز لاله چراغے دارد

از سرِ کوچۂ آں زلف گذشته ست مگر
که نسیمِ سحرا اے میرؔ دماغے دارد

(۲۰۲)

گرچه بوے گلِ نو وا شده دیدن دارد | نالۂ مرغِ چمن نیز شنیدن دارد
ایں کنارم که لبالب ز برو دوشِ تو بود | حالیا کار به خمیازه کشیدن دارد
پنجه اش نیز چو عاشق به گریبانِ خود است | گل هم آیا هوسِ جیب دریدن دارد
هر زماں تا مژه می آید و بر می گردد | ایں دلِ خوں شده اندازِ چکیدن دارد

من عزادارِ شکیبائیِ مرحومم میرؔ
بر دلِ من الفے چند بریدن دارد

(۲۰۳)

نومید ز جاں گشت به هر کس که نگه کرد | ایں چشمِ سیاهِ تو بسے خانه سیه کرد
یک صبح نه شد با رخِ خوبِ تو برابر | هر چند که گل مشورہ شب ها به کله کرد

شد کشته به سر کوچۂ او میرؔ به خواری
معلوم نه گردید که مسکیں چه گنه کرد

(۲۰۴)

در محبت محنتِ بسیار می باید کشید | بهرِ یک نظاره صد آزار می باید کشید
بے ترشحِ بادۂ گل رنگ بے کیفیت است | دامنِ ابرے سوے گلزار می باید کشید
چهرۂ زیباے او من بعد خواهی نقش بست | اوّل اے نقاش دستِ یار می باید کشید
مدعا نایاب و راهِ جستجو دور و دراز | پا به دامن هم نشیں ناچار می باید کشید

من نمی گفتم که از ناخن جبیں مخراش میرؔ
قدرِ دل نے نیست دست از کار می باید کشید

(۲۰۵)

ہر کہ بر بسترِ فراق افتاد — چشم او دیدہ ام بہ طاق افتاد
شد مرا قصدِ عافیت معلوم — کارِ دل چوں بہ اشتیاق افتاد
دوش از پرتوِ رُخِ ساقی — آتشے در مئے رواق افتاد
میر و من دیر دردِ دل کردیم
چوں ملاقات اتفاق افتاد

(۲۰۶)

نہ شوی غرّہ بر ایں ہستی ایامے چند — کز عزیزانِ جہاں نیست بجز نامے چند
کاش باد سحر ایں جا شدہ یک رہ برود — کہ زمن ہم برساند بہ تو پیغامے چند
جملہ تن خوں شدہ از دیدہ چکید آخر کار — ایں دلِ خود سرم از یاریِ خود کامے چند
من و پروانہ و بلبل ہمہ یک جا جمعیم — در گرفتہ ست بہم صحبت بدنامے چند
تلخ او میر بود صفتِ مذاقم چوں شہد
کاش بنوازدم آں شوخ بہ دشنامے چند

(۲۰۷)

ہزار چاک بہ پیراہن اہلِ دل دارند — از ایں حریر قبایاں کہ خوش بر کارند
برائے عبرتِ یاراں ضرورت است اے کاش — دو روز کشتۂ مارا بہ خاک نسپارند
رود ز خاطرِ مجنوں جنونِ مجنوں میر
اگر بہ طورِ خودم چند روز بگذارند

(۲۰۸)

چشم تو غارتِ خردِ شیخ و شاب کرد — یک سرمہ داں شراب بسے را خراب کرد
از بزمِ یار دوش پشیماں بر آمدم — اُمیدِ لطف بود مرا او عتاب کرد
سرمست در رسیدی و دست در بغل شدی — قربانِ مے شوم کہ ترا بے حجاب کرد
مے خورد با رقیب شبے روئے ما نہ دید — ایں بے مروّتی دلِ مارا کباب کرد
اہلِ نظر سزد کہ زبانش قلم کنند — چشم ترا کسے کہ بہ نرگس حساب کرد

شرحِ سلوکِ او چہ دہم چوں شدم بہ پیش　　زد و دشنام با مخالف و بر من خطاب کرد

میرؔ از غمِ تو قابلِ دیدن نہ ماندہ است
نامت بہ گوش خورد کہ چشماں پُر آب کرد

(۲۰۹)

گر شود دہر گلستاں کہ تماشا نہ کنند　　غنچہ خیابانِ تو ہرگز مژہ را وا نہ کنند

در دیارے کہ وفا شیوۂ اہلِ آں جاست　　رسم ایں است کہ میرند و تمنا نہ کنند

فتنہ در زیرِ سر از دیدنِ پنہاں دارند　　گرچہ از شرمِ بتاں چشم بہ بالا نہ کنند

ناز پیرایۂ حسن است نکو رویاں را　　ایں ادا گر نہ بود در دلِ من جا نہ کنند

موکشانِ سرِ آں زلف کساں عجب اند　　گر جراحت بشود زخم کہ پروا نہ کنند

لعلِ جاں بخشِ تو ہر گاہ سخن آغازد　　لائق آں است کہ مذکورِ مسیحا نہ کنند

تلخ کامانِ وفا طرفہ کسان اند اے میرؔ
کہ بجز مرگ بہ خود ہیچ گوارا نہ کنند

(۲۱۰)

تا کارِ دل بہ چوں تو سراپا جفا فتاد　　بر خاک جملہ خوں شدہ از دیدہ ہا فتاد

سوے دل و جگر سحر از آہِ سوزناک　　جَست آتشے و لیک نہ دانم کجا فتاد

با من کسے کہ دید ترا گفت از عجب　　کایں گوہر از چہ راہ بہ دستِ گدا فتاد

می گفتمش کہ گیسوے پُرپیچ او بلاست　　حرفم نہ کرد گوش دل و در بلا فتاد

در بزم مطربے غزلِ میرؔ خواندہ بود
زاہد بہ سر درآمد و صوفی ز پا فتاد

(۲۱۱)

سرم پگاہ سبک از شراب می گردد　　طلوعِ کیف از ایں آفتاب می گردد

تو بر مزارِ دلِ غیر مست می گردی　　دلم ز آتشِ غیرت کباب می گردد

زموج خیزیِ بحرِ جہاں فریب مخور　　کہ ایں محیط بہ یک دم سراب می گردد

همیشه گل ز رُخت سُرخ و زرد می باشد — مدام باده ز لعلِ تو آب می گردد

ز حالِ میرؔ چه گوید کسے که آں بے کس
به کوچهٔ تو به حالِ خراب می گردد

(۲۱۲)

هرگه به شرحِ هجر دل از کار می رود — چشمم چو مُہرِ وصل به طومار می رود

سروے به جنبش آمد و من از فریبِ شوق — پنداشتم که یار به گلزار می رود

هرگز نمی فتد به کسے چشمِ بے خودش — مستِ گذاره است و چه هشیار می رود

حُسن است و شورِ قصهٔ یوسف نخوانده ای — در آخر ایں متاع به بازار می رود

نرگس ز خاکِ منتظراں رُسته یک قلم — حرفے ست ایں که حسرتِ دیدار می رود

ره می رود چناں که اثر نیست ظاهرش — ایں عمرِ برق جلوه چو عیّار می رود

از میرؔ پا شکسته چه آید که آں ضعیف
تا کوے یار دست به دیوار می رود

(۲۱۳)

ز غم خلق میرد لبت خنده دارد — ترا حق تعالیٰ بسے زنده دارد

پے اش می رود چشم تا می خرامد — خرامش چه طرزِ خوش آینده دارد

اگر سُرخ و زرد است یاقوت شاید — که لعلِ تو اش سخت شرمنده دارد

کجا مختلط می شود با من و تو — دلے از جهاں هر که بر کنده دارد

به رخسارهٔ او برابر نه گردد — چه شد ماه اگر روے تابنده دارد

به هر فرد موجود بالذّات باشد — خدا هم نه دانم چه پاینده دارد

دمے چند با میرؔ آواره بنشیں
عجائب مزاجِ پراگنده دارد

(۲۱۴)

تسکینِ جانِ غم زده در تن نمی شود — یعنی که بے تو زیستن از من نمی شود

تاریک دانِ سینهٔ من بے رخِ کسے — دارد هزار رخنه و روشن نمی شود

زیں لطفِ گاہ گاہِ تو اے کامِ جانِ خلق — با من کدام دوست کہ دشمن نمی شود

گل پُر مکلف است ولے بے تو ہرگزم — میلانِ دل بہ دیدن گلشن نمی شود

طبعِ تو گر بہ شیخ نہ سازد بعید نیست

صحبت برآر میرؔ زکودن نمی شود

(۲۱۵)

ہیچ کارم[1] میرؔ حسبِ مدعا در غم نہ شد — مردنے مرکوزِ خاطر داشتم آں ہم نہ شد

اے فلک طورِ ستم از دلبرِ من یاد گیر — ریخت خونِ یک جہاں از نازو ابرو خم نہ شد

نیست ہرگز جامۂ احرامِ زاہد معتبر — ماند عمرے در حریمِ کعبہ و محرم نہ شد

از عصا و سبحہ و سجادہ و صوم [و] صلوٰۃ — رہ نمائے عالمے شد شیخ و خود آدم نہ شد

جا بہ چشمِ مردماں چوں سرمہ کرد از یمنِ عجز

شد بہ خاکِ تیرہ یکساں میرؔ و قدرش کم نہ شد

(۲۱۶)

عنقریب است کز یں بے سروسامانے چند — دامنے چند بیابند و گریبانے چند

سینۂ من کہ مشبک بہ نظر می آید — بے محابا زدہ ام بر سرِ مژگانے چند

گرد باد من و مجنوں بہ عمت یک جا ایم — گشتہ چپاں چہ قدر ربطِ پریشانے چند

در رہِ شعر کسم راہ نمانیست مگر — حرفے چندے ست بہ یادم زسخن دانے چند

دائے بر ما کہ در ایں دیرِ کہن بعد از مرگ — می گذاریم کفِ خاکے و عصیانے چند

جانبِ خانقہ اے کافرِ بدکیش مرو — رحم بنمائے بہ احوالِ مسلمانے چند

بود نزدیک کہ افسردہ شود آتشِ عشق

میرؔ پیدا شُد و بر وے زدہ دامانے چند

---

[1] نسخہ رام پور "ہیچ گاہم کار"

(۲۱۷)

دیدی آخر کہ محبت چہ ادا با ما کرد　　کوچہ در کوچہ بہ پیرانہ سری رسوا کرد

شہر در شہر ز انداز قدت غوغا بود　　طرز رفتار تو ہنگامۂ نو برپا کرد

وای بر آں کہ ازو چشم ترحم دارد　　کشتہ شد خلقے و آں شوخ کجا پروا کرد

شیخ را باطن دل خستہ جوانان زدہ است　　کہ بدیں گونہ بہ پیرانہ سری سودا کرد

دارد انداز خرامش روش آب حیات　　مردہ ریگے اگر آمد تہ پا احیا کرد

اُنس با کس نہ بُوَد در وطن مالوفم　　شہر را وحشت دیوانگیم صحرا کرد

مست اکثر بہ سر کوے تو می آید میر

ایں خرابات نشیں رفتگی پیدا کرد

(۲۱۸)

چہ باید کرد حیران ایم اکنوں کار مشکل شد　　بلائے چوں دل بے تاب ناگاہے مقابل شد

نمایاں گشت شوق از پردہ چشمے در نمود آمد　　بہ خود پیچید درد جاں گدازے ہیئت دل شد

ز رو افگندہ برقع در چمن چوں جلوہ گر گشتی　　گل از خود رفت سنبل گشت والہ سرو مائل شد

محبت از محباں دست ہرگز بر نمی دارد　　اگر شد جسم مجنوں خاک گرد راہ محمل شد

تو زخمے زن خلاف رسم عشق از ما نمی آید　　کُہ ایں کُشتۂ تیغ ستم بدخواہ قاتل شد

نہ ماند آیا ز قطرہ گریہ خوں در پیکر زارم　　کہ داغ سینہ ام بے نور تر از چشم بسمل شد

قریب صبح خوابم بُرد و کوچیدند ہمراہاں　　بہ سر ہم چوں منش خاکے کہ از اوقات غافل شد

اخیر عمر در طبع سلیم آوارگی آمد　　چہ گویم آہ راہ من غلط نزدیک منزل شد

بجز پامالی کشت اُمید اے میر در آخر

بگو بارے کہ از ورزیدن عشقت چہ حاصل شد

(۲۱۹)

عزم رہ گر مہ من خواہد کرد　　عالمے ترک وطن خواہد کرد

ہر کہ عُریاں بدنش خواہد دید　　در زماں خلع بدن خواہد کرد

چشم گل شام و سحر بر راہ است　　یارے کے رو بہ چمن خواہد کرد

بے تو ایں گریۂ خونیں آخر    چشم را زخمِ کہن خواہد کرد

می چکد خوں زلبِ بستۂ میرؔ
از غمش تا چہ سخن خواہد کرد

(۲۲۰)

بہ گلشن بسے آں کہ گردیدہ باشد    گلِ نازکے چوں تو کم دیدہ باشد

بدیں رنگ اگر از درِ باغ آئی    ندامت کشد ہر کہ گل چیدہ باشد

بیامد بہ چشمِ من امروز سنبل    زگیسوے او شانہ دزدیدہ باشد

چہ ناعاقبت بیں کسے بود ظالم    نخست آں کہ عشقِ تو ورزیدہ باشد

بہ خود نیست امروز از صبح نرگس    مگر چشمِ مخمورِ او دیدہ باشد

یقین است آں کم سخن حالِ زارم    پس از مرگِ من ہم نہ پرسیدہ باشد

خرامت بہ طرزے کلامت بہ طورے
ترا کم کسے میرؔ فہمیدہ باشد

(۲۲۱)

تا کجا آہ بدیں گونہ بسر باید برد    از سرِ کوے توام رختِ سفر باید برد

یار دیرے ست کہ وارفتۂ جاں دادنِ ماست    گر بمیریم بہ او زود خبر باید برد

واے بر من کہ بہ ایں جانِ سراپا خواہش    از گلستانِ توام داغِ جگر باید برد

نعشِ من دیر از آں کوچہ گذر خواہد کرد    بعدِ جاں دادنم از راہِ دگر باید برد

خستۂ چشمِ تو بہتر ز اطبا نہ شود
میرؔ را بر درِ اربابِ نظر باید برد

(۲۲۲)

وارفتگاں زکوے تو ہر گاہ می روند    جاں می دہند ہر قدم و راہ می روند

ناچار ہر سحر ز درت بے کسانِ عشق    در دیدہ ہا سرشک و بہ لب آہ می روند

ما خود فقط بہ زلف و زنخ مبتلا نہ ایم    خوباں بہ ریسمانِ تو در چاہ می روند

با روے خوے فشاں چو بہ مہتاب می رسی    انجم بہ چشمِ روشنیِ ماہ می روند

مستانہ پا منہ کہ جہاں شیشہ خانہ است ۔۔۔ رہ رو چناں کہ مردم آگاہ می روند
افتادگانِ عشق بہ تحریکِ اشتیاق ۔۔۔ با کوہِ درد و غم چو پر کاہ می روند
اے میرؔ غفلت از سفر مرگ خوب نیست
یاران و دوستاں ہمہ ناگاہ می روند

(۲۲۳)

دل نہ دانستم کہ سوے آں دہن خواہد کشید ۔۔۔ وز سکوتِ من بہ جای ایں سخن خواہد کشید
گر ز طرفے دست و تیغِ یار خواہد شد بلند ۔۔۔ عالمے سر در گریبانِ کفن خواہد کشید
گر فروغِ چہرہ اش این است امشب شمع را ۔۔۔ اشتیاقِ او بروں از انجمن خواہد کشید
در گلستانم مبر باخود کہ جاں خواہم سپرد ۔۔۔ بلبلے گر نالہ از طرفِ چمن خواہد کشید
دل بہ غربت چند یا رب ہر سحر چوں آفتاب ۔۔۔ جامِ خوں بر یادِ یارانِ وطن خواہد کشید
نقشِ چسپاں پوشِ من خواہد چساں نقاش بست ۔۔۔ گر نہ دامانش بہ زور از دستِ من خواہد کشید
مدتے در پردہ وحشت کردہ ای ایں بار میرؔ
جوشِ سودایت بروں از پیرہن خواہد کشید

(۲۲۴)

عشق می خواہد کہ دل را بر سرِ کار آورد ۔۔۔ نعرہ بر لب در سماعم سوے بازار آورد
آں سراپا ناز مغرور است ورنہ روزگار ۔۔۔ سال ہا باید کہ چوں من ناز بردار آورد
گر بہ ایں رنگیں خرامی بگذری از طرفِ باغ ۔۔۔ سرو را شوقِ تماشایت بہ رفتار آورد
در غمِ مجنوں اگر کاہید جسمِ من بجاست ۔۔۔ رفتنِ یارِ موافق رنج بسیار آورد
گر بہ یک برقع نگندن غش کند عاشق چہ لطف ۔۔۔ دل چناں باید کہ تاب جلوۂ یار آورد
تا کجا از ناکسی شرمندہ برگردم ز راہ ۔۔۔ وایں دلِ بے طاقتم سوے تو ہر بار آورد
اشتیاقِ چشمِ مستِ او ز خلوت ہر زماں ۔۔۔ گوشہ گیراں را بروں آشفتہ دستار آورد
ایں ہوا را ہیں کہ منت می گزارد صد چمن ۔۔۔ گر صبا برگِ گلے سویم ز گلزار آورد
آہ از اعجازِ رنگِ آں لبِ خاموش میرؔ
صورتِ دیوار اگر باشد بہ گفتار آورد

(۲۲۵)

پیش از ایں دردِ محبت بیش بود　　ہر کجا داغے ست ایں جا ریش بود
عاقبت دل شد نشانِ تیرِ او　　ایں سخن نشنو جہالت کیش بود
دوشش وصلِ او میسر شد ولے　　دل ز بےتابی بہ فکرِ خویش بود
وقتِ آخر زیرِ لب فرہاد گفت　　کایں محبت بدستم اندیش بود
عزتِ مجنوں ضرور افتادہ است　　عہدِ او از من دو روزے پیش بود

کار با دنیا و مافیہا نہ داشت
دیدہ ام من میرؔ را درویش بود

(۲۲۶)

ناگہاں کاکلِ صبحم زمقابل واشد　　جلوہ اے در نظر آمد کہ از او دل وا شد
چشمِ خوں بستۂ خود بے تو سحر بکشادم　　مژہ ام ہم چو پرِ طائرِ بسمل وا شد
للہ الحمد پیِ جرعۂ مے زاہد را　　بر درِ مے کدہ آں عقدِ انامل وا شد
بستنش باز نہ دانم کہ چساں صورت بست　　دیدہ اے کاو بہ رُخ ہم چو تو قاتل واشد
روزگارے ست کہ دل قفلِ درِ زنداں است　　می شدش گاہ در ایامِ اوائل واشد
آخر الامر دلِ خود بہ گدازے دادم　　گرہِ کارِ من غم زدہ مشکل واشد
تاچہ گویم کہ چہ از دستِ تہی بر من رفت　　اندر آں دم کہ بہ چشمم لبِ سائل واشد
در عزاداریِ یک خواہشِ مجنوں چوں بید　　بار ہا موے سرِ صاحبِ محمل واشد

حرفِ بے فائدۂ میرؔ ز را ہم می برد
خوب شد از سرم آں ہادیِ باطل واشد

(۲۲۷)

چشمے بہ یک طرف کہ دلم ژنگ پارہ کرد　　روے ترا شگافِ درے گر نظارہ کرد
پایانِ کار خواہشِ قصاب بچہ اے　　در مسلخم ببرد و سزاے قنارہ کرد
ہر چند بود قطرۂ آبے سرشکِ گرم　　چوں بازگشت از مژہ کارِ شرارہ کرد
اے مہ زجنبشِ دُرِ گوشِ تو فتنہ خاست　　در روزگارِ ماچہ قِراں ایں ستارہ کرد

جز بندہ دست در کمرِ او کسے نہ زد — این کار دست بستہ ہمیں ہیچ کارہ کرد

گفتم کہ پیر گشتہ ام اکنوں کجا روم — قدِ خمیدہ جانبِ خاکم اشارہ کرد

از دربہی حالِ فرستادہ ظاہر است — کآں شوخ چشم خط مرا پارہ پارہ کرد

کارے نہ کرد درد دلِ زارم تو ہیچ گاہ — گو نالہ رخنہ در جگرِ سنگِ خارہ کرد

شورے ست در زمانہ زجوشِ سرشکِ من — دریا چہ خوب کرد کہ چندے کنارہ کرد

از ذکرِ تلخ کامی اش اکنوں چہ فائدہ
با زہرِ مرگ دردِ ترا میرؔ چارہ کرد

(۲۲۸)

چوں تیغِ ناز آں ستم اندیش برکشید — در جیبِ خاک فتنہ سرِ خویش درکشید

اشکم مشابہ است بہ یاقوتِ سوختہ — شاید کہ کارِ سوختگی تا جگر کشید

بربختِ سبز خویشتنش ناز می رسد — آں کس کہ سروِ قامتِ او را بہ برکشید

پیدا ست جاے آدمِ خاکی بہ بزمِ قدس — این مشتِ خاک تا چہ مقام آہ سرکشید

شعرم بہ طرز بود عجب نیست میرؔ اگر
از خاک برگرفتہ سپہرم بہ زر کشید

(۲۲۹)

کماں بہ دست چو گیرد جفاے تازہ کند — دچارِ ہر کہ شود یکہ و جنازہ کند

بہ راہِ تست شب و روز چشمِ گل در باغ
کہ خاکِ پاے تو آرد بہ دست غازہ کند

(۲۳۰)

دلبراں جز جفا نمی دانید — راہ و رسمِ وفا نمی دانید

آہ او سادہ نیست پرکار است — میرؔ صاحب شما نمی دانید

(۲۳۱)

حدیثِ درد بہ زاہد مگو نمی داند — ترا ز اشکِ ریائی بہ آب می راند

جہاں کتابِ مصور سپہر صورت خواں — زمانہ اے ست دگر چوں ورق بگرداند

(۲۳۲)

بر ورق نقاش مشکل صورتِ دلبر کشید　　　در خیالِ آں جبیں بسیار دردِ سر کشید

(۲۳۳)

گرچہ نقشِ گیسوے آں ماہ رانائی کشید　　　نقشش اما خوب ننشست و پریشانی کشید[1]

(۲۳۴)

کے نقشِ ساقِ یار بہ خوبی تواں کشید　　　نقاش خوب کرد کہ پا از میاں کشید

(۲۳۵)

تصویرِ آں دو نرگسِ بیمار می کشند　　　صورت گراں چنیں عبث آزار می کشند

(۲۳۶)

گر بے نقاب چہرۂ آں رشک مہ شود　　　. . . . . . . . . . . . [2]

(۲۳۷)

نالہ ہاے بلبل از شوقِ فراوانِ تو بود　　　گل کہ از ہم ریخت آں ہم دل پریشانِ تو بود

تا نگاہِ واپسیں ہم دردمندانِ ترا

کاوشے در سینہ از برگشتہ مژگانِ تو بود

(۲۳۸)

تا متصل ز دیدۂ من خوں نمی رود　　　از دل بخارِ جورِ تو بیروں نمی رود

ناصح دماغِ خود بہ عبث صرف می کند

مہر از دلم بہ حیلہ و افسوں نمی رود

(۲۳۹)

دل از بے طاقتی در سینہ خوں شد　　　دماغے داشتم صرفِ جنوں شد

بہ پاکاں کار کے گیرد فلک تنگ

کہ عیسیٰ از سرِ سوزن بروں شد

---

[1] نقلِ رام پور: "نقش بنشت خوب اما خود پریشانی کشید"

[2] مصرعِ ثانی حاشیے میں کٹ گیا ہے۔ نقلِ رام پور میں نہیں ہے۔

(۲۴۰)

نے شور بہ سر ماندہ ونے زور بہ پا ماند    از عمر ہمیں حسرت بسیار بجا ماند
زاہد کہ بہ تقوائے تمامے زجہاں رفت    در رہن مے اش خرقہ وتسبیح وردا ماند

بُر غافلی از وقت عزیز آہ وگرنہ
ہر گام دریں بادیہ یوسف زتو وا ماند

(۲۴۱)

شد آں عہدے کہ می گفتم زچشم آب می ریزد    کنوں زیں رخنہ چشمہ چشمہ خونِ ناب می ریزد

شبم را روز کُن ساقی بہ یک افشاندنِ دستے
زچاکِ آستینت پرتوِ مہتاب می ریزد

(۲۴۲)

کدام دل شدہ شب درخروش می آید    کہ شورِ سینہ خراشی بہ گوش می آید

زمیر نیست عجب پائمالِ غم گشتن
تو ہر چہ گوئی از آں سرفروش می آید

(۲۴۳)

بس کہ در ہر کوچہ از جورِ کسے بیداد شد    عاقبت شہرِ جہان آباد جور آباد شد
من نیم تنہا پریشاں حال مثلِ گرد باد    در ہوائے گیسوے او عالمے برباد شد

آخراے کافر زطورِ چشم مستی شیوہ ات
کعبہ ویراں گشتہ وبُت خانہ اے آباد شد[1]

(۲۴۴)

طرزِ دیدن ہوش از سر طاقت از پا می برد    جنبشِ مژگانِ شوخش دُزد زدل ہا می برد

گر بہ قربانِ سراپایش رود دشمن بجاست
دوستاں ہر جائے خوب او دل از جا می برد

---

[1] مصرع ثانی منقول از نقلِ رام پور۔ مخطوطۂ ادیب میں کٹ گیا ہے۔

(۲۴۵)

غمش تا درِ این دلِ تنگ زد  سرشکم بہ مژگاں دم از رنگ زد
تنک آب بودہ ست معذور دار
اگر کوہکن سنگ بر سنگ زد

(۲۴۶)

خاکِ زیرِ قدمت خلق تمنا دارد  خوں اگر بر سرِ ایں خاک شود جا دارد

(۲۴۷)

از وِردِ سحرگاہ نہ شد خاطرِ من شاد  صد عقدہ چو تسبیح بہ کارِ دلم افتاد

(۲۴۸)

او چہ داند کہ زما نالہ عجب می داند  نوحہ و زاریِ ما را دلِ شب می داند

(۲۴۹)

لالہ از خاک و گل از شاخ بروں می آید  مژدہ اے عقل کہ ہنگامِ جنوں می آید
ہر دم از دیدۂ تر لجۂ خوں می آید
از تہِ پردۂ دل تا چہ بروں می آید

(۲۵۰)

اِمشب کہ در کنارِ من آں کامِ جاں نہ بود  حالے گذشتہ است کہ جاں درمیاں نہ بود

(۲۵۱)

دی پرتوِ رخسارِ تو در جلوہ گری بود  آئینۂ خورشید چراغِ سحری بود

(۲۵۲)

کے بدیں گونہ کسے طرزِ جفا می داند  کافرے چوں تو نہ دیدیم خدا می داند

(۲۵۳)

با من آں رشکِ ماہ صاف نہ شد  جرمِ ناکردہ ام معاف نہ شد

(۲۵۴)

شب نالۂ من گوش زدِ مرغِ چمن شد  ہنگامہ زبے خوابیِ او بر سرِ من شد

(۲۵۵)

نے محوِ روے او شد نے از لبش تر آمد　　　بے چشم و روگلِ تر از آب بد بر آمد

(۲۵۶)

بر سرِ من از جنوں ہنگامہ اے برپا نمود　　　آسمانِ بے تمیز آخر مرا رسوا نمود

(۲۵۷)

گرچہ در نقشِ خطش اعجازِ عیسیٰ می کنند　　　لیکن ایں صورت گراں صورت نویسی می کنند

(۲۵۸)

از کعبہ میر راہ بروں کس چرا برد　　　لیکن تو قصدِ بت کدہ داری خدا برد

(۲۵۹)

بہ من چو غیر بہ راہِ تو پاے بردارد　　　مرا خدا بردا و را خداے بردارد

(۲۶۰)

تماشا کردہ ہر کس جرأتِ من سخت حیراں شد　　　بہ حدے زخم ہا خوردم کہ آں شمشیر خنداں شد

نصیبِ کس نہ گردد در جہاں یارب دلِ تنگے　　　ز آبادی بہ صحرا رفتم آں ہم رشکِ زنداں شد

قدِ من تا دوتا شد از نسیمِ رنگ می بازد

بہ پیری پرتوِ عمرم چراغِ زیرِ داماں شد

(۲۶۱)

از تعلق در جہاں پایم بہ گل اے میر بود　　　خاکِ ایں صحراے دل کش سخت دامن گیر بود

بر مدارِ ایں مشتِ خاکستر بہ دستِ کم صبا　　　صحبتم با آتشیں رویاں بسے درگیر بود

کس نیامد بر سرِ نعشم کہ زیرِ لب نہ گفت

کایں جوانِ جملہ خواہش محض بے تقصیر بود

(۲۶۲)

چشم و دل چوں بہ ثباتِ کمِ دنیا افتاد　　　ایں عمارت ہمہ از طاقِ دلِ ما افتاد

گفتم آں آتشِ سوزانِ سرِ طور چہ شد

دل اشارت بہ جگر کرد کہ ایں جا افتاد

(۲۶۳)

از نوشِ کبر صاف دلاں پاک بودہ اند — مردانِ ایں طریق ہمہ خاک بودہ اند
ایں غنچہ ہائے گل کہ کلہ کج نہادہ اند — خوبانِ ناز پیشہ و بے باک بودہ اند

ایں چشمہ ہا کہ از دلِ خاک اند جوش زن
چشمانِ عاشقانِ الم ناک بودہ اند

(۲۶۴)

بہ گوشِ اہلِ دل آوازۂ ہوس نہ رسد — بہ وادیٔ کہ منم نالۂ جرس نہ رسد

ز بے وفائیِ گاذر پسر سخن چہ کنم
زمانہ ایست کہ صابونِ کس بہ کس نہ رسد

(۲۶۵)

در باغ چوں بہ ناز قد آں نازنیں کشید — شمشادِ ناز پیشہ الف بر زمیں کشید

بے روئے او گریستنِ میر کم نہ شد
بر چشمِ تر اگرچہ بسے آستیں کشید

(۲۶۶)

قطرۂ آب کہ دوشش از سرِ مژگاں اُفتاد — آتشے بود کہ در گوشۂ داماں اُفتاد

وجعِ اسناں پئے خوں خوردنِ ما می میرد
غالباً چاشنی اش در بُنِ دنداں اُفتاد

(۲۶۷)

سرم زیں پیش خاکِ پائے او بود — ہمیں ویرانۂ دل جائے او بود

بہ صد خوبی گل آمد پیشش لیکن
مرا بے تو کجا پروائے او بود

(۲۶۸)

شد داغِ دل سیاہ ببینم چہ می شود — تا موسمِ گل آہ ببینم چہ می شود

صعب است راہِ دورِ جدائی اگرچہ لیک
پا می نہم بہ راہ ببینم چہ می شود

(۲۶۹)

شورِ عشقِ این چمن آناں کہ در سر داشتند      ہر سحر مانندِ شبنم دیدۂ تر داشتند

از چمن بگذر کہ گل با جملہ تن گردیدہ چشم

برامیدِ دیدنت از خاک سر برداشتند

(۲۷۰)

گل برگِ رخسارت چوں مہ نظرے دارد      سنبل بہ سرِ زلفت چوں مشک سرے دارد

(۲۷۱)

اگر بہ ترکِ ہوس دل نہاد جا دارد      ستم رسیدۂ عشقِ تو دل کجا دارد

ہزار بار بہ بزمِ تو آمدم رفتم

کسے نہ گفت کہ مسکیں چہ مدعا دارد

(۲۷۲)

حذر از دردمندے کن کہ محزوں نالۂ دارد      بہ دنبالِ شکایت از جگر پرکالہ اے دارد

مکن ایں ہا کہ ناکام از سرِ کویت رواں گردم

نگاہِ یاسِ نومیداں بلا دنبالہ اے دارد

(۲۷۳)

عشق دل را بیشتر رو می دہد      بد بلا را آہ پہلو می دہد

آں چہ از انداز معلوم است میرؔ

سنبلِ تر خط بہ آں مو می دہد

(۲۷۴)

دل ملاقاتِ بتِ سیم برے می خواہد      خبرش نیست کہ ایں کار زرے می خواہد

نگذری تا ز سرِ خویش قدم مگذاری

رفتنِ راہ محبت جگرے می خواہد

(۲۷۵)

در روزِ جزائیم چو به این طور درآئند　　　اعمال نه دانم چه قیامت به سر آرند

آں رفت که از بہر تماشاے تو خوش بود

ایں رخنه که داریم به دل کاش برآئند

(۲۷۶)

ہر کس که به عشقِ تو سرے داشته باشد　　　داغ جگرے چشمِ ترے داشته باشد

برخیز و به دامانِ نسیمِ سحر آویز

شاید که از آں گل خبرے داشته باشد

(۲۷۷)

شب ابرے که بر عالمِ خاک بود　　　نظر کردهٔ چشمِ نم ناک بود

(۲۷۸)

سیلِ دگر به سنگ . . . . [1]　　　جائے که کوہکن سرِ خود را به سنگ زد

(۲۷۹)

بوالہوس را تابِ ایں جور و ستمگاری نه بود　　　آں چناں رفت از سرِ کویش که پنداری نه بود

درجہاں محشر بپا کردیم و لب بستیم میرؔ

بیش ازیں مارا دماغِ ناله و زاری نه بود

(۲۸۰)

کے به دام آیند ہر دم در کمینِ فرصت اند　　　چوں غزال ایں شوخ چشماں بستهٔ بندِ وحشت اند

داغ ہا دارم ز بزم آرائیِ خوباں به دل　　　باکس و ناکس بسانِ شمع گرمِ صحبت اند

از براے دلبراں صاحب دلاں جاں می دہند　　　حسنِ معنی آشنایاں رفتگانِ صورت اند

تیغ بر کف می رسی و بر نمی دارند سر　　　ناتوانانِ محبت زیرِ بارِ منت اند

در تنِ اکنوں نیست غیر از استخوانے چند پوست

میرؔ صاحب را که می بینم تمامی عبرت اند

---

[1] نقل رام پور ''سیلِ دگر به سنگ درنخانه رسید'' مخطوطهٔ ادیب میں کٹ گیا ہے

## ردیف ر

### (۲۸۱)

کہ گفتہ بود بہ سویم گہے قدم مگذار　　امید ہاست مرا نا امید ہم مگذار

زتیغِ نازِ تو سہل است خونِ مشتاقاں　　تو ترکِ جور مکن شیوۂ ستم مگذار

بیا بیا و زخاکِ مذلتم برگیر　　بسانِ نقشِ قدم چشم بر رہم مگذار

بہ از سخن بہ جہاں یاد بودِ آدم نیست　　زدستِ خویش دمے کاغذ و قلم مگذار

زگریۂ میر ببیں کار را بہ بالا شد
تو نیز گوشۂ دامانِ چشم نم مگذار

### (۲۸۲)

رحمے بکن تا کے ستم آخر جفاکار ایں قدر　　یک سینہ و زخم ایں ہمہ یک جان و آزار ایں قدر

با ایں متاعِ دلبری ظالم مناسب نیستت　　گردیدنِ بے گاہ و گہ در کوے و بازار ایں قدر

اے گردِ سر گردم ترا از دل چو پا بیروں نہی　　در چشم ہم یک رہ بیا رہ نیست دشوار ایں قدر

از دیدنے بلفند بیدم و ز گفتنے بشکیبدم　　من سادہ و ابلہ چنیں او شوخ و پُرکار ایں قدر

میر ایں معیشت تا بہ کے پیدا کن اندک غیرتے
خواہش ترا ایں مرتبہ او از تو بیزار ایں قدر

### (۲۸۳)

داغِ دل شد سیاہ آخرِ کار　　سوختم بے تو آہ آخرِ کار

فکرِ زادے بکن کہ تا نہ شوی　　ہم چو من خرجِ راہ آخرِ کار

شد تلف مُفت جانِ نومیدم　　بر امیدِ نگاہ آخرِ کار

سنگِ آں آستانہ گم گردید　　از ہجومِ جباہ آخرِ کار

بردہ از راہ تنگ پوشِ مرا　　جامۂ راہ راہ آخرِ کار

تیرہ شد روزگار در چشمم　　بے تو اے رشکِ ماہ آخرِ کار

برد آوازۂ خرابا تم　　رونقِ خانقاہ آخرِ کار

میر در بزمِ ما شراب کشاں
شیخ شد دستگاہ آخرِ کار

(۲۸۴)

بے تو دل دردناک شد آخر — وز تپش سینہ چاک شد آخر
در غم آں جوانِ خوش پرکار — کشتیِ بندہ پاک شد آخر
عشق یارب چہ داشت با فرہاد — آں بلاکش ہلاک شد آخر
جستجو بیش ازیں نمی باشد
در رہش میر خاک شد آخر

(۲۸۵)

نہ شد شورِ مزاجِ امسال از تدبیر ہم آخر — گسست از وحشتِ بسیارِ من زنجیر ہم آخر
نمی بایست ایں ساں پنجہ در خونم فرو بردن — ز آدم می شود اے بے وفا تقصیر ہم آخر
بہ ایں وحشی غزالاں بے محابا عشق می بازد
بیاباں مرگ خواہد شد چو مجنوں میر ہم آخر

(۲۸۶)

بلبلے در باغ می نالید زار — ناگہاں افتاد آں سویم گزار
رفتم و پرسیدمش احوال چیست — از دلت آخر چہ شد صبر و قرار
وجہِ نالیدن نہ شد معلوم ہیچ — نالہ عاشق می کند در ہجرِ یار
ایں زماں گل گل چمن شگفتہ است — سبز دارد جلوۂ فصلِ بہار
شعر ہائے میر اگر داری بہ یاد — خوش بخواں و یک دو دم از خوش برآر
گفت بر گل نیست ہرگز اعتماد — یاد دارم صحبتِ دلگیرِ یار
داشتدے می داشت با من صبح و شام — لحظہ لحظہ می کشیدم در کنار
از نظر یک دم نہ رفتے روئے او — دیدنی بودہ ست رنگِ اعتبار
سر بہ زیرِ بال بردم یک شبے — صبح با پائیز گردیدم دوچار
بادِ دل کش گشتہ ریحِ عاصفے — زد بہ جرأت مہرگاں دستے بہ کار
شاخِ عریاں بودہ ہر نو بادہ لے — در تنہ خواری درختِ سایہ دار
غنچہ از جائے کہ چشمک می زدے — سر بروں آورد از آں جا نوکِ خار

از روشِ شس ہا باد گرد انگیختہ　　شد چمن صحرائے پُر گرد و غبار
والئے کاو دیدہ باشد ایں چنیں　　ہست در بے طاقتی بے اختیار
من نہ دارم رنگ از گلزارِ حسن　　داغ ہا بر سینہ دارم بے شمار
ایں بگفت و نالہ از دل بر کشید　　داد با آں نالہ جانِ مستعار
او زہم بگذشت و من رفتم زخویش
از ہلاکِ او گرفتم اعتبار

(۲۸۷)

مشو غافل اوقات را در نظر دار　　کہ وقت است چوں سیفِ قاطع خبردار
نہ رفتے زجا گر ہمہ خوں شدہ تے　　دلے داشتم در غمِ او جگر دار
بہ ہر صبح تا کے دعا ہا نمائیم　　از ایں ہا بباید شدن دست بردار
جگر داغ و دل خوں و ماغم پریشاں　　تلف مفت گشتند ایں ہر سہ سردار
چساں میر بلبل زگل کام گیرد
کہ کام است مشکل زمعشوقِ زر دار

(۲۸۸)

سال ہا بگریست بے تو دیدۂ من زار زار　　در گریبانم رگِ ابر است اکنوں تار تار
کار ضائع کرد و در عالم مرا رسوا نمود　　سعئے او از شوقِ مفرط رفتنِ من بار بار
بے دماغ از دعویِ خوبیِ سرو و گل مشو　　می زنند از بے تہی ایں یک دو ناکس چار چار
عاشق ام خواہم بجائے قولِ ایماں ہم زشوق　　از زبانِ من دمِ آخر بباید یار یار
میر را تنہا نہ کشتہ ست اشتیاقِ آں مژہ
عالمے با خود بہ زیرِ خاک برد ایں خار خار

(۲۸۹)

تا توانی با بتانِ سادہ ملے دل کار دار　　سبحہ خوانی را دعا می گوے چوں زنار دار
دل بہ ایں کافر بتاں ہر گاہ دیے گہ کار دار　　سبحہ را باید زدست افگند چوں زنار دار[1]

[1] یہ مطلع ثانی حاشیے پر درج ہے

ثمرۂ ناسازیِ طبعِ خشن تنہائی است　　　روئی آرد کسے سوئے درختِ خار دار

جمع کن دل از حیاتِ دردمندانِ وفا　　　نے دوائے درمیان و نے کسے بیمار دار

از شکم دارانِ دنیا نیست حاصل جز گزند　　　مار می زایند اکثر ایں زنانِ بار دار

میرؔ از ہولِ قیامت ایں ہمہ اندیشہ چیست

رو توکل کن امیدِ مرحمت از یار دار

(۲۹۰)

یک رہ ز شوقِ میرؔ رہِ آں سوار گیر　　　تا چند نامِ او بُوَدت حرفِ بار گیر

سازِ زمانہ ہم نہ بُوَد جائے اعتماد　　　ہست ایں گزندہ زیرِ فلک طرفہ مار گیر

دیرے ست شیوۂ تو دلا بے قراری است

اکنوں بہ ضبط کوش و زمانے قرار گیر

(۲۹۱)

بہ امیدیکہ می نالی خموشی اے جرس بہتر　　　نہ دارد اہلِ دل ایں کارواں ضبطِ نفس بہتر

بہ گامِ اولیں سر می رود در راہِ عشقِ او

اگر باور نمی داری بیا اے بوالہوس بہتر

(۲۹۲)

اے کہ با تو نہ شود صحبتِ عاشق درگیر　　　لطف کن یک رہ ہم از خاکِ مذلت برگیر

تا کسے تہمتِ آرام نہ بندد بہ دلت

سرگذشتِ تو بہ آخر چو رسد از سر گیر

(۲۹۳)

مرو بہ راہِ خرابات گر نہ ای پُرکار　　　کہ گفتہ اند حریفاں قمار و راہِ قمار

(۲۹۴)

گر از تہِ دل نمی شوی یار　　　بارے بہ زبان نگاہ می دار

(۲۹۵)

نقاشِ تو خوں کشید آخر　　　کارش بہ جنوں کشید آخر

## ردیف ز

(۲۹۶)

جاں می رود ز فرطِ تپش ہر شبم ہنوز　　خوں می چکد بہ گاہِ سخن از لبم ہنوز
از خاکِ من گذشت نسیم و سموم شد　　گردیده ام غبار و ہماں در تبم ہنوز
مقصودِ من توای ہمہ زیں آگہ اند لیک　　ظاہر نمی کند بہ تو کس مطلبم ہنوز
تکرارِ حرفِ عشق زیک عمر می کنم　　پیری رسیده بر سر و در مکتبم ہنوز

جاں رفت و میرؔ سوختگی ہم چناں کہ بود
پُر آتش است قبرِ من از قالبم ہنوز

(۲۹۷)

بے خود شدۂ چشمش ہشیار نہ شد ہرگز　　تا روزِ قیامت خفت بیدار نہ شُد ہرگز
از یاسِ وصالِ او جانے دالم دارم　　ہر چند از او گشتم او یار نہ شد ہرگز
وابستۂ آسائش یک لحظہ نہ گردیدم　　از بندہ بہ عشقِ او ایں کار نہ شد ہرگز
در شہرِ وفا ہر یک بیماریِ دل دارد　　از اہلِ ہوس کس را آزار نہ شد ہرگز

از تصفیۂ باطن میرؔ آئنہ گردیدم
امّا بہ مرادِ دل دیدار نہ شد ہرگز

(۲۹۸)

در خانہ نشیں شرم کن اے خانہ بر انداز　　تا چند بہ بازار روی مست بسر انداز
در دیر و حرم شد سببِ فتنہ و آشوب　　چشمِ سیہ تست بلا شوخ و در انداز
ہر دیدنِ او موجبِ صد گونہ بلاے است　　تا چشمِ سیاہِ تو چہ دارد نظر انداز
بے مصلحتِ وقت مزن دست بہ کارے　　چوں تیغِ جفا یار بر آرد سپر انداز

خواہم ہدفِ ناوکِ او میرؔ جگر کرد
امروز نشاں یافتہ ام زاں قدر انداز

(۲۹۹)

کشتند از غمش ہمہ اجزاے ما گداز　　چوں شمع گشتہ ایم ز سر تا بہ پا گداز

دستے مزن بہ من کہ زسوزِ دروں شدہ ست　　چوں آبِ خستہ میوہ تنم جا بہ جا گداز

شعرے نہ خواندہ ام کہ بجائے نہ کردہ میرؔ
بسیار در غمِ تو شدہ ست آں گدا گداز

(۳۰۰)

او چہ داند کہ گل داغ نہ چیدہ ست ہنوز　　غنچہ ایست وہوایش نہ رسیدہ ست ہنوز
او چہ داند کہ چہ در دوری او می باشد　　چند گامے بہ رہ غم نہ دویدہ ست ہنوز
بر سر رہگذر از حالِ من او را چہ خبر　　انتظارے چو خودے را نہ کشیدہ ست ہنوز
گوشش بر قصۂ عشاق نیند اختہ است　　شورِ ہنگامۂ دل ہم نہ شنیدہ ست ہنوز
کے بہ ایں چشم جگر بار منش چشم افتد　　اشک ہم از مژۂ او نہ چکیدہ ست ہنوز
قدرِ ما سینہ فگاراں چہ کند کاں بے رحم　　چوں گل از شوق گریباں نہ دریدہ ست ہنوز

داغم اے میرؔ من از بکر نگاہے کہ ز شرم
صورتِ آئنہ یک چشم نہ دیدہ ست ہنوز

(۳۰۱)

آماجِ تست تربتِ اہلِ وفا ہنوز　　تیرِ تو گرد می کند از خاکِ ما ہنوز
من درمیانہ نیستم و درمیانِ باغ　　دارد بہ لب فسانۂ شوقم صبا ہنوز
جانم بہ لب رسید و قریب است رفتنم　　خوباں بد ابد با منِ مسکیں شما ہنوز

فرسودہ شد زبانِ انابت بہ کامِ میرؔ
کارے نمی کند بہ دلِ او دعا ہنوز

(۳۰۲)

باقی ست بعدِ مرگ ہم آثارِ ما ہنوز　　دارد نشانِ خوں در و دیوارِ ما ہنوز

از حالِ ماست غافل اگر جائے شکوہ نیست
باکس وفا نہ کردہ جفا کارِ ما ہنوز

(۳۰۳)

او چہ داند کہ دلش عشق نہ ورزیدہ ہنوز　　رنگِ آں غیرتِ گلزار نہ گردیدہ ہنوز

## ردیف س

(۳۰۴)

نہ کردیم گشتِ چمن یک نفس — بہ حرماں بسر رفت اوقات و بس

بہار آمد و گل فشاں شد و لے — نیفتاد یک برگِ گل بر قفس

از ایں منزلِ رفتنی بار بند — بیا حرف دررہ بگو چوں جرس

ز شوقِ گلم سینہ پُر داغ شد — بدیں رنگ گل کرد آخر ہوس

چہ برخوبیِ خویشتن غرّہ ای — بہ دردِ دلِ غم کشاں ہم برس

چساں میر خواہی بسر کرد آہ
مزاجِ تو سازے نہ دارد بہ کس

(۳۰۵)

آزردہ دلے ہم چو منے را چہ کند کس — غربت زدۂ بے وطنے را چہ کند کس

برجاست گر از صحبتِ من خلق نفور است — ہنگامہ کنے نعرہ زنے را چہ کند کس

از بلبلِ شوریدہ گذشتم بہ تغافل — رسوا شدۂ ہر چمنے را چہ کند کس

سودائی لے چو من نہ بود قابلِ صحبت — ایں قسم پریشاں سخنے را چہ کند کس

شمعے نہ فروزند کہ حاضر نہ شود میر
پروانۂ ہر انجمنے را چہ کند کس

(۳۰۶)

در دہر چوں تو ظلم شعارے نہ دید کس — ناآشنا تر از تو نگارے نہ دید کس

روشن نہ شد کہ عشق در دونم چگونہ سوخت — افتاد آتشے و شرارے نہ دید کس

نَبْوَد دلے کہ در تہِ گردِ ملال نیست — زیں خاکداں بغیرِ غبارے نہ دید کس

خوں ہا نمودہ ای و نہ دانم چہ کردہ ای — کاندر رہت نشانِ مزارے نہ دید کس

جانے نہ داد میر بہ ایں بے کسی کسے
در مُردنِ تو گریۂ زارے نہ دید کس

(۳۰۷)

ما از آں بے مہر گل رخسار کیں دیدیم و بس　　　بر جبینِ ہم چو ماہش جملہ چیں دیدیم و بس

روز و شب با دیدۂ نم ناک کارے داشتیم
آں چہ ما دیدیم در عشقِ تو ایں دیدیم و بس

## ردیف ش

(۳۰۸)

دل کہ ہر لحظہ داشتم بہ برش　　　حالیا دیر می رسد خبرش
فکر بسیار کردم و لیکن　　　بستہ ہرگز نہ شد زمن کمرش
آہ در دل چہ داشت بلبلِ باغ　　　پُر بہ دل خورد نالۂ سحرش
از قدِ چوں سنانِ آں بے رحم　　　نیزہ بالاست خوں بہ رہگذرش
خوب شد دل ازایں میاں برخاست　　　بود از غم قیامتے بہ سرش
داغم از چشمِ شرمگینِ کسے　　　بر نہ دارد ز پشتِ پا نظرش

آں مقدس کسے ست میرؔ کہ خلق
بہ تبرک برند خاکِ درش

(۳۰۹)

دلا برخیز و آہے از جگر کش　　　بریز اشکے و دامانِ اثر کش
برابر کرد با خاکِ سیاہم　　　خرامِ نازِ ایں سبزان سرکش
تو مغروری بہ عقل و دانشِ خویش　　　نمی دانی کہ دشوار است درکش
ز دل آہے مکش اکثر کہ ہر جا　　　نُہُفتہ زند تیر روے ترکش
بہ فصلِ گل چہ در بندِ لباس ای　　　گرو کن جامہ را و جام درکش

بہ گلشن غنچۂ خُسپی تا کجا میرؔ
بغل بکشا و آں گل را بہ برکش

(۳۱۰)

ہر کہ شد دیوانۂ او کس نہ گردد ہمدمش — شیر ناخن می گذارد در بیابانِ غمش

ابر کے گردد حریفِ غرقۂ دریائے عشق — لخت لخت می چکد حسرت زمژگانِ نمش

قیس را گر تعزیت دارے نہ باشد گو مباش — بید مجنوں موے سر وا کردہ اندر ماتمش

ایں ہمہ بر خود شکستن را سبب پرسیدمے — گر ملاقاتم میسر می شدے با محرمش

با سرِ زلفت سروکارے ست شاید میر را

رحم می آید بسے اکنوں بہ حالِ درہمش

(۳۱۱)

نہ دارد آرزوے دیدنِ فردوس و گلزارش — زدہ ست آں کس کہ سر پیچ خوشے در پاے دیوارش

اگر در باغ می آید بہ خوبی می نمائیمست — کہ ہاں اے گل چہ کافر چہرہ اے افتادہ رخسارش

نشستم مدتے خاموش و تاثیرے نہ شد ظاہر — مگر از حالِ من نالیدنے سازد خبردارش

کنوں در گوشہ زاہد را نہ خواہی دید اے ہمدم — کہ چشمِ بے خودِ سبزینہ اے دل بردہ از کارش

چنیں معلوم می گردد کہ جائے میر عاشق شد

محبت می تراود متصل از طرزِ گفتارش

(۳۱۲)

آں کہ جاں می رود بہ قربانش — می کشد تیر زخمِ پیکانش

جانبِ من کسے نمی گیرد — ورنہ دستے زنم بہ دامانش

آرزومندِ خویش را دریاب — رمقے بیش نیست از جانش

تعزیت خانہ است باغِ جہاں — روضہ خوان است مرغِ خوش خوانش

کردہ اذیاں بہ یک نگہ برہم — چشمِ پر خشمِ نامسلمانش

آں سیہ کاسہ است چرخ کہ میر

غیرِ خونے نہ خورد مہمانش

(۳۱۳)

چہ گویم آہ من از خوے جور ایجادش — نشستہ ام بہ سرِ باز دستِ بیدادش

دلم بہ دستِ تو ماند بہ آں گرفتارے — کہ بال بستہ سپارد بہ طفلِ صیادش
شبے بہ سعیِ رقیباں از او جدا گشتم — کنوں چو خوابِ فراموش رفتم از یادش
چہ حرف می زنی از برگ برگ گشتنِ گل — ہوائے دیدنِ روئے تو دادہ بر بادش

کدام دشمنِ جاں میرؔ را بہ شور آورد
کہ می چکد ہمہ شب دوستی ز فریادش

(۳۱۴)

دوش از لعلِ یارِ جانیِ خویش — یافتم لطفِ زندگانیِ خویش
صحبتِ او بہ ناکساں و مرا — انفعالے ز نکتہ دانیِ خویش

یک دو روزے بہ ترکِ او پرداز
رحم کن میرؔ بر جوانیِ خویش

(۳۱۵)

می گشت بادِ صبح گہی گردِ خانہ اش — زد آتشم بہ دل روشِ محرمانہ اش
از ہم گذشت بلبلِ شوریدہ سر مگر — یک نالہ بر نمی زند از آشیانہ اش
سیمائے پاک تر ز جبینِ ملک بیار — مسجودِ ہر سرے نہ شود آستانہ اش
بودیم دوشش پیشِ ستم دیدۂ غمت — جز داغِ دل نہ بود چراغے بہ خانہ اش
بر سر رسیدہ بود مرا بعدِ مدتے — امّا نہ داد فرصتِ یک دم زمانہ اش
ایں چند بال و پر کہ عبارت ز بلبل است — سوراخ می کند بہ جگر ہر ترانہ اش

با میرؔ دوش صحبتِ شعر اتفاق شد
بے خود شدیم از غزلِ عاشقانہ اش

(۳۱۶)

چشم دارم ز دیدۂ ترِ خویش — کہ نماید بہ ابر گوہرِ خویش
بالشم سنگ و بسترم خاک است — تکیہ تا کردہ ام بہ دلبرِ خویش
نیستم در خود و بہ فکرِ خودم — وطن آوارہ ام بہ کشورِ خویش

تا چو آئینہ دیدہ ام وا شد　　چہرہ گشتم بہ خلق بر درِ خویش

خوب شد پائمالِ نازِ تو شد
میرؔ بسیار بود بر سرِ خویش

(۳۱۷)

بود اگر جبرئیل شد رامش　　خوردہ آبے زچشمۂ دامش

از ہجومِ نگاہ منتظراں　　شکوہ ہا ہست بر لبِ بامش

دل در آغازِ عاشقی خوں شد　　تا چہ خواہد شدن سرانجامش

بادہ خواریِ عشق بازی نیست　　بوے خوں آید از لبِ جامش

خود کشی ہا نمودہ ام کہ چنیں　　آشنا گشتہ لب بہ دشنامش

دل کہ سرمایۂ حیاتِ من است　　از تپش نیست یک دم آرامش

پیشِ من ہمنشیں کہ بے صبرم　　چہ ضرور است بُردنِ نامش

یادِ آں عہد می کنم کہ مرا　　دم بہ دم می رسید پیغامش

اے کہ صبحِ چمن بسے دیدی　　در خزاں یک نظر ببیں شامش

بہ جہنم چو میرؔ کافر شد
او چہ بود و چہ دین و اسلامش

(۳۱۸)

زخم بر زخم خورد نخچیرش　　داشت آب برندہ شمشیرش

تا کجا آہ استخواں شکنیم　　کہ بپائیم بر سرِ تیرش

دل کہ شد رہ گراے کوچۂ زلف　　نہ تواں داشتن بہ زنجیرش

بہ خرابی قرارِ دل دادم　　کہ نہ دارم دماغِ تعمیرش

کار آخر نہ کرد در دلِ او　　نالہ معلوم بود و تاثیرش

بلبلِ ایں چمن خموش بہ است　　می چکد خونِ دل ز تقریرش

میرؔ از دیر قصدِ کعبہ نمود
کرد آوارگی خدا گیرش

(۳۱۹)

چوں پردہ برافتند سحر از چہرۂ آلش — گویند عزیزان چمن گل بہ جمالش

یارب چہ ہوس بلبل شوریدہ بہ خود برد — کآوارہ ہنوز اند بہ گلشن پر و بالش

در خواب عدم ہم دلِ آسودہ نہ داریم — مردیم و ہماں است تمنائے وصالش

از جان و جہاں در غم او آہ گذشتیم — امّا نہ گذشتیم یکے ہم بہ خیالش

ما حال بتاہان ہمہ نومید بمردیم — ہر کس بہ اُمیدِ تو زیید وائے بہ حالش

گر حور کند جلوہ نگاہے نہ دہد آب — حیرت زدۂ چہرۂ آئینہ مثالش

بس کن کہ بسے کرد قلم سحر طرازی
دفتر شدہ اے میر ز وصفِ خط و خالش

(۳۲۰)

داغ ایم از ایں باغ و ہم از رنگ نہالش — بر بادِ فنا آہ نوشتند بر آنش

رشک است بر آں نیک سرانجام کہ ظالم — تا عہدِ جفائے تو وفا کرد حیاتش

کیفیتِ زہد و ورعِ میر میرسید
بدتر بُود از بادہ کشی صوم و صلوٰتش

(۳۲۱)

در ایں ایام دل تنگ است چندے بد نہ گو بیش — برخود میر را خوانید و خوباں دل بجوئیدش

نہ باشد چارہ اے جنس پارہ کردن دامنِ تر را — نہ گر دریاک ہرگز گر بہ آبِ خضر شوئیدش

بہ داغِ سینۂ من چشم را نتواں سیہ کردن
گُلِ ایں باغ دارد بوئے جاں سوئے بموئیدش

(۳۲۲)

مستِ غفلت چند باشی باخبر اے یار باش — عمر ہم چوں نشۂ مے می رود ہشیار باش

تا تامل می کاری ایں ورق برگشتہ است
وضعِ بے شیرازہ اے داری بہ فکرِ کار باش

(۳۲۳)

گر فشارم گوشۂ دامانِ خویش　　غرق گردد نوح با طوفانِ خویش

دست در دامانِ او خواہیم زد

آستیں افشاندہ ایم از جانِ خویش

## ردیف ص

(۳۲۴)

خصلتِ من شعارِ من اخلاص　　راہ و رسم دیارِ من اخلاص

از محبت سرشتہ اند گلم　　شیوہ مہر است و کارِ من اخلاص

دشمنِ جانی من است اے میرؔ

آں کہ دارد بہ یارِ من اخلاص

## ردیف ض

(۳۲۵)

دیدمش پُر بے وفا و خود غرض　　خود نما و خود ستا و خود غرض

خود سر و خود رائے و از بس خود پسند

خوب رو و بد بلا و خود غرض

## ردیف ط

(۳۲۶)

نیست شایانِ تو با ہر نوعِ مردم اختلاط　　دل ربایاں را نہ باید شد سرِ شیم اختلاط

(۳۲۷)

در دیارِ حسن خوبے نیست چساں اختلاط　　بر نمی خیزد از ایں جا جز پریشاں اختلاط

## ردیف ظ

(۳۲۸)

دلا بے رُخِ یارِ جانی چہ حظ　　بمیر از چنیں زندگانی چہ حظ

شوی یار اگر از تہ دل خوش است

وگرنہ ز لطفِ زبانی چہ حظ

## ردیف ع

(۳۲۹)

دیدن در انتظارِ تو شب داشت سوزِ شمع — آخر دمید صبح و سیہ گشت روزِ شمع

(۳۳۰)

بے روے تست آہ بہ صد سوز و سازِ شمع — باب ترحم است دلِ نو نیازِ شمع

در بزمِ شب ز دعویِ خوبی نہ شد خموش — داغم نمود بے تو زبانِ درازِ شمع

شد صرفِ اشک و داغ سراپا او بہ بزم

گشتم کباب میرؔ ز سوز و گدازِ شمع

## ردیف غ

(۳۳۱)

من و ز کوے تو عزمِ سفر دروغ دروغ — مرا دماغ کجا این قدر دروغ دروغ

تو و خیالِ وفا کذب و افترا و غلط

من و تو ہم مہر دگر دروغ دروغ

(۳۳۲)

در فضاے سینۂ من نیست اکنون جاے داغ — دارم از سوزِ محبت داغ بر بالاے داغ

## ردیف ف

(۳۳۳)

اے بے تو جوشِ سبزۂ باغ و بہار حیف — بلبل ترانہ بیند و گوید ہزار حیف

بر باد داد عشق کفِ خاکِ من تمام — گر سر بہ آسماں نہ کشد این غبار حیف

صیدِ خوشے ست میرؔ درایں دشت خوفناک

از غفلتِ تو رفت اگر آں شکار حیف

## ردیف ق

به نہ گرد د از دوا بیمارِ عشق (۳۳۴) — می رود ہمراہِ جاں آزارِ عشق

جانِ خود رامفت از کف می دہند — دل فروشانِ سرِ بازارِ عشق

موجبِ این نظم گل دانی کہ چیست — گر شوی آگاہ از اسرارِ عشق

جاں کبابِ گل شدہ ست از داغِ ایں — لیک سرگرم است دل در کارِ عشق
من بہ کم عمری اگر مُردم چہ دُور — داشتم در دل غمِ بسیارِ عشق
سبز دارد سینۂ پُر داغِ من — خوش شگفت ایں تختۂ گلزارِ عشق

تکیۂ ما میرؔ خوش واقع شدہ ست
برلبِ دریاے لنگر دارِ عشق

(۲۳۵)

می کشد آخر ببینم تا کجا ہا کارِ شوق — با در و دیوار اکنوں می کنم اظہارِ شوق
خواستم بنویسم او را یک دو حرف از حالِ زار — چوں قلم آمد بہ دستم رُقعہ شد طومارِ شوق
کار ضائع شد ز اشک افشانیِ ہر لحظہ ام — کرد رسواے جہانم گریۂ بسیارِ شوق
سال ہا بر مرگِ قیس و کوہکن رفت و ہنوز — در جہاں باقی ست زاں لب تشنگاں گفتارِ شوق

رخنۂ دیوارِ گلشن دیدۂ نظارگی ست
ظاہر است اے میرؔ از اندازِ او آثارِ شوق

## ردیف ک

(۲۳۶)

آں ابروے خمیدہ کہ باشد کمانِ پاک — ہر دم رسد خدنگِ جفایش بہ جانِ پاک
جائے بہ از درش نہ بُود بہرِ سجدہ ام — شرط است از براے عبادت مکانِ پاک
گل در چمن دہن بہ ہزار آب شُستہ است — تا آورد بہ لب سُخنے زاں دہانِ پاک
از چشمِ انتظار کشاں چہرہ را مپوش — تاثیر ہاست در نظرِ عاشقانِ پاک

مژگانِ خود ز خاکِ درش میرؔ دور دار
ایں خار و خس بروب از آں آستانِ پاک

(۲۳۷)

چوں می نہم ز عجز بسجدہ گاہ سر بہ خاک — می ریزدم ز چشم ہزاراں گہر بہ خاک
اکثر ز خاک چشمۂ نو جوش می زند — یارب کہ بردہ است بہ خود چشمِ تر بہ خاک
یک شام گہ ز نا ز قدم بر سرم گزار — تا کے رُخِ نیاز نہم ہر سحر بہ خاک

در دورِ چرخِ سفلہ چہ مذکورِ راحت است  آسودہ بعد مرگ شود کس مگر بہ خاک

تا میرؔ چشم کار کند خاکِ آدم است
باید فگندنت بہ تأمل نظر بہ خاک

(۳۳۸)

می برد آب ابرِ ایں صحرا ز چشمِ گریہ ناک  لنگر از کف می دہد دریا ز چشمِ گریہ ناک

ایں بحارِ ارض پیش از من کنارِ خشک داشت  رفتہ کارِ ابرِ تر بالا ز چشمِ گریہ ناک

بشکند ایں کاسۂ دریوزۂ دیدار میرؔ
در ہمہ عالم شدم رسوا ز چشمِ گریہ ناک

(۳۳۹)

تنہا نیم ز شوقِ منِ ناتواں ہلاک  خلقے ست از برائے تو لئے کامِ جاں ہلاک

زنہار روزگار موافق نہ شد بہ میرؔ
شد آخر از جفائے فلک آں جواں ہلاک

## ردیف ل

(۳۴۰)

عہد کردم یا بگیرم در برت با کامِ دل  یا ہماں گیرم کہ در طالع نہ بود آرامِ دل

چشم و دل خصم اند خواہم شد بہ شہرے کاندر او  کس نہ بیند روئے چشم و کس نہ گیرد کامِ دل

طوفِ دل را بر طوافِ کعبہ نتواں حمل کرد  می دہد دستم بہ صد خونِ جگر احرامِ دل

آں کہ سرگرمِ محبت با ہمہ کس ہست و نیست  پختگی ہا یش نباید در خیالِ خامِ دل

اضطرابِ مفرطِ من نیست بے تحریکِ شوق  می رسد در گوشِ جانم ہر نفس پیغامِ دل

ہر کرا باشد تہِ بسیار خوش باشد کہ ہست  بادہ از خونِ کبوتر سرخ تر در جامِ دل

گر تپیدن ہا بہ ایں رنگ است در آغازِ عشق
من نمی دانم چہ خواہد گشت میرؔ انجامِ دل

(۳۴۱)

روے سخن بہ وصفِ بخت نیست سوے گل　　آں تازگی کجاست ببینید روے گل

امروز عندلیب زباں را بہ کام دار　　نازک تراست خوے نگارم زخوے گل

بیزار می رسی ز گلستاں مگر کہ میرؔ

بسیار بر دماغ تو خوردہ ست بوے گل

(۳۴۲)

ہر لحظہ آں قیامتِ جان و بلاے دل　　صد ہا کرشمہ عرض دہد از براے دل

خوں گشت و داغ گشت و تمامی گداز گشت　　لیکن ترددے ست ترا در وفاے دل

ہر چند در عذاب الیم ام ز دل و لے　　گر آیدم بہ دست بیفتم بہ پاے دل

یک چند ترک بردنِ دل ہا ضرورت است　　اکنوں نہ ماندہ در شکنِ زلف جاے دل

چیزے کہ دل کشد بہ جہاں میرؔ آں دل است

جہدے نما و شو قدرے آشناے دل

(۳۴۳)

خوباں نگاہِ لطف نہ کردند سوے دل　　زیں قوم آں شکستہ نہ دید آرزوے دل

در کوچۂ تو جانِ بسے دردمند رفت　　تا حشر خواہد آمد از آں خاک بوے دل

خواہش خوش است میرؔ و لیکن نہ ایں قدر

آخر ہلاک کرد ترا آرزوے دل

(۳۴۴)

آمدم تنگ ز دل جوئی و دلداریِ دل　　آہ تا چند خورد کس غمِ بیماریِ دل

یاد باشد کہ بہ کس انس نہ گیری زنہار　　جانِ من بندِ گرانے ست گرفتاریِ دل

یک نگہ بیش بہایش نہ نہادم لیکن　　خود پسنداں نہ نمودند خریداریِ دل

آں چناں دل کہ منش خواستمے دست نہ داد　　حرف شد عمرِ گرامی بہ طلبگاریِ دل

ہر کجا پاے نہی بر سرِ دل می آید　　رہ بہ کویش نہ تواں برد ز بسیاریِ دل

در رہ دورِ فراقش چہ شکیبد چہ تواں　　کس ازایں بیش نیامد کہ کند یاریِ دل

میر در وقتِ علم بازیِ آہِ سحری
جز جگر کیست کہ آید بہ سپرداریِ دل

(۳۴۵)

درایں سختی نہ رفت اصلا ز جا دل　　الٰہی پارۂ سنگ است یا دل
ز دل افسانۂ ماندہ ست باقی　　تو می خواہی ز من دل را کجا دل
طریقِ عاشقی مشکل طریقے ست　　درایں رہ کار بسیار است با دل
بہ یک بے طاقتی آرم بہ رحمش　　دہد گر پاسِ عشقِ او مرا دل
رسیدی گر بہ دل در کعبہ ای میر
کہ چنداں نیست راہ از کعبہ تا دل

(۳۴۶)

خواہم کہ دمے فلطم مستانہ بہ پائے گل　　بر خاک جیندازم تکلیفِ ہوائے گل
ما کہنہ گرفتاراں از گل چہ خبر داریم　　داریم گلِ داغے بر سینہ بجائے گل
ما مدِ نظر داریم دل جوئیِ بلبل را
در باغ نمی آئیم اے میر برائے گل

(۳۴۷)

با خلق چہرہ گشتم از آشنائیِ دل　　شد باعثِ کدورت آخر صفائیِ دل
تا رفت از برِ من شورے ست در سرِ من　　سودا بہم رساندم از بے وفائیِ دل
از درد سینہ ریشم از غم بہ فکرِ خویشم　　بسیار شاق آمد بر من جدائیِ دل
فرہاد و کوہ کندن افسانۂ ست بشنو　　بودہ ست در حقیقت زور آزمائیِ دل
زیں دام گہ کہ ہر جا صد ہا فریب دارد　　دشوار می نماید ما را رہائیِ دل
در وادیِ محبت دل را دلیلِ خود کن　　راہے نمی نماید بے رہ نمائیِ دل
چوں عشق برگزیند شے کسے نہ بیند　　القصہ گشت ما را بے اقتضائیِ دل

بربند چشم و بنگر در جلوہ رنگ ہا را　　از لطف نیست خالی میر خدائی دل
شد اشک خوں مبادا چشم تو بشکند میر
ایں کاسہ رانگہ دار بہر گدائی دل

(۳۴۸)

تا چند اضطراب کند در کنار دل　　آزردہ دل ستم زدہ دل بے قرار دل

ردیف م

(۳۴۹)

فراموشت نہ خواہم کرد تا در جسم جاں دارم　　چو مرغ دوست حرف دوست اکثر بر زباں دارم
سخن پردازیم دارد شنیدن یک زماں بشنو　　کہ از اندوہ بے پایاں بہ لب صد داستاں دارم
تو اے دل در ہجوم اشک تا رفتی دگم گشتی　　فغاں ہا یک بیاباں چوں درلے کارواں دارم
بہ کویش ہر چہ بادا باد امشب می روم لیکن　　امید مرحمت یک دم زخواب پاسباں دارم
زدستم حالیا جز خانہ ویرانی نمی آید
کہ من اے میر قصد رفتنے زیں خاکداں دارم

(۳۵۰)

چشم بے روے تو چوں چشمہ جوشاں دارم　　دل در آغوش چو سیلاب خروشاں دارم
بے خودی کن چو فراموشی غم می خواہی　　من چنیں یاد ز درباختہ ہوشاں دارم
تا کجا عمر بہ کنجے گذرانم تنہا　　قصد ہم صحبتی خانہ بدوشاں دارم
دل زجایم نہ برد پرتو ماہ و خورشید　　دعوی عاشقی با دلہ پوشاں دارم
پارہ ہاے جگر و دل بہ بغل می گردم　　من بہ کویش روش دست فروشاں دارم
کار دل ہیچ ز وارستگی من نہ کشود　　خواہش بندگی حلقہ بگوشاں دارم
گر شوم کشتہ زباں را نہ کشایم چوں شمع
ایں سخن میر بہ خاطر زخموشاں دارم

(۳۵۱)

چوں ابر نیست بے جا گر گریہ ہا نمودم　　عمرے در ایں گلستاں چشم آب دادہ بودم

باہر کہ مہر ورزم بند دگر بہ کینم ... در عشق بختِ خود را صد بار آزمودم
آں شوخ از نیازم مغرور تر شُد آخر ... ہرگز نہ داد سودم ہر چند جبہہ سودم
مُشتاقِ قِصّۂ من بسیار بود مجنوں ... چوں سرگزشت گفتم ہوش از سرش ربودم

ایں گل زمینِ دل کش یکسر نہ دیدنی بود
من میرؔ کاشکی ایں جا چشمے نمی کشودم

(۲۵۲)

شب و روز در جستجوے دلم ... من از خاک شویانِ کوے دلم
مرا حیرتِ جُنبش آئینہ کرد ... بہ سوے کسے نیست روے دلم
گہ از پُشت پا چشم بر داشتہ ... نگاہے نہ کردی بہ سوے دلم
بہ فریادِ او گوش دارم مدام ... چہ وارفتۂ ہاے وہوے دلم

بلے بہر او میرؔ جاں می دہد
جگر خوں شد از آرزوے دلم

(۲۵۳)

بے خود بہ کوے بادہ فروشاں فتادہ ام ... از نشأتین بے خبرم مستِ بادہ ام
می داشتم امیدِ وصالش از ایں سبب ... جاں را بہ روزگارِ جدائی نہ دادہ ام
بر من چو کار تنگ شود بگذرم ز جاں ... کارم محبت است کہ اشراف زادہ ام
شرمم نگاہ دار خدایا کہ وقتِ شیب ... بر آستانِ مغبچہ اے رو نہادہ ام

با شیخ شہر و واعظِ مسجد مرا چہ کار
من میرؔ دست بیعِ جوانانِ سادہ ام

۲۵۴

با غمِ جاودانہ ساختہ ام ... چہ کنم با زمانہ ساختہ ام
غم در ایں پردہ می کنم ظاہر ... شاعری را بہانہ ساختہ ام
قاصدے آخر از سرشکِ گرم ... جانبِ او روانہ ساختہ ام
تا بہ بت خانہ ام رہے باشد ... طورِ خود کافرانہ ساختہ ام

سادگی ہیں کہ آتشیں نفس ام — وز نے خشک خانہ ساختہ ام
من نہ دانم کہ در غمش تا حال — کارِ خود را چرا نہ ساختہ ام
بر امیدِ خدنگِ نازِ کسے — جگرے را نشانہ ساختہ ام
بے تو دانستہ من بہ رسوائی — خویشتن را فسانہ ساختہ ام
جان و جاناں یک است و من اے میرؔ
صد سخن در میانہ ساختہ ام

(۳۵۵)

اشک چوں الماس می ریزد ز مژگاں در برم — نہر الماس است گویا میرؔ ایں چشمِ ترم
مدّتے شد طائرِ جاں کرد پرواز ے و ہست — یاد بودے در قفس تا حال از بال و پرم
کارِ من از جوششِ غم آخر بہ رسوائی کشید — تنگ چوں بسیار می آیم گریباں می درم
اندکے دم در کش اے بلبل دماغم می رود — تا کجا ایں شورِ بے حاصل بہ درد آمد سرم
رفت آں موسم کہ رو بر روئے گل می داشتم — حالیا از چرخ می ریزد خسک بر بسترم
بس کہ می بالد بہ خود خواہم کہ سروِ باغ را — قامتت بنمایم و بر سر قیامت آورم
گرچہ بابِ آتش ام از ارتکابِ آبِ رز
شاد و شاداں می زیم لیکن بہ امیدِ کرم

(۳۵۶)

یک دم اے کاش بہ مقصودِ دل آئی بہ برم — تا کجا سوئے تو از دور بہ حسرت نگرم
رہ بہ دل بُردم و فارغ شدم از دیر و حرم — ختم گردید بر ایں آبلہ سیر و سفرم
جلے اشک از مژہ خوناب رواں ساختہ ام — روئے خوبِ تو اگر رفتہ دمے از نظرم
گر بہ سرِ منزلِ ما پا بگزاری الطاف — وَر بہ پرسش بدہی رنج لبِ خویش کرم
ہم چو من عاشقِ طفلانِ بد او ضائع نہ شد — خوب گذراند تحیات بہ روحِ پدرم
از چہ راہ است شد انم کہ تو می پوشی چشم — من بہ راہِ تو ز نقشِ قدم افتادہ ترم
طائرے نیست کہ امسال بہ گلزار نہ رفت — وائے بر حالِ منِ زار کہ بے بال و پرم
فتنہ انگیز چو من عاشقِ صادق می خواست — کرد پیدا فلکِ سفلہ بہ خونِ جگرم

من چہ دانم کہ چہ ہنگامہ دریں مصطبہ است      نشۂ شوقِ تو دارد زجہاں بے خبرم
عاقبت خواہشِ وصلِ تو دلم بُرد بہ خاک      قدمے رنجہ نہ کردی نہ رسیدی بہ سرم
کارِ عشقم بہ جنوں کاش کشد یک دو سہ روز      کہ کشم دامنِ آں شوخ و بہ صحرا ببرم
دہ چہ حال است کہ ناچار زبیمِ اغیار      از تو چوں می گذرم از سرِ جاں می گذرم
یا رب اے خانہ برانداز کجای تو کہ من      خاک مالیدہ بہ تن شام و سحر در بہ درم
ترک کن میر بکاے دلِ شب را دو سہ روز
دورِ چشمِ تو زحد بیش نمودہ ست ورم

(۳۵۷)

مُردم بہ ذوقِ تیغِ تو خوں سیر می خورم      من مے بہ طاقِ ابروے شمشیر می خورم
مو شُد سفید و طفل مزاجی ہماں کہ بود      چوں صبح پیر گشتہ ام و شیر می خورم
از من کمانِ آں ستم آئیں نمی کشد      چوں می شوم مقابلِ او تیر می خورم
از بہرِ من بہ قیدِ جنوں ایں قدر بس است      ہر روز چند دانۂ انجیر[1] می خورم
از فرطِ غم چہ از ہمگی در گذشتہ ام      گر دست می دہد ہمہ اکسیر می خورم
ہست ایں جوابِ آں غزلِ آرزو کہ گفت      در ہر قدم ز آبلہ زنجیر[2] می خورم
ہستم فقیر میر و نیم لذت آشنا
نانِ جواں بہ نانِ خورش، پنیر[3] می خورم

(۳۵۸)

چو اشکِ سختیِ غربت کشیدہ می آیم      چکیدۂ دل ام از راہِ دیدہ می آیم
ہزار حیف اگر گل بہ من نہ پیوندد      ز آشیاں بہ امیدے پریدہ می آیم
اگر ز سایۂ خود وحشتے کنم بر جاست      شکارِ دشتِ جنوں ام رمیدہ می آیم

---

[1] از نقلِ رام پور۔ مخطوطۂ ادیب" دانۂ زنجیر"

[2] از نقلِ رام پور۔ مخطوطۂ ادیب" انجیر"

[3] نقلِ رام پور" سیر"

تو آہ گوشش بہ حرفم نمی گذاری و من | چہ ہا برائے نوائے گل شنیدہ می آیم

زحالِ میر چہ پرسی کہ من بہ حالِ خراب
فتادہ اش بہ سرِ راہ دیدہ می آیم

(۳۵۹)

پیش ازیں ما ہم سخن سازِ نکوئے داشتیم | نو خطِ دل چسپِ نستعلیق گوئے داشتیم
حالیا در کشورِ خوبی کفِ خاکستر ایم | یادِ ایامے کہ چوں آئینہ روئے داشتیم
بعدِ ما روزے نگہ بر بیدِ مجنونش فتاد | گفت ما ہم ایں چنیں ژولیدہ موئے داشتیم
نیست آں شورِ مزاج اکنوں کہ چوں دیوانگاں | بر سرِ کوئے کسے شب ہائے و ہوئے داشتیم
لحظہ لحظہ سوئے او افتان و خیزاں می شدیم | تا بہ تن جاں داشتیم اندازِ گوئے داشتیم
بہر آں سرمایۂ جاں ہر درے را می زدیم | طاقتے تا بود در پا جستجوئے داشتیم
یادِ آں عاشق شرابی ہا کہ روز و شب بہ باغ | چوں گلِ تریاک ما با خود سبوئے داشتیم

موسمِ دیوانگی خوش موسمے بودہ ست میر
با خیالِ یار ہر دم گفتگوئے داشتیم

(۳۶۰)

پُر بہ تنگ ام جانبِ صحرا دگر رو می کنم | کارِ خود را در جنوں ایں بار یکسو می کنم
آخر از جورِ تو خواہد گشت روزِ من سیاہ | اندک اندک با فغانِ نیم شب خو می کنم

بوئے او بسیار می ماند بہ بوئے یار میر
زیں سبب در باغ گل را دیر تر بو می کنم

(۳۶۱)

بے تو شاخِ بریدہ را مانم | تازہ آفت رسیدہ را مانم
رفتم از جا و نیستم جائے | رنگے از رخ پریدہ را مانم
نیست بیش از خیالِ ہستیِ من | صورتِ ناکشیدہ را مانم
شدہ رہِ آشیاں فراموشم | طائرِ نو پریدہ را مانم
من ادب دانِ بزمِ دہر نیم | طفلِ صحبت نہ دیدہ را مانم

چشمِ خوں بار کرد گل رنگم　　میدے در خوں تپیدہ را مانم

میرؔ در عورگی مویز شدم
میوۂ خام چیدہ را مانم

(۳۶۲)

بے سبب نیست کہ پا بر سرِ دنیا زدہ ایم　　تنگ بودیم درایں خانہ بہ صحرا زدہ ایم

بے رُخت خوں شدہ از دیدہ فرو ریختہ است　　گر بہ تکلیفِ کسے ساغرِ صہبا زدہ ایم

معتبر نیست اگر حرفِ پریشاں گفتیم　　عُذرِ ما را بپذیرید کہ سودا زدہ ایم

باعثِ رفتنِ سرہاے کساں خواہد شد　　در رہِ عشق تو ایں تیشہ کہ برما زدہ ایم

کم نہ شد سوزِ درون گرچہ زبے تابی میرؔ
بارہا مضطرب الحال بہ دریا زدہ ایم

(۳۶۳)

پے قوت پیشِ فلک من نہ نالم　　چہ نازم کہ بر شیشہ ناں را بمالم

زحالم سخن با مصیبت کشے کن　　چہ دانند آسودگاں در چہ حالم

ز دنیا و عقبیٰ چہ کار است مارا　　بہ عشقش گذشتیم از ہر دو عالم

جدا از تو مفت است گر من بمیرم　　کہ جاں بر لب آمد زشوقِ وصالم

فلک کاہشِ بندہ واجب شمارد　　ازآں رو کہ چوں بدر صاحب کمالم

نہ دانم زبالیدن و سبز گشتن　　کہ پژمردہ از خاک سرزد نہالم

بنالم پے آں کمر میرؔ ہر دم
جز ایں بگذرد ہیچ اندر خیالم

(۳۶۴)

چہ می پرسی چرا غربت شعارِ خویشتن کردم　　ز حد بگذشت رسوائی کہ من ترکِ وطن کردم

نیامد در مشامم از ہیچ شاخم نکہتِ اُنسے　　بہ امیدِ وفا بسیار گشتِ ایں چمن کردم

بہ یادم داد از نوبے کسی یارانِ دیریں را　　شدم تنہا و یادِ عہدِ قیس و کوہکن کردم

نمی بردم ترا کاش از رہِ دیر و حرم ظالم　　جفائے بے حدے بر حالِ شیخ و برہمن کردم

دگرگوں گشت رنگِ بزم از حرفِ غم افزایت
غلط کردم ترا اے میرؔ تکلیفِ سخن کردم

(۳۶۵)

خواہم کہ شوم ابرِ تر و زار بگریم　　بر روبکشم دامن و بسیار بگریم
یا رب چہ تمناست گرہ در دلِ زارم　　ہر گاہ کشایم لبِ اظہار بگریم
از چاکِ جگر طرح کنم خندہ کہ تاچند　　بے روئے گلے در پسِ دیوار بگریم
شرط است اگر کار کند جذبِ محبت　　تنگش بہ بغل درکشم و زار بگریم

صد رنگ سخن میرؔ بہ لب دارم ناچار
وقتے کہ کشد کار بہ گفتار بگریم

(۳۶۶)

بہ جانم از فراقش مبتلائے صد بلا گشتم　　کہ افسونِ جدائی خواند کز جاناں جدا گشتم
شناسائے نہ ماند از آشیانم در چمن ہرگز　　کہ بعد از مدتے از قیدِ صیاداں رہا گشتم
بہ اخلاصِ دل از من سر نہ زد یک سجدہ ہم گاہے　　چہ شد چوں مقری تسبیح عمرے مقتدا گشتم
من از لطفِ بہار آگہ نیم کز بے دماغی ہا　　نہ با بلبل سخن کردم نہ در گلزار وا گشتم

کدامیں شیوہ اش باعث نہ شد نومیدیِ دل را
نہ دانم میرؔ با او بر چہ امید آشنا گشتم

(۳۶۷)

گہ خونِ دل بہ راہِ نگارے نہ ریختم　　یا از سرشک رنگِ بہارے نہ ریختم
شاید کہ بلبلے تپد و جاں دہد ز رشک　　از احتیاط گل بہ مزارے نہ ریختم

داغم از ایں کہ عمر بہ مے خانہ رفت میرؔ
آبے بہ دستِ بادہ گسارے نہ ریختم

(۳۶۸)

بحر خون است چشمِ پُر خونم　　گل بحری ست اشکِ گلگونم

داغِ جوشِ سرشکِ گلگونم  چوں شقائق تمام درخونم
خانۂ شوقِ دل خراب شود  دیدم آزارہا و ممنونم
نقرِ من نیست از جنوں خالی  تکیہ دارِ مزارِ مجنونم
گرچہ سحر است حرفِ من لیکن  در تو کارے نہ کرد افسونم
مُردم و دل ہماں تپش دارد  باقیامت بہ خاک مدفونم
کرد آخر مرا برابرِ خاک  پائمالِ خرامِ گردونم
بستہ ام لب بہ ایں زبانِ دراز  چہ بگویم کہ در غمت چونم
جوے خوں شد رواں ز دیدۂ من  بگذر اے بے مروّت از خونم
ماتمِ قیس چند خواہم داشت  مدّتے شد کہ من بہ ہامونم
خندۂ زیرِ لب بہ رنگے کرد  کہ ستم شد بہ جانِ محزونم

حیف کیفیتم نہ شد ظاہر
کس نہ داند کہ من چہ معجونم

(۲۶۹)

می رسیم از شہرِ دل سوداگریم  ہر کہ جنسِ درد دارد می خریم
روز و شب خوں می خوریم از بہرِ دل  دشمنے را در بغل می پروریم
آتشے بودیم چندے پیش ازیں  ایں زماں خود تودۂ خاکستریم
شد حنائی پنجۂ مژگاں ز خوں  داغِ آتش دستیِ چشمِ تریم
وقتِ آخر ہم بہ او گفتہ نہ شد  آں چہ در دل بود باخود می بریم
شوقِ آں گل باعثِ آوارگی ست  چوں نسیمِ صبح گہ بر ہر دریم

میرؔ با ما آشنائی مشکل است
در نزاکت چوں مزاجِ دلبریم

(۲۷۰)

سخن دیوانہ و عاشق کتابم  ادا فہمِ تمام اجزا خطابم
شکستِ منظرِ دل دیدنی بود  نہ بُردی رہ بہ احوالِ خرابم
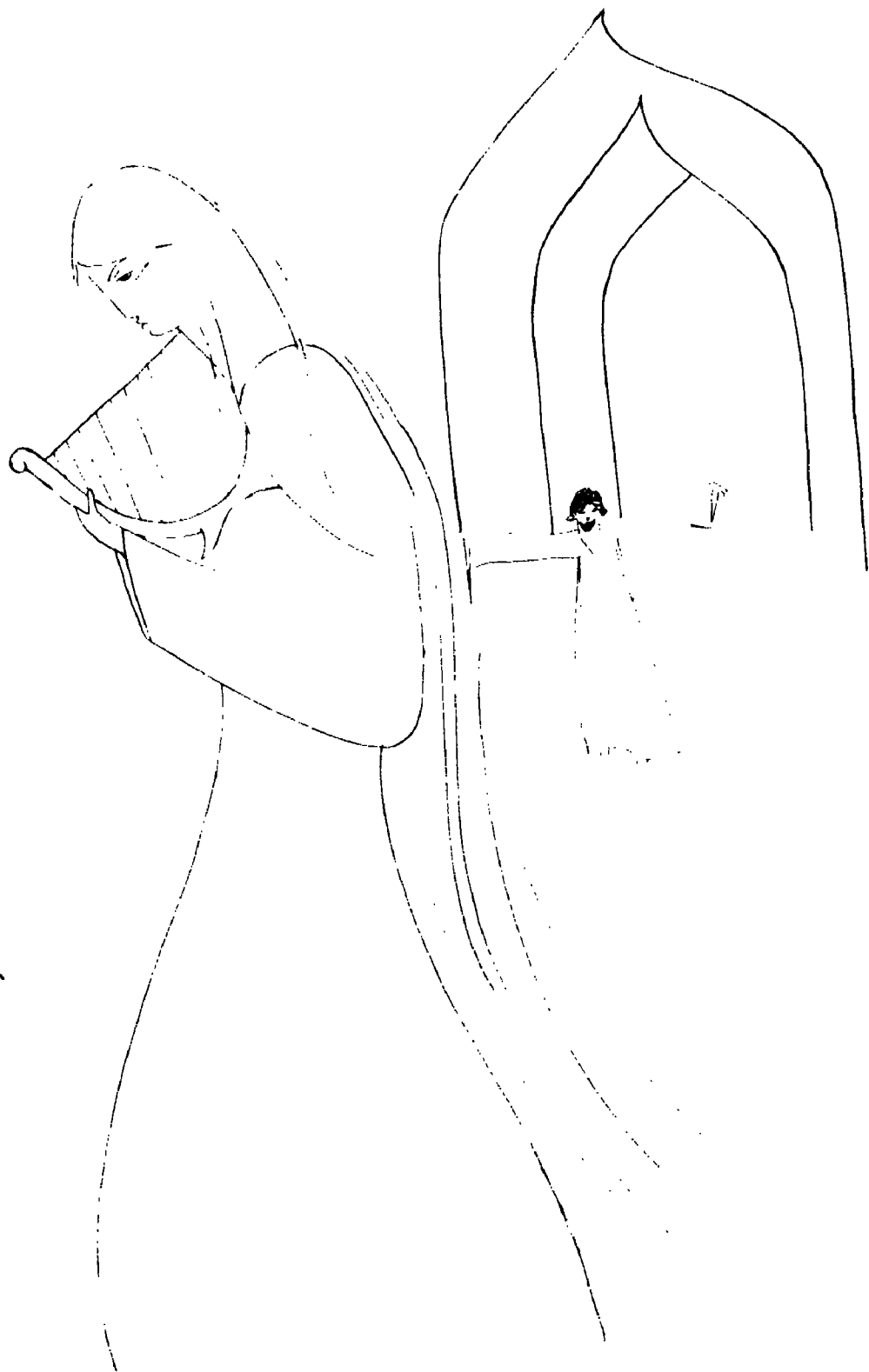
آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر یار دیکھنا
عاشق کا اپنے آخری دیدار دیکھنا

خدا ناکردہ گر خیزم بہ دعویٰ    چہ خواہی گفت در محشر جوابم
چناں گم گشتہ ام کز من اثر نیست    ہزار افسوس اگر او را نہ یابم
دلالت می کند چشمش بر آشوب    ز انداز نگہ در اضطرابم
تپاکِ او بہ دشمن جان و دل سوخت    من از گرمی بے جایش کبابم
بہ عالم محتسب بگذار اکنوں    کہ گر گرفتی بسا مست شرابم
چہ گویم آہ غفلت راہِ دل زد    جہانے بار بست و من بہ خوابم

دمِ آخر بسے پرسیدم از میرؔ
نہ کرد اظہارِ عشقش از حجابم

(۳۷۱)

مکن الفت کہ ایں آزار مردم    نہ دیدم چارہ لے ناچار مردم
سپاریدم بہ زیرِ خاک در راہ    کہ من از رفتنِ آں یار مردم
تاسف ایں زماں بر نقشِ من چیست    ز عمرے بودہ ام بیمار مردم
بہ زندانِ جہانِ پیچ در پیچ    بہ تنگ آمد دلم بسیار مردم
نہ دیدم آفتابِ روے او را    ز غم در سایۂ دیوار مردم
ز تن جاں رفت و می کردم تماشا    چو چشم بسملے بیدار مردم
نہ دانم دل کجا ایں آرزو داشت    کہ وقتِ جاں دہی دشوار مردم

چہ گویم آہ از آں آئینہ رو میرؔ
عبث در حسرتِ دیدار مردم

(۳۷۲)

دل زجاں بندۂ شاہے ست کہ من می دانم    مائل طرف کلاہے ست کہ من می دانم
ایں کہ در آتشِ غم دل ہمہ شب می سوزد    داغ از دوری ماہے ست کہ من می دانم

طورِ رندانۂ او را تو نمی دانی آہ
میرؔ آں خانہ سیاہے ست کہ من می دانم

(۳۷۳)

مہیائے سفر ہم چوں غریباں در جہاں ماندم ۔۔۔ دریں محنت سرا یک چند من ہم میہماں ماندم
کسم فریاد رس جز بےکسی نبود دریں وادی ۔۔۔ کہ چوں صوتِ جرس بسیار دور از کارواں ماندم
نمودم صرفِ ضعفِ دل دماغِ ہرزہ گردی را ۔۔۔ بہ ہر جا پا نہادم چوں غبارِ ناتواں ماندم
چو صیدِ زخمِ کاری خوردہ رفتم از سرِ کویش ۔۔۔ کہ بر ہر یک قدم از قطرۂ خونے نشاں ماندم

چناں بر شمعِ مجلس میؔر زد پروانہ از جرأت
کہ من تا صبح دم حیرانِ آں آتش بہ جاں ماندم

(۳۷۴)

غم در دل بر لب آہ دارم ۔۔۔ من حالِ بسے تباہ دارم
گلزار نیم کہ در ببندم ۔۔۔ دشت ام کہ ہزار راہ دارم
شد موے سفید و کار نکشود ۔۔۔ چوں نافہ دلِ سیاہ دارم
بر خاکِ رہِ کسے ست رویم ۔۔۔ یعنی من رو بہ راہ دارم[1]
مقصودِ من آں قدِ بلند است ۔۔۔ دیرے ست کہ حبِّ جاہ دارم
یا رب چہ کنم چگونہ دل را ۔۔۔ زآں چشمِ سیہ نگاہ دارم
نے معتقدِ فقیر گردم ۔۔۔ کارے نہ بہ پادشاہ دارم
عاشق شدہ ام بر آں دو رخسار ۔۔۔ . . . . . . دارم[1]

ترکِ سرِ خویش می کنم میؔر
من مژدۂ بارگاہ دارم[2]

(یہ غزل نقلِ حیدرآباد میں بھی نہیں ہے)

(۳۷۵)

خیالِ دیر و حرم را ز سر بہ در کردم ۔۔۔ بہ سجدہ اے درِ مے خانہ سر بہ سر کردم
مرا ز دیر و حرم مطلبے نہ بود اے شوخ ۔۔۔ ز فرطِ شوقِ تلاشِ تو در بہ در کردم

---

[1] مصرعِ ثانی از نقلِ رام پور، مخطوطۂ ادیب میں کٹ گیا ہے
[2] مصرعِ ثانی از نقلِ رام پور، مخطوطۂ ادیب میں کٹ گیا ہے
[2] یہ شعر نقلِ رام پور میں نہیں ہے۔ مخطوطۂ ادیب میں کٹ گیا ہے

تمام عمر زدم سر بہ سنگ دور از تو — ببیں کہ عمرِ گرامی چساں بسر کردم
من از بہار چو آبِ رواں چہ می دانم — کہ سر فگندہ بہ زیر از چمن گذر کردم
رہِ وفا و محبت رہیست دور و دراز — در ایں دو مرحلہ بسیار من سفر کردم
بجای اشک ہمہ خوں گریستم یعنی — شبِ فراق بہ صد خونِ دل سحر کردم
چنار ساں ہمہ در من فتاد و پاک بسوخت — ز دستِ سودنِ خود آتشے کہ بر کردم
ترا چہ جرم کہ ضبطِ خودم نہ شد مقدور — رسید نامِ تو در گوشش و چشم تر کردم

زطرزِ دیدنِ او میر فتنہ می بارد
مباش ایں ہمہ غافل مَنَت خبر کردم

(۳۷۶)

زلف یا دستار می پیچد ادا را بندہ ام — شرم از آئینہ می دارد حیا را بندہ ام
پیچشِ زلفش نہ ام دزدیست با جانم دلے — ہر گہ دیے گاہ تحریکِ صبا را بندہ ام
زر خریدِ دلبرانِ بے مروت نیستم — می کشم حکمِ دلِ خود من وفا را بندہ ام
می کند احیا ز لطف و می کُشد از ناز و خشم — کشتۂ آں التفات ام ایں جفا را بندہ ام
گریہ ہا در گوشۂ محراب دارم روز و شب — با بتانم نیست روئے دل خدا را بندہ ام
خرقۂ کوتاہ دامن کے بہ دل می چسپدم — من کہ چسپاں جامہ و چاکِ قبا را بندہ ام

در امیدِ یک نگاہے لطفِ جانِ میر رفت
دلبرانِ پوشیدنِ چشمِ شما را بندہ ام

(۳۷۷)

بندۂ بوترابؑ گردیدم — ذرۂ آفتاب گردیدم
ایں چمن نیست جائے آسائش — ہر طرف ہم چو آب گردیدم
نسبتم شد بہ زلفِ او چو درست — جملہ تن پیچ و تاب گردیدم
او مےِ ناب خورد با دشمن — من ز غیرت کباب گردیدم
عاقبت بر گناہِ پاسِ وفا — قابلِ صد عتاب گردیدم
بزمِ امکاں نہ داشت کیفیت — من چو جامِ شراب گردیدم
بودہ ام میر شہرِ آبادے — رفتہ رفتہ خراب گردیدم

(۳۷۸)

غبار گشتم و سودائے جستجو دارم — بہ باد رفتم و در سر ہوائے او دارم

چہ دردِ دل کنم از من سخن نمی آید — زماں زماں ز غمش گریہ در گلو دارم

کنوں کہ وصل میسر شدہ ست می گریم — در ایں غم ام کہ نہ دانم چہ آرزو دارم

چو عکس شخص سخن گوے روے آئینہ — ز خویش رفتم و با خویش گفتگو دارم

چہ شد کہ مبتذل ام اعتبارِ من باقی ست — مثالِ آئنہ در چشم ہر کہ رو دارم

بیا کہ شوق بہ دیوانگی کشید آخر — ز دیر بر سرِ کوے تو ہائے و ہو دارم

بغیرِ حوصلہ یک جرعہ بیش نتواں خورد
ازاں شرابِ محبت کہ در سبو دارم

(۳۷۹)

ز جوشِ شوق چو مستِ شراب می گردم — مریدِ احمدِ جام ام خراب می گردم

چہ غم ز مردنِ خویشم کہ روز حشرے ہست — اگرچہ می روم اما شتاب می گردم

بہ سیرِ باغ ام و وارفتۂ فنائے خودم — پئے ز خویش گذشتن چو آب می گردم

نہ بہرِ خاطرِ غیر ایں خطاب افزے ست — ہمیشہ موردِ خشم و عتاب می گردم

ز ضعف ہر نفسم چشم بستہ می گردد — ترا خیال کہ مائل بہ خواب می گردم

گہے بر آتشِ دل گریہ ام نہ زد آبے — مدام داغ ام و ہر دم کباب می گردم

تنک شراب چناں ام کہ شرح نتواں داد — بہ یک پیالۂ مے بے حجاب می گردم

گریز نیست مرا از تلاشِ او ہرگز — چو سایہ در پئے آں آفتاب می گردم

ثباتِ من نہ بُود یک نفس فزوں تر میر
دریں محیط چہ شد چوں حباب می گردم

(۳۸۰)

مرو ز دیدہ کہ من خاطرِ غمیں دارم — نگاہِ حسرت ام و گریہ در کمیں دارم

بیا کہ سوزِ دروں آتشے بہ دل زدہ است — بہ رنگِ شمعِ سحر جاں در آستیں دارم

ادائے کینۂ او را چو من کہ می فہمد — کہ زخم می خورم و بر لب آفریں دارم

امید ہست کہ ایں ناتواں قبول افتد   کہ من فقیرِ تنک مایہ ام ہمیں دارم

بہ ایں امید کہ یک صبح رو بہ من آری   سرِ نیاز بہ ہر شام بر زمیں دارم

شوم غبار کہ تقریب نیست بہتر ازیں   کہ قصدِ کوئے تو از دیر دل نشیں دارم

ز رنگِ شمعیِ او میر داغ شد دلِ من

دلیلِ روشنِ ایں آہِ آتشیں دارم

(۳۸۱)

چشم از گریہ بر نمے دارم   کہ ہمیں دیدۂ نمے دارم

تو بسر بر بہ خاطرِ شادے   من دلے دارم و غمے دارم

می روم چشم گرم ناکردہ   چوں شرر فرصتِ کمے دارم

گرچہ با تست عالمے بے من   بے تو من نیز عالمے دارم

چوں نیَم خستۂ دلِ زارے   می کشم نالہ تا دمے دارم

سادگی ہائے من ببیں کہ ہنوز   چشمِ لطفے از او ہمے دارم

دل بہ آں زلف میر خواہم بست

چہ کنم حالِ در ہمے دارم

(۳۸۲)

بزمِ برہم زدۂ عالمِ امکاں دیدم   تا چہ گویم کہ عجب خوابِ پریشاں دیدم

غالب است ایں کہ ز طوفانِ قیامت نہ شود   آں چہ بے روئے تو از دیدۂ گریاں دیدم

یادگارے ز اسیرانِ چمن آخرِ کار   مشتِ پر در پسِ دیوارِ گلستاں دیدم

دل کہ در سینۂ من قطرۂ خونے بودہ ست   چوں بہ چشم آمد از او شیوۂ طوفاں دیدم

در گلستانِ جہاں رنگ نہ دارم کہ چو گل   من ہمیں زخمِ دل و چاکِ گریباں دیدم

چوں تسلی شوم از دلدہیِ غم خواراں   من کہ شب لختِ جگر بر سرِ مژگاں دیدم

ہر کسے گل بہ گریباں ز گلستانِ تو رفت

میر را لختِ دلِ خویش بہ داماں دیدم

(۳۸۳)

از عدم حیرانِ کارِ دل بہ دُنیا آمدیم — شکلِ تصویر ایم از خود رفتہ پیدا آمدیم
جملہ تن مصروفِ دل جوئی ہو تارِ سبحہ شد — ما بہ چشمِ مردماں از راہِ دل ہا آمدیم
رفتۂ خویش ایم ورنہ منزلِ ما دُور بود — شوقِ ما دامن کش ما شد کہ ایں جا آمدیم
عالمے لبریزِ ما و چشمِ ما بر راہِ ماست — انتظارے می کشیم از خویش و ہر جا آمدیم
غرقۂ وہم ایم دریا خویش را فہمیدہ ایم — ورنہ چوں موج از پے رفتن مہیا آمدیم
جلوہ ہا داریم و از ہر جلوہ بے خود گشتہ ایم — خود تماشا ایم و خود بہرِ تماشا آمدیم

ہر نفس گم گشتۂ ما را چہ می پرسی کہ میر
جستجوئے خویش می داریم ما تا آمدیم

(۳۸۴)

بہ روئے تو پنہاں نظر داشتم — بلائے عجب زیرِ سر داشتم
تو با کامِ دل زندگانی بکن — من از جانِ خود دست بر داشتم
سرشکے بہ صد درد و غم می چکد — نماند آں کہ من ہم جگر داشتم
نہ بود ایں چنیں بے خودی پیش از یں — ز احوالِ خود ہم خبر داشتم
خراشندۂ جبہہ چوں من نہ بود — در ایں کار دستِ دگر داشتم
نہ کردش بہ دل ہیچ تاثیرِ آہ — نگاہے بہ آہِ سحر داشتم

بہ ہر شاخِ گل کردہ ام نالہ اے
گہے میر من بال و پر داشتم

(۳۸۵)

چہ شد گر نقر دار د خاکِ راہم — شکستے ہست در طرفِ کلاہم
بہائے خونِ من یک دیدنِ اوست — تمنا کشتۂ ذوقِ نگاہم
من و ابرے کہ بر می خیزد از دشت — دو ہم درد ایم می گرییم باہم
نمی دانم کہ اے دل بر چہ امید — برابر کردہ ای با خاکِ راہم
ہمیں بر جرمِ دیدن گشتہ گشتم — دگر ثابت نمی گردد گناہم

ستم آخر بہ ہر کس می نمائی　　سنانے خنجرے تیغے بہ ماہم
بہ یک سنبل سرے دارم در این باغ　　کہ من زنجیریِ زلفِ سیاہم
بہ درد آمد دل آخر ہمدماں را　　ز آوازِ حزینِ آہ آہم

اگر ایں بار مانم زندہ اے میرؔ
کسے را بعد ازیں ہرگز نہ خواہم

(۳۸۶)

چند آرزوئے وصلِ تو در سینہ خوں کنم　　تا کے معاش بے تو بہ حالِ زبوں کنم
در خاک دانِ دہر نہ شد کس انیسِ من　　تا یک نفس غبار ز خاطر بروں کنم
گل می زند مرا ز تہِ برگ چشمکے　　یعنی ز جائے خیزم و فکرِ جنوں کنم
یارب چہ روز خواہدم آمد بہ پیش آہ　　فریاد ہر شب از شبِ دیگر فزوں کنم

دادم بہ خود قرار کہ ہر صبح گاہ میرؔ
از خونِ دیدہ چہرۂ خود لالہ گوں کنم

(۳۸۷)

دارد اگرچہ طورِ زمانہ مشوّشم　　ہر صورتے کہ روئے دہد راضی ام خوشم
آیم چرا ز نغمہ نہ در وجد کز ازل　　از خاک برگرفتۂ آوازِ دل کشم
من تشنہ کامِ وادیِ شوق ام عجب مدار　　سیلاب اگر نہ کرد کفایت بہ لب چشم
یک لحظہ بر مرادِ خودم زیستن نہ شد　　بارے ست زندگی کہ بہ ناچار می کشم

از گریہ میرؔ سوزِ دروں کم نمی شود
دریا ز دیدہ می رود و من در آتشم

(۳۸۸)

چمن پروردہ طیرم لیک روئے قفس دارم　　بہ زاری می کنم عادت گرفتاری ہوس دارم
نہ دانم منزلِ مقصودِ من یارب کجا باشد　　پیے ایں کارواں ہر گام شورِ چوں جرس دارم
بسے بگذشت و برنگرفتہ کس از خاکِ صحرایم　　چو نقشِ پائے چشمِ لطف از بسیار کس دارم
تو دشمن گل بہ دامن داری و من بر سرِ کویش　　پئے آتش فروزی چوں فقیراں خار و خس دارم

به کاهش پیکر زردم تمامی رفت و نالان ام — چو نے ازمن نمی آید خموشی تا نفس دارم
نه دارم هیچ باک ازمستی بازار و برزن ها — که مربوط ام به شیخ شهر و یاری با عسس دارم

مپرس اے میرؔ از انداز چشم نیم باز او
قیامت نشه زاں جام شراب نیم رس دارم

(۳۸۹)

سخت در کار خویش حیرانم — چه به دل خورد من نمی دانم
من که گلچین ایں گلستانم — پُر ز لخت دل است دامانم
به سر زلف می زند حرفے — او چه داند که من پریشانم
من ز پہلوے او چه ها دیدم — دل مگر بود دشمن جانم
هر زماں بے تو آفت تازه — سر بروں آرد از گریبانم
ترک ساغر گرفتم و بے مے — در بہاراں بسے پشیمانم
رسم دین کہن چه می پرسی — من چه دانم که نو مسلمانم
شوق فہمیدن دل است مرا — غیر ایں نسخه من نمی خوانم

غالباً میرؔ شب به خاک افتاد
جگر از راه چشم گریانم

(۳۹۰)

من که از خود خبرے یافته ام — از فقیراں نظرے یافته ام
گر همه درد شوی دریابی — آں چه از چشم ترے یافته ام
با کس الفت نه کنی کز بلبل — در چمن مشت پرے یافته ام
دل چساں زاں گل تر بردارم — کش به خون جگرے یافته ام

خاطرم میرؔ ز مُردن جمع است
چوں غمش چاره گرے یافته ام

---

ے نسخه بدل "بلا مستی از آں ......"

(۳۹۱)

ز شستِ صافت اے ابروکماں ازبس خطر دارم
تو می بینی بہ سوے تیر و من فکرِ جگر دارم

سراسر گردِ ایں صحرا دلِ وحشت اثر دارم
بسانِ چشمہ در ہر گوشۂ او چشمِ تر دارم

نہ دانم راحتِ دل چیست خوابِ خوش چہ می باشد
کہ من از عشقِ خوش چشماں بلائے زیرِ سر دارم

دمے اے جامہ زیباں گرمی اے بامن تواں کردن
کہ جاں در آستیں از شوق چوں شمعِ سحر دارم

نہ پنداری جہانِ رفتنی منزل گہِ من شد
پس از آسائشِ یک چند قصدِ پیش تر دارم

شنیدم ہر کرا ذی ہوش دیدم سخت بے ہوشش
زحالِ مردمِ آگاہِ عہدِ خود خبر دارم

بیا انصاف اگر داری بہ دستم بوسہ دہ دشمن
کہ من در فنِ شعر و شاعری دستِ دگر دارم

نہ دانم باغمم اے میرؔ گردوں خوش چرا دارد
نہ دارم غیر ازیں عیبے کہ من اندک ہنر دارم

(۳۹۲)

با دلبرانِ ہندی تا میرؔ کار دارم
دل چاک چاک در بر ہم چوں انار دارم

یک رہ مگر از آں سو گردے کند غبارے
چوں نقشِ پاے چشمے بر رہ گزار دارم

افراطِ اشتیاقم در وصل ہم ہماں است
او در برِ من است و من انتظار دارم

در عشق طرفہ صحبت افتاد اتفاقم
نے یار رحم دارد نے من قرار دارم

دل بر سفر نہادم زآں کو جبیں خراشاں
پائے بہ راہ دارم دستے بہ کار دارم

از نشۂ جوانی دردِ سر است بامن
زاں مے کہ مست بودم اکنوں خمار دارم

(۳۹۳)

دعویٰ شدہ ست قطع بہ سوے تو آمدیم
راضی بہ مرگ بودہ بہ روے تو آمدیم

مارا دماغِ دیدنِ گل ہا نہ بودہ است
در گلشنِ زمانہ بہ بوے تو آمدیم

تسکیں نہ یافتیم پس از مرگ زیرِ خاک
آخر غبار گشتہ بہ کوے تو آمدیم

(۳۹۴)

چند روزے شد کہ ایں جا باش و بودے می کنم
در حقیقت نیستم اما نمودے می کنم
بندگی کیشم نیم زنہار در بندِ جہت
رو بہ ہر جانب کہ می آرم سجودے می کنم

(۳۹۵)

عہد کردم کہ اگر جاں رود آہے نہ کنم
بعد ازیں خواہش ہر چشم سیاہے نہ کنم
می دہد یاد ز تابندہ رُخِ او ہر شب
من ہماں بہ کہ سوے ماہ نگاہے نہ کنم

(۳۹۶)

چناں صبح دادِ فغاں می دہم
کہ مرغِ چمن را زباں می دہم
چنانم زجا رفتۂ او کہ میرؔ
بہ ہر جاے آں شوخ جاں می دہم

(۳۹۷)

صبر بر صد گونہ جورِ آں جفا جو می کنم
نیم جانے دارم اکنوں ظلم بر او می کنم
بر امیدِ آں کہ شاید آید آں پیمان گسل
خانہ را از اشکِ مژگاں آبِ جارو می کنم

(۳۹۸)

یادِ آں عہدے کہ من ہم مہربانے داشتم
کینہ ورزے خشمگینے بدزبانے داشتم
ہم نشیں از حالِ میرؔ من چہ پُرسی ہر نفس
دردمندے، بے کسے، بے خانمانے داشتم

(۳۹۹)

براے گریہ خونیں جگر تراشیدم
چو زخمِ تازہ یکے چشمِ تر تراشیدم
ز تازہ کاریِ من در خزاں عجب مکنید
ز چوبِ خشک گلِ تر اگر تراشیدم

(۴۰۰)

تکہ بہ ابر زن از جامِ صبح گاہِ خوداَم[1]  دماغ من چو شود تخت بادشاہِ خوداَم

(۴۰۱)

از دلِ داغ گشتہ بے مزہ ام  زیں کبابِ گذشتہ بے مزہ ام

(۴۰۲)

تا کے زدرت با دلِ صد چاک در آئیم  چسند کہ آزردہ از ایں شہر برآئیم

(۴۰۳)

من آں بوریا پوشِ آتش بہ جانم  کہ یک لحظہ بے شعلہ خویاں نہ مانم

(۴۰۴)

روزیِ خود را بہ رنج از دردِ دنداں می خورم  ناں بہ خوں ترمی شود تا پارۂ ناں می خورم

(۴۰۵)

بہ دل داری تواں کردن علاجم  کہ من دیوانۂ عاشق مزاجم

(۴۰۶)

من کہ در روے تو می بینم وکاہش دارم  چشمِ لطف از تو بہ اندازۂ خواہش دارم

(۴۰۷)

در فکرِ خویش آخر اے دلبر اوفتادم  تا تکیہ بر تو کردم بر بستر اوفتادم

(۴۰۸)

درمے کدہ پیراہن بسیار گرو کردم  ایں مرتبہ چوں رفتم دستار گرو کردم

(۴۰۹)

در ایں درس گہ نیست جز بحثِ وہم  تو اے مغزِ خر خوردہ اندک بفہم

(۴۱۰)

پاے سروِ چمن وطن کردم  فکر بر اصلِ خویشتن کردم

---

[1] حاشیے پر نسخہ بدل، نیز نقل رام پور میں "غلامِ خوردنِ افیونِ صبح گاہ خوداَم"

شور و ہنگامہ اے عجب زد او | از لبِ یار تا سخن کردم
دل بہ او بستم آں چناں کہ چنیں | عاشق آزار و دل شکن کردم
رفتہ رفتہ زگریۂ خونیں | ہمہ آں کوچہ را چمن کردم

ہر زماں دیدنش نمی بایست[1]
ظلم بر خویشتن میرؔ من کردم

(۴۱۱)

از فغانِ بلبل مکن ہر لحظہ آزارِ دلم | بر نمی تابد دماغ من کہ بیمار دلم

(۴۱۲)

آخر از یمنِ زہد و تقوایم | بادہ پالا شدہ مصلّایم

(۴۱۳)

شورِ عشقِ دلبرے از دیر در سر داشتیم | یا جنوں گفتیم و ایں بارِ گراں برداشتیم

## ردیف ن

(۴۱۴)

بیا و میرؔ غم از دل بہ باغ بیروں کن | در ایں شگفتہ زمیں یک دو شعر موزوں کن
دلا بہ شہر چہ سودائیانہ می گردی | برو بہ دشت و طوافِ مزارِ مجنوں کن
دماغِ رنجشِ بے جاے ہر زمانم نیست | بہ زخمِ تیغ سرم بر فراز و ممنوں کن
بہ ملکِ عشق دلِ شاد را نمی پرسند | تلاشِ خاطرِ غمگین و جانِ محزوں کن
بہ ہر لباس کہ باشی بلند ہمت باش | گرت بہ خاک بپوشند قصدِ گردوں کن
اگر بہ حسن قبول است میلِ خاطرِ تو | دماغ سوز و جگر چاک ساز و دل خوں کن

بہ کنجِ شہر چہ ہر لحظہ می خروشی میرؔ
بسانِ سیل بزن جوش و قصدِ ہاموں کن

---

[1] مصرعِ اوّل از نقلِ رام پور۔ مخطوطۂ ادیب میں کٹ گیا ہے۔

(۴۱۵)

شد عشق برقِ طاقت و تاب و توانِ من | زد شعلہ اے کہ در زدہ آتش بہ جانِ من
خاموش از آں شدم کہ تفِ سوزشِ دروں | مانندِ شمع سوخت سخن بر زبانِ من
اخلاص ہم دگر بہ جہاں رسمِ کہنہ بود | عیبے شدہ ست عشق ہمیں در زمانِ من
بسیار استخواں شکنی کردہ ام چہ دور | گردد اگر نشانۂ تیر استخوانِ من
مرغانِ باغ از دلِ شب تا دمِ سحر | مذکور می کنند بہم داستانِ من
چوں شمع گرم رہ چو شوم خامشی گزیں | گم می شوم چناں کہ نہ یابی نشانِ من
با موجِ بحرِ نور طرف شد ہلالِ عید | ہر چند یک کنارہ رسیدش زخوانِ من
من آں مقدسم کہ ازیں رہ چو بگذرند | بوسند قدسیاں بہ نیاز آستانِ من
آں نیستم کہ تابِ جفائے تو داشتم | اکنوں مباش ایں ہمہ در امتحانِ من
با ایں قدِ خمیدہ بلائے زمانہ ام | امروز در جہاں نہ کشد کس کمانِ من
ہر چند تن بہ خواریِ خود دادہ ام ولے | سوگند می خورند عزیزاں بہ جانِ من
پروائے کج پلاسیِ گردوں نمی کنم | ارفع بود بہ فقر ازیں سفلہ شانِ من
آں قدرناشناس پئے خاطرِ رقیب | آخر کشید پردہ ز رازِ نہانِ من

در عشق میرؔ خوردہ فنددشی گزیدہ ام
لختِ دل است جملہ متاعِ دکانِ من

(۴۱۶)

یک رہ بہ سر نیامد از لطف دلبرِ من | دورم ز خاکِ پایش اے خاک بر سرِ من
باید کہ پاسِ دل را چندے نگاہ داری | نادیدہ روزگار است آغوشِ پرورِ من
تا رفتہ ای ز چشمم اے خوب تر ز یوسف | پیراہن است آبی چوں نیل در برِ من
از بوستانِ جنت دارد دلم فراغے | قدِّ تو طوبیِ من لعلِ تو کوثرِ من
دیدم ز دستبردش بے دین و دل بسے را | تُجْز بد نہ باختت باکس خوب ستم گرِ من
آئینہ دار ایں جا تا چشم باز کردم | خلقے ہجوم دارد ہر صبح بر درِ من

آخر ز گریہ ناکی رسوائے خلق گشتم
شد میرؔ کارضائع از دیدۂ ترِ من

(۴۱۷)

تنگ شد حوصلہ آخر چہ قدر خوں خوردن / بہر ایں ہستی موہوم و بہ حسرت، مُردن

خودکشی کن کہ تہِ تیغِ کسے بنشینی / ننگِ عشق است ولا جاں بہ سلامت بُردن

شکرِ ایں حسن مگر در پے ایذا شدن است / اے جوان چُمن نہ دارد دلِ کس آزردن

بے نیازیِ فقیراں ز رعونت مشمار / مصلحت نیست ترا بر سرِ ناز آوردن

یک رہش میر بتر گیرو بگفتار بہ کام

چند خود را زرہِ ذوق بہم افشردن

(۴۱۸)

شد گلستان از خیالِ دلبراں زندانِ من / یوسفستاں گشت آخر کلبۂ احزانِ من

دل کہ از من می بری بارے پئے تسکیں بگو / ہیچ می دانی رہ و رسمِ وفا را جانِ من

بس کہ کارِ گریہ ام اے میر بالا رفتہ است

غرقہ دارد ابر ہم از دیدۂ گریانِ من

(۴۱۹)

آتش بہ دل زند نفسِ آتشینِ من / سوراخ در جگر کند آہِ حزینِ من

من سخت شیشہ جان ام و آں غیرتِ پری / سرگرمِ کینہ سنگ بہ کف در کمینِ من

شب ہا بہ وقتِ گریہ چو بر چشمِ تر کشم / چوں برق رُوئے ابر بود آستینِ من

در حضرتِ تو بردہ ام از بس کہ سجدہ ہا / سائیدہ شد بسانِ مہِ نو جبینِ من

ابرو ترش نمودہ بہ مرگم نشست و رفت / یعنی کہ بر نہ داشتہ دل را ز کینِ من

خوارم نہ من کہ از نگہِ کافرکے / از راہ رفتہ اند عزیزانِ دینِ من

خوب است ضبطِ نالہ کنم یک دو روز میر

آزردہ خاطر است ز من ہم نشینِ من

(۴۲۰)

یا بیا تلخِ او گوارا کن / یا برو ترکِ ایں تمنا کن

ہم چو من گر سرِ جنوں داری / اوّل اے شیخ عقل پیدا کن

آں کمر ہیچ بود و بگرفتم　　دستِ غیب مرا تماشا کن
واجب است آب گیری شمشیر　　رحم بر جانِ غم کشِ ما کن
پے طوفِ حرم چہ می گردی
سعی کن میر در دلے جا کن

(۴۲۱)

نہ پنداری کہ آسان است باکینش طرف گشتن　　جگر می خواہد اے دل ناوکِ او را ہدف گشتن
چو سیلابے کہ می افتد بہ ریگستاں گزار او　　بہ ہر گامم درایں رہ پیش می آید تلف گشتن
گدایم میر لیکن دستِ خواہش زیرِ سر دارم
نمی آید زمن درکوچہ ہا کشتی بہ کف گشتن

(۴۲۲)

نہ دارم بیش ازیں تابِ جفا من　　ترحم کن کہ آخر تا کجا من
رو دشمن الٰہی بستہ باشد　　ہنوز آں بد زباں خوب است با من
سخن کوتاہ شد تا جاں سپردم　　تمامی گفتگو بود است با من
کشی ہر دم صفیرم از پے سر　　تو بلبل نیستی یک رو زیا من
منہ دل بر خرابِ آبادِ عالم　　خطرگاہ است ایں صحرا نہ ما من
بسانِ گرد باد از وحشت اے میر
بباید بودنت برچیدہ دامن

(۴۲۳)

خواہم چو ابر بے تو بہ صحرا گریستن　　دامن بہ رو کشیدن و دریا گریستن
بر چشمِ ما کسے نہ کشید آستیں ز لطف　　ماایم و کلبۂ غم و تنہا گریستن
فرصت غنیمت است اگر یک نفس بود　　اے صبح خندہ از تو و از ما گریستن
یک جا گر اتفاق شود گریہ خوشتر است　　داری تو ہم سحاب سرے با گریستن
دوش از چہ بود دیدۂ خوں بستۂ تو میر
چوں زخمِ تازہ پختہ سراپا گریستن

(۴۲۴)

هر لحظه نهان سوے تو باشد نظرِ من | از عشق بلائیست عجب زیرِ سرِ من
از فرطِ تپش دوش چه گویم که چه دیدم | صد مرتبه برگشت ز مژگاں جگرِ من
در فکرِ تُرا غم نفسِ خویش مسوزید | عمرے ست که گم گشت عزیزاں خبرِ من
من جاں بکنم خوب و جگر خوب خراشم | بر سنگ زدن تیشه نه باشد هنرِ من
چوں نقشِ قدم هست گر امروز نمودم
فرداست که اے میرؔ نه یابی اثرِ من

(۴۲۵)

رفتن ضرورت است دلا اضطراب کُن | فرصت کم است دورِ فلک را شتاب کُن
دارم شُبتے بلا به سرِ عالم آورے | جورِ زمانه در ستمِ خود حساب کُن
دارد فلک فسرده دلت تا لبِ چو موم | آہے بکش ز سوز و دلِ سنگ آب کُن
آرام و عشق میرؔ عجب جمع می شوند
داری اگر خیالِ کسے ترکِ خواب کُن

(۴۲۶)

محبت پیشه ام دارم جگر خوں | دلِ من می تپد بسیار در خوں
شد آں عهدے که مژگاں نم نمی شد | کنونم می چکد از چشمِ تر خوں
از آں روزے که بستی بر کمر تیغ | به کویت مانده ظالم تا کمر خوں
به تن از گریه ام رنگے نه مانده ست | کمر را بسته ای ناحق تو بر خوں
به گُل بنشسته دشمن تا به گردن | مرا بگذشته در بر مش ز سر خوں
بیا مانندِ زخمِ تازه تا چند | رود از دیدهٔ من هر سحر خوں
دمے صد بار چشمت خوں ببارد
بیاید از کجا میرؔ ایں قدر خوں

(۴۲۷)

گه سنگ زدن بر سر گه پاره جگر کردن | چندے به سر کویش هر نوع بسر کردن

می گریم و می نالم لیکن ہمہ تن یاسم — کز اشک سرایت شد و زنالہ اثر کردن
دیدم ہمہ می آید زاں چشم و نمی آید — بر حالِ وفاداراں از لطف نظر کردن
از مضطرب الحالی صد بار بہ لب آید — افتادہ مگر جانم در فکرِ سفر کردن
اے میرؔ مشو غافل از وقتِ عزیزِ خود
ایں بے خبری تا کے شرط است خبر کردن

(۴۲۸)

از خلفِ وعدہ خوباں تا کے حیا نہ کردن — ہر روز وعدہ کردن یکٹ رہ وفا نہ کردن
زیں صید پیشہ ترکاں ایں طور یادگار ست — مرگِ اسیر دیدن لیکن رہا نہ کردن
عادت پذیرِ لطفت اے شوخ دیگران اند — ظلمے ست بے نہایت بر من جفا نہ کردن
از غم کشانِ او ماند ایں رسم در زمانہ — کز فرطِ دردِ مُردن ہرگز دوا نہ کردن
پیری رسید و آمد نزدیک وقتِ رفتن
تا چند میرؔ صاحب ترکِ ہوا نہ کردن

(۴۲۹)

نیامد یک تپش از بسملِ من — کہ شد حیرانِ حسنِ قاتلِ من
دمے استادم ایں جا و گذشتم — کہ بود آں سوے عالم منزلِ من
دلم می گوید آں بحرِ بلا ام — کہ پیدا نیست ہرگز ساحلِ من
درونم سوختی اے بت زسختی — کباب سنگ شد آخر دلِ من
بیا بعد از نمازِ جمعہ بشنو — خواصِ من ز پیرِ کاملِ من
تو مستغنی و دل را اضطراب ست — خدا آساں نماید مشکلِ من
بہ آں مقصود رہ بردن دلیل ست — کہ حق بودہ ست سعیِ باطلِ من
بہ ایں تلخی پےِ خونم فتادہ ست — چہ شیریں است اے ہمدم گلِ من
دریں فن گرچہ کم گو بودہ ام میرؔ
و لیکن عالمے شد قائلِ من

---

لہ نسخہ بدل، نیز نقلِ رام پور "گاہے وفا نہ کردن"

(۴۳۰)

سر رفت و گشت باعثِ راحت برائے من ‌‌‌‌‌ مردن بہ راہِ عشق تو آمد بہ پائے من
مجنوں گذشت و بندہ نشستم بہ جائے او ‌‌‌‌‌ تا بعدِ مردنم کہ نشیند بہ جائے من
در عیش گاہ رحل اقامت نیفگند ‌‌‌‌‌ عادت پذیر بودنِ ماتم سرائے من
کے گفتہ ام کہ ترکِ مروت مکن و لے ‌‌‌‌‌ یک چند شرم دار زروئے وفائے من
با غیر بادہ خورد و مرا تلخ ہم نہ گفت ‌‌‌‌‌ بسیار آب می برد ایں ماجرائے من

خواہم کہ میرؔ یار شود عاشق کسے
تا ہمدمِ غمش نہ شود کس سوائے من

(۴۳۱)

از ہر کسے نیاید صرفِ نیاز گشتن ‌‌‌‌‌ ایں جا چو موم باید یکسر گداز گشتن
ایں جمع رفتنی را دریاب و مغتنم داں ‌‌‌‌‌ چوں عمر کس نہ دارد امیدِ باز گشتن
تقریبِ راحتِ دل بہتر ازیں نہ دیدم ‌‌‌‌‌ ہر چند قبح دارد بے امتیاز گشتن
بنشیں دمے و بنگر احوال جاں گدازاں ‌‌‌‌‌ مغرورِ حسن و خوبی تا کے بہ ناز گشتن

افگن بساطِ عشرت چوں سبزہ میرؔ تا کے
در سایۂ درختاں بے برگ و ساز گشتن

(۴۳۲)

سرم بجاست اگر رفت در سرِ خوباں ‌‌‌‌‌ علاقہ داشت دلِ من بہ خنجرِ خوباں
ہمیشہ سرخ بہ خونِ شکار می باشد ‌‌‌‌‌ خدنگ بیر جفا زخم پرورِ خوباں
ازیں حدیقہ کہ سرسبز تا قیامت باد ‌‌‌‌‌ خوشم فتاد قیامت گلِ ترِ خوباں
بہ زلف و کاکل و خط می کشد دلم ہر دم ‌‌‌‌‌ چہ خوش سواد فتادہ ست کشورِ خوباں

بیا و میرؔ سرانجامِ عشق بیں کآخر
گلوے خویش بریدیم بر درِ خوباں

(۴۳۳)

رفتم ز خویش آخر از فرطِ دل تپیدن ‌‌‌‌‌ دشوار می نماید اکنوں بہ خود رسیدن

اے کاش دل زچشم یک بارگی بیفتد | تا چند قطرہ قطرہ خوں از مژہ چکیدن
من خود فقط نہ بُردم باخویش ناامیدی | پوشید چشم خلقے در آرزوئے دیدن
ہر چند از ایں بیاباں بوئے فتیلہ آمد | در خاطرم نیامد اندیشۂ رمیدن
ایں گونہ دلبرے را دامن کہ می گذارد | اے گل فروش باید دستِ ترا بریدن
از جوشِ اشکِ خونیں سطرے نوشتہ ام من | رنگیں حکایت است ایں یکدم تواں شنیدن

کس نیست بابِ صحبت دل باکہ انس گیرد
خوب است میرؔ چندے درِ را بہ رو کشیدن

(۴۳۴) [دوغزلہ]

برباد شد بہ راہِ تو مشتِ غبارِ من | یک رہ نیامدی ز وفا بر مزارِ من
رسوائے عشق آخرِ کارم قرار داد | بر ہر سخن گریستنِ زار زارِ من
باسرکشی چو نقشِ قدم نیست نسبتم | اُفتادگی ست شیوۂ اہلِ دیارِ من
گامے ہزار اشک چو ابرم ز دیدہ ریخت | دشوار شد زوادیِ مجنوں گذارِ من
کشتی مگر روانہ شود در شطِ شراب | خُم خانہ خود نہ گشت حریفِ خمارِ من
طفل است[1] روزگار محبت نہ دیدہ است | مہر و وفا مدار توقع ز یارِ من
آوازہ ام گرفت چو عنقا تمام شہر | شد گوشہ گیریم سببِ اشتہارِ من
یارے کہ پائمالِ غمِ ہجرِ اوشدم | از دست رفت کار نیامد بہ کارِ من

گلگونیِ سرشک و دلِ داغ داغ میرؔ
رنگِ بہار ریخت بہ جیب و کنارِ من

خواہم کہ فکرِ یک دو سہ بیتِ دگر کنم | تا ماند ایں غزل بہ جہاں یادگارِ من

مطلعِ دوم

عزت تمام رفت و نہ ماند اعتبارِ من | در کوے تو ز آمدنِ بار بارِ من
باآں کشش جہت ز تو لبریز گشتہ بود | مُردم در انتظار و نہ گشتی دُچارِ من
قامت ز داغ ہر بنِ مو گشت گلبنم | حیف از غرورِ حسن نہ گشتی بہارِ من

[1] نسخہ بدل، نیز نقلِ رام پور "نہ دیدی"

در صحبتِ نخست بہ تاراجِ غمزہ داد — ایمان و دین و ہوش و حواس و قرارِ من
از داغ تا بہ داغ بود فرق اے نسیم — بنما بہ لالہ این جگرِ داغ دارِ من
یارب کجا ز بے خودیِ عشق رفتہ ام — چشمم سفید شد بہ رہِ انتظارِ من
صد حیف در محبتِ آں ترکِ شوخ چشم — شد با ہزار رنج بسر روزگارِ من
پنہاں ز ناکسی اگرش از نظر شوم — گوید کہ مفت رفت دریغا شکارِ من

این حرف گفتنی ست بہ دیوار و در کہ میر
رفتہ ست کارِ چشمِ تر از اختیارِ من

(۴۳۵)

ہر شب نشینم از غمِ او تا کمر بہ خوں — دست و دہانِ خویش کشم ہر سحر بہ خوں
مسکیں کبوترے کہ بر او بود نامہ ام — آغشتہ یافتند از او بال و پر بہ خوں

چنداں تعب کشیدم بسملم کہ یار
ہرگز کمر نہ بست کسے را دگر بہ خوں

(۴۳۶)

دل مگر مردی ز جورِ آسماں دادے بکن — دست زن در دامنِ صحرا و فریادے بکن
خاکم از کوے کسے بسیار دور افتادہ است — اندک اندک اے صبا ہر روز امدادے بکن

می برد از بزمِ عیشت طالعِ برگشتہ ام
جرعہ اے بر خاک اگر ریزی ز من یادے بکن

(۴۳۷)

برِ ہر کہ چند گریم ز عذابِ دردِ دنداں — نہ خورم بہ بزم چیزے نہ شوم ز شرم خنداں

دلِ آئینہ مثالم شدہ دیدنی و لیکن
نہ شد آں کہ رو دہندش دمِ چند خود پسنداں

(۴۳۸)

تا سوزِ عشق رفے خود آورد سوے من — چوں شمع اشک متصل آید بہ روے من

گم شد مرا چو جانِ عزیز آہ یوسفے
سوئے نہ داد در رہِ او جستجوے من

(۴۳۹)

غیر ہر چند دہد یاد فراموشیِ من ، خواہد آمد بہ سخن یار ز خاموشیِ من
عید تقریب خوشے بود ولیکن صد حیف
ماند بر عید دگر از تو ہم آغوشیِ من

(۴۴۰)

گر ز تیرِ عشق جاں قربانِ او خواہد شدن ، استخوانم کرسیِ پیکانِ او خواہد شدن

(۴۴۱)

بہ رہش گذار می کن و لے لے صبا نہ چنداں ، کہ رود بہ باد یکسر کفِ خاکِ دردمنداں

## ردیف و

(۴۴۲)

چساں قصدِ رفتن کنم از درِ او ، نہم پاے ایں سو رود اشک آں سو
بہ دل داشتم چوں کماں زہ نماید ، جگر را ہدف سازم اما جگر کو
تو ہمچیاں کُشل خط برآوردی و من ، تجاوز نہ کردم ز پیماں سرِ مو
بہ قدغن نمایند قطع زبانش ، کند ہر کہ مذکور جنت در آں کو
بلاے سیاہ ہست اے میرؔ ہر یک
چہ زلف و چہ کاکل چہ چشم و چہ ابرو

(۴۴۳)

کے بے اشارتِ نگہِ شوخ و شنگِ تو ، شمشیر می کشد مژۂ پیش جنگِ تو
اے عشق ناخوش از تو فقط کوہکن نہ رفت ، پاے چو او ہزار کس آمد بہ سنگِ تو
دستِ ستم بہ خونے کہ بُردی فرو دگر ، رنگیں بہ رنگِ پنجۂ گل گشت چنگِ تو
ایماے ابروے تو بہ ہر جاے کار کرد ، گاہے نہ دیدہ ام دو کمانہ خدنگِ تو
شمشاد الف بہ پیشِ قدت می کشد بہ خاک ، گل می شود عرق عرق از شرمِ رنگِ تو
طفل ای کہ از حلاوتِ تلخت خبر نہ ای ، شہد است در مذاقِ عزیزاں شرنگِ تو
تا کے سخن ز سبزۂ خطِ بتاں کنی
شعر است میرؔ ایں کہ خیالاتِ بنگِ تو

(۴۴۴)

بہ آنے دل ز صدہا می بری تو | بلا ای فتنہ ای جادوگری تو
بہ خوبانِ گلستانت چہ نسبت | ز گل صد پیرہن نازک تری تو
بہ ہر گام این بیابان گریہ می خواست | گذشتی ہم چو صرصر سرسری تو
بہ این خوش صورتی آدم نہ دیدم | گرو بُردی بہ خوبی از پری تو
بُوَد لافش دروغِ بے فروغے | زمہ صد شہر نورانی تری تو
ز چشمم رفتہ خوں سیلاب سیلاب | چہ دور از خونِ من گم بگذری تو
خیالِ کعبہ و دیرت ہمان است | دلا از مدتے بر ہر دری تو
اگر بر ہم شود سودا عجب نیست | متاعِ من دل است و مشتری تو
جوابِ این جفا و جور و بیداد | چہ خواہی گفت روزِ داوری تو

کمانت میرؔ نتوانم کشیدن
بہ این قدِّ دوتا زور آوری تو

(۴۴۵)

ہرگز ز من نیامدہ ترکِ ہوائے او | آخر شدم بہ خاک برابر برائے او
غافل مشو ز قافلۂ عمرِ رفتنی | کم می رسد بہ گوش صدائے درائے او
دردے ست دردِ عشق کہ جز مرگ در جہاں | ہرگز نہ یافتند مناسب دوائے او
چوں مو ضعیف گشتنم افشائے راز کرد | بر سر شکست کاسہ مرا از جفائے او
ہر مظہرے کہ می نگرم عینِ ظاہر است | ہرگز نیامدم بہ نظر ما سوائے او
رہ می رود چناں کہ بہ ہر گام می شود | بیدار خونِ خفتہ ز آوازِ پائے او
کے پیشِ منعمانِ جہاں می شود دراز | بالینِ زیرِ سر شدہ دست گدائے او
داغم ز اختلاطِ پریشانِ جلوہ اش | نبود دلے کہ نیست در او گرم جائے او

دیدم کہ رفتہ رفتہ بہ بستر فتاد و مرد
میرؔ آں کہ تکیہ کرد بہ عہدِ وفائے او

(۴۴۶)

دهد دادِ شستِ تو نخچیرِ تو    که برداشت رنگ از دلش تیرِ تو
من ای گریه چشم از تو می داشتم    نه دیدم ولے ہیچ تاثیرِ تو
به صد رنگ گل جلوه گر شد ولے    مرا در نظر بود تصویرِ تو
من از طورِ خود کشته گردیده ام    به خوں ریزِ من نیست تقصیرِ تو
کُجا ایں جراحت جراحت نه شُد    مگر زہر بود آبِ شمشیرِ تو
به حدّے خرابی تو اے شہرِ دل    که مقدورِ من نیست تعمیرِ تو

به خوف ام ز شورِ مزاجِ تو میرؔ
مبادا شود پاره زنجیرِ تو

(۴۴۷)

ہرگز نمی شود که نیایم به سوے تو    یا چشمِ من ز شوق نیفتد به روے تو
از کار رفتنِ دلِ من نیست بے سبب    می آیدم ز ہر گلِ ایں باغ بوے تو
طوفم نه داد دست و زعمرے ست در برم    از خاکِ راه جامۂ احرامِ کوے تو
گر در بغل به کامِ من آئی چه می شود    دارم دلے که خوں شده در آرزوے تو

پیدا نه گشت ہر که قدم در رہت گذاشت
تنها نه میرؔ گم شده در جستجوے تو

(۴۴۸)

ناصح جنوں زیاده شد آخر ز پندِ تو    نفعے نه کرد داروے ناسودمندِ تو
در کُشت و خونِ اہلِ نظر اے زباں دراز    کوتاہی اے نه کرد نگاهِ کشندِ تو
خوش قامتے چو یار به بر تنگ می کشی    اے جامه رشک ہاست به بختِ بلندِ تو
زنہار از نزولِ ملائک رضائیم    بر خاکِ من بس است گذارِ سمندِ تو
دل جمع کرده ام ز رہائیِ خویشتن    کُافتاده ام بسانِ گره در کمندِ تو
دشوار مُردنم اگر آساں شمرده ای    افسوس از طبیعتِ مشکل پسندِ تو

شاید که میرؔ محنتِ بے حد کشیده ای
خوں می تراود از سخنِ دردمندِ تو

(۴۴۹)

اے عمر برق جلوہ دلِ من فدائے تو | گرم از برم گذشتی و گرم است جائے تو
یک رہ نقاب برفگن اے مایۂ حیات | در فکرِ مردن است جہانے برائے تو
اکنوں بداں سرم کہ بمیرم بہ ذوق اگر | دستم دہد گذاشتن سر بہ پائے تو
زنہار من بہ باغ نمی بستم آشیاں | معلوم کردمے اگر اے گل وفائے تو

ہر کس کہ دید طورِ تو با من بہ طنز گفت
گر میرؔ آشنائے تو این است وائے تو

(۴۵۰)

خوش است آں گوہر و خوش آبیِ او | ولے خوں شد دل از نایابیِ او
تر آمد مہر چو از برقع برآمد | شباں گیہ چہرۂ مہتابیِ او
بہ دل می چیدم بسیار امسال | فضائے وحشت و خوش سیلابیِ او
غمِ بے انتہائے دیشبِ من | شد آخر باعثِ بے خوابیِ او
چہ گویم آہ از دریائے ہستی | کہ آتش زد بہ دل کم آبیِ او
جگر خوں کرد لعلِ بے بہارا | ز خوش رنگی لبِ عنابیِ او
مپرس از جانِ صاحب مردۂ من | چہ ہا می بینم از بے تابیِ او
فریب است اتقائے شیخ دریاب | تہِ سجادۂ محرابیِ او

نہ دارد میرؔ غیر از آفتابے
ہمہ داغ ام ز بے اسبابیِ او

(۴۵۱)

مے در عرق افتادہ است از نرگسِ شہلائے تو | گل برگ سرخ و زرد شد از خوبیِ لب ہائے تو
اے گردِ سر گردم ترا بسیار می چسپی بہ دل | صد داغ دارد سینہ ام از خوبیِ ہر جائے تو
تا قدِ ناز افراشتی ہرگز نیامد آفتے | دارد مگر در دل بلا اندیشہ از بالائے تو
افتادہ خلقے بر درت غوغا اگر سر می کشد | یک روز خوں خواہد شدن بر خاکِ زیر پائے تو

یک چند ترکِ عشق کن بسیار لاغر گشتہ ای
اے میرؔ نسخے ہم نہ ماند از جسمِ غم فرسائے تو

(۴۵۲)

در دمے صد بار خوں گریند بیمارانِ تو — قابلِ تدبیر اند ظالم زرد رخسارانِ تو
با الم دست و بغل رفتند آخر زیرِ خاک — بہ نہ شد زخمِ نمک بندِ دلِ افگارانِ تو
من نمی گفتم کہ با ایں بے تہاں صحبت مدار — عاقبت مے خوردنت ظاہر شد از یارانِ تو
چشم را نکشودی از ناز ارنہ اے مغرورِ حسن — دیدنی بودند مردم در گرفتارانِ تو

بر مزارِ میر شب رفتم عجائب جلوہ داشت
ایں جواں شاید کہ بود از ناز بردارانِ او

(۴۵۳)

یارب چہ روز بود کہ دل گشت یارِ او — تا زندگی دگر نہ شدم من دوچارِ او
در عینِ جوشِ داغِ جگر رفتم از جہاں — باغے رساند عشق و نہ دیدم بہارِ او
شمشیرِ جورِ یار نہ دانم چہ ذوق داشت — ہرگز نہ شد بہ زخم تسلی شکارِ او
شد بعدِ خاک گشتنِ مجنوں چو گرد باد — آوارہ گردِ بادیہ مشتِ غبارِ او
چشمم چو نقشِ پا بہ سفیدی رسیدہ است — گردے سرے نمی کشد از رہگذارِ او
نتواں بپائے آبلہ رفتن بہ دشتِ شوق — کز شیشہ ریزہ شوختر افتادہ خارِ او

بر خاکِ میر صبح گذارم فتادہ بود
ہنگامہ شد ز شورِ ملک بر مزارِ او

(۴۵۴)

ہمیں شکستنِ دل نیست کارِ الفتِ او — ہزار خانہ خرابی ست در محبتِ او
اگر قمر کندت دلکشی سیہ بخت است — ور آفتاب شود چہرہ با تو شامتِ او
ز فرطِ شوق چہ سختی کہ کوہکن کشید — ولے دریغ کہ برباد رفت محنتِ او
نگارِ من بہ چمن رفت تا کہ بنشیند — گلِ شگفتہ نہ دارد دہانِ صحبتِ او
بہ باغ پیشتر از آفتاب می آئی — اگر بہ صبحِ چمن مائلی ای سعادتِ او

ز بس کہ بر سرِ تابوتِ میر کثرت شد
نہ داد دست بسے را نمازِ میتِ او

(۴۵۵)

تا چند سر بہ سنگ زند کس ز قہر تو  مُفتے زدہ ست آں کہ بدر زد ز شہر تو

جاں داد میرؔ و زندگی جاوداں بیافت
اے وائے بر کساں کہ نہ مُردند بہر تو

(۴۵۶)

صبح برخیز و پے بادہ گدایانہ برو  شئ للہ زناں بر درِ مے خانہ برو

یا منہ پائے بہ میدانِ محبت یا میرؔ
ترکِ سر گیر و در آں معرکہ مردانہ برو

ردیف ہ

(۴۵۷)

رہ در جہاں فتاد چو باجانِ سوختہ  دیدیم تُند باد و بیابانِ سوختہ

عشقے ز سینہ سوختگانِ وفا بگو  گر بر خوری صبا بہ جوانانِ سوختہ

گرمِ تلاشِ صحبتِ آسودہ اے مباش  دستے بزن بہ گوشۂ دامانِ سوختہ

داغ ایں چنیں ز منتِ دوناں نمی شدیم  می ساختیم گر بہ لبِ نانِ سوختہ

اے بادِ صبح گر تر سم در کنار ریز  شایستہ نیست گل بہ گریبانِ سوختہ

حالے از آں عمارتِ خوش طرحِ دل مپرس  افتادہ اند یک دو سہ ایوانِ سوختہ

از شعرِ میرؔ دوش بہ جاں آتشم فتاد
بود آں عزیز طُرفہ سخن دانِ سوختہ

(۴۵۸)

یک دست سبزۂ تر از خاکِ من دمیدہ  وقت است اگر بیاید آں آہوئے رمیدہ

بامے فراقِ خوباں گذراندہ شد بہ خوبی  کس ایں چنیں بلا را ایں گونہ بر نہ چیدہ

ہر گام چشمِ عاشق پنہاں بہ زیرِ خاک است  در کوئے خویش پارا بگزار دیدہ دیدہ

آزاد سبز بختے گاو در بُنِ درختے  دامن بہ رو کشیدہ چوں سایہ وا کشیدہ

در قتل گاہ از دل آواز بر نیامد | شاید ز تیغِ جورش زخمِ رسا رسیدہ
پروانہ دوشِ خود را در بزم زد بر آتش | لیکن نہ گفت چیزے شمع زباں بریدہ
ہر گز نہ شد در ایں عہد تغییر حالتِ او | بودہ ست میر آخر مردِ زمانہ دیدہ

(۴۵۹)

شد گوش زد طورِ تو ام از رہ بہ بزمت بردہٗ | رنجش ز من فہمیدہ کن دارم دلِ آزردہٗ
خواہم دلے پیدا کنم کفر آشنا دیں دشمنے | از کعبہ سر پیچیدہٗ با دَیر رُو آوردہٗ
اے شیخ با پیرِ مغاں یک لحظہ صحبت گرم کن | تا چند تنہا زیستن با خاطرِ افسردہٗ
بس آزمایش کردہ ام پُر ایں قضایا دیدہ ام | در یک نفس جاں می دہد بر دل جراحت خوردہٗ
از میر واقف نیستم لیکن چو شب می آمدم
دیدم جوانِ تازہٗ در رہ بہ حسرت مردہٗ

(۴۶۰)

مرا دلے ست بہ بر چاک چاک چوں شانہ | ز اختلاطِ پریشانِ زلفِ جانانہ
بہ ہر دو گام بُوَد در رہِ غمش مارا | بہ دیدہ اشک و بہ لب نالۂ غریبانہ
بہ بزمِ عیشِ جہاں صبح گہ بیا و ببیں | کہ شمع دودے و خاکسترے ست پروانہ
دمے کہ نالہ کشم عندلیب دم در کش | کہ دم کشی نہ توانی بہ ایں چک و چانہ
نہ تابد از سحر آں آفتابِ طالعِ من | کہ چشم دوختہ ام من بہ روزنِ خانہ
برید کشتۂ مارا دوستاں ببینید | کہ او ہم از غمِ ما رنجہ می شود یا نہ
چہ گویم آہ کہ احوالِ ما نمی گیرد | در ایں دیار کس از آشنا و بیگانہ
بہ ایں غرورش کہ داریم شہر تنگی کرد | نہادہ ایم چو سیلاب سر بہ ویرانہ
بہ سیرِ لالہ و گل می برد بسر عمرے
مگو کہ میر بُوَد سیدِ گلستانہ

(۴۶۱)

اے کہ می پُرسی کہ ای ہستم سپاہی زادہٗ | زخم بر دل خوردہ اسے در خاک و خوں افتادہٗ

بازگشتِ خود نمی بینم بہ روزِ حشر ہم — رفتہ ام از خویش بر طرزِ خرام سادۂ
این نہ دانم کیست لیکن بر سرِ رہ دیدہ ام — دست از جاں شستۂ، آزردہ دل دادۂ
یادگارِ شیخ بسیار است در مے خانہ ہا — جُبّۂ اے پیراہنے عمامۂ اے سجادۂ

میر با اہلِ جہاں ربطے نہ دارد مطلقاً
کے فرود آید سرش مرو بے ست او آزادۂ

(۴۶۲)

نگاہش آں چناں بے خود زبادہ — کہ تا بر من فتد صد جا فتادہ
تبسم گوشۂ آں لالہ رخسار — درِ فردوس بر رُو ہا کشادہ
مپرس از طرزِ رفتارش کہ ہر گام — ز رو ضعِ خود قدم بیروں نہادہ
تہِ نیرنگِ او شکل تواں یافت — کہ در ہر جا بہ صد رنگ ایستادہ
سمندِ ناز از نرمیِ رانش — عنانِ اختیار از دست دادہ
شکایت نامۂ دوری رہ بود — نہ فہمیدی خطِ پیچانِ جادہ
ترا اے گل بہ روئے او چہ نسبت — مگو حرف از دہانِ خود زیادہ

بدیں ساں میر چوں خواہی بسر کرد
کہ او بسیار پُر کار و تو سادہ

(۴۶۳)

یک بار ایں کہ ترکِ ملاقات کردۂ — از من چہ دیدہ ای و چہ اثبات کردۂ
بر جانِ من ز وعدہ خلافیِ متصل — نومیدی و امید مساوات کردۂ
در ہر کسے کہ می نگرم مست و بے خود است — عالم بہ یک نگاہ خرابات کردۂ
می خواستم پیالہ دلِ شب چو آفتاب — اے پیرِ مے فروش کرامات کردۂ
شب ہا بہ گریہ داشتہ ای تا سحر مرا — روزے اگر سلوک و مدارات کردۂ
زاہد فُتد بہ دست کہ تا گوہرِ مراد — من گریہ کردہ ام تو مناجات کردۂ

شعرے نہ شد شنیدہ دریں مدت از تو میر
معلوم شد کہ ترکِ خیالات کردۂ

(۴۶۴)

جرمم چه بود کاین همه بدخواه بودهٔ     تا خون به این ستم زده همراه بودهٔ
جائے نمی رسی که از آن جا نمی روی     غافل تمام عمر تو در راه بودهٔ

رفتی ز سبزه زارِ جهان آن چنان که میرؔ
پیدا نه ای مگر تو پرِ کاه بودهٔ

(۴۶۵)

می نمایم گریهٔ بے اختیارے گاہ گاہ     می دہم تسکینِ جانِ بے قرارے گاہ گاہ
خواہشِ لطفِ تو کردن بے فضولی نیست لیک     گر نہ باشد اکثر اوقات بارے گاہ گاہ

آگه از مجنون نیَم لیک این قدر دانم که میرؔ
می کند گردے از این صحرا غبارے گاہ گاہ

(۴۶۶)

در رہت آہ داغ ہا دیدہ     دل کبابِ گذشته گر دیده
چه قدر ہا پسند می آید     از بتان طورِ ناپسندیده

حیف در شہرِ خوب رویان میرؔ
کس زبانِ مرا نه فهمیده

(۴۶۷)

سر کن که در غزال به چه دل را نهادهٔ     اے عندلیب دیر به دستم فتادهٔ
داغ ام ز غفلتت که از این انجمن چو شمع     ہر لحظہ گرم راہ ای و بے غم ستادهٔ
بر جا نه بودنِ تو دلا نیست بے سبب     شاید قدم به راهِ محبت کشادهٔ
گشتی جوان و فرق نه کردی زیار و غیر     خطّت نمود کرد و ہنوز آہ سادهٔ

از اُفت و خیزِ دم به دم و قصدِ ضبط میرؔ
معلوم می شود که دل از دست دادهٔ

(۴۶۸)

شیخ در عشق پاے گیر شده     این ہوس کشته مفت اسیر شده

امتیاز ز گدا و شاہ نہ ماند　　عالمے بہر او فقیر شدہ
سادگی بود موسم شوخی　　او در ایام خط شریر شدہ
دید ہر کس نزاری من گفت　　ایں جواں راچہ شد کہ پیر شدہ
در غم قامت تو فاختہ نیز
با علم خواں لسان میر شدہ

(۴۶۹)

اے خنک آں کس کہ وقت گریہ را دریافتہ　　کانچہ ہر کس یافتہ از دیدۂ تر یافتہ
بوالہوس انداز کوے آں ستم گر کردہ بود
چشم او تر دید چوں در ہر قدم سر یافتہ

(۴۷۰)

اشک من لغزاں بہ رخسار آمدہ　　ہم چو طفل نو بہ رفتار آمدہ
سال ہا باید کہ آید از سحاب
آں چہ شب از گریہ زار آمدہ

(۴۷۱)

دلا جملہ داغ ای وخوں گشتۂ　　مگر خرج راہ جنوں گشتۂ
کسے می شود زرد بے لعل یار
تو خود میر زار و زبوں گشتۂ

(۴۷۲)

می کند کہ التفاتے بر من بے چارۂ　　آستین کہنہ دارم جامۂ صد پارۂ
گرد بادے دیدم و مُردم ز رشک ایں کہ میر
از غم او خاک بر سر می کند آوارۂ

(۴۷۳)

مرا رنجے ست اے مہ بے تو جاں کاہ　　تو پشت چشم نازک می کنی آہ

(۴۷۴)

درنقش [دو] ابروے توبس دیر کشیدہ[1] نقاشش بہ تنگ آمدہ شمشیر کشیدہ

(۴۷۵)

کرد ازبس خونِ مشتاقاں مصوّر زادۂ شد زمیں دیوارِ صورت کاریِ افتادۂ

## ردیف ی

(۴۷۶)

دلے داریم در بر فو نیازے بلا گردان قدِ سروِ نازے
بہ شہرِ حُسن چوں آئینہ گشتم نہ دیدم دلبرِ عاشق نوازے
چہ می پُرسی کہ در داوِ نخستین دلم شد مالِ شوخِ سخت بازے
برائے عشقِ ایں بالا بلنداں تمنّا می کنم عمرِ درازے
معیشت میرؔ بے دردانہ تا چند
بکائے شیونے حزنے گدازے

(۴۷۷)

مدام دعویِ خوبی بہ یارِ من داری زخلق شرم کن اے گل تو ایں دہن داری
دلا جوابِ غمت از کسے نمی آید تو آں کس ای کہ دریں باب صد سخن داری
شدم بہ باغ و دریغ از گلے نہ پرسیدم کہ از برائے کہ صد چاک پیرہن داری
کدام گل کہ نیفسرد و داغِ یاس نہ شد تو آرزوے تماشاے ایں چمن داری
اگر زخود شدنت دست دادہ خوش دل باش در ایں مقام مکن فکرِ خویشتن داری
بغیرِ ذکرِ بتاں میرؔ بر زبانت نیست
تو اے عزیز مگر کیشِ برہمن داری

---

[1] قیاسی تصحیح۔ مخطوطۂ ادیب نیز نقل رام پور میں "درنقشِ ابروے توزبس دیر کشیدہ" ناموزوں۔

(۴۷۸)

شد در قفسم غم رہائی — معشوقۂ روز بے نوائی
کے از نگہے شود تسلی — تصدیع کشندۂ جدائی

از راہِ طلب خبر نہ داریم — ما ایم و ہمیں شکستہ پائی
ایں مرتبہ زندہ گر بمانیم — دیگر نہ کنیم آشنائی

در عشق و ہوس تمیز سہل است — از خانہ اگر بروں بیائی

دوشم گذرے بہ کویش افتاد — امّا بہ بہانۂ گدائی

شد میرؔ فقیر و از عزیزاں
ہرگز نہ کشید میرزائی

(۴۷۹)

یک لحظہ بہ سر خستۂ خود را نہ نشادی — یک دم بہ خبر پرسشِ او لب نہ کشادی
بلبل حقِ صحبت مگرت یاد نہ بودہ ست — کز باغ گذشتیم و تو آواز نہ دادی

اے صیدِ حرم ذوقِ شہادت تو چہ دانی — نے تیغ بہ سر دیدی و نے کشتہ فتادی
داغ ایم ز واماندگیِ قافلہ اے کاش — از دور سیاہی بکند آتشِ وادی

امروز فلک بر سر لطف است عجب نیست
گر پا بہ زمینم نہ رسد میرؔ ز شادی

(۴۸۰)

نہ آہِ سینہ خراشے نہ نالۂ زارے — شبِ فراق بہ پایاں چساں رسد بارے
یکے بہ دیدنِ دل خستگانِ شوق بیا — کہ دیدہ اند برائے تو رنج بسیارے

نہ شد کشودِ دل از کوچہ گردیم اکنوں — بداں سرم کہ بیفتم بہ پائے دیوارے
مرو بہ سوئے قفس اے صبا گلے در دست — مباد رنجہ شود خاطرِ گرفتارے

صدف ز گوشش مہے یاد می دہد مارا — گہر ز اہلِ زبانے ست حرف تہ دارے
سپاسِ عشق بجن میسر ہر کرا نہ دہند
دلِ ستم زدۂ دیدہ جگر بارے

لہ نقلِ رام پور "کشیدہ"

(۴۸۱)

| | |
|---|---|
| چہ بدن ہاے خود نما داری | پیرہن پیرہن صفا داری |
| پیش ازاین پاسِ عشق ختنے داشت | حالیا ننگ شد وفا داری |
| سادگاں گرچہ عالم آشوب اند | تو زخط عالمے جدا داری |
| تیغ در دست می رسی ہر دم | من نہ دانم چہ مدّعا داری |
| ہمرآں رشکِ باغ داغ شدم | در من آتش زد این ہوا داری |
| زرخ یار دیدہ ای لے گل | دست زیر زنخ بجا داری |
| [یادِ][1] عبدِ ضعیف خواہی کرد | [بعدِ مَن][2] گر سرِ جفا داری |
| از بتاں گو نہ شد کشود اے دل | این ہمہ غم مخور خدا داری |

خوبیِ بے زری چہ گویم میرؔ
بد بلاے ست عشق و ناداری

(۴۸۲)

| | |
|---|---|
| ہرچہ امّید دل زجا رفتی | سوختی خوں شدی و وا رفتی |
| پنجۂ گل بہ دامنت نہ رسید | از گلستاں بہ کبریا رفتی |
| بودہ ای تا بہ قتل ہمرا ہم | این نہ دانم دگر کجا رفتی |
| طالعِ کشتہ اے کہ با نعشش | تا سرِ خاک پا بہ پا رفتی |
| اے کہ با زلفِ او سرے داری | آہ دانستہ در بلا رفتی |
| چہ بگویم کہ بر دلِ زارم | حیف ہا رفتہ است تا رفتی |
| کشتہ ام ہرکہ دید گفت سزاست | این ہمہ پیشِ او چرا رفتی |

میرؔ مُردی و چشم جانب دست
تو بہ گشتن ازاین دا رفتی

---

[1] و [2] قیاسی۔ مخطوطۂ ادیب میں کرم خوردہ، نقلِ رام پور میں یہ شعر نہیں ہے۔

(۴۸۳)

ہر گاہ سفیدی بکند ابرِ سیاہے ۔ مے نوش کہ ضائع نہ شود وقتِ گناہے
قربانیِ اندازِ کہ بودہ ست ندانم ۔ دیدیم ستم کشتۂ جوانے سرِ راہے
گر سر کشد از تربتِ من سرو عجب نیست ۔ بودہ ست دلم سایۂ روِ قامتِ آہے
خوش باشد اگر صحبتِ رنداں خوشت آید ۔ ایں جا نہ عصائے نہ ردائے نہ کلاہے

از میرؔ نہ دانیم ولے می گذرد کس
با حالِ تباہے زسرِ کوے تو گاہے

(۴۸۴)

گاہے نہ رفتہ گامے دل خواہِ تشنہ کامے ۔ خوردہ ست ابلقِ چرخ بس آب بے لجامے
زآں ہا کہ ایں عمارت زیرِ نگینِ شاں بود ۔ اکنوں نہ ماندہ باقی آثارِ غیرِ نامے
بارو ے دل کشِ آں گاو رشکِ آفتاب است ۔ کے می شود برابر چوں ماہ نا تمامے
نیرنگِ عشق بنگر دارد بہ ہر دیارے ۔ رسمے، رہے، طریقے، پیغمبرے، امامے

مصروفِ دیدنِ تست اے دشمنِ دل و جاں
ہرگز نہ دیدہ ام من چوں میرؔ دوست کامے

(۴۸۵)

خوش است اے بے وفا گر چند روزے رخ بگردانی ۔ زنی حرفے بہ ابرو تا کجا و رو بگردانی
بہ رنگے نازک ای کز خوابِ بے تابانہ برخیزی ۔ اگر بر بسترِ برگِ گلے پہلو بگردانی
تو اے گل در چمن بر خویش می پیچی و می ترسم ۔ صبا از سیلیِ پائیز رنگِ او بگردانی

نمی فہمی تو اے میرؔ از نہ خلقے رو بہ تو آرد
اگر یک لحظہ روے دل بہ سوے او بگردانی

(۴۸۶)

مرا ہم دلے بود نشنودہ پندے ۔ ستم دیدۂ عاشقے دردمندے
مگو دل در ایں راہ گردد دلیلم ۔ نہ شور و درائے نہ گردِ سمندے
چو آئینہ حیرانِ کارِ دل ام من ۔ کہ کارش فتادہ ست با خود پسندے

چو در جلوہ دیدیم بالاے او را بگفتیم از دورِ عشق بلندے
قرارے نہ دارد دلت میرؔ ہرگز
ہمانا کہ عاشق شدی بر لوندے

(۴۸۷)

چہ گویم آہ از دستِ جفاے شوخِ بے باکے دلے دارم بر اُو زخمے جگر دارم بر او چاکے
دلِ بشگفتہ اے باید صبا از بہرِ گلگشتے تو و ایں خاطرِ شاد ے من و ایں جانِ غم ناکے
فراغت دارم از طوبیٰ و احسانِ بہشتِ تو مرا بردہ ست خواب اے شیخ زیر سایہ تاکے
نشستم مدتے در بزم مستان و دمِ رفتن بہ رنگِ ابرِ تر برخاستم با دامنِ پاکے
درآں جائے کہ سر می زد شب از من شعلۂ آہے نہ شد معلوم آں جا صبح دم عنبر از کفِ خاکے
گُل افشاں اے نسیمِ صبح کن خاکِ عزیزاں را بیفشاں بر مزارِ ما غریباں مُشتِ خاشاکے
بہ امیدے کہ دارد میرؔ ہر نخچیر ایں وادی
گلوئے بابِ شمشیرے سرے شایانِ فتراکے

(۴۸۸)

ز تُرکِ چوں تو اے حیف است محرومیِ نخچیرے کمندے نیزہ اے تیغے کمانے ناوکے تیرے
بہ بدنامی نمودی شہرہ و با قتلِ ہمراہی نہ کردی در حقِ ما بے کساں اے عشق تقصیرے
بہ تسلیم دمے در صید گاہِ عشق آسودم گذر کردم بہ آسانی ز آبِ تیزِ شمشیرے
بہ بزمِ عیشِ او استادنم خاموش از حیرت بداں ماند کہ بر دیوار چسپانند تصویرے
سرِ ایں داستاں مکشا کہ از غم بر زباں دارم بہ رنگِ خامۂ شنجرف خوں آلودہ تقریرے
نہ امروزے ست ایں صحبت کہ ہست از اوّل خلقت بہ دستِ حسن شمشیرے بہ پاے عشق زنجیرے
بہ قولِ دشمنش گرمی گُنشتی فہمیدہ کش بارے
کہ دیگر درجہاں ہرگز نہ خواہی دید چوں میرے

(۴۸۹)

ز بختِ ماست اگر بے خبر بہ دست آئی کہ برمرادِ دل اے خوش کمر بہ دست آئی
ز شوقِ وصلِ تو اے رشکِ شمع بے تاب ام سر فتیلہ کُنم چرب اگر بہ دست آئی

مرا بہ دست بہ صد صنعت آمدی و شدی　　نصیب آں کہ تو اش چوں ہنر بہ دست آئی
بہ حالِ مرگ ز دستِ تہی گرفتست رام　　خدا کند کہ تو اے سیم بر بہ دست آئی
چگونہ میرؔ بگو از تو دست بردارد
تو آں گل ای کہ بہ خونِ جگر بہ دست آئی

(۴۹۰)

گر بہ سخن یار سرے داشتے　　روے سخن کے دگرے داشتے
ہر کہ شدے تنگ بدمی زدے　　کاشکے ایں خانہ درے داشتے
ایں ہمہ آزار نہ کردے مرا　　گر ز دلِ من خبرے داشتے
ذوقِ جفاے تو نہ شد حاصلم　　کاش دلِ من جگرے داشتے
موے سرش وا نہ شدے در غمم　　گر زمن آشفتہ سرے داشتے
میرؔ ز ایام چہ نقصان شدے
گر شبِ ما ہم سحرے داشتے

(۴۹۱)

نہ شاید کایں ہمہ در کوچہ ہا گردیدنے داری　　تو معشوق ای و ہر کس را بہ دل چسپیدنے داری
بسوزاں بر دلِ خود یک گلستاں داغِ محرومی　　در ایں گلزارِ دل کش گر سرِ گل چیدنے داری
چہ آتش در جگر داری کہ ز او اے میرؔ ہر ساعت
بسانِ ماہیِ بے آب دل تفتیدنے داری

(۴۹۲)

نیستش پروا ز تیرِ دل گذارِ دیگرے　　جاں کہ صیدِ تست کے گردد شکارِ دیگرے
ہر کسے می میرد اما مرگِ من ہم تازہ است　　مردن از بہرِ نگاہے نیست کارِ دیگرے
از منِ عاجز طریقِ پاسداری یاد گیر　　می کشم بر دوشِ خود چوں سایہ بارِ دیگرے
مردنت گر رو دہد بے یار مفتِ خود شمار　　ہاں بخواہی زیستن سالِ ہزارِ دیگرے
طرفہ صحبت در محبت اتفاق افتادہ است　　من ہلاکِ او سے ام و او بے قرارِ دیگرے

من کشم خمیازہ بر خمیازہ از شوقِ وصال　　او بخوابد مست مے سر در کنارِ دیگرے

اوجِ دنیا میرؔ در چشمم نہ دارد اعتبار
ہر زماں باشد جہاں در اختیارِ دیگرے

(۴۹۳)

در قفس دیدم سحر گہ مرغِ بے بال و پرے　　شعر ہائے میرؔ می خواندے بہ حالِ ابترے
گفتمش اے مشتِ پر آخر چہ بیتابی ست ایں　　کارِ دل چوں من فتادت باکدایں دلبرے
کایں ہمہ می نالی و اشعار می خوانی ز درد　　لحظہ لحظہ می کشی آہ از دلِ غم پرورے
گفت دارم دل ربائے شیشہ جانے نازکے　　شہرتے دارد بہ گل محبوبِ دق از دل برے
نکہتش بے خود کنے چشمک جہاں برہم زنے　　رنگِ او در بُردنِ دل ہا عجب جادوگرے
بے وفا دشمن نیازے ناز آئیں سرکشے　　خود پسندے خود ستائے خود نمائے خود سرے
بے مروّت بس کہ در خونم فرو بردہ ست آہ　　پنجہ اش از پنجۂ مرجاں شدہ رنگیں ترے
گہ شود وا با نسیم صبح و گہ با باغباں　　من برائے او ہلاک ام او برائے دیگرے

گر کنم بے طاقتی معذور دار اے دردمند
آشنا با ایں چنیں کافر نہ گردد کافرے

(۴۹۴)

اے آں کہ غافل ای و پئے کارِ نیستی　　از ہستیِ خود آہ خبردار نیستی
در موج خیز دہر حباب ای بہ خود مناز　　تا چشم وا کنی کہ بہ یک بار نیستی
عاشق شدی مگر کہ بہ رحمِ آشنا شدی　　از چند روز در پئے آزار نیستی
در بارِ ماست جملہ متاعِ خوشِ وفا　　اما چہ فائدہ کہ خریدار نیستی
اظہارِ بے علاقگیت ایں ہمہ چرا　　معلوم شد دلا کہ گرفتار نیستی

افتادہ بودنت بہ رہش میرؔ تہمت است
آرے نہ بودہ ای تو طلبگار نیستی

(۴۹۵)

دل بہ زُلفش مگر اسیر شدی　　کز منِ خستہ شانہ گیر شُدی

آخر از اختلاطِ اوباشاں　　شوخ و شِلتاقی و شریر شدی
خواجہ می گفتمت کہ بادہ مخور　　مُسرفی کردی و فقیر شدی
قدِ خم سوے خاک ایمائے ست　　عاجزی پیشہ کن کہ پیر شدی
جُز محبّت نہ بود تقصیرش
بہ عبث خصم جانِ میرؔ شدی

(۴۹۶)

می خواند سحر گہ غزلِ میرؔ جوانے　　در گریہ زہر شعر ترش بود جہانے
آں ہا کہ زکوے تو گذشتند گذشتند　　پیدا نہ شد از گم شدگانِ تو نشانے
از زمزمۂ مرغِ قفس آہ مپرسید　　شورِ عجبے داشتہ تا داشت زبانے
در رہگذرِ یار کہ خاکش ہمہ خون است　　بر ہر قدمے گریہ تواں کرد زمانے
پیری چو رسد لطفِ حیاتِ تو نہ ماند　　در ضعفِ قوی زیست بُوَد بار گرانے
افسوس کہ از منزلِ دل زود گذشتی　　در شہرِ وفا بود ہمیں تحفہ مکانے
محو است و خبر نیستش از سود و زیاں لیک
خاکِ قدمت را نہ دہد میرؔ بہ جانے

(۴۹۷)

ہمدمِ اشک و آہِ سرد شدی　　آخر اے دل تمام درد شدی
رُو تعلق بہم رساں بہ کسے　　چہ کمال است ایں کہ فرد شدی
شیخ داری بہ کف عصا شمشیر　　اے مُخنّث تو نیز مرد شدی
دل پےِ طفلگانِ تہ بازار　　رفتہ رفتہ تو کوچہ گرد شدی
عشق ورزیدہ ای مگر اے میرؔ
کہ چنیں ناتوان و زرد شدی

(۴۹۸)

اے مستِ ناز ایں ہمہ برخویش چیدنے　　گاہے بہ دردِ دل شدگاں ہم رسیدنے
ایں اختراعِ تازۂ چشمِ گشندۂ تست　　غلطاندنے بہ خون و بداں سو نہ دیدنے

آں سبزہ ام کہ سبزدہ پامال گشتہ ام — در بختِ من نہ بود بہ خوبی دمیدنے

صد فصلِ گل گذشت در ایں گلستاں مرا — یک دم نہ شد بہ کام میسر پریدنے

اے گل بہ حرفِ بلبلِ شوریدہ گوش دار — دارد حکایتِ غمِ عاشق شنیدنے

در آرزوے بوسِ تو از جاں گذشتہ ایم — آئی اگر بہ تربتِ ما لب گزیدنے

تا کے دریدہ جیب بہ ہر کوچہ گشتنے
یک چند میر پاے بہ دامن کشیدنے

(۴۹۹)

حریفم کن دمے یارب بہ ترکِ سر بہ سر کینے — کہ از خونِ خود افشاں کردہ آید دامنِ زینے

الٰہی ربط خاصے با گل اندامے ہمہ جوئے — دلِ شادے ندیمِ خوش بیانے شعرِ رنگینے

چساں ماند بجا در عہدِ او رسمِ مسلمانی — فراموش خصمِ ایمانے کلاہش رہزنِ دینے

نہ خواہد رفت داغِ مرگِ او تا زندگی از دل — در ایں صحراے وحشت بود مجنوں یارِ دیرینے

زغم صد بار نالیدم یکے نشنید فریادم — گلِ ایں باغ دارد ہم نوایاں گوشِ سنگینے

گہ و بے گاہ محوِ خوبی و رعنائیِ خویش ای — نیامد در نظر آئینہ را ہم چوں تو خود بینے

نہ باید میر از سوزِ درونت ایں قدر غفلت
اہم است از پے گرمیِ دل تدبیرِ تسکینے

(۵۰۰)

بر آوردی خط ولیکن نمی بینم ز تو روئے — نمی دانم چہ در گوشت دمیداے شوخ بدگوئے

خدایا روزِ محشر در گذر از لطفِ بے پایاں — ز جرمِ بوریا پوشاں بہ حقِ آتشیں خوئے

غرورِ حسن و خوبی دل نہ داد آں شوخ را ورنہ — بہ اندک لطف راضی می شدے چوں من تنک روئے

بہ دورِ خطِ آں سرمایۂ جاں ہا چہ ہا دیدم — دلے ہرگز نیاوردم بہ روے او سر موئے

گزیرے نیست میر از مرگ اما آرزو دارم
کہ افتد اتفاقِ مُردنِ من بر سرِ کوئے

(۵۰۱)

میر ہر لحظہ چشم تر داری — روئے خوبے کہ در نظر داری

بر درِ کس نشیں کہ آسائی — سخت دردِ سراست سرداری
من بہ حالِ خودم نہ باید داشت — از من امید ناز برداری
دست از جاں بشو کہ شرط افتاد — در محبت دلا جگر داری
ہر سحر گرمِ نالہ ای بلبل — بو کہ زآں گل تو ہم خبرداری
نہ شوی اے شراب خانہ خراب — ہر طرف عالمِ دگر داری

عبرت از سرگذشتِ قاروں گیر
بد بلائے ست میرؔ زر داری

(۵۰۲)

کردم از بادہ منع و نشنیدی — خواجہ آخر فقیر گردیدی
کوہکن ہمتِ تراعشق است — ایں بلا راچہ سہل بر چیدی
دل عجائب رسالہ بودہ ست — حیف اوقات گر نہ فہمیدی
گفتنِ غم دماغ می خواہد — لطف کردی کہ حال پرسیدی

میرؔ نے زور داشتی نے زر
بہ چہ سرمایہ عشق ورزیدی

(۵۰۳)

اے اشک گر از دیدۂ گریاں بدر آئی — یارب کہ بہ صد شیوۂ طوفاں بدر آئی
خواہیم کہ یک جمعہ تو اے واعظِ مسجد — از مے کدہ دستار پریشاں بدر آئی
تا کے بہ تنم رنج کشی جانِ الم ناک — اے کاش از ایں منزلِ ویراں بدر آئی
دانم کہ پس از قتلِ من اے دشمنِ جاں ہا — از معرکہ بسیار پشیماں بدر آئی

چوں میرؔ دَرَد شیخ گریبانِ قبا را
از خانہ اگر برزدہ داماں بدر آئی

(۵۰۴)

از جذبِ دلِ شمشیر تو ہر سینہ کبابے — دارد بہ دلِ خویش تمنا دم آبے
از دیر شعارِ منِ غم دیدہ سکوت ست — نے خواندنِ شعرے و نہ مذکورِ کتابے

تا چند بدیں حال کسے زندہ بماند | یا خشم و خطابے ز تو یا ناز و عتابے
صد بار ز بے تابیِ دل نامہ نوشتم | یک مرتبہ ممتاز نہ کردی بہ جوابے
گر چشم کشایم بہ نظر ہیچ نیاید | ایں ہستیِ من بر سرِ آب است حبابے
روے سخن از زشتیِ اعمال نہ دارم | ظلم است کہ از بندہ بگیرند حسابے

از میرؔ بہ پرہیز کہ چوں او بہ جہاں نیست
رسوا شدہ آے در بہ درے خانہ خرابے

۵۰۵

گر بہ قدرِ بے قراری بے قراری کردمے | از زمیں تا آسماں فریاد و زاری کردمے
ہاے آدم ایں قدر ہم بے مروت می شود | گر چنیں دانستمے کے با تو یاری کردمے
گر نمی کردم حیا زیں دینِ میراثِ پدر | سبحہ را بگسستمے زنار داری کردمے
آہ از آں شوخے کہ بر من می گرفتے راہِ من | با ہزاراں خونِ دل دامن گذاری کردمے
کاش آگہ می شدم از سست عہدی ہاے یار | تا بہ وقتِ دادنِ دل استواری کردمے
چند روزے شد کہ دل افسردہ ورنہ پیش ازیں | در شبِ آدینہ اکثر بادہ خواری کردمے
شد شبیہ نقشِ پا با چشم از افتادگی | کاش من ہم شیوۂ خود خاکساری کردمے
نیست ایں دیوانگی امروزہ دستم سوے جیب | آں زماں می شد کہ من دامن سواری کردمے
مصلحت در ضبطِ خود می بینم اکنوں ورنہ من | دیدمے سوے تو و بے اختیاری کردمے

حالیا نے سینہ کاوی نے جگر چاکی ست میرؔ
یادِ ایامے کہ ہر دم تازہ کاری کردمے

(۵۰۶)

رنگ ہاے تو دیدہ اندبسے | جامہ در خوں کشیدہ اندبسے
من نہ زیں باغ داغ بر جگرام | گل بدیں رنگ چیدہ اندبسے
یک رہ اے مایۂ حیات برس | کہ بہ مُردن رسیدہ اندبسے
از پےِ رفتگاں ہلاک مشو | آں غزالاں رمیدہ اندبسے

چند روزے مزاج گوئی کن
میرؔ صاحب کبیدہ اندبسے

(۵۰۷)

مارا دلے ست در بر آئینہ دار نازے — مستغنی المزاجے از خلق بے نیازے
در بزم ما نشینی افسردہ چند زاہد — شعرے بہ شند و بیتے و چیزے بہ سوز و سازے

گردشِ سپہر دارد حسبِ اشارۂ او — چوں روزگار نبود امروز طاس بازے
یک بار شب نشیناں از من تواں شنیدن — دارم بہ لب از آں موانسانۂ درازے
تو شاد زندگی کن از غم ترا فراغ است — من چوں زیم کہ دارم اندوہِ جاں گدازے
در عشقِ جامہ زیباں ناکام بس کہ ماندم — دارد ز خونِ خواہش دامانِ دل طرازے
شاید کہ بر نہ خیزد چوں من ازیں بیاباں — بے پا و سر خرابے آوارہ ہرزہ تازے
مشکل اگر بدیں ساں ایں رخنہ دیر ماند — ہر لحظہ می تراود از چاکِ سینہ رازے

شد کشتہ میرؔ و افسوس از کثرتِ خلائق
دستم نہ داد ہرگز بر نعشِ او نمازے

(۵۰۸)

ہر زماں غم می خوری ہر دم ملالت می کشی — اے سرت گردم نمی دانم چہ حالت می کشی
داشتن ہر دم زباں زیرِ زبانت خوب نیست — یاد باشد حرفِ من آخر خجالت می کشی

رو بہ شخصے کن کہ زنگ از دل برد در یک دمت
ورنہ چند آئینہ ساں رنجِ صقالت می کشی

(۵۰۹)

دانم کہ پس از مرگم رخسارہ بخوں شوئی — بسیار ز من گوئی بسیار مرا جوئی

میرؔ از چہ نمی جوشی تا چیست کہ خاموشی
یک شعر نمی خوانی یک حرف نمی گوئی

(۵۱۰)

اے برق وش ز شوخی دل را کباب داری — از عمر ہم عزیزی لیکن شتاب داری

گر دل بہ دل ربائے جائے نہ دادہ ای تو
بہر چہ میرؔ ہر دم چشمِ پُر آب داری

(۵۱۱)

از تپیدن سبب رنج و عنا گردیدی — آخر اے دل خلۂ پہلوے ما گردیدی

من نمی گفتمت اے میرؔ کہ ترکِ مے گیر

گفتۂ من نہ شنیدی و گدا گردیدی

(۵۱۲)

با خرامِ تو کام نکشودے — گر پری آدمی روش بودے

دیدم احوالِ میرؔ و داغ شدم

کاش مُردے و عشق نمودے

(۵۱۳)

داریم دلے خوں شدۂ مہر و فائے — ہر لمحہ از او رنجے و ہر لحظہ بلائے

اے رفتۂ مقصود توکّل کن و بنشیں

کز پاے طلب ما نہ رسیدیم بہ جائے

(۵۱۴)

گر تو اے پروانہ زیں ساں پیروِ من می کنی — چوں چراغِ صبح گاہی خانہ روشن می کنی

(۵۱۵)

خدا کند کہ تو ہم رفتۂ کسے گردی — برائے دیدنش اے بے وفا بسے گردی

(۵۱۶)

دل اگر با من دو روزے ساختے — عشقِ خوباں کے چنیں بد باختے

(۵۱۷)

شدم بیزار از عشقِ مجازی — نمی آید ز من ایں بچہ بازی

(۵۱۸)

خدا ناکردہ شاید ربطِ دل با چوں خودے داری — کہ بے تابانہ چوں من ہر زماں آمد شدے داری

(۵۱۹)

مرا بس بود از پے سیر گشتے — گریبانِ کوہے و دامانِ دشتے

من اے ظلم کیشاں ز جاں دست شستم — بیارید نطعی و تیغی و طشتے

بہ ہر حرف دستے زدے میرؔ بر سر
شنیدم از او شب عجب سرگذشتے

(۵۲۰)

گرد آمدند نقش نگارانِ چیں بسے — صورت نہ بست چہرۂ خوب تو از کسے

ضمیمۂ ردیف الف (۵۲۱) [غزلِ منسوخ][1]

تاب کو رفتگانِ بے دل را — کہ بگیرند راہِ قاتل را

از غریقے چو من چہ آگاہی — خاک افتادگانِ ساحل را

آہوانِ حرم چہ می دانند — ذوقِ زخم شکارِ بسمل را

شدہ تیغے بلند کشتہ شدیم — ما نہ دیدیم روئے قاتل را

از تپش جانِ من بہ درد آورد — چہ بلا زد نہ دانم ایں دل را

کس بہ آں محملی ناز نہ گفت — مشکلِ ایں خرابہ منزل را

چہ بگویم ز فرطِ شوقِ جنے — بندہ ام آں خدائے باطل را

زاں چہ در دشت رفت بر مجنوں — چہ خبر پردگیِ محمل را

چوں گہر می برم بہ خود زیں بحر — گرہِ سختِ کارِ مشکل را

از دل و جانِ صبر و زاں پرسی — کینۂ آں جوانِ جاہل را

سرکن اشعارِ ماتمِ دلِ میرؔ
بر مخواں واقعاتِ مقبل را

ضمیمۂ ردیف د (۵۲۲) [اشعارِ منسوخ][2]

ہر کہ بر حالِ من خستہ نظر خواہد کرد — دردمندانہ زبانِ مژہ تر خواہد کرد

میرؔ اے شیخ قدم بر قدمت رہ نہ رود
از سرِ کوچہ ترا دست بہ سر خواہد کرد

---

[1] یہ غزل مخطوطۂ ادیب کے حاشیے پر لکھ کر کاٹ دی گئی ہے۔ اس لیے آخر میں یہ بطورِ ضمیمہ درج کی جاتی ہے۔

[2] یہ شعر بھی مخطوطۂ ادیب کے حاشیے پر لکھ کر کاٹ دیے گئے ہیں۔ دونوں شعروں کے مصرعہائے ثانی مخطوطۂ ادیب سے غائب اور نقلِ رام پور سے منقول ہیں

# رباعیات

(۱)

گر بخت شود یار روم در کعبہ
از شوق بہ ہر سوے دوم در کعبہ
بر قوتِ پا ضعف چو غالب آید
رو سوے خدا خاک شوم در کعبہ

(۲)

اے ختمِ رسلؐ چارہ ندارد دردم
بخشاے کہ جرمِ بے نہایت کردم
بر چہرۂ زرد خونم آید ہر دم
یعنی کہ ز فرطِ شرم سُرخ و زردم

(۳)

کوتاہی اگر نمی کند عمرِ دراز
ایں مرتبہ میسّر می رودم سوے حجاز
ان شاء اللہ قطرہ زن گریہ کناں
بر خاکِ مدینہ می نہم روے نیاز

(۴)

چشمے در روزِ حشر داریم از تو
خواہیم خطِ شفاعت آریم از تو
نومید در آں مہلکہ مارا مگذار
اے سیّدنا امید داریم از تو

(۵)

خواہم کہ روم گریہ کناں سوے نجف
زاں پیش کہ فرصت برود تیر ز کف
تا حشر بہ جاں منّت از او خواہد بود
گر چرخ در آں خاک مرا کرد تلف

(۶)

قصدے دارم کہ کربلا را بینم
و آں مرقدِ پاک مرتضیٰؓ را بینم
زاں جا بہ ہمیں چشمِ سرار عمر بود
خاکِ ترِ پاے مصطفیٰؐ را بینم

(۷)

یا رب بہ حقِ حسینؓ جرمم بگذار
وز خاکِ سیاہِ ہند زودم بردار
آیم چو گدا یا نہ من اندر عرصات
دستم بہ کفِ شاہِ شہیداں بسپار

(۸)

اے ختمِ رسلؐ سخت در آزارم من — بے چارہ و بے یاور و بے یارم من
غیر از تو شفیع خود نہ پندارم من — پس پیشِ کہ ایں روے سیہ آرم من

(۹)

یارب مگذار بے کس و بے یارا — آں دم کہ نہ داریم بہ محشر یارا[1]
نیکی چو بہ جاے کس نہ کردیم ایں جا — آں جا بہ حسنؑ بخش گناہِ مارا[2]

(۱۰)

مُسلم ہر چند مجرم و بد باشد — شایستۂ بخشائشِ بے حد باشد
از گرمیِ خورشیدِ قیامت چہ غم اش — او سایہ رَوِ لطفِ محمدؐ باشد

(۱۱)

رحمے اے خضرِ گم رہاں بر حالم — کز رفتنِ کارواں جدا پا مالم
تنہائی و کم پائی و منزل بس دور — راہے چو جرس می روم و می نالم

(۱۲)

بود آں چہ نہ دیدنی در ایں جا دیدیم — مکروہ کشیدیم و بلا ہا دیدیم
اکنوں اے میر چشم باید پوشید — دنیا دیدیم و اہلِ دنیا دیدیم

(۱۳)

منعم تا کے غرورِ مال و اسباب — دیروز نہ دیدی گدائے خانہ خراب
شورِ من و ما بود کساں را کہ بہ سر — رفتند از ایں فسانہ یکسر در خواب

(۱۴)

تا بستہ ای اے عشق تو مارا بر کار — داریم مدام بے قراری در کار
ہر چند بہ صبر دل گرائید و لے — آں جنس نہ بود بابت ایں سرکار

---

[1] و [2] دوسرا اور چوتھا مصرع از نقلِ رام پور، مخطوطۂ ادیب میں کٹ گئے ہیں۔

(۱۵)

دیرے ست کہ غیر را تو بنواختہ ای — وزکین بہ من ایش دلیر تر ساختہ ای
اے ترکِ سیاہ چشم شرمت بادا — آہوے حرم پیشِ سگ انداختہ ای

(۱۶)

گفتم[1] کہ شبے اے سببِ آسائش — ایوانِ مرا زیب دہ و آرائش
گفتا[2] کہ زبے صرفگیت شرمے نیست — با ایں لب و لہجہ میر ایں فرمائش

(۱۷)

از تازہ دمیدنِ خطِ آں رخسار — افتاد ز فکر سیرِ سبزہ یک بار
بکشود صبا چوں گرہِ گیسوے یار — شد سنبلِ تر موے دماغِ گلزار

(۱۸)

جاں می رُود م بہ شوقِ روے چو مہش — در بخت نہ بود دیدنِ جلوہ گہش
گر عزتِ من کنند یاراں پسِ مرگ — سازند عبیرِ کفنم خاکِ رہش

(۱۹)

جُز جورِ رقیب چوں بہ کوے تو نہ دید — جاں داد ز غم میر و بہ سوے تو نہ دید
غیرت ست عشاق را چنیں می باید — در روزِ وصال نیز روے تو نہ دید

(۲۰)

سنگ است بہ نوکِ مژہ سفتن آساں — اما نہ بود عشق نہفتن آساں
زیں مشکلِ سخت کس بہ او ہیچ نہ گفت — حرفے ست کہ گفتہ اند گفتن آساں

(۲۱)

بے شعلہ رخاں میر بہ خود در جنگ ایم — داغ ایم و جگر سوختہ و دل تنگ ایم
القصہ کہ ما سینہ کبابانِ وفا — پروانۂ دلبرانِ شمعی رنگ ایم

---

[1] و [2] پہلا اور تیسرا مصرع از نقلِ رام پور۔ مخطوطۂ ادیب میں کٹ گئے ہیں۔

(۲۲)

اے میر تو در دامنِ آں مست آویز  تا از پے خونت بُوَدش دست آویز
از دور چہ می خوری خدنگ جورش  نزدیک برو کہ او کندت شست آویز

(۲۳)

اے وائے کہ میر سید از آں سرگشتہ  خوں کردنِ میر چوں مقرر گشتہ
آویختہ از پیچشِ بے جا زُلفش  ابرو کج باختہ مژہ برگشتہ

(۲۴)

دیدار تو ہر کہ را میسر گشتہ  بگزیدہ فقیری و بہ ہر در گشتہ
مالید بہ رو خاک و نمد در پوشید  آئینہ نہ دیدی کہ قلندر گشتہ

(۲۵)

گیرم کہ بہ دل غمِ نہانے داری  ہم جسم نزار و ناتوانے داری
افتاں خیزاں برو بہ بسمل گاہش  اے صیدِ زبوں ہنوز جانے داری

(۲۶)

تا بود شباب میرزائی کردم  طاقت ہمہ صرفِ خوشنمائی[1] کردم
درشیب کفِ خاک بہ رو مالیدہ  چندے درکوے او گدائی کردم

(۲۷)

از عزّ و درود بس مباہی کردی  درویشیِ من بدل بہ شاہی کردی
چشمم شدہ بود با سفیدی نزدیک  اے نامۂ یار خوش سیاہی کردی

(۲۸)

عزّت طلبم وقارِ خود خواہانم  سرکردۂ فرقۂ دل آگاہانم
بر ظاہرِ فقرِ من نگاہے نہ کنی  من صدر نشینِ مجلسِ شاہانم

---

[1] نقلِ رام پور "خود نمائی"

جلوہ ہا داریم واز ہر جلوہ بیخود گشتہ ایم
خود تماشا ایم وخود بہرِ تماشا آمدیم

(۲۹)

اے میرؔ گر از اہلِ وفا می بودی      شائستۂ انواعِ جفا می بودی
ابنائے زماں زار ترا می کشتند      تا حال در ایں عرصہ کجا می بودی

(۳۰)

عمرے بہ نیازِ[1] شام پر داختہ ام      عمرے با گریۂ سحر ساختہ ام
چوں خوب بہ خود رسیدہ ام محجوب ام      دیرے ست کہ سر بہ پیش انداختہ ام

(۳۱)

راہے سر کُن کہ بے ملامت باشد      نے آں کہ چو بگذری ندامت باشد
وارفتۂ حسنِ عمل امروز بشو      فرداست کہ بر سرت قیامت باشد

(۳۲)

شرمے کُن و ترک کُن خدا دانی را      بردار چُنیں بساطِ ایمانی را
تسبیح بہ کف چند بہ سے خانہ روی      رسوا مکن اے میرؔ مسلمانی را

(۳۳)

تمیز نہ ماند ہرزہ تازی کردم      اوقات بسر بہ لہو و بازی کردم
ہر آں چو ناسازیِ ایام افزود      چندے من ہم زمانہ سازی کردم

(۳۴)

عریاں ز لباسِ نام و ننگت کردند      شایانِ ہزار تلخ و ننگت کردند
نگذاری اگر جامہ چہ سازی اے میرؔ      بچپاں پوشاں بسے بہ تنگت کردند

(۳۵)

نے شعر بخواند و نے ترنم کردہ      نے نالہ کشیدہ نے تظلّم کردہ
در رہ چو شدے دُچار ساکت در ماند      پیداست کہ میرؔ دست و پا گم کردہ

---

[1] نقل رام پور "نمازِ شام"

(۳۶)

مستِ اندازِ آں سراپا نازم  بے خود شدہ ام ولے بہ او دم سازم
درگردنِ اوست دستِ شوقم اکثر  گوئی اے میرؔ من صراحی بازم

(۳۷)

گہ چہرہ بیارائی وگہ دُ سازی  گاہے بہ خط و خالِ سیہ پردازی
آئی ہر دم بہ شکلِ دیگر در چشم  اے آئنہ رو مگر تو صورت بازی

(۳۸)

خصمِ دل و دین اند و بلا ساز اند  با ایں ہمہ راست قامتی کج باز اند
امیدِ سلوک میرؔ از ایشاں غلط است  طفلانِ نیاز دوستِ محوِ ناز اند

(۳۹)

چوں شوقِ بت و بت کدہ وافر گردید  میر از حرمِ کعبہ مسافر گردید
در اوّلِ گام ترکِ اسلام نمود  آخر ایں ترکِ سادہ کافر گردید

(۴۰)

با میرؔ کسے نہ گفت درد ز نخُست  کاں سخت کماں درپئے خوں کردنِ تُست
از تیرِ جگر گدازش آخر جاں داد  وز تربتِ او لالۂ پیکانی رُست

(۴۱)

تا کے شنوم آہ کرا یار بکُشت  وز تیغِ ستم یک دو سہ کس زار بکُشت
از رشکِ شہیدانِ تو خوں گشت جگر  ایں دردِ مرا عاقبتِ کار بکُشت

(۴۲)

حاجت بس پیشِ اہلِ دولت بردیم  کارے نہ کشود عرضِ غیرت بردیم
برگشتہ از ایں طریقہ آخر دمِ مرگ  حیدرؑ گفتیم و رہ بہ جنّت بردیم

(۴۳)

غش تا بہ کجا ز دردِ مژگاں تر کُن  برخیز و فسانۂ محبت سر کُن
شد روزِ غمت شام بسوزاں داغے  اے میرؔ چہ مُردہ ای چراغے بر کُن

(۴۴)

آن ام کہ ز عرشِ استوا می آیم — یعنی ز حریمِ کبریا می آیم
گر رتبۂ من میپرسی نہ دانی برجاست — معلوم تو نیست کز کجا می آیم

(۴۵)

از کج روی سپہر یاران رفتند — در پردۂ خاک غمگساران رفتند
این ابلقِ چرخ دُو نہ یابد یارب — کز سرکشیش چہ شہسواران رفتند

(۴۶)

این جا کہ محیط بستہ کشتی باخیک — لب خشک شدم بہ پیش ترک و تاجیک
کس مردمیِ کاسۂ شربت نہ نمود — ناچار تلف شدم چو آبِ باریک

(۴۷)

دل بہرچہ صَرفِ بے قراری می شد — در خلق چرا رواجِ زاری می شد
دل خواہ ملاقات بہم می کردیم — اے کاشکے عشق اختیاری می شد

(۴۸)

برخاکِ درت ماندہ کسے روئے نیاز — می آید از آں خاک مرا بوئے نیاز
معلوم نہ شد ہیچ کہ با این ہمہ ناز — از بہرِ چہ مائل شدہ ای سوئے نیاز

(۴۹)

اے غیرتِ حور محوِ غرور ای چہ قدر — پنہاں شدہ در عینِ ظہور ای چہ قدر
برگو کہ بسازم بہ صبوری چہ قدر — نزدیکِ دل ای وآہ دور ای چہ قدر

(۵۰)

سنگم بہ سر از جورِ فلک می بارد — بر بسترِ آرام خسک می بارد
از چشمِ من آبِ شور آید ہر دم — یعنی کہ ز گریہ ام نمک می بارد

(۵۱)

بر قدِ دلآرائے تو پُر می نازم — سرو و شمشاد را خجل می سازم
از شام گرفتہ تا سحر در گلزار — بالائے ترا بلند می اندازم

(۵۲)

چوں بارِ گرانِ عشق بر ما افتاد در دامنِ [ما] ز چشم دریا افتاد
در شہر ز بس گریۂ خونیں کردیم راہِ سیلابِ خوں بہ صحرا افتاد

(۵۳)

ہر لحظہ فراق مُردنے می خواہد رنجِ بسیار بردنے می خواہد
دل بے تو بہ جا داشتن آساں نبُوَد دنداں بہ جگر فشردنے می خواہد

(۵۴)

واسوختہ گر از برِ او خواہم رفت دانم بہ یقیں در سرِ او خواہم رفت
وَر زندہ بمانم پے عُذرِ ایں جُرم شمشیر و کفن بر درِ او خواہم رفت

(۵۵)

یک بار مجرّدانِ فرداں رفتند از دائرۂ سپہرِ گرداں رفتند
آفاق ز طالبانِ دنیا پُر شد حمّام زنانہ گشت مرداں رفتند

(۵۶)

طفلی ہمہ اے میرؔ بہ غفلت بگذشت برنائیِ من بہ عیش و عشرت بگذشت
در شیب جز افسوس کنوں نتواں کرد مہلت کم ماند و وقتِ فرصت بگذشت

(۵۷)

زاہد کہ خیالِ روزۂ طے دارد شیداست سرِ زُہد و وَرع کے دارد
میلش بہ کلہ بے سببے اکثر نیست عمامہ گرو در عوضِ مے دارد

(۵۸)

در عہدِ جنوں بندہ بہ ہاموں بودم گاہے در خاک و گاہ در خوں بودم
با چشمِ کمم مبیں کہ من از مژگاں جاروب کشِ تربتِ مجنوں بودم

(۵۹)

بر ظاہرِ خوب کم نگہ باید کرد ترکِ کج کردنِ کلہ باید کرد
خوبی آخر چو گل نہ خواہد ماندن یک روز بساطِ ناز تہ باید کرد

(۶۰)

آں سادہ خوانندہ کہ عودی رنگ است — ناساز مزاج است و بلاآہنگ است
چشمش کہ گرفتہ ترکِ مردم داری — بے پردہ فرو بردہ بہ خونم چنگ است

(۶۱)

زاہد پسرے ز دستِ دل دم می زد — ز آوازِ گدا بہ ابروان خم می زد
ہر گاہ لبِ ناں بہ فقیرے می داد — خرکرّہ لگد بہ گورِ حاتم می زد

(۶۲)

مہرم بہ چنیں بلا ز نادانی بود — بدبختیِ ایں مدعی جانی بود
آخر بہ کفم عنانِ آرام نہ ماند — شبدیزِ فلک ستارۂ پیشانی بود

(۶۳)

اے میرؔ مشو دہ دِلہ می باید رفت — ہر روز رود قافلہ می باید رفت
ایں گونہ تعلق ز جنوں خالی نیست — بگسستہ ز پا سلسلہ می باید رفت

(۶۴)

آرام ز من مجو کہ آفت زدہ ام — راحت مطلب کہ سخت محنت زدہ ام
بر قامتِ او نہ گشتہ ام عاشق میرؔ — من دست بہ دامنِ قیامت زدہ ام

(۶۵)

دیدن بہ رُخت چشمِ ترے می خواہد — رفتن بہ رہت ترکِ سرے می خواہد
من صید بہ یک تیر ہلاک ام بگذار — آماجِ تو بودن جگرے می خواہد

(۶۶)

آں شیوہ گزیں کہ اہلِ دل خوش دارند — سوے تو ہمہ روے توجّہ آرند
برگرد از آں طریقہ کافر درشے — از ہم گذری چوں تو بہ رہ بسپارند

(۶۷)

بر بحثِ علوم میرؔ مائل گشتم — یعنی بسیار بر مسائل گشتم
کارے نہ کشود از نزاعِ لفظی — بستم لب ہاے خویش و قائل گشتم

(۶۸)

تا هست جهان گفت و شنیدے باقی ست     شبلی گر رفت بایزیدے باقی ست
مردیم و گرفتیم بپا شد محشر     آں جا ہم آرزوے دیدے باقیست

(۶۹)

یک لخت جگر داغ شتابِ عمر است     دل سوختہ و سینہ کبابِ عمر است
باید برخاست صبحِ پیری بدمید     کایں وقتِ غروبِ آفتابِ عمر است

(۷۰)

در عشق دلے جو کہ قرار آید از او     صبرے بہ ستمگاریِ یار آید از او
نے ہم چو دلِ بے جگرِ من بے تاب     دل می باید چناں کہ کار آید از او

(۷۱)

ہمدم بنشیں کہ با تو حرفے دارم     در زیرِ فلک حالِ شگرفے دارم
از حادثہ می خورم شکستے ہر دم     جُرمم نہ بُوَد جُز ایں کہ ظرفے دارم

(۷۲)

ہر چند مہ تمام نورے دارد     لیکن بہ رُخت نسبت دورے دارد
بے پردہ میا بروں کہ چشمے نخوری     ایں تیرہ دُروں دیدۂ شورے دارد

(۷۳)

در فُرقتِ تو صبور باید گشتن     نے در طلبِ حضور باید گشتن
قُربِ تو ز آدابِ محبت دور است     برگردِ سرت ز دور باید گشتن

(۷۴)

چشمم کہ بجائے اشک خوں می آرد     خونِ جگرِ من ز دروں می آرد
دیوانہ شدم زبس کہ ماندم دل تنگ     ایں جاست کہ جوشِ غم جنوں می آرد

(۷۵)

عاشق چو شوی اشک فشانی دانی     ذوقِ ایں تلخ زندگانی دانی
من بے تو بہ جان ام و نمی دانی ہیچ     تو بے تو اگر دمے بمانی دانی

(۷۶)

گاہے از خلق بے خبر می باشم　　گاہے از خویشتن بدر می باشم
بے روے تو حالات عجائب دارم　　ہر لحظہ بہ عالم دگر می باشم

(۷۷)

ہر چند فقیر ایم و ہوس ما را نیست　　دل را مَیلِ محبتِ دنیا نیست
لیکن با ایں شکستہ پائی داریم　　طولِ اَملے کہ آں سرش پیدا نیست

(۷۸)

شیب آمدہ ناگاہ بباید رفتن　　زیں منزلِ خوش آہ بباید رفتن
پیری بسیار جائے خوف است اے میرؔ　　ایں جا بہ عصا راہ بباید رفتن

(۷۹)

بر سر و فقدانِ شہر مائل گشتم　　محوِ ماہانِ دیدہ منزل گشتم
در حرص و ہوا رفت شبابم ہمہ میرؔ　　از عمرِ گذشتہ آہ غافل گشتم

(۸۰)

در عشق بہ مرگِ خود طرف باید شد　　شمشیرِ جفاش را علف باید شد
نے تابِ وصالِ اوست نے طاقتِ ہجر[۱]　　در ہر صورت مرا تلف باید شد

(۸۱)

از رفتنِ یاران و رفیقاں ناگاہ　　مانندِ جرس ماند بہ لب نالہ و آہ
بعد از چندے سکوت من ہم کردم　　بسیار غریبانہ گذشتم زیں راہ

(۸۲)

ہر لحظہ چو موج اضطرابے داری　　ہر دم رفتارِ تُند آبے داری
صرصر گو شیم یا کہ برقت خوانیم　　اے عمرِ عزیز بس شتابے داری

---

[۱] نسخہ بدل، نیز نقل رام پور:

"نے طاقتِ وصلِ او نہ تابِ دوری"

(۸۳)

از درد و اَلم چشمِ پُر آبے داری  وز سوزِ درون دلِ کبابے داری
داری نظرے مگر بہ آن نرگسِ مست  اے میرؔ عجب حالِ خرابے داری

(۸۴)

بگذار کہ رو بہ مرگ یکبارہ کُنیم  آن درد نہ داریم کہ ما چارہ کنیم
بیماریِ صعبِ عشق دارد دلِ ما  گر جامہ گذاریم کفن پارہ کنیم

(۸۵)

این بود و نمودِ یک نفس ہم چو حباب  در دیدۂ ہوش مند نقشے ست بر آب
ہر لحظہ چو موجِ بحر رفتن داریم  زان پیش کہ جوئی و نہ یابی دریاب

(۸۶)

آن سرو کہ دل بر او ست مائل این است  جُز جَور ثمر نہ داشت حاصل این است
من دامنِ او بہ دست خواہم لیکن  ناید آسان بہ دست مشکل این است

(۸۷)

ہر قطعۂ خاک گلستانے بودہ ست  مرغِ گلزار خوش زبانے بودہ ست
این سنبل و گل را کہ تماشا کردی  از زلف و رُخِ کسان نشانے بودہ ست

(۸۸)

ما گر بہ جہانِ آب و گل می گردیم  با طبعِ لطیف متّصل می گردیم
جُز نکتہ رسے کسے نہ یابد ما را  ما لذّتِ شعر ایم بہ دل می گردیم

(۸۹)

واعظ سرِ سیرت کہ مگو غیر از راست  طورم ز کجا و تُہمتِ مے ز کجاست
من مست و خرابِ راہِ دُردِ طلب ام  بے منّتِ بادہ نشّہ دارم کہ مراست

(۹۰)

ثانم دلِ غیر ہر زمان می شکند  خوفم بہ دہانِ او زبان می شکند
امّا در پردہ از پئے ذلّتِ من  ہر روز و شب این سگ استخوان می شکند

(۹۱)

هر چند مرا قوتِ رفتار کم است — اما ز رهِ صعب جدائی چه غم است
با صد غم و رنج دل به جاے است هنوز — این آبله یک رفیقِ ثابت قدم است

(۹۲)

در بستنِ لب جهدِ اتم می باید — یعنی که به فقر پاسِ دم می باید
بے گفتۂ دل راه مرو تا مقدور — کِفت و قدمت همرهِ هم می باید

(۹۳)

جاں را به غمِ تو چند خرسند کنم — تا کے دلِ پاره پاره پیوند کنم
بے تاب ام و ناچار به ضبطِ خویش ام — دفتر شود ار حال قلم بند کنم

(۹۴)

از شانه مگو به صد زباں خاموش است — ز آئینه مپرس کز حیا روپوش است
آرائشِ آں چهره نه بندد صورت — مشاطه ز اندازِ نگه بے هوش است

(۹۵)

هر چند که ما خسته دلاں بد حالیم — روزانه بگرییم و شباں گه نالیم
در شورشِ الماس و نمک دست زنیم — آں دم که سرِ زخمِ دلِ خود مالیم

(۹۶)

گر جانبِ او پریم پر می سوزد — وز چهرۂ روشنش نظر می سوزد
در وقتِ سکوت زاں لبِ سرخ مپرس — آں آتشِ خاموشِ جگر می سوزد

(۹۷)

هر چند ز مفلسی اخیرِ وقت است — اما ز غنا میر امیرِ وقت است
کارے به زرِ سرخ و سفیدش نه بود — آں سکۂ درست بے نظیرِ وقت است

(۹۸)

خار و خسِ این چمن به مژگاں رفتیم — با هر گل و غنچه دردِ خود را گفتیم
چوں عقدۂ دل میر ازایں ها نه گشود — پا بر سرِ پا فگنده آخر خفتیم

(۹۹)

سرسبزیِ من از غمِ یاراں رفتہ    حیفے بہ فراقِ غم گساراں رفتہ
مانندِ تنِ زردِ من بہ آں کشت کہ او    خواہد باران و وقتِ باراں رفتہ

(۱۰۰)

رونق نہ بُوَد بے تو بہ کاشانۂ چشم    یعنی کہ نہ ماندہ دیدنی خانۂ چشم
اے مستِ مےِ ناز چو جایت خالی ست    از خونِ جگر پُر است پیمانۂ چشم

(۱۰۱)

دل را کہ دمے بہ رنج نگذاشتہ ایم    او شد ہمہ خون و دست برداشتہ ایم
وایں چشم کہ چشمۂ روانے بودہ ست    از خاکِ سرِ راہِ تو انباشتہ ایم

(۱۰۲) [رباعی مستزاد]

شورِ جاں کاہ بلبل از جایم بُرد    ہنگامِ سحر
حالِ تبہش رواں بہ دردم آورد    داغ است نظر
رفتم دو قدم پیش و بسے پُرسیدم    خود ہیچ نگفت
رُو سوے گُل آخر بہ ہماں حال بمرد    خوں کرد جگر

(۱۰۳) [رباعی مستزاد]

برخیز و رُخ خود ز عمارت برتاب    دنیا ست سراب
وایں ہستیِ موہومِ تو مانندِ حباب    نقشے ست بر آب
در فکر بنا ہاے غلط عمرِ عزیز    کردی ہمہ صرف
اکنوں زیں دشت درگذر چوں سیلاب    اے خانہ خراب

(۱۰۴) [رباعی مستزاد]

با میرؔ ملاقات نمی کردم کاشش    دیدم ہمہ جہل
باطل اوقات و بادہ خوار و اوباش    پُر ناکس و سہل
وارفتۂ طفلگانِ تہ بازاری    بدنام و الوط
رند و بد وضع و سخت باز و قلّاشش    جلف و نا اہل

# مثنوی

اے صبا گر سوے دہلی بگذری   ہم چو صرصر آہ مگذر سرسری
بوسہ دہ بر ہر قدم از سوے من   بود بر آں خاک عمرے رفتے من
بر مقابر آیۂ رحمت بخواں   در مساجد خدمتے از من رساں
ہم بکن پیدا جبینِ تازہ اے   سجدہ اے بر ہر سر دروازہ اے
وقفہ اے بر ہر سر کو ساعتے   بر در و بامش نگاہِ حسرتے
سیر کن طفلانِ تہ بازار را   اشتیاقم گو در و دیوار را
از مصیبت دیدگاں یادے بکن   زیرِ ہر دیوار فریادے بکن
پس نشانِ دوستانِ من بجو   حسن اگر بینی ز من عشقے بگو
بعد از آں بکشا سرِ ایں داستاں   یعنی آں سرخیلِ آفت دیدگاں
از وطن مہجور بے دل میرؔ نام   می کند از غم بکائے صبح و شام
نے خطِ شوقش زیارے می رسد   نے پیامے از نگارے می رسد
زیرِ لب دارد شکایت خوں چکاں   کاے فلک رحمے بہ دور افتادگاں
بے کس ام ہر دم ملالت می کشم   کس چہ داند من چہ حالت می کشم
زرد گشتم زار گشتم دل گداخت   آبِ فرقت با مزاجِ من نہ ساخت
یادِ یارانِ وطن از دل نہ رفت   تختہ ام زیں ورطہ بر ساحل نہ رفت
بود ہر جائے کہ آبادانیے   گوش زد می گردد ام ویرانیے
در چنیں ویرانہ نبود ضبطِ باب   ایں بنا باید رسانیدن بہ آب
یعنی از غم زار می باید گریست   ہر قدم بسیار می باید گریست
خانۂ بنشستہ گر منزل شود   از سرشک آں خاک باید گل شود
دیر سیرِ آں عمارت کردہ ام   ہر مقامے را زیارت کردہ ام
بر چنیں خاک ار نہ یاری دیر ماند   یک زماں خاکے بہ سر باید فشاند

باغ ویرانے اگر پیش آیدت — چشم عبرت بیں کشودن بایدت
خار از جائے کہ سر برکردہ است — جلوہ ہا ایں جا گلِ تر کردہ است
باد از جائے کہ گرد انگیختہ — لالہ رنگِ تازہ ایں جا ریختہ
سالہائے سال بر آں گل زمیں — نرگسی زن ماندہ نرگس پیش ازیں
ہر کجا دل می شود از خور گداز — سایہ افگن بود آں جا سروِ ناز
گر کشائی چشم را بر برگِ زرد — یادِ سبزاں کن بہ صد اندوہ و درد
کاں نہالاں بزمِ عشرت داشتند — سر بہم آوردہ صحبت داشتند
عندلیبے گر نوا سازی کند — وز غمِ دل نالہ پردازی کند
گوش نِہ بر نالہ و افغانِ او — آں گُلے آویز در دامانِ او
او بہ تو احوال خواہد وا نمود — گل دریں جا بود آں جا لالہ بود
گرچہ اکنوں باغ صحرا شد ولے — سرو ایں جا بود آں جا جدولے
چشمکِ نرگس دل از کف می ربود — زلف را از تارِ سنبل می کشود
گل رخاں دلشاد جامے می زدند — ہر طرف مستانہ گامے می زدند
چشمِ ساقی فتنہ می انگیختے — خونِ مینا دم بہ دم می ریختے
وقتِ خود احباب خوش می داشتند — ایں روش دیدند و جا بگذاشتند
ناگہاں آں بزمِ خرم بر شکست — آں شراب افتاد و آں ساغر شکست
چشمِ گل پوشیدہ شد ہم آب رفت — سبزۂ تر دیر شد در خواب رفت
نے گل و نے لالہ و نے سروِ باغ — ماندہ ام من با ہزاراں درد و داغ
نالہ اے از درد گاہے می کشم — گاہ گاہ از سینہ آہے می کشم
کار دارم با سکوت و غم کشی — دم کشے کو تا نمایم دم کشی
من ہم از شوقِ وطن دل خستہ ام — ورنہ عمرے شد کہ لب را بستہ ام
کو دماغ و دل کجا و وقت کو — تا کنم ایں گونہ در ہم گفت گو
شہرۂ شہر است استغنائے من — شور دارد بے دماغی ہائے من
دل ز جوشِ درد و غم خوں می کنم — مصرعے را گاہ موزوں می کنم

رفتۂ عشق ام غم من وافر است ‏ ہر کہ داند شاعرم ناشاعر است

سینہ را بخراش در اندوہِ شہر ‏ گریۂ بسیار کن بر یادِ شہر

شہر از بس خوش عمارت بودہ است ‏ ہر مکانش قصرِ جنّت بودہ است

کوچہ اش دامانِ دل نگذاشتے ‏ راستہ یک شہر رونق داشتے

رونق و خوبی بہ ہر سو دیدہ ام ‏ صد درِ دولت بہ یک کو دیدہ ام

زاں بناہا مطلقاً آثار نیست ‏ از عزیزاں ہیچ کس دیّار نیست

ایں بداں افسانہ می ماند کہ من ‏ گوشش می کردم ز یارانِ کہن

[شروعِ داستان]

بود در مغرب زمیں شہرے خوشے ‏ خوش سوادے خوش ہوائے دل کشے

ہر طرف عالی بنا کاشانہ ہاے ‏ داربستے بود در ہر خانہ اے

ساکنانش صرفِ رعنائی ہمہ ‏ دلبرانش محوِ خود رائی ہمہ

زاہدے آں جا اقامت داشتے ‏ بے عبادت وقت را نگذاشتے

خضر پیشِ او شباں گہ می رسید ‏ گوہرِ پندے بہ گوشش می کشید

ایں حکایت چوں بہ گوشِ شاہ خورد ‏ اشتیاقِ خضر دل از جاے بُرد

بر درِ او رفت و ترکِ کار کرد ‏ قصہ کوتہ خدمتِ بسیار کرد

صبح خاکِ در بہ مژگاں بیختے ‏ شام گہ آبے بہ دستش ریختے

بعدِ چندے عرض گستاخانہ کرد ‏ مطلق آں عزلت گزیں پروانہ کرد

باز گفتا وصلِ خضرم آرزوست ‏ دل بسے مشتاقِ دیرین گفتگوست

صحبتِ او گر میسر آیدم ‏ سر بہ اوجِ چرخِ عزت سایدم

از تو بر جاں منتے خواہم گذاشت ‏ خود بشاید چشم بر راہم گذاشت

گفت ربطِ خضر برمن تہمت است ‏ چوں منے را کے دہانِ صحبت است

او بہ عزت شہرہ و من خوار و زار ‏ او سراپا وقر و من بے اعتبار

او بہ چشمِ خلقِ عالم آمدہ ‏ من سبک پا بے نوائے غم زدہ

خضر با سبزی ست مشہورِ جہاں ‏ ہیچ نسبت نیستش با گم رہاں

زو سرِ خود گیر و ترکِ واہیات　　مردہ ریگے کو دکو آبِ حیات
چوں ازاں مرتاض روے دل نہ دید　　شہ بہ خود پیچید و رو درہم کشید
برزباں آورد یا جاں می دہم　　یا بہ خوں ریزِ تو فرماں می دہم
روزِ خوش داری اگر مدِ نظر　　سوے خضرم شو دلِ شب راہبر
زیں خشونت رنگِ روے او پرید　　صرفۂ خود در رضاے شاہ دید
گفت یک چندے بہ حالم واگذار　　وآں گہے بر دیدۂ من پا گذار
گر دہدت شاید کہ کامِ دل حصول　　از من الحاح و از آں جانب قبول
خضر را افتاد بر وے چوں گذر　　سر نمود آں خشک دامن چشمِ تر
کز پئے تو شہ درپئے جانِ من است　　خضر می داند بہ فرمانِ من است
بہرِ تو سر بر سرِ من داشتہ　　ہمتے بر گشتنم بگماشتہ
من نہ دانستم کہ ربطِ تو بلاست　　خضر راہِ ظلمت آباد فناست
اختلاطت گر بہ ایں رنگ است ہاے　　واے بر اخلاص مندانِ تو واے
خضر دل جمعش نمود و وعدہ داد　　دید او را پادشاہ و لب کشاد
کاے بہ درگاہت جبینِ راستاں　　لطف کن یک داستانِ باستاں
وز سپہر و گردشِ آں خاک شو　　بہرِ پاسِ خاطرم چیزے بگو
کآں ستم اندیش با یاراں چہ کرد　　با جہان و با جہاں داراں چہ کرد
گفت در وقتے از ایں رہ آمدم　　شہر دیدم بر درِ شہ آمدم
داشت آں شہ یال و کوپالِ خوشے　　شہریاں را بود احوالِ خوشے
دل کشیدے ہر در و دیوارِ شہر　　ہوش بردے کوچہ و بازارِ شہر
صحبتِ ہر خانہ دیدن داشتہ ست　　حرفِ ہر واحد شنیدن داشتہ ست
ہر طرف باغے و ہر جانب گلے　　نالہ کش بر ہر نہالے بلبلے
صحبتِ رنگیں بہ ہر کاشانہ اش　　خانقہ آباد و ہم مے خانہ اش
از خرابا تش چو جمشید آمدے　　وز رباطش با یزیدے سر زدے
خواہ صوفی خواہ مستم رونمود　　ہیچ کس خالی ز کیفیت نہ بود

یک طرف شورے ز حسن سادگاں — یک طرف ہنگامۂ دل دادگاں
آہ از طفلانِ شمّاسی نژاد — ہیچ یک خورشید را روئے نہ داد
وائے بر آں زرد رخسارانِ شہر — کار ہر کس را بہ ناز و خشم و قہر
حسن را در ہر دو کف شمشیر بود — عشق را در ہر دو پا زنجیر بود
بعدِ چندے رفتنم شد دل نہاد — اتفاقاً باز چوں راہم فتاد
نے شہ و نے شہر و نے کاشانہ بود — شد بلائے بود و یک ویرانہ بود
دام دارِ چند را گسترده دام — دیدم و کردم سوال از ہر کدام
ہیچ یک زاں شہر حرفے سر نکرد — کس بہ یادِ شاہ چشمے تر نکرد
در جگر چاکے و بر دل تازہ ریش — عاقبت کردم از آں جا قصدِ پیش
بارِ دیگر شد چو زاں سو ہم گذار — یافتم در جوشش بحرِ بے کنار
لجّہ لجّہ لطمہ لطمہ در خروش — تیرہ و تہ دار طوفانے بہ جوش
ساحلش پیدا نہ و موجش بلا — لرزہ از وے خضر را بر دست و پا
باز شد چشمم بہ ماہی گیر چند — ہر یکے در آب شستے می فگند
گفتمش ایں جا بود دشتِ ہولناک — دام داراں دام گسترده بہ خاک
سر کشید آں دام داراں را چہ شد — ناگہ آں صحرا شکاراں را چہ شد
نے بیابان و نہ صیادے بہ خواب — تا نگاہم می رود آب است آب
ہر یکے حیرانِ حرفِ من بماند — کس از آنہا بر زباں حرفے نہ راند
ایں زماں با زم چو رہ افتادہ است — طرفہ حیرانی مرا رو دادہ است
شہر آباد است و ہر سو عشرتے ست — بر سرِ ہر کو و برزن صحبتے ست
حالیا ایں شہر و شاہی از تو شد — چند روزے کج کلاہی از تو شد
مملکت زیرِ نگیں آمد تمام — سکّہ ات بر زر زدند اما بہ نام
ایں جہاں شاہا کہن ویرانہ ایست — رونق و آبادیش افسانہ ایست
زندگانی کن چناں با ہر کسے — کز پسِ رفتن بہ یاد آئی بسے

ایں بگفت و خضر جا بگذاشتہ
شاہ شد درویش و دل برداشتہ

# مسدس

[ترجیع بند]

## در منقبت

تاثیر شد ز نالہ نفس بے سرایت است
دل تنگیم ز چرخ بہ اقصائے غایت است
کے از ستم بغیرِ تو چشم حمایت است
از خاک برگرفتنم اکنوں رعایت است
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

دیرے ست کز جفائے سپہرِ ستم شعار
ہر دم ز دیدہ می رودم بحرِ بے کنار
نے دست بر تدارک و نے آشنا و یار
چوں موج گشتہ ام ہمگی حیرتی کار
یا مرتضیٰؑ علی کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

یک رہ بہ سر بیا و بہ خاکم عیاں نگر
دستم بنہ بہ سینہ و دل را تپاں نگر
چشمے کشا و ایں مژۂ خوں فشاں نگر
لطفے نما و حال منِ خستہ جاں نگر
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

آن ای کہ بعدِ ختمِ رسلؐ جانشیں تو ای
نورِ سپہر و رونقِ روے زمیں تو ای
قیومِ عرش و حامیِ شرعِ متیں تو ای
یعنی کہ جرم پوشش و بیایش گزیں تو ای
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

کس را درایں زمانہ خیالِ کمال نیست
داریم اضطراب و کسے را خیال نیست
یاری گری ز اہلِ جہاں احتمال نیست
ایں یک دو روزہ مہلتِ ما جز وبال نیست
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

تا چند سر بہ سنگ زنم گریہ سر کنم
تا کے بہ آہ و نالہ شبِ خود سحر کنم
لطفے کہ در ممانعتِ غم جگر کنم
رحمے کہ با ثبات بہ کنجے بسر کنم
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

از اضطرابِ دل ز نظر ہا فتادہ ام
بر خاکِ آستانِ خساں رو نہادہ ام
تو خود سوارِ دولت ای و من پیادہ ام
چند پائمالِ حوادث چو جادہ ام
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

دل داغ و سینہ چاک و جگر خوں ز غم مراست
ہنگامۂ عجب ز فلک بر سرم بپاست
ظالم اگر نہ پیشِ تو پس دادرس کجاست
مگذار نا امید کہ از تو امید ہاست

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

در کار کن ز رحمتِ عامت ترحّمے
تا گردوم ملال بدل با تبسّمے
رحمے بہ حالِ خستۂ افغاں ترنّمے
گوشے بہ زاریٔ نظرے بر تظلّمے

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

امید وارم از تو کہ امدادِ من کنی
یک گونہ پاسِ خاطرِ ناشادِ من کنی
چوں وقتِ خاص دست بہ فریادِ من کنی
رحمت بہ آہ و نالہ و فریادِ من کنی

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

ختم است بر تو بعدِ نبیؐ خوبیٔ صفات
ذاتِ تو یاد می دہد از جلوہ ہائے ذات
سہل است پیشِ قدرتِ تو حلِّ مشکلات
عاجز نوازیٔ کہ بیابم ز غم نجات

یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری و وقتِ عنایت است

کوہِ وقار بود کہ ممنونِ ہر خسے ست
بہرِ تلاشِ ناں بہ درِ ناکس و کسے ست
ذلت پے تنبّہِ میرؔ ایں قدر بسے ست
بخشایشے کہ بے دل و بے یار و بے [بیٹے][1] ست
یا مرتضیٰ علیؑ کرمت بے نہایت است
ہنگامِ دست گیری وقتِ عنایت است

---

[1] قیاسی تصحیح۔ مخطوطۂ ادیب۔ نیز نقلِ رام پور میں "کسے" تکرارِ قافیہ ("بے بس" فارسی میں مستعمل ہے)

کیا آپ کو معلوم ہے؟

کہ

میر تقی میر، حصہ دوم

میں

میر پر جتنے اہم مضامین، گزشتہ ایک صدی میں چھپے

اُن کا

انتخاب اس نمبر میں موجود ہے

لکھنے والوں میں

سر شاہ محمد سلیمان، حبیب الرحمٰن شیروانی، عبدالباری آسی

ڈاکٹر عبدالحق، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر محی الدین زور

مالک رام، مسعود حسن رضوی، آل احمد سرور

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مجنوں گورکھپوری، سید احتشام حسین

فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری

ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مولانا وحید الدین سلیم

ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ناصر کاظمی

غرض ہر اہم نقاد!

---

# میر کے ہم مضمون فارسی اُردو شعر

منتخب کردہ : مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم

## فارسی

این نہ پنداری کہ مُردن موجبِ آسودن است
مرگ ہم یک منزل است از راہِ بے پایانِ ما

جہانے گو بہ محشر بر سرِ خود خاک اندازد
کہ می پُرسد بہ پیشِ خوبی او دادخواہاں را

نشمری سہل زغیب این بہ شہود آمدہ را
رہ بسے طے شدہ باشد بہ نمود آمدہ را

آں چناں می آئی از تمکیں کہ گویا می رَوی
طرزِ رفتارِ تو باشد آمدِ کارِ مرا

زباز پرسِ قیامت چہ غم کہ بس باشد
وسیلۂ سرِ زلفت سیاہ کاراں را

ز چند روز دلِ شب نمی کند فریاد
مگر کہ میر بہ تنگ آمدہ ز کوئے تو رفت

## اُردو

موت اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر

اسی جو خوبی سے لائے تجھے قیامت میں
تو حرف کن نے کیا گوش دادخواہوں کا

مت سہل ہمیں بوجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

نازکی یہ بھی کوئی لٹک ہے جی کاہے کو کڑھاتے ہو
آتے اس تمکین سے ہو تم جیسے کہیں کو جاتے ہو

تری ہی زلف کو محشر میں ہم دکھا دیں گے
جو کوئی مانگے گا نامہ سیاہ کاروں کا

نالۂ میر سواد میں ہم تک دوشیں شب سے نہیں آیا
شاید شہر سے ظالم کے عاشق وہ بدنام گیا

| فارسی | اردو |
| --- | --- |
| بستۂ وہم است نقشِ زندگی<br>ورنہ ہستی اعتبارے بیش نیست | یہ توہّم کا کارخانہ ہے<br>یاں وہی ہے جو اعتبار کیا |
| نہ دیدم میرؔ را در کوے او لیک<br>غبارِ ناتوانے باصبا بود | نہ دیکھا میرؔ کو آوارہ لیکن<br>غبار اک ناتواں سا کو بہ کو تھا |
| در بزمِ مطربے غزلِ میرؔ خواندہ بود<br>زاہد بہ سر درآمد و مطرب ز پا فتاد | مطرب سے غزل میرؔ کی کل میں نے پڑھائی<br>اللہ رے اثر سب کے تئیں رفتگی آئی |
| ؎ | مطرب نے پڑھی تھی غزل اک میرؔ کی شب کو<br>مجلس میں بہت وجد کی حالت رہی سب کو |
| دمے چند با میرؔ آوارہ بنشیں<br>عجائب مزاجِ پراگندہ دارد | پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ<br>افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی |
| نیست ہرگز جامۂ احرامِ زاہد معتبر<br>ماند عمرے در حریمِ کعبہ و محرم نہ بود | جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا<br>تھا حرم میں لیک نا محرم رہا |
| چہ ناعاقبت بیں کسے بود ظالم<br>نخست آں کہ عشقِ تو ورزیدہ باشد | سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ<br>مذہبِ عشق اختیار کیا |
| خرامت بہ طرزے کلامت بہ طورے<br>ترا کم کسے میرؔ فہمیدہ باشد | تری چال ٹیڑھی تری بات انوکھی<br>تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے |

## فارسی

مستانہ پا منہ کہ جہاں شیشہ خانہ است
رہ رو چناں کہ مردم آگاہ می روند

---

گفتم کہ پیر گشتہ ام اکنوں کجا روم
قدِ خمیدہ جانبِ خاکم اشارہ کرد

---

پُر غافلی از وقتِ عزیز آہ وگرنہ
ہر گام درایں بادیہ یوسف نتواں ماند

---

ایں چشمہ ہا کہ از دلِ خاک اند جوش زن
چشمانِ عاشقانِ المناک بودہ اند

---

اکنوں ز خاک چشمۂ نو جوش می زند
یارب کہ بردہ است بخود چشمِ تر بخاک

---

بہ ایں وحشی غزالاں بے محابا عشق می بازد
بیاباں مرگ خواہد شد چو مجنوں میر ہم آخر

---

بہ اُمیدے کہ می نالی خموشی اے جرس بہتر
نہ دارد اہلِ دل ایں کارواں ضبطِ نفس بہتر

---

بہ گامِ اوّلیں سر می رود در راہِ عشق او
اگر باور نمی داری بیا اے بوالہوس بہتر

---

## اُردو

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہِ ہستی دوکانِ شیشہ گر ہے

---

سوال میں نے جو انجامِ زندگی سے کیا
قدِ خمیدہ نے سوئے زمیں اشارت کی

---

غیرتِ یوسف ہے یہ عمرِ عزیز
میر اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

---

نکلے چشمہ جو کہیں جوشِ زناں پانی کا
یاد دِہ ہے وہ کسی چشم کی طغیانی کا

---

×

---

پھرتے ہے باولا سا پیچھے ان وحشی غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میر بھی آخر

---

نہ ہو ہرزہ درا اتنا خموشی اے جرس بہتر
نہیں اس قافلے میں اہلِ دل ضبطِ نفس بہتر

---

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میر
کہ سر جاتا ہے گامِ اوّلیں پر

---

رحمے بکن تا کے ستم آخر جفا کار ایں قدر
یک سینہ و زخم ایں ہمہ یک جان و آزار ایں قدر

کر رحم ٹک کب تک ستم مجھ پر جفا کار اس قدر
یک سینہ خنجر سیکڑوں یک جان و آزار اس قدر

---

میر از دیر قصدِ کعبہ نمود
کرد آوارگی خدا گیرش

بت کدہ چھوڑ میر کعبے گیا
کیا کرے گا خدا خراب کرے

---

یک نگہ بیش بہایش نہ نہادم لیکن
خود پسنداں نہ نمودند خریداریِ دل

جنسِ دل دونوں جہاں جس کی بہا تھی اس کا
اک نگہ مول ہوا تم نہ خریدار ہوئے

---

فرہاد و کوہ کندن افسانہ ایست بشنو
بودہ ست در حقیقت زور آزمائیِ دل

کوہ کن کیا پہاڑ توڑے گا
پردے میں زور آزما ہے عشق

---

//

کوہ کن کیا پہاڑ کاٹے گا
عشق کی زور آزمائی ہے

---

ترک کن میر بکاے دلِ شب را دو سہ روز
دورِ چشمِ تو زحد بیش نمودہ ست و رم

کہاں تک بھلا روئیے گے میر صاحب
اب آنکھوں کے گرد اک ورم دیکھتے ہیں

---

شناسائے نہ ماند از آشیانم در چمن ہرگز
کہ بعد از مدتے از قیدِ صیاداں رہا گشتم

تعارف کیا رہا اہلِ چمن سے
ہوئی اک عمر میں اپنی رہائی

---

//

تعارف ہم صفیروں سے نہیں کچھ
ہوا ہوں ایک مدت میں رہا میں

---

//

اہلِ چمن سے کیوں کر اپنی ہو روشناسی
برسوں اسیر رہ کر اب ہم رہا ہوئے ہیں

---

## فارسی

آتشے بودیم چندے پیش ازاں
ایں زماں خود تودۂ خاکستر ایم

---

دل کہ در سینۂ من قطرۂ خونے بودہ ست
چوں بہ چشم آمد از و شیوۂ طوفاں دیدم

---

عید تقریب خوشے بود و لیکن صد حیف
ماند بر عیدِ دگر از تو ہم آغوشیِ من

---

یارب کجا ز بے خودیِ عشق رفتہ ایم
چشمم سفید شد بہ رہِ انتظارِ من

---

بہ رہش گذار می کن و لے اے صبا نہ چنداں
کہ رود بہ باد یک سر کفِ خاکِ دردمنداں

---

کے پیشِ منعمانِ جہاں می شود دراز
بالینِ زیرِ سر شدہ دستِ گدائے او

---

زبس کہ بر سرِ تابوتِ میر کثرت شد
نہ داد دست کسے را نمازِ میتِ او

---

## اُردو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

---

جگر ہی میں یک قطرہ خوں تھا سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

---

عیدِ آئندہ تک رہے گا گلہ
ہو چکی عید تو گلے نہ ملا

---

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

---

خدا جانے ہمیں اس بے خودی نے کس طرف پھینکا
کہ مدت ہو گئی ہم کھینچتے ہیں انتظار اپنا

---

تو گلی میں اس کی جا آ و لے لے صبا نہ چنداں
کہ گڑے ہوئے پھر اکھڑیں دلِ چاکِ دردمنداں

---

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

---

کم کسو کو میر کی میت کی ہاتھ آئی نماز
نعش پر اس بے سر و پا کی بلا کثرت ہوئی

## فارسی

شد کشتہ میر و افسوس از کثرتِ خلائق
دستم نہ داد ہرگز بر نعشِ او نمازے

———

بہ سیرِ لالہ و گل می برد بسر عمرے
مگر کہ میر بود سیدِ گلستانہ

———

حیف در شہرِ خوب رویان میر
کس زبانِ مرا نہ فہمیدہ

———

برائے خاطرِ مجنوں و کوہ کن زنہار
بہ کوہ و دشت نہ بردیم دست برکارے

———

زآں ہا کہ ایں عمارت زیرِ نگینِ شان بود
اکنوں نہ ماندہ باقی آثار غیرِ نامے

———

بہ بزمِ عیشِ او ایستادم خاموش از حیرت
بداں ماند کہ بر دیوار چسپانند تصویرے

"

"

———

## اردو

کم کسو کو میر کی میت کی ہاتھ آئی نماز
نعش پر اس بے سر و پا کی بلا کثرت ہوئی

———

لالہ و گل ہی کے مصروف رہو ہو شب و روز
تم مگر میر جی سید ہو گلستانے کے

———

رہی نہفتہ مرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

———

کوہکن و مجنوں کی خاطر کوہ و دشت میں ہم نہ گئے
عشق میں ہم کو میر نہایت پاسِ عزت داراں ہے

———

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

———

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

———

تصویر کے مانند لگے در ہی سے گزری
مجلس میں تری ہم نے کبھو بار نہ پایا

———

دروازے سے لگے ہیں تصویر سے کھڑے ہیں
وارفتگاں کو اس کی مجلس میں کب جگہ ہے

———

## فارسی

آں سبزہ ام کہ سر زدہ پامال گشتہ ام
در بختِ من نہ بود بہ خوبی دمیدنے

---

در شیرہ خانہ میر مگر بود شب کہ صبح
دیدم بہ دستِ مغبچہ مہرِ نماز را

---

من چہ دانم راہ و رسمِ خانقاہ
عمرِ من در خدمتِ مے خانہ رفت

---

کس چہ داند غبارِ کیست کہ میر
گردِ دنبالِ کارواں شدہ است

---

غلط کردم کہ وا بوسیدم از خود
نہ دانستم دریں قالب خدا بود

---

کاش می داشتم اے میر زباں را در کام
آخر ایں زمزمۂ صبح گرفتارم کرد

---

سال ہا بگریست بے تو دیدۂ من زار زار
در گریبانم رگِ ابر است اکنوں تار تار

---

## اُردو

سبزہ نورستہ رہگذر کا ہوں
سر اُٹھایا کہ ہوگیا پامال

---

شاید شراب خانے میں شب کو رہے تھے میر
کھیلے تھا ایک مغبچہ مہرِ نماز سے

---

شاید کہ آج رات کو تھے میکدے میں میر
کھیلے تھا ایک مغبچہ مہرِ نماز سے

---

سر نشینِ رہ مے خانہ ہوں میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں شیخ کہ آیا نہ گیا

---

اک گردِ راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

---

غلط تھا آپ سے غافل گزرنا
نہ سمجھے ہم کہ اس قالب میں تو تھا

---

میر اے کاش زباں بند رکھا کرتے ہم
صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا

---

کیا میں نے رو کر فشارِ گریباں
رگِ ابر ہے تار تارِ گریباں

---

## فارسی

صحبتِ او بہ ناکسان و مرا
انفعالے ز نکتہ دانیِ خویش

---

خواستم بنویسم او را یک دو حرف از حالِ زار
چوں قلم آمد بہ دستم رقعہ شد طومارِ شوق

---

مپرس اے میر از اندازِ چشمِ نیم بازِ او
قیامت نشہ زاں جامِ شرابِ نیم رس دارم

---

بر جانِ من ز وعدہ خلافیِ متصل
نومیدی و امید مساوات کردہ ای

---

دوش بر شعرِ ترے در رقص آمد جانِ ما
چوں نظر کردیم بود آں شعر در دیوانِ ما

---

بر ہر غزلِ من اجتماع است
در مجلسِ صوفیاں سماع است

---

من و ز کوے تو عزمِ سفر دروغ دروغ
مرا دماغ کجا ایں قدر دروغ دروغ
تو و خیالِ وفا کذب و افترا و غلط
من و تو ہم مہرِ دگر دروغ دروغ

---

## اُردو

صحبت رکھا کیا وہ سفیہ و ضلال سے
کیا خاک میں ملی ہیں مری نکتہ دانیاں

---

لکھتے نامہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

---

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

---

کتنا خلافِ وعدہ ہوا ہوگا وہ کہ میرؔ
نومیدی و امید مساوات ہو گئی

---

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سنا تو ہے میرا کہا ہوا

---

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع
خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

---

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ
تم اور ہم سے محبت تمھیں خلاف خلاف
ہم اور الفتِ خوبِ دگر دروغ دروغ

---

## فارسی

تا کے شنوم غم دلِ میر
اکنوں خاموش کن صداع است

—

در فضائے سینۂ من نیست اکنوں جائے داغ
دارم از سوزِ محبت داغ بر بالائے داغ

—

طفلی ہمہ اے میر بہ غفلت بگذشت
برنائیِ من بہ عیش و عشرت بگذشت
در شیب بجز افسوس کنوں نتواں کرد
مہلت کم ماند و وقتِ فرصت بگذشت

—

دل ز جوشِ درد و غم خوں می کنم
مصرعے را گاہ موزوں می کنم

## اُردو

میر دردِ دل نہ کہہ ظالم بس اب
ہو گیا ہے سامعوں کو تو صداع

—

اب نہیں سینے میں میرے جائے داغ
سوزِ دل سے داغ ہے بالائے داغ

—

ایام لڑکپن کے کٹے غفلت میں
اوقات جوانی کی گئی عشرت میں
پیری میں بجز افسوس کیا کیا جاتے
یک بار کمی آ ہی گئی طاقت میں

—

مصرع کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

—

# اشاریۂ اشعار

## منیرؔ مسعود

شعروں کا یہ اشاریہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی "فہرستِ اشعار" کے اصولوں پر بنایا گیا ہے، یعنی اشعار کی ردیفوں کو الفبائی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب معکوس ہے اور اس میں لفظوں کے ابتدائی حروف کے بجائے آخری حروف کا لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً "تو" اور "من" کی ردیفوں میں "من" کا اندراج "تو" سے پہلے ہوا ہے اس لیے کہ "من" کا آخری حرف ن ہے، جو "تو" کے آخری حرف و سے مقدم ہے۔ اسی طرح ردیف "باید کرد" کا اندراج ردیف "خواہد کرد" کے بعد ہوا ہے۔ ہر ردیف کے ذیل میں آنے والے قافیوں اور غیر مردّف کلام کے قافیوں میں بھی یہی معکوس ترتیب ملحوظ رکھی گئی ہے۔

تین باتوں میں یہ اشاریہ "فہرستِ اشعار" سے مختلف ہے:

۱۔ نشان دہی کے لیے صفحے اور سطر کا حوالہ دینے کے بجائے متن میں غزلیہ کلام کے اندراج کا نمبر دیا گیا ہے۔ رباعیوں، مثنوی اور مسدس کے اندراج کا نمبر قوسین میں دیا گیا ہے اور نمبر سے پہلے علی الترتیب "ر"، "مثنوی" اور "مسدس" لکھ دیا گیا ہے۔

۲۔ غیر مردّف کلام میں پہلے مصرعے کے قافیے کے ساتھ قوسین میں اس کا دوسرا قافیہ بھی لکھ دیا گیا ہے تاکہ قافیے کی صحیح نوعیت ظاہر ہو جائے، مثلاً "برہم" کے ساتھ [سرم] کے اندراج سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قوافی "کرم"، "سرم"، "درم" وغیرہ ہیں، "کم"، "صنم"، "قسم" وغیرہ نہیں ہیں۔ اسی طرح "دمیدہ" کے ساتھ [دیدہ] سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ قوافی "خمیدہ"، "رمیدہ" وغیرہ نہیں بلکہ "چیدہ"، "رسیدہ" وغیرہ ہیں۔

۳۔ قافیوں کے اندراج میں اُن کے نہ بدلنے والے آخری حرفوں کی الفبائی ترتیب کو مدِّ نظر رکھا گیا ہے، یعنی قافیہ "نظر، خبر، اثر" کو صرف ر اور قافیہ "غبار، بہار، قرار" کو ر مع الالف قرار دے کر "نظر" کا اندراج "غبار" سے پہلے کیا گیا ہے[1] وعلیٰ ہٰذا القیاس

(منیرؔ مسعود)

---

[1] نسخۂ عرشی کی فہرستِ اشعار میں "نام" [قوافی: سلام، انجام، استفہام وغیرہ] کا اندراج "ارم" [قوافی: باہم، کم، آدم وغیرہ] سے پہلے کیا گیا ہے، اسی طرح "دل" [قوافی: کامل، مشکل] کا اندراج "اطفال" [قوافی: حال، استقبال] کے بعد ہے۔ میں اس سے انحراف کی اجازت حاصل کرنے کے لیے مولانا امتیاز علی صاحب عرشی کو خط لکھنے جا رہا تھا کہ ان کی وفات کی خبر آ گئی۔

اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون۔ (نیرؔ)

(الف)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱ | نم ناک ، | آں جا | ۸ |
| ۲ | جان ، | کجا | ۴۶ |
| ۳ | دامت، | بادا | ۳۲ |
| ۴ | پا ، | را | [ر - ۹] |
| ۵ | لب ، | را | ۴۴ |
| ۶ | یار ، | را | ۱۵ |
| ۷ | ناز ، | را | ۳۷ |
| ۸ | کیش ، | را | ۱۲ |
| ۹ | بے دل ، | را | ۵۲۱ |
| ۱۰ | آدم ، | را | ۵۰ |
| ۱۱ | بے قرارم ، | را | ۳۱ |
| ۱۲ | گلشن ، | را | ۲۲ |
| ۱۳ | خوش قدل ، | را | ۱۰ |
| ۱۴ | ہمزاں ، | را | ۲۶ |
| ۱۵ | بے قراراں ، | را | ۴ |
| ۱۶ | جاناں ، | را | ۳ |
| ۱۷ | رسوایاں ، | را | ۲۸ |
| ۱۸ | ہاموں ، | را | ۴۷ |
| ۱۹ | آتشیں ، | را | ۳۹ |
| ۲۰ | نوشیں ، | را | ۴۹ |
| ۲۱ | پیالہ ، | را | ۶ |
| ۲۲ | رندانہ ، | را | ۷ |
| ۲۳ | دانی ، | را | [ر - ۳۲] |
| ۲۴ | زبلنے ، | را | ۳۸ |
| ۲۵ | کشید ، | مارا | ۲۹ |
| ۲۶ | انساں ، | مارا | ۱۶ |
| ۲۷ | منزلِ ، | خودرا | ۴۸ |
| ۲۸ | سینۂ ، | خودرا | ۴۰ |
| ۲۹ | زار ، | خویش را | ۱۴ |
| ۳۰ | روے ، | خویش را | ۴۲ |
| ۳۱ | نگاہِ ، | خوبان را | ۱۸ |
| ۳۲ | شہود ، | آمدہ ترا | ۵ |
| ۳۳ | سامانِ ، | ترا | ۳۰ |
| ۳۴ | نظر ، | نیست ترا | ۲۳ |
| ۳۵ | دانم ، | نمی دانم چرا | ۱۱ |
| ۳۶ | محبوب ، | مرا | ۲۴ |
| ۳۷ | تپید ، | مرا | ۱۳ |
| ۳۸ | سر ، | مرا | ۴۳ |
| ۳۹ | گفتار ، | مرا | ۲۱ |
| ۴۰ | گل ، | مرا | ۵۱ |
| ۴۱ | خزانِ ، | مرا | ۹ |
| ۴۲ | دیدی | مرا | ۲۵ |
| ۴۳ | آبروے ، | مرا | ۲ |
| ۴۴ | شام ، | است مرا | ۴۵ |
| ۴۵ | نبرد ، | ما | ۳۳ |
| ۴۶ | بسیار ، | ما | ۱۷ |
| ۴۷ | رنگِ ، | ما | ۲۰ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۴۸ | داریم ، | ما | ۳۶ |
| ۴۹ | جانِ ، | ما | ۳۴ |
| ۵۰ | امکان ، | ما | ۱ |
| ۵۱ | یگانہ ، | ما | ۱۹ |
| ۵۲ | نیالودہ ، | ایم ما | ۲۵ |
| ۵۳ | معیوب ، | می دانیم ما | ۴۱ |
| ۵۴ | پیشتر ، | کہ ما | ۲۷ |

(ب)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵۵ | حباب (آب) | – | [ر-۸۵] |
| ۵۶ | اسباب (خراب) | – | [ر-۱۳] |
| ۵۷ | سراب (آب) | – | [ر-۱۰۳] |
| ۵۸ | اضطراب (خراب) | – | ۵۵ |
| ۵۹ | حالا ، | شب | ۵۴ |
| ۶۰ | دیوانہ ، | شب | ۵۲ |
| ۶۱ | بے اختیار ، | ہر شب | ۵۶ |
| ۶۲ | خواب ، | امشب | ۵۷ |
| ۶۳ | وفا ، | طلب | ۵۳ |

(ت)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۶۴ | درمانم ، | سوخت | ۷۸ |
| ۶۵ | نخست (تست) | – | [ر-۴۰] |
| ۶۶ | اقتضا ، | ست | ۱۲۲ |
| ۶۷ | رسیدہ ، | ست | ۶۵ |
| ۶۸ | چسپیدنی ، | ست | ۱۱۱ |
| ۶۹ | اشارۂ لے ، | ست | ۱۳۴ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۷۰ | آفتے ، | ست | ۱۱۳ |
| ۷۱ | یارے ، | ست | ۷۷ |
| ۷۲ | ننگے ، | ست | ۹۲ |
| ۷۳ | جفائے ، | ست | ۸۵ |
| ۷۴ | تر ، | این جاست | ۹۸ |
| ۷۵ | رخشانِ ، | اوست | ۱۰۴ |
| ۷۶ | گرہ گیر ، | ساختہ ست | ۱۲۳ |
| ۷۷ | زیبا ، | افتادہ ست | ۱۳۸ |
| ۷۸ | دل ، | شدہ ست | ۱۳۹ |
| ۷۹ | گلشانے ، | بودہ ست | [ر-۸۷] |
| ۸۰ | گزینے ، | بودہ ست | ۱۴۵ |
| ۸۱ | تنگ ، | نہ بودہ ست | ۷۵ |
| ۸۲ | دلدار ، | کشیدہ ست | ۱۲۴ |
| ۸۳ | شنیدے ، | باقی ست | [ر-۶۸] |
| ۸۴ | راست (کجاست) | – | [ر-۸۹] |
| ۸۵ | محالات ، | است | ۱۰۷ |
| ۸۶ | ملالت ، | است | ۶۵ |
| ۸۷ | بے سرایت ، | است | [مت س-آ] |
| ۸۸ | تر ، | است | ۱۰۶ |
| ۸۹ | سر ، | است | ۶۳ |
| ۹۰ | جگر ، | است | ۵۹ |
| ۹۱ | درخور ، | است | ۱۰۱ |
| ۹۲ | کار ، | است | ۷۴ |
| ۹۳ | سروکار ، | است | ۱۴۲ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۹۴ | زور، | است | ۱۰۳ |
| ۹۵ | سیر، | است | ۷۱ |
| ۹۶ | تمیز، | است | ۱۴۰ |
| ۹۷ | خاموش، | است | [ر-۹۴] |
| ۹۸ | اجتماع، | است | ۱۳۷ |
| ۹۹ | شوق، | است | ۶۷ |
| ۱۰۰ | عاشق، | است | ۱۴۱ |
| ۱۰۱ | رنگ، | است | [ر-۶۰] |
| ۱۰۲ | حاصل، | است | ۷۳ |
| ۱۰۳ | حاصل، | است | ۱۲۸ |
| ۱۰۴ | کم، | است | [ر-۹۱] |
| ۱۰۵ | زمان، | است | ۱۳۹ |
| ۱۰۶ | بےبصرن، | است | ۶۹ |
| ۱۰۷ | درویشان، | است | ۹۶ |
| ۱۰۸ | کین، | است | ۶۰ |
| ۱۰۹ | دستہ، | است | ۹۷ |
| ۱۱۰ | کشادہ، | است | ۱۲۱ |
| ۱۱۱ | نشانہ، | است | ۱۱۰ |
| ۱۱۲ | اخیر، | وقت است | [ر-۹۷] |
| ۱۱۳ | گیسوے، | خود است | ۱۱۷ |
| ۱۱۴ | جفاے، | دگر است | ۸۲ |
| ۱۱۵ | زبان، | دگر است | ۶۱ |
| ۱۱۶ | شتاب، | عمر است | [ر-۶۹] |
| ۱۱۷ | سفر، | نزدیک است | ۱۱۵ |
| ۱۱۸ | ابصار، | مشکل است | ۱۲۹ |
| ۱۱۹ | خاک، | من است | ۱۳۵ |
| ۱۲۰ | جان، | من است | ۱۳۰ |
| ۱۲۱ | شادی، | من است | ۶۲ |
| ۱۲۲ | مائل، | این است | [ر-۸۶] |
| ۱۲۳ | ناچشیدہ، | بہ است | ۱۳۱ |
| ۱۲۴ | یغما، | رفتہ است | ۸۴ |
| ۱۲۵ | نہاں، | شدہ است | ۷۹ |
| ۱۲۶ | تنگ، | آمدہ است | ۱۰۸ |
| ۱۲۷ | مزاے، | ماندہ است | ۹۴ |
| ۱۲۸ | زردے، | بودہ است | ۷۶ |
| ۱۲۹ | یار، | من برخاست | ۹۳ |
| ۱۳۰ | دادے، | برنخاست | ۱۰۹ |
| ۱۳۱ | اسیرے، | برنخاست | ۱۳۶ |
| ۱۳۲ | کار، | بست | ۶۴ |
| ۱۳۳ | تمنائے، | ہست | ۹۱ |
| ۱۳۴ | پیشہ، | چیست | ۱۳۳ |
| ۱۳۵ | زار، | می باید گریست | ۷۲ |
| ۱۳۶ | جا، | نیست | ۱۰۰ |
| ۱۳۷ | مارا، | نیست | [ر-۷۷] |
| ۱۳۸ | ما، | نیست | ۸۹ |
| ۱۳۹ | بیمار، | نیست | ۸۶ |
| ۱۴۰ | رہگذارے، | بیش نیست | ۱۰۲ |
| ۱۴۱ | دہاں، | معلوم نیست | ۵۸ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۴۲ | اعتبار ، | تو نیست | ۸۸ |
| ۱۴۳ | شان ، | تو بے چیزے نیست | ۹۰ |
| ۱۴۴ | آب ، | داشت | ۶۶ |
| ۱۴۵ | یار ، | داشت | ۱۳۲ |
| ۱۴۶ | خیال ، | داشت | ۸۳ |
| ۱۴۷ | ترسے ، | داشت | ۷۰ |
| ۱۴۸ | جستجوئے ، | داشت | ۱۱۲ |
| ۱۴۹ | کماں ، | برداشت | ۱۰۵ |
| ۱۵۰ | سر ، | گذشت | ۸۱ |
| ۱۵۱ | گل ، | گذشت | ۱۲۶ |
| ۱۵۲ | زہم ، | گذشت | ۱۲۷ |
| ۱۵۳ | گراں ، | گذشت | ۱۲۰ |
| ۱۵۴ | ہاموں ، | گذشت | ۱۱۶ |
| ۱۵۵ | غفلت ، | بگذشت | [ر-۵۶] |
| ۱۵۶ | یار ، | بگشت | [ر-۴۱] |
| ۱۵۷ | لاغر ، | گشت | ۱۱۸ |
| ۱۵۸ | نگاہ ، | رفت | ۱۱۴ |
| ۱۵۹ | جانانہ ، | رفت | ۶۸ |
| ۱۶۰ | دہ دلہ ، | می باید رفت | [ر-۶۳] |
| ۱۶۱ | برِ ، | او خواہم رفت | [ر-۵۴] |
| ۱۶۲ | دید ، | در رفت | ۸۷ |
| ۱۶۳ | آرزوئے ، | تو رفت | ۸۰ |
| ۱۶۴ | بجست | و برفت | ۹۹ |

(ث)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۶۵ | رسیدی ، | بہ عبث | ۱۴۳ |

(ج)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۶۶ | با ، | علاج | ۱۴۴ |

(چ)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۶۷ | نشاں | آخر ہیچ | ۱۴۵ |

(ح)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۶۸ | شرح [طرح] | | ۱۴۶ |

(خ)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۶۹ | در ، | شاخ | ۱۴۸ |
| ۱۷۰ | کارِ ، | شیخ | ۱۴۷ |

(د)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۷۱ | شاد [افتاد] | — | ۲۴۷ |
| ۱۷۲ | جفا ، | فتاد | ۲۱۰ |
| ۱۷۳ | ما ، | اُفتاد | [ر-۵۲] |
| ۱۷۴ | دنیا ، | اُفتاد | ۲۶۲ |
| ۱۷۵ | فراق ، | اُفتاد | ۲۰۵ |
| ۱۷۶ | مژگاں ، | اُفتاد | ۲۶۶ |
| ۱۷۷ | خو ، | اُفتاد | ۱۹۱ |
| ۱۷۸ | کم ، | نہ داد | ۱۶۸ |
| ۱۷۹ | شراب ، | می گردد | ۲۱۱ |
| ۱۸۰ | خوں ، | می آرد | [ر-۴۷] |
| ۱۸۱ | فلک ، | می بارد | [ر-۵۰] |
| ۱۸۲ | جا ، | دارد | ۲۷۱ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱۸۳ | تمنا ، | وارد | ۲۴۶ |
| ۱۸۴ | اضطراب ، | وارد | ۱۷۹ |
| ۱۸۵ | گذر ، | وارد | ۱۷۸ |
| ۱۸۶ | تپاں ، | وارد | ۱۷۵ |
| ۱۸۷ | جہاں ، | وارد | ۱۹۸ |
| ۱۸۸ | دیدن ، | وارد | ۲۰۲ |
| ۱۸۹ | گلو ، | وارد | ۱۸۴ |
| ۱۹۰ | خندہ ، | وارد | ۲۱۳ |
| ۱۹۱ | آبلہ ، | وارد | ۱۹۳ |
| ۱۹۲ | نالہ اے ، | وارد | ۲۷۲ |
| ۱۹۳ | نظرے ، | وارد | ۲۷۰ |
| ۱۹۴ | نورے ، | وارد | [ر۔ ۷۲] |
| ۱۹۵ | طے ، | وارد | [ر۔ ۵۷] |
| ۱۹۶ | فراغے ، | وارد | ۲۰۱ |
| ۱۹۷ | وفائے ، | وارد | ۲۸۱ |
| ۱۹۸ | پاسے ، | بردارد | ۲۵۹ |
| ۱۹۹ | چرا ، | برد | ۲۵۸ |
| ۲۰۰ | بسر ، | باید برد | ۲۲۱ |
| ۲۰۱ | پا ، | می برد | ۲۴۴ |
| ۲۰۲ | یک بار ، | می برد | ۱۸۳ |
| ۲۰۳ | ما ، | کرد | ۲۱۷ |
| ۲۰۴ | شباب ، | کرد | ۲۰۸ |
| ۲۰۵ | تر ، | کرد | ۱۷۳ |
| ۲۰۶ | ناز ، | کرد | ۱۷۱ |
| ۲۰۷ | آزارم ، | کرد | ۱۹۴ |
| ۲۰۸ | پارہ ، | کرد | ۲۲۷ |
| ۲۰۹ | نگہ ، | کرد | ۲۰۳ |
| ۲۱۰ | خون فشانی ، | کرد | ۱۶۱ |
| ۲۱۱ | نظر ، | خواہد کرد | ۵۴۲ |
| ۲۱۲ | من ، | خواہد کرد | ۲۱۹ |
| ۲۱۳ | جگرش ، | باید کرد | ۱۹۰ |
| ۲۱۴ | نگہ ، | باید کرد | [ر۔ ۵۹] |
| ۲۱۵ | زار ، | چہ کرد | ۱۷۶ |
| ۲۱۶ | تر ، | نہ کرد | ۱۸۰ |
| ۲۱۷ | ببرد ، | د مرد | ۱۶۷ |
| ۲۱۸ | کار ، | آورد | ۲۲۴ |
| ۲۱۹ | یار ، | آورد | ۱۶۰ |
| ۲۲۰ | تنگ ، | زد | ۲۴۵ |
| ۲۲۱ | سنگ ، | زد | ۲۷۸ |
| ۲۲۲ | دم ، | می زد | [ر۔ ۶۱] |
| ۲۲۳ | پر ، | می سوزد | [ر۔ ۹۶] |
| ۲۲۴ | خانہ ، | برخیزد | ۱۷۰ |
| ۲۲۵ | آب ، | می ریزد | ۲۴۱ |
| ۲۲۶ | ہوس ، | نہ رسد | ۲۴۶ |
| ۲۲۷ | بیداد ، | شد | ۲۴۳ |
| ۲۲۸ | فتور ، | شد | ۱۹۳ |
| ۲۲۹ | چاک ، | شد | ۱۷۴ |
| ۲۳۰ | مشکل ، | شد | ۲۱۸ |

| ۲۷۹ | میسر ، | بود | ۲۶۱ |
|---|---|---|---|
| ۲۸۰ | بیش ، | بود | ۲۲۵ |
| ۲۸۱ | خاک ، | بود | ۲۷۷ |
| ۲۸۲ | تنگ ، | بود | ۱۴۹ |
| ۲۸۳ | جلوہ گری ، | بود | ۲۵۱ |
| ۲۸۴ | نادانی ، | بود | [ر — ۶۲] |
| ۲۸۵ | اعتبارے ، | بود | ۱۸۹ |
| ۲۸۶ | پاسے ، | او بود | ۲۶۶ |
| ۲۸۷ | قربانِ ، | تو بود | ۲۳۶ |
| ۲۸۸ | سر ، | زدہ بود | ۱۵۳ |
| ۲۸۹ | استغنا ، | نہ بود | ۱۹۷ |
| ۲۹۰ | جاں ، | نہ بود | ۲۵۰ |
| ۲۹۱ | ستمگاری ، | نہ بود | ۲۱۹ |
| ۲۹۲ | عیار ، | رود | ۱۵۱ |
| ۲۹۳ | ثریا ، | می رود | ۱۷۷ |
| ۲۹۴ | کار ، | می رود | ۲۱۲ |
| ۲۹۵ | خوں ، | می رود | ۱۸۸ |
| ۲۹۶ | خوں ، | نمی رود | ۲۳۸ |
| ۲۹۷ | مہ ، | شود | ۲۳۶ |
| ۲۹۸ | من ، | می شود | ۱۵۰ |
| ۲۹۹ | زبانے ، | می شود | ۱۹۶ |
| ۳۰۰ | سیاہ ، | ببینم چہ می شود | ۲۶۸ |
| ۳۰۱ | برپا ، | نمی شود | ۱۵۹ |
| ۳۰۲ | تن ، | نمی شود | ۲۱۴ |
| ۳۰۳ | برپا ، | نمود | ۲۵۶ |
| ۳۰۴ | سیم برے ، | می خواہد | ۲۷۴ |
| ۳۰۵ | ترے ، | می خواہد | [ر — ۶۵] |
| ۳۰۶ | مُردنے ، | می خواہد | [ر — ۵۳] |
| ۳۰۷ | جہاں ، | دہد | ۲۰۰ |
| ۳۰۸ | اذاں ، | می دہد | ۱۹۲ |
| ۳۰۹ | رو ، | می دہد | ۲۷۳ |
| ۳۱۰ | خروش ، | می آید | ۲۴۲ |
| ۳۱۱ | بروں ، | می آید | ۲۴۹ |
| ۳۱۲ | خوش رو ، | ایں چنیں باید | ۱۶۶ |
| ۳۱۳ | اَنتم ، | می باید | [ر — ۹۲] |
| ۳۱۴ | کامے ، | نمی باید | ۱۶۹ |
| ۳۱۵ | کوے ، | تو نہ دید | [ر — ۱۹] |
| ۳۱۶ | وافر ، | گردید | [ر — ۳۹] |
| ۳۱۷ | چاک ، | گردید | ۱۵۲ |
| ۳۱۸ | صبا ، | رسید | ۱۹۹ |
| ۳۱۹ | ضرر ، | رسید | ۱۵۵ |
| ۳۲۰ | بر ، | کشید | ۲۲۸ |
| ۳۲۱ | دلبر ، | کشید | ۲۳۲ |
| ۳۲۲ | فواں ، | کشید | ۲۳۴ |
| ۳۲۳ | نازنیں ، | کشید | ۲۶۵ |
| ۳۲۴ | مانی ، | کشید | ۲۳۳ |
| ۳۲۵ | دہن ، | خواہد کشید | ۲۲۳ |
| ۳۲۶ | بسیار ، | می باید کشید | ۲۰۴ |

(م)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۴۰۹ | ناز ، | ام | [ر - ۳۶] |
| ۴۱۰ | خواہان ، | ام | [ر - ۲۸] |
| ۴۱۱ | پرداختہ ، | ام | [ر - ۲۰] |
| ۴۱۲ | فتادہ ، | ام | ۳۵۳ |
| ۴۱۳ | صبح گاہِ ، | خود ام | ۴۰۰ |
| ۴۱۴ | جادوانہ ، | ساختہ ام | ۳۵۴ |
| ۴۱۵ | خبرے ، | یافتہ ام | ۳۹۰ |
| ۴۱۶ | آفت ، | زدہ ام | [ر - ۶۴] |
| ۴۱۷ | ادا ، | را بندہ ام | ۳۷۶ |
| ۴۱۸ | گذشتہ ، | بے مزہ ام | ۴۰۱ |
| ۴۱۹ | کتابم [خطابم] | - | ۳۷۰ |
| ۴۲۰ | نگارے ، | نہ ریختم | ۳۶۷ |
| ۴۲۱ | نظر ، | داشتم | ۳۸۴ |
| ۴۲۲ | مہربانے ، | داشتم | ۳۹۸ |
| ۴۲۳ | بلا ، | گشتم | ۳۶۶ |
| ۴۲۴ | مائل ، | گشتم | [ر - ۶۷] |
| ۴۲۵ | علاجم [مزاجم] | - | ۴۰۵ |
| ۴۲۶ | دلبر ، | اوفتادم | ۴۰۷ |
| ۴۲۷ | دردم [کردم] | - | [ر - ۲] |
| ۴۲۸ | بدر ، | کردم | ۳۷۵ |
| ۴۲۹ | خویشتنی ، | کردم | ۳۶۴ |
| ۴۳۰ | وطن ، | کردم | ۴۱۰ |
| ۴۳۱ | تازی ، | کردم | [ر - ۳۳] |
| ۴۳۲ | میرزائی ، | کردم | [ر - ۲۳] |
| ۴۳۳ | بسیار ، | گروکردم | ۴۰۸ |
| ۴۳۴ | شراب ، | می گردم | ۳۷۹ |
| ۴۳۵ | ازار ، | مردم | ۳۷۱ |
| ۴۳۶ | مائل ، | ماندم | [ر - ۷۹] |
| ۴۳۷ | جہاں ، | ماندم | ۳۷۳ |
| ۴۳۸ | نمودم [بودم] | - | ۳۵۱ |
| ۴۳۹ | ہامون ، | بودم | [ر - ۵۸] |
| ۴۴۰ | مکاں | دیدم | ۳۸۲ |
| ۴۴۱ | بوتراب | گردیدم | ۳۷۷ |
| ۴۴۲ | جگر ، | تراشیدم | ۳۹۹ |
| ۴۴۳ | برم [نزم] | - | ۳۵۵ |
| ۴۴۴ | برم [نگرم] | - | ۳۵۶ |
| ۴۴۵ | خطر ، | دارم | ۳۹۱ |
| ۴۴۶ | کار ، | دارم | ۳۹۲ |
| ۴۴۷ | قفس ، | دارم | ۳۸۸ |
| ۴۴۸ | کاہش ، | دارم | ۴۰۶ |
| ۴۴۹ | جاں ، | دارم | ۳۴۹ |
| ۴۵۰ | جوشاں ، | دارم | ۳۵۰ |
| ۴۵۱ | عنیں ، | دارم | ۳۸۰ |
| ۴۵۲ | جستجو ، | دارم | ۳۷۸ |
| ۴۵۳ | آہ ، | دارم | ۳۷۴ |
| ۴۵۴ | حرفے ، | دارم | [ر - ۷۱] |
| ۴۵۵ | بر ، | نمے دارم | ۳۸۱ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۴۵۶ | سیر، | می خورم | ۳۵۷ |
| ۴۵۷ | دنداں، | می خورم | ۴۰۴ |
| ۴۵۸ | نازم [سازم] | - | [ر-۵۱] |
| ۴۵۹ | مشتو قشم [کشم] | - | ۳۸۷ |
| ۴۶۰ | بے خبر، | می باشم | [ر-۷۷] |
| ۴۶۱ | کاشانہ، | چشم | [ر-۱۰۰] |
| ۴۶۲ | عالم [پامالم] | - | [ر-۱۱] |
| ۴۶۳ | نالم [ہمالم] | - | ۳۶۳ |
| ۴۶۴ | آزار، | دلم | ۴۱۱ |
| ۴۶۵ | جستجوے، | دلم | ۳۵۲ |
| ۴۶۶ | جانم [مانم] | - | ۴۰۳ |
| ۴۶۷ | حیرانم [دانم] | - | ۳۸۹ |
| ۴۶۸ | شاہے، | سنت کہ من می دانم | ۳۷۲ |
| ۴۶۹ | بریدہ، | را مانم | ۳۶۱ |
| ۴۷۰ | خرسند، | کنم | [ر-۹۳] |
| ۴۷۱ | خوں، | کنم | ۳۸۶ |
| ۴۷۲ | آہے، | نکنم | ۳۹۵ |
| ۴۷۳ | جفاجو، | می کنم | ۳۹۷ |
| ۴۷۴ | رو، | می کنم | ۳۶۰ |
| ۴۷۵ | بوسے، | می کنم | ۳۹۴ |
| ۴۷۶ | خونم [گلگونم] | - | ۳۶۸ |
| ۴۷۷ | کربلا، | رابینم | [ر-۶] |
| ۴۷۸ | وہم [بفہم] | - | ۴۰۹ |
| ۴۷۹ | راہم [کلاہم] | - | ۳۸۵ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۴۸۰ | فغاں، | می دہم | ۳۹۶ |
| ۴۸۱ | استوا، | می آیم | [ر-۴۴] |
| ۴۸۲ | کشیدہ، | می آیم | ۳۵۸ |
| ۴۸۳ | تقوایم [مصلایم] | - | ۴۱۲ |
| ۴۸۴ | جنگ، | ایم | [ر-۲۱] |
| ۴۸۵ | نگذاشتہ، | ایم | [ر-۱۰۱] |
| ۴۸۶ | دنیا، | زدہ ایم | ۳۶۲ |
| ۴۸۷ | سر، | داشتیم | ۴۱۳ |
| ۴۸۸ | نکوئے، | داشتیم | ۳۵۵ |
| ۴۸۹ | رفتیم [گفتیم] | - | [ر-۹۸] |
| ۴۹۰ | دولت، | بردیم | [ر-۴۲] |
| ۴۹۱ | گل، | می گردیم | [ر-۸۸] |
| ۴۹۲ | دنیا، | آمدیم | ۳۸۳ |
| ۴۹۳ | سوے، | تو آمدیم | ۳۹۳ |
| ۴۹۴ | جا، | دیدیم | [ر-۱۲] |
| ۴۹۵ | سوداگریم [خریم] | - | ۳۶۹ |
| ۴۹۶ | زار، | بگریم | ۳۶۵ |
| ۴۹۷ | حالیم [نالیم] | - | [ر-۹۵] |
| ۴۹۸ | یک بارہ، | کنیم | [ر-۸۴] |
| ۴۹۹ | در، | آئیم | ۴۰۲ |

(ن)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵۰۰ | سر، | خوباں | ۴۳۲ |
| ۵۰۱ | چنداں [دردمنداں] | - | ۴۴۱ |
| ۵۰۲ | دنداں [خنداں] | - | ۴۳۷ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵۰۳ | سفتن ، | آساں | [ر - ۲۰] |
| ۵۰۴ | صحرا ، | گریستن | ۴۲۳ |
| ۵۰۵ | نیاز ، | گشتن | ۴۳۱ |
| ۵۰۶ | طرف ، | گشتن | ۴۲۱ |
| ۵۰۷ | صبور ، | باید گشتن | [ر - ۴۷] |
| ۵۰۸ | ناگاہ ، | بباید رفتن | [ر - ۴۸] |
| ۵۰۹ | خوردن [مُردن] | - | ۴۱۷ |
| ۵۱۰ | جگر ، | کردن | ۴۲۷ |
| ۵۱۱ | حیا ، | نہ کردن | ۴۲۸ |
| ۵۱۲ | قربانِ ، | او خواہد شدن | ۴۴۰ |
| ۵۱۳ | تپیدن [رسیدن] | - | ۴۳۳ |
| ۵۱۴ | گوارا ، | کُن | ۴۲۰ |
| ۵۱۵ | اضطراب ، | کُن | ۴۲۵ |
| ۵۱۶ | تر ، | کُن | [ر - ۴۳] |
| ۵۱۷ | بیروں ، | کُن | ۴۱۴ |
| ۵۱۸ | دادے ، | بکُن | ۴۳۶ |
| ۵۱۹ | جفا ، | من | ۴۲۲ |
| ۵۲۰ | دلبرِ ، | من | ۴۱۲ |
| ۵۲۱ | نظرِ ، | من | ۴۲۴ |
| ۵۲۲ | غبارِ ، | من | ۴۳۴ |
| ۵۲۳ | بسمل ، | من | ۴۲۹ |
| ۵۲۴ | آزارم ، | من | [ر - ۸] |
| ۵۲۵ | زندانِ ، | من | ۴۱۸ |
| ۵۲۶ | توانِ ، | من | ۴۱۵ |
| ۵۲۷ | آتشینِ ، | من | ۴۱۹ |
| ۵۲۸ | فراموشیِ ، | من | ۴۳۹ |
| ۵۲۹ | برائے ، | من | ۴۳۰ |
| ۵۳۰ | سوے ، | من | ۴۳۸ |
| ۵۳۱ | جگر ، | خوں | ۴۲۶ |
| ۵۳۲ | کمر ، | بہ خوں | ۴۳۵ |

(و)

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵۳۳ | او [سو] | - | ۴۴۲ |
| ۵۳۴ | الفتِ ، | او | ۴۵۴ |
| ۵۳۵ | یارِ ، | او | ۴۵۳ |
| ۵۳۶ | خوش آبی ، | او | ۴۵۰ |
| ۵۳۷ | ہولے ، | او | ۴۴۵ |
| ۵۳۸ | قرار ، | آیداز او | [ر - ۷۰] |
| ۵۳۹ | پندِ ، | تو | ۴۴۸ |
| ۵۴۰ | قہرِ ، | تو | ۴۵۵ |
| ۵۴۱ | نخچیرِ ، | تو | ۴۴۶ |
| ۵۴۲ | تنگِ ، | تو | ۴۴۳ |
| ۵۴۳ | بیمارانِ ، | تو | ۴۵۲ |
| ۵۴۴ | بری ، | تو | ۴۴۴ |
| ۵۴۵ | فدائے ، | تو | ۴۴۹ |
| ۵۴۶ | شہلائے ، | تو | ۴۵۱ |
| ۵۴۷ | سوئے ، | تو | ۴۴۷ |
| ۵۴۸ | داریم ، | از تو | [ر - ۴] |
| ۵۴۹ | گدایانہ ، | برو | ۴۵۶ |

### (ہ)

۵۵۰ جاں کاہ [آہ] - ۴۷۳
۵۵۱ ناکاہ [آہ] - [ر - ۸۱]
۵۵۲ بے اختیاے ، گاہ گاہ ۴۲۵
۵۵۳ ردم ، درکعبہ [ر - ۱]
۵۵۴ جانِ ، سوختہ ۴۵۷
۵۵۵ سر ، گشتہ [ر - ۲۳]
۵۵۶ بیتر ، گشتہ [ر - ۲۴]
۵۵۷ در ، یافتہ ۴۲۶
۵۵۸ یاراں ، رفتہ [ر - ۹۹]
۵۵۹ بادہ [فتادہ] - ۴۶۲
۵۶۰ ترقم ، کردہ [ر - ۲۵]
۵۶۱ پلے گیر ، شدہ ۴۶۸
۵۶۲ رخسار ، آمدہ ۴۷۰
۵۶۳ دیدہ [گردیدہ] - ۴۶۶
۵۶۴ دمیدہ [دیدہ] - ۴۵۸
۵۶۵ دیر ، کشیدہ ۴۷۴
۵۶۶ شانہ [جانانہ] - ۴۶۰

### (ع)

(مرادفِ "ای")

۵۶۷ خوں ، گشتۂ ۴۷۱
۵۶۸ نہادۂ [فتادۂ] - ۴۶۷
۵۶۹ ملاقات ، کردۂ ۴۶۳
۵۷۰ بدخواہ بودۂ ۴۶۴

(مرادفِ "اے")

۵۷۱ زادۂ [افتادۂ] - ۴۶۱
۵۷۲ زادۂ [افتادۂ] - ۴۷۵
۵۷۳ بردۂ [آزردۂ] - ۴۵۹
۵۷۴ بے چارۂ [پارۂ] - ۴۷۲

### (ی)

۵۷۵ بنواختہ ، ای [ر - ۱۵]
۵۷۶ کار ، نیستی ۴۹۴
۵۷۷ جا ، رفتی ۴۸۲
۵۷۸ شادی [کشادی] - ۴۷۹
۵۷۹ مباہی ، کردی [ر - ۲۷]
۵۸۰ کسے ، گردی [۵۱۵]
۵۸۱ سرد ، شدی ۴۹۷
۵۸۲ اسیر ، شدی ۴۹۵
۵۸۳ وفا ، می بودی [ر - ۲۹]
۵۸۴ نشنیدی [گردیدی] - ۵۰۲
۵۸۵ عنا ، گردیدی ۵۱۱
۵۸۶ بگذری [سرسری] - [مثنوی - ۱]
۵۸۷ خودنما ، داری ۴۸۱
۵۸۸ کباب ، داری ۵۱۰
۵۸۹ تر ، داری ۵۰۱
۵۹۰ من ، داری ۴۷۷
۵۹۱ آبلے ، داری [ر - ۸۳]
۵۹۲ اضطرابے ، داری [ر - ۸۲]

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۵۹۳ | نخودے ، | داری | ۵۱۸ |
| ۵۹۴ | نہانے ، | داری | [ر-۲۵] |
| ۵۹۵ | گرد بدنے ، | داری | ۴۹۱ |
| ۵۹۶ | مجازی [بازی] | - | ۵۱۷ |
| ۵۹۷ | سازی [پردازی] | - | [ر-۳۷] |
| ۵۹۸ | ملالت ، | می کشی | ۵۰۸ |
| ۵۹۹ | اشک فشانی ، | دانی | [ر-۷۵] |
| ۶۰۰ | خو ، | بگردانی | ۴۸۵ |
| ۶۰۱ | من ، | می کُنی | ۵۱۴ |
| ۶۰۲ | بے خبر ، | بہ دست آئی | ۴۸۹ |
| ۶۰۳ | گریاں ، | بہ در آئی | ۵۰۳ |
| ۶۰۴ | رہائی [نوائی] | - | ۴۷۸ |
| ۶۰۵ | شوئی [جوئی] | - | ۵۰۹ |
| | (ے) | | |
| ۶۰۶ | کبابے [آبے] | - | ۵۰۴ |
| ۶۰۷ | ساختے [باختے] | - | ۵۱۶ |
| ۶۰۸ | گشتے [دشتے] | - | ۵۱۹ |
| ۶۰۹ | سرے ، | داشتے | ۴۹۰ |
| ۶۱۰ | پندے [دردمندے] | - | ۴۸۶ |
| ۶۱۱ | نکشودے [بودے] | - | ۵۱۲ |
| ۶۱۲ | پرے [ابترے] | - | ۴۹۳ |
| ۶۱۳ | زارے [بارے] | - | ۴۸۰ |
| ۶۱۴ | گذار ، | دیگرے | ۴۹۲ |
| ۶۱۵ | بخجیرے [بترے] | - | ۴۸۸ |
| ۶۱۶ | نازے [نیازے] | - | ۵۰۷ |
| ۶۱۷ | نیازے [نازے] | - | ۴۷۶ |
| ۶۱۸ | لبے [رکے] | - | ۵۲۰ |
| ۶۱۹ | دبدہ ، | اندلیے | ۵۰۶ |
| ۶۲۰ | بے باکے [چالاکے] | - | ۴۸۷ |
| ۶۲۱ | کلامے [لجامے] | - | ۴۸۴ |
| ۶۲۲ | بے قراری ، | کردے | ۵۰۵ |
| ۶۲۳ | جوانے [جہانے] | - | ۴۹۶ |
| ۶۲۴ | چیدنے [رسیدنے] | - | ۴۹۸ |
| ۶۲۵ | کینے [زینے] | - | ۴۹۹ |
| ۶۲۶ | سیاہے [گاہے] | - | ۴۸۳ |
| ۶۲۷ | وفائے [بلائے] | - | ۵۱۳ |
| ۶۲۸ | روئے [بدگوئے] | - | ۵۰۰ |

# فرہنگ

نیر مسعود

اس فرہنگ میں بعض لغات ایسے ہیں جو کثیر المفہوم ہیں - یہاں اُن کے صرف وہ مفہوم بیان کیے گئے ہیں جو میر کے کلام سے علاقہ رکھتے ہیں

(نیر مسعود)

## آ

**آب باریک** : ذرا سا پانی جو جلد خشک ہو جاتا ہے -
**آب بالائے سنگ** : سیاہی مائل سفید رنگ -
**آب بردن** : تعجب انگیز ہونا -
**آب بردن (از چیزے)** : بے وقار کر دینا ، بے رونق کر دینا -
**آب بُرندہ** : کھانے کو جلد ہضم کرنے والا پانی -
**آب بہ روئے کار آوردن** : کام بنانا -
**آب بے لجام خوردن** : مطلق العنانی - خود سری -
**آب تُند** : تیزاب -
**آب خستہ** : وہ پھل جو پانی میں پڑے پڑے خراب ہو گیا ہو -
**آب خوردن** : ذرا دیر کو ٹھہرنا -
**آب دادن چشم / نگاہ** : نظارے کا لطف حاصل کرنا -
**آب گیری** : تلوار پر دھار رکھنا -
**آتش برکردن** : آگ جلانا -
**آتش دستی** : مہارت - چالاکی -

آستین افشاندن : دست بردار ہو جانا۔
آستین بر چشم کشیدن : دلاسا دینا ۔
آستینِ کہنہ داشتن : افلاس میں مبتلا ہونا ۔
آفتابی شدن : پھل کا دھوپ سے سوکھ جانا یا داغی ہو جانا ۔
آمدِ کار : کام بن جانا ۔
آئینۂ جامہ نما : بڑا آئینہ جس میں پورا بدن دکھائی دے سکے ۔

## (الف)

ابروے مردانہ : گھنی بھنویں ۔
اختلاطِ پریشاں : ہر ایک سے گھل مل جانا ۔ [ نیز دیکھیے "پریشاں اختلاط" ]
از آب بدر آمدن : عیب ظاہر ہو جانا ۔
از پا افتادن : بے خود ہو جانا ۔ طاقت سلب ہو جانا ۔
از پا در آمدن : لڑکھڑا کر گرنا ۔
از پا نشستن : تھک کر بیٹھ رہنا ۔ کسی کام کا ترک کر دینا ۔
از پیرہن بیروں کشیدن : کسی کا بھید کھول دینا ۔
از جا رفتنِ (عضو) : کسی عضو کا جوڑ پر سے ہٹ جانا (ہڈی کھسکنا)
از دل بدر کردن : دل سے نکال دینا ۔
از راہ بُردن : بہکانا ۔
از راہ رفتن : بہک جانا ۔
از سر وا شدن : پاس سے ہٹ جانا ۔
از طاقِ دل افتادن : نظروں سے گر جانا ۔
از ہم ریختن : بکھر جانا ۔
از ہم گذشتن : مر جانا ۔
استخواں شکستن : نہایت محنت کرنا ۔
الف بر خاک / زمین کشیدن : شرمندہ ہونا ۔

**الف بریدن** : اظہارِ غم کے لیے بدن پر زخم ڈالنا ۔
**الف داغ** : نشانی، علاج، سزا کے طور پر اظہارِ غم کے لیے بدن کو داغنے کا لمبا نشان ۔
**الوط** : اوباشں۔ مسخرہ ۔

## (ب)

**با خود حساب داشتن** : اپنی دھن میں ہونا ۔
**بادہ پالا** : شراب چھاننے کا سامان ۔
**بازار شکستن** : ماند پڑجانا۔ بہتر چیز کے سامنے آجانے کی وجہ سے کمتر ٹھہرنا ۔
**باز خواہِ خون** : خوں بہا طلب کرنے والا۔ [ نیز دیکھیے "خون خواہش" ]
**باطل اوقات** : فضول وقت ضائع کرنے والا ۔
**باطن زدن** : بددعا کا اثر کرنا ۔ آہ لگنا ۔
**باقی داستاں بہ فردا شب** : باقی پھر کبھی ۔
**برات نوشتن** : تنخواہ منظور کرنا ۔
**برچیدنِ بلا** : مصیبت کو جھیل لے جانا ۔
**برخود جنبیدن** : خوشی سے اُچھلنا ۔
**برخود شکستن** : اکڑنا ۔
**برخویش چیدن** : غرور کرنا ۔
**بردماغ خوردن** : ناگوار گزرنا ۔
**بررو آمدن** : مقابلے پر آنا ۔
**برزباں ہا افتادن** : بدنام ہونا ۔ نکو بننا ۔
**برسرِ خویش بودن** : خود رائی ۔ خودسری ۔
**برسر کشیدن** : ایک گھونٹ میں پی جانا ۔
**برکردن** : [ دیکھیے "آتش برکردن" ]
**برمسائل گشتن** : کتابوں کا بہ غور مطالعہ کرنا ۔
**برّہ بند** : مشّاق ۔ ماہر ۔

بکر نگاہ : شرمیلا۔ وہ معشوق جس کو ابھی ناز و انداز دکھانا نہ آتے ہوں۔
بلا گردان : تصدق جسے ردِ بلا کے لیے کسی پر سے صدقے اتارا جائے۔
بلند انداختن : بہت زیادہ تعریف کرنا۔
بنگ : بھنگ [ نیز دیکھئے " خیالاتِ بنگ " ]
بوزدہ شدنِ زخم : زخم کا ناسور ہو جانا یا بگڑ جانا۔
بو کردن : سونگھنا۔ سراغ لگانا۔ بوسہ لینا۔
بو کش : پتا پا جانے والا۔
بو کہ : شاید۔ اس امید پر کہ [ " بود کہ " کا مخفف ]
بوئے فتیلہ آمدن : کسی ظاہری علامت کے بغیر خطرہ محسوس کر لینا۔
بہ آب راندن : دھوکا دینا۔ بہکانا۔
بہ آب رساندنِ ( بنا ) : بنیاد مضبوط کرنا۔ نیز بنیاد کمزور کر دینا۔
بہ پائے آمدن : کام آنا۔ فائدہ پہنچانا۔
بہ جاں آمدن : تنگ آ جانا۔
بہ جاں رسیدن : عاجز آ جانا۔ مرنے کے قریب پہنچ جانا۔
بہ چشم روشنیِ کسے رفتن : کسی کو مبارکباد دینے کے لیے جانا۔ ( ایران میں شادی کی ایک رسم )
بہ حالِ خود بودن : اپنے آپ میں گرفتار ہونا۔
بہ دستِ کسے افتادن : کسی کی منت سماجت کرنا۔
بہ دستِ کم برداشتن : حقیر سمجھنا۔
بہ رو افتادن : اوندھے منہ گرنا۔
بہ رو آوردن : ظاہر کرنا۔ بتا دینا۔
بہ ریسمانِ کسے در چاہ رفتن : کسی کی بدولت مصیبت میں پھنسنا۔
بہ زر کشیدن : سونے میں تولنا۔
بہ سرِ پا نشستن : چلنے کو تیار ہونا۔ قریب مرگ ہونا۔
بہ سر در آمدن : سر کے بل گرنا۔

**بہ سرِ زلف سخن کردن** : اشاروں کنایوں میں بات کرنا ۔ بے نیازانہ گفتگو کرنا ۔
**بہ صحرا رفتن** : ضائع ہونا ۔ ختم ہو جانا ۔
**بہ طاق افتادنِ چشم** : [ دیکھیے "چشم بہ طاق افتادن" ]

## ( پ )

**پا از میاں کشیدن** : کنارہ کش ہو جانا ۔
**پا بہ پا رفتن** : کسی کی برابری کرنا ۔
**پا بہ دامن کشیدن** : بیٹھ رہنا ۔ جستجو ترک کر دینا ۔
**پا بہ ہوا** : ( امرد بازوں کی اصطلاح ) بدفعلی کرانے والا ۔
**پاسِ دم** : حبسِ دم کی ریاضت ۔
**پاشکستہ** : تھکا ہوا ۔ نڈھال ۔
**پا علم خوانی** : عزای علم کے نیچے نوحہ پڑھنا ۔
**پاک** : بالکل ۔
**پاے بہ سنگ آمدن** : ٹھوکر کھانا ۔
**پاے کلاغ** : گھسیٹ لکھی ہوئی تحریر جو پڑھی نہ جا سکے ۔
**پاے گیر شدن** : پھنس جانا ۔
**پُر** : بہت ۔
**پردہ از کار برخاستن** : راز افشا ہونا ۔
**پُرسہ گاہ** : مکان کا وہ حصّہ جہاں مرنے والے کی تعزیت کو آنے والے بٹھائے جائیں ۔
**پریشاں اختلاط** : ہر ایک سے گھُل مل جانے والا [ نیز دیکھیے "اختلاطِ پریشاں" ]
**پُشتِ چشم نازک کردن** : غرور کرنا ۔ تغافل ۔
**پنجۂ گل** : پھولوں کا گچھا ۔ نیز پورا کھُلا ہوا پھول ۔
**پہلو دادن** : پشت پناہی کرنا ۔ حمایت کرنا ۔
**پے بردن** : پتا لگانا ۔ تاڑنا ۔
**پیراہنِ آبی** : ماتمی لباس ( آبی = نیلگوں )

**پیش جنگ** : میدانِ جنگ میں لڑنے کے لیے سب سے پہلے نکلنے والا ۔

## (ت)

**تاب خوردن** : بل کھانا ۔ بہت تکلیف اُٹھانا ۔
**تا خون/قتل ہمراہ بودن** : انتہائی دشمنی رکھنا ۔
**تاریک دان** : اندھیری جگہ ۔
**تختۂ قیمہ** : وہ لکڑی جس پر گوشت کا قیمہ کوٹتے ہیں
**تر آمدن** : شرمندہ ہونا ۔
**تر جمان** : جرمانہ ۔ تاوان
**ترخانی** : مسخرہ پن ۔
**تر کردن** : بے عزت کرنا ۔ بدنام کرنا ۔
**تُند آب** : [دیکھیے "آب تُند"]
**تُنک آب** : کم ظرف ۔ چھچھورا ۔
**تُنک رو** : (۱) شرمیلا (۲) ذرا سے اصرار پر راضی ہو جانے والا ۔
**تنگ پوش** : چست لباس پہننے والا
**تنہ خواری** : تکلیفوں کی وجہ سے بدن کا گھٹنا اور گھُلنا ۔
**تیر آور** : مکّار ۔
**تیر خوردن** : مات کھا جانا ۔ چوٹ کھانا ۔
**تیر روئے ترکش** : سب سے عمدہ اور چنا ہوا تیر جس کے لیے ترکش پر الگ جگہ بنائی جاتی تھی ۔
**تیر کشیدن** : (۱) زخم کا بڑھ جانا (۲) زخم کا دُکھنا ۔

## (ج)

**جامہ گذاشتن** : مر جانا ۔
**جان در آستین داشتن** : جان ہتھیلی پر ہونا ۔
**جبہہ/جبیں خراش** : بہادر ۔
**جملہ تن** : مجسّم ۔ سر تا پا ۔

## (چ)

**چار چار زدن** : بہکی بہکی باتیں کرنا ۔
**چاشنی در بنِ دنداں افتادن** : منہ کو مزہ لگ جانا، چاٹ پڑ جانا ۔
**چسپاں اختلاط** : دل سے ملنے والا ۔ دوستی نباہنے والا ۔
**چسپاں پوش/جامہ** : چست لباس پہننے والا ۔ (چسپاں، چست اُوپری لباس)
**چشم آب دادن** : نظارے سے لطف لینا ۔
**چشم بہ طاق افتادن** : عالمِ نزع میں آنکھیں پتھرا جانا ۔
**چشم چرانی** : آنکھیں سینکنا ۔
**چشم خوردن** : نظر لگ جانا ۔
**چشم رسیدن** : نظر لگنا ۔
**چشم سیاہ کردن** : ہوس کرنا ۔ حسد کرنا ۔
**چشم شکستن** : اندھا ہو جانا ۔
**چشم گرم کردن** ۱۔ سونا ۲۔ نیند کی ایک جھپکی لینا ۔
**چکارہ گر** : کس کام کا ۔ بے کار ۔
**چک و چانہ** : استعداد ۔ اہلیت ۔
**چوبِ گل** : گلاب کی شاخ جس سے پاگل کو مارتے ہیں تو اس کا جنون کم ہو جاتا ہے ۔
**چہرہ شدن/گشتن** : مقابل ہونا ۔
**چہرۂ مہتابی** : زردی مائل سفید رنگت والا چہرہ ۔

## (ح)

**حرفِ بارگیر** : تکیۂ کلام ۔
**حیف رفتن** : ظلم ہونا ۔ مصیبت پڑنا ۔

## (خ)

**خاکِ تیرہ** : انسانی بدن ۔
**خاکِ دامن گیر** : چکنی گیلی مٹی جس پر چلتے ہیں، پیر پھنستے ہوں ۔ ایسی سرزمین جہاں سے جانے کو دل نہ چاہتا ہو ۔

**خاک داں** : کوڑا پھینکنے کی جگہ۔ دُنیا
**خاک شو** : مٹّی میں سے سونے چاندی کے ذرّے نکالنے والا۔
**خام دست** : اناڑی۔ بے تُکا خرچ کرنے والا۔
**خانہ سیاہ** : بدقسمت۔ بے خاماں۔
**خدا برد** : [دعا] بخیریت پہنچے۔
**خدا بردارد** : [بد دعا] مرجائے۔
**خداگیر** : آفتِ ناگہانی میں مبتلا ہو جانے والا۔
**خرقہ داشتن/کردن** : چاک چاک کر دینا۔
**خرکرّہ** : گدھے کا بچّہ۔ بے وقوف۔
**خسک بر بستر ریختن** : آرام حرام کر دینا [خسک = گوکھرو]
**خطِ پائے کلاغ** : [دیکھیے "پائے کلاغ"]
**خطِ پشتِ لب** : بالائی ہونٹ پر کے روئیں۔
**خط دادن** : خوبی کا اعتراف کرنا۔
**خط کشی** : مٹا دینا۔ مسترد کر دینا۔
**خَلہ** : سوئی یا کوئی اور چبھنے والی چیز۔
**خنداں شدن/خندۂ شمشیر** : ۱۔ تلوار سے خون کی بوندیں ٹپکنا۔ ۲۔ تلوار میں دندانے پڑ جانا۔
**خود شکنی** : کسرِ نفسی۔
**خود کشی** : سخت محنت اور کوشش۔
**خونِ خفتہ** : وہ مقتول/قتل جس کا بدلہ نہ لیا گیا ہو۔
**خونِ خواہش** : قصاص طلبی۔ [نیز دیکھیے "بازخواہِ خوں"]
**خوں کشیدن** : فصد کھولنا۔
**خویشتن داری** : خود کو لیے دیے رہنا۔
**خیالاتِ بنگ** : اوٹ پٹانگ خیالات، جیسے بھنگ کے نشے میں پیدا ہوتے ہیں

## ( د )

**دامن بر زدن** : کسی کام یا رخصت کے لیے کمر بستہ ہونا۔

**دامن چیدن** : ترک کرنا ۔ کنارہ کرنا ۔
**دامن سواری کردن** : بچوں کا گھوڑ سواری کا کھیل ۔
**دردِ دل کردن** : گریہ وزاری کرنا ۔ اپنا غم کسی ہمدرد کو بتانا ۔
**درغورگی مویز شدن** : کمال تک پہنچنے سے پہلے ہی زوال آجانا ۔ [ "غورہ" = کچا انگور ۔ "مویز" = خشک انگور ، کشمش]
**درگرفتنِ صحبت** : صحبت موافق آنا ۔ [ نیز دیکھیے "صحبتِ درگیر" ]
**دست افشاندن** : گانے ناچنے میں ہاتھوں کو جنبش دینا ۔
**دست بستہ** : [ دیکھیے "کار دست بستہ" ]
**دست بیع** : ۱ ۔ فروخت شدہ مال ۲ ۔ مُرید
**دست دگر داشتن** : غیر معمولی مہارت حاصل ہونا ۔
**دست فروش** : خوانچہ فروش ۔ پھیری والا ۔
**دست گاہ شدن** : ۱ ۔ مذاق کا نشانہ بننا ۔ ۲ ۔ کمزور ہو جانا ۔ ۳ ۔ دولت ملنا ۔
**دست وبغل شدن** : ۱ ۔ ہم آغوش ہونا ۲ ۔ کُشتی لڑنا ۔
**دعا گفتن** : ۱ ۔ رخصت کرنا ۲ ۔ رخصت ہونا ۔
**دعویٰ قطع شدن** : جھگڑا نپٹ جانا ۔
**دق از دل بردن** : ملال دُور کرنا [ "دق از دل بر" = کُشتی کا ایک داؤں]
**دل (از چیزے) جمع کردن** : یکسو ہو جانا [ اطمینان اور مایوسی دونوں کی صورت میں]
**دلِ شب** : آدھی رات ۔
**دل نہاد شدن** : ٹھان لینا ۔
**دماغ تخت شدن** : نشے میں وحشت ہو جانا ۔
**دماغ رسیدن** : نشہ چڑھنا ۔
**دمِ آب** : پانی کا گھونٹ ۔
**دم درکشیدن** : چُپ رہ جانا ۔ خاموشی اختیار کر لینا ۔
**دم کش** : اصل گانے والے کے ہمراہ گانے والا ۔
**دم کشی** : ہم دردی ۔ ہم زبانی ۔

**دنبالہ داشتن** : بعدی اثرات کا حامل ہونا ۔
**دنبالہ گرد** : پیچھے پیچھے آتا ہوا ۔
**دنداں بہ جگر فشردن** : ۱۔ سخت اذیت کو ضبط کرنا ۲۔ مرنے پر تیار ہو جانا ۔
**دوست کام** : عاشق ۔
**دو کمانہ شدن** : تیر کا اُچٹ جانا ۔
**دَو نہ یابد** : [ بد دعا ] نامراد رہے
**دہان/دہن داشتن** : ۱۔ اہلیت رکھنا ۲۔ مجال ہونا ۔
**دَہ دلہ** : ۱۔ بہادر ۲۔ منافق ۳۔ ڈھلمل یقین ۔
**دیدنِ گرم** : قریب سے دیکھنا ۔ بہ غور دیکھنا ۔
**دیدۂ شور** : نظرِ بد ۔
**دیدہ نازک کردن** : دقّتِ نظر سے کام لینا ۔

**( ر )**

**راہ بہ جائے داشتن** : حق بہ جانب ہونا ۔
**راہ راہ** : دھاری دار ۔
**رخنہ** : فساد
**رخنہ برآوردن** : کسی شگاف کو بھر دینا ۔
**رگِ ابر** : بادل کی دھاری ۔
**رگِ خواب در دستِ کسے بودن** : کسی کے اختیار میں ہونا ۔ کسی پر خوشی اور سکون کا انحصار ہونا ۔
**رنگ باختن** : رنگ اُڑنا ۔
**رنگ برداشتن** : رنگ اُڑا دینا ۔
**رنگ داشتن** : بہرہ ور ہونا ۔
**رنگِ شمعی** : سیاہی مائل سبز رنگ
**رنگ ہا دیدن** : طرح طرح کی مصیبتیں اُٹھانا ۔
**رو از کسے دیدن** : کسی سے مدعا حاصل ہونا ۔

رو بہ راہ داشتن : کسی کام کے لیے بالکل تیار رہنا ۔
رو دادن : ۱۔ متوجہ ہونا ۔ ۲۔ نمودار ہونا ۔ ۳۔ واقع ہونا ۔
رو داشتن : ۱۔ ہمت رکھنا ۲۔ توقع رکھنا ۔
روزۂ طے : مسلسل تین دن کا روزہ جس کے دوران صرف افطار کے وقت ذرا سا پانی پی لیا جاتا ہے ۔
رو ساختن : جھینپ جانا ۔
روضہ خوان : مجلسِ عزا میں کتاب "روضۃ الشہدا" یا اسی طرح کی کوئی اور کتاب پڑھ کر سنانے والا ۔
روکشی کردن : مقابل آنا ۔ برابری کرنا ۔
روے دل دیدن : مدعا بر آنا ۔ کسی کا التفات حاصل ہونا ۔
روے سخن نہ داشتن : بولنے کی مجال نہ ہونا ۔
رہ آورد : وہ تحفہ جو کسی سفر سے ساتھ لایا جائے ۔
رہ/راہ بردن : راستہ پا جانا ۔
رہ/راہ چیزے دادن : ۱۔ کسی بات کی اجازت دینا ۔ ۲۔ کسی کام کی ابتدا کرنا ۔

## ( ز )

زانو زدن : تعظیم کرنا ۔ باادب بیٹھنا ۔
زبان دادن : سکھانا ۔
زبان زیرِ زباں داشتن : بات پر قائم نہ رہنا ۔ کئی طرح کی بات کہنا ۔
زباں شکستن : ہکلانا ۔
زبانہ : شعلہ ۔
زخمِ دامن دار : سوجا ہوا زخم ۔
زخمِ نمک بند : وہ زخم جس کو خون روکنے کے لیے نمک چھڑک کر باندھ دیا جائے ۔
زرِ سرخ : سونا ۔
زرِ سفید : چاندی ۔
زنبور خانہ : بھڑوں کا چھتا ۔
زنجیر خوردن : لڑکھڑانا ۔

یک معنیِ شگفتہ سو رنگ بندھ گئے ہیں
الوانِ گُل ہیں رُسوا اب کے بہار سے بھی

**زہ داماں** : دامن کے سرے پر آرائش کے لیے ٹانکا جانے والا حاشیہ یا فیتہ ۔

## (س)

**سایہ رو** : نگہبان ۔
**سبزاں** : سانولے رنگ والے ۔
**سبز بخت** : خوش نصیب ۔
**سبز وار** : ایران کا ایک شہر جہاں کے شیعہ مشہور تھے ۔
**سبز بینہ** : سانولے رنگ کا نوخیز حسین ۔
**ستارہ پیشانی** : وہ گھوڑا جس کی پیشانی پر سفید نشان[1] ہو۔ اسے منحوس سمجھا جاتا تھا ۔
**سخت باز** : ۱۔ کھیل میں ہمیشہ جیتنے والا ۔ ۲۔ جوئے میں جیتے بغیر نہ ہٹنے والا ۔
**سرانداز** : [دیکھیے "مست سرانداز"]
**سر بدر کردن** : سر اُبھارنا ۔
**سر بر چیزے داشتن** : کسی چیز کا طالب ہونا ۔
**سر بہ سر کردن** : ۱۔ برابر کر دینا ۔ ۲۔ یکساں کر دینا ۳۔ صلح کر لینا ۔
**سر بر/ بہ سنگ زدن** : بے سود کوشش کرنا ۔ محنت کا رائگاں جانا ۔
**سر بہم آوردن** : مل جل کر بیٹھنا ۔
**سر پیچ زدن** : سونا ۔
**سر پیچیدن** : منحرف ہو جانا ۔
**سر خود گرفتن** : ۱۔ خود رائی سے کام لینا ۲۔ اپنے کام سے کام رکھنا ۔
**سُرخ و زرد شدن** : شرمندہ ہونا ۔
**سر داشتن** : خواہش مند ہونا ۔
**سر در کشیدن** : ۱۔ نافرمانی کرنا ۲۔ چھپ جانا ۔
**سر سبک گشتن** : نشہ چڑھنے سے خمار کی سرگرانی دور ہونا ۔
**سر فتیلہ چرب کردن** : جنسی خواہش کی تسکین کرنا ۔ جنسی عمل یا اس کی تیاری ۔

---

[1] منحوس اس صورت میں کہ یہ نشان ہاتھ کے انگوٹھے سے چھپ جاتا ۔ اگر نشان اتنا بڑا ہوتا کہ انگوٹھے سے نہ چھپ سکتا تو اسے مبارک سمجھا جاتا تھا
[حوالہ "مطلع العلوم و مجمع الفنون" از واجد علی خان ۔ مطبع زبدۃ الاخبار، آگرہ ۱۲۶۳ھ/۴۷-۱۸۴۶ء صفحہ ۴۰۰]

سر کردن : ۱۔ بیان کرنا ۲۔ شروع کرنا۔
سر نمودن : کہنا۔ سنانا۔
سروِ مائل : ۱۔ ایسا سرو جو ہوا سے جھک جاتا ہو۔ ۲۔ ایک طرف جھکا ہوا سرو۔
سریشم اختلاط : چپک کر رہ جانے والا ملاقاتی ["چچڑ" کا مرادف۔ "سریشم" = سریش]
سفیدی کردن : نمودار ہونا۔
سکّہ درست : ۱۔ وضع دار ۲۔ صاف گو۔
سلسلہ مو : گھونگھر دار بالوں والا۔
سنگ بر سنگ زدن : ۱۔ معمولی سے کام کو زور شور سے کرنا۔ ۲۔ کام بگاڑ دینا۔
سنگِ شیشہ : وہ پتھر جس سے شیشہ بنایا جاتا ہے۔
سوختہ : نشے میں مست۔
سودا کردن : پاگل ہو جانا۔
سُونش : جواہرات تراشنے میں نکلنے والی کھرچن۔
سہل : نکما۔
سیر آہنگ : مطمئن۔ آسودہ۔
سیمِ شاخ دار : خالص چاندی۔

(ش)

شاخ بر آوردن : شرمندگی اٹھانا۔
شاخ دار : [دیکھیے "سیم شاخ دار"]
شانہ خالی کردن : بہانے بنانا۔ پہلو تہی کرنا۔
شانہ دُزدیدن : کترانا۔ اعراض کرنا [نیز دیکھیے "شانہ گیر شدن"]
شانہ کاری : ریاکاری۔ فریب۔
شانہ گیر شدن : کترانا، اعراض کرنا [نیز دیکھیے "شانہ دُزدیدن"]
شاہ اندازی : بڑھ بڑھ کر باتیں کرنا۔
شب شکستن : رات کٹ جانا۔

**شست آویز** : سزا کا ایک طریقہ جس میں آدمی کو انگوٹھوں سے لٹکا دیا جاتا ہے۔

**شکستن** : [ دیکھیے "چشم شکستن"، "شب شکستن" ]

**شکم دار** : ۱۔ حاملہ عورت ۲۔ صاحبِ مال۔

**شلتاقی** : جھگڑالو۔

**شلنگ** : چھلانگ۔ اُچھل کود۔

**شمسی** : سورج کا پجاری۔ کافر۔

**شمعی رنگ** : [ دیکھیے "رنگِ شمعی" ]

**شیشہ جان** : ۱۔ صاف طینت ۲۔ نازک دل۔

## (ص)

**صابونِ کس بہ کس / کسے بہ کسے رسیدن** : ایک دوسرے کے کام آنا۔

**صاحب مردہ** : گالی جو عموماً جانوروں کو دی جاتی تھی۔ وہ جس کا مالک مرگیا ہو۔

**صحبتِ درگیر** : موافق صحبت [ نیز دیکھیے "درگرفتنِ صحبت" ]

**صراحی باز** : مداری۔ فریبی۔

**صورت باز** : بہروپیا۔

**صورت خوان** : اُس شخص کو کہتے تھے جو بازاروں میں قیامت کے مناظر اور جنت، دوزخ فرشتوں وغیرہ کی تصویریں دکھا کر حیات بعد موت کے حالات سناتا تھا۔

**صورتِ دیوار** : مبہوت۔

**صورت نویسی** : مطلب سمجھے بغیر نقل کر دینا [ "مکھی پر مکھی بٹھانا" کا مرادف ]۔

## (ط)

**طاس باز** : شعبدہ باز۔ فریبی۔

**طراز** : بیل بوٹے، نقش و نگار۔

**طرح دادن** : مفت دے دینا۔

**طرح کش** : ۱۔ محکوم۔ ۲۔ فرماں بردار۔ ۳۔ مظلوم۔

## (ع)

**عشق است** : شاباش ہے۔

**عشق گفتن** : سلام کہنا ۔

**عصا شمشیر** : گپتی [عصا کے اندر چھپی ہوئی چھری یا تلوار]

**عضوِ از جا رفتہ** : [دیکھیے "از جا رفتن"]

**عقدِ انامل** : انگلیوں پر حساب لگانا ۔

**علم بازی** : محرّم کے علم یا جھنڈے کو طرح طرح سے اُچھالنے اور روکنے کے کمال دکھانا ۔

**عودی رنگ** : سانولا ۔

## (غ)

**غبار آوردنِ چشم** : آنکھیں چکاچوند ہو جانا ۔

**غرّہ شدن** : دھوکا کھانا ۔

**غنچہ بستن** : شاخ میں کلی پھوٹنا ۔

**غنچہ خُسپی** : (اوڑھنے کے لیے کچھ نہ ہونے کی وجہ سے) سکڑ کر سونا ۔ مفلسی ۔

## (ف)

**فیروزۂ حبابی** : بلبلے کی شکل کا فیروزہ ۔

## (ق)

**قامتِ آہ** : لمبا قد ۔

**قبا شدنِ [پیراہن]** : چاک ہو جانا ۔

**قراول** : ۱۔ سپاہی ۔ ۲۔ بندوق کی نال پر نشانے کے لیے بنی ہوئی مکھی ۔

**قلتبان** : عورتوں کا دلّال ۔ بے حمیّت ۔

**قمار و راہِ قمار** : جوئے کا کھیل سیکھنے کے بعد ہی جوا کھیلنا چاہیے ۔ پوری واقفیت کے بغیر کوئی کام نہ کرنا چاہیے ۔

**قنارہ** : ذبح کیے ہوئے جانور کو لٹکانے کا آنکڑا یا سلاخ ۔

## (ک)

**کار بالا رفتن** : ۱۔ ترقی ہونا ۔ ۲۔ کامیابی ہونا ۔

**کارِ دست بستہ** : وہ کام جو کسی اور سے نہ کیا جا سکے ۔

**کاسہ از آش گرم تر** : شوربے سے زیادہ گرم پیالہ = غیر معمولی اور تقریباً محال بات ۔ نیز "مدعی سست گواہ چست" کا مرادف ۔

**کاسہ بر سر شکستن** : ۱۔ رسوا ہونا ۲۔ رسوا کرنا۔
**کام کشودن** : مراد حاصل ہونا۔
**کبابِ سنگ** : گرم پتھروں پر بھُونا ہوا گوشت۔
**کبابِ گذشتہ** : جلا ہوا کباب۔
**کبابِ گل** : گلاب کے پھول کی شکل کا کباب۔
**کبابِ ورق** : کھرا بھنا ہوا گوشت یا کباب جس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے
**کج باز** : فریبی، بے ایمان۔
**کج پلاسی** : فریب دہی۔ بدمعاملگی۔
**کُرسیِ پیکاں** : تیر کے پھل کے پاس لگی ہوئی ہڈی یا کوئی اور سخت چیز جس کی مدد سے پھل مضبوطی کے ساتھ جما رہتا ہے۔
**کُشتہ** : لاش۔
**کشتی** : کاسۂ گدائی۔
**کشتی بار / بہ خیک[1] بستن** : نہایت کنجوسی کرنا۔
**کُشتی پاک شدن** : مقابلہ ختم ہو جانا۔
**کُشندہ** : قاتل۔
**کِفت و قدم ہمراہ بودن** : قول و فعل میں مطابقت ہونا۔ [''کفت[2]'' = کندھا]
**کمانِ پاک** : مضبوط کمان۔
**کمانِ کسے کشیدن** : کسی کا ہم پلہ ہونا۔
**کنارہ از خوان رسیدن** : بڑی جگہ سے بہت تھوڑا سا حصہ ملنا۔

## (گ)

**گراں بودنِ بیمار** : مریض کی حالت نازک ہونا۔
**گرد بر آوردن** : تہس نہس کر دینا۔
**گرد کردن** : ۱۔ تباہ کر دینا ۲۔ ظاہر کر دینا

---

[1] ''خیک'': پانی کی مشک، یا کپّی۔ یہ غالباً تصحیف ہے۔ محاورہ ''کشتی بہ خشک بستن'' ملتا ہے۔ (مشفق)
[2] بعض لغات میں ''گفت'' بجائے ''کفت''۔ (مشفق)

**گردن کش** : سرکش ۔
**گرگ و میش** : [دیکھیے "وقتِ گرگ و میش"]
**گرم دیدن** : [دیکھیے "دیدنِ گرم"]
**گرم گذشتن** : تیزی سے گزر جانا ۔
**گرو بردن** : ۱ ۔ شرط جیتنا ۔ ۲ ۔ کھیل میں جیتنا ۔
**گریۂ سرشار** : آنسوؤں سے رونا ۔
**گُلِ ابر** : بادل کا ٹکڑا ۔
**گِلِ بُخری** : ایک قسم کی سُرخ مٹی ۔
**گُلِ داغ** : چوٹ یا جلنے کا نشان ۔
**گلستانہ** : ایران میں سیدوں کی ایک بستی ۔
**گُل کردن** : ظاہر ہونا ۔
**گُلِ کفش** : جوتے یا چپل پر کی سجاوٹ ۔
**گُل گفتن** : تعریف کرنا ۔
**گُل گُل** : رنگ برنگ ۔ کثیر تعداد میں ۔

## (ل)

**لب چشی** : مزہ معلوم کرنے کے لیے چکھنا ۔
**لنگر از کف دادن** : بے وقار ہو جانا ۔
**لَوَند** : فاحشہ

## (م)

**مارگیر** : فریبی ۔ [لغوی معنی : سانپ پکڑنے والا]
**مبالات** : پروا ۔
**مبتذل** : پرانا ۔ متروک ۔
**محنت کشیدن** : تکلیف اٹھانا ۔
**مردہ ریگ** : مُردوں کے بچے کھچے آثار ۔

مُرغِ دوست : ایک پرندہ جو "یا دوست" "یادوست" کہتا معلوم ہوتا ہے۔
مزاج گوئی : خوشامد۔ کسی کی مرضی کے مطابق گفتگو کرنا۔
مژگانِ برگشتہ : بدلی ہوئی / پھری ہوئی نظریں۔
مستِ سرانداز : نشے میں جھومتا ہوا۔
مستِ گذارہ : نشے میں دُھت۔
مُشک در شراب کردن : بے ہوش کر دینا۔
مضجع : خواب گاہ۔ قبر
معشوقۂ روزِ بے نوائی : ایسی شے جس کے تصور سے پریشانی اور بے سر و سامانی کی حالت میں دل بہلایا جائے۔
مغزِ خر خوردہ : کودن۔ بے عقل۔
مفتے زدن : مفت پا جانا۔ محنت کے بغیر فائدہ حاصل ہونا۔
مُقری تسبیح : تسبیح کا بڑا دانہ، امام تسبیح۔
موج خیز : طوفانی۔
موسے وماغ : ایسا شخص جس کی موجودگی میں لطفِ صحبت جاتا ہے۔ [جدید اصطلاح "بور" کا مرادف]
مہتابی : [دیکھیے "چہرۂ مہتابی"]
مہرِ وصل : لپٹے ہوئے طومار [کاغذ کی لمبی پٹی] کو کھلنے سے روکنے والی مہر۔
میرزائی کشیدن : کسی کی شان اور اکڑ سہنا۔
مےِ رواق : مقطر شراب۔

## (ن)

ناخن گذاشتن : نہایت خوف اور عاجزی کا اظہار۔
نان بر شیشہ مالیدن : ۱۔ شدید حرص ۲۔ بے فائدہ کام کرنا۔
نان بہ خوں تر شدن : کسی کام کا بہت زحمت اور بے لطفی کے ساتھ انجام پانا۔
نانِ جوان بہ / و ناخورشِ پیر : موٹا جھوٹا کھانا [ "نانِ جواں" = تازہ روٹی، "ناخورشِ پیر" = باسی سالن]
نرگسی زن : طعنہ زن۔
نستعلیق گو : پُر تکلف گفتگو کرنے والا۔

**نشأتین** : دونوں دنیائیں۔

**نشان داشتن** : صاحبِ امتیاز ہونا۔

**نطع** : چمڑے کی بساط جس پر مجرم کو بٹھا کر اس کی گردن ماری جاتی ہے۔

**نظر کردہ** : ۱۔ ممنونِ احسان ۲۔ تربیت یافتہ۔

**نظر یافتن** : تربیت پانا۔

**نفس سوختن** : ۱۔ سخت زحمت اُٹھانا۔ ۲۔ دم گھٹنے لگنا۔

**نفس شماری** : نزع کا عالم۔

**نمازِ معکوس** : عملیات میں سے ایک عمل جس میں سر نیچے ٹانگیں اُوپر رکھی جاتی ہیں۔ (؟)[1]

**نمد مو** : جھبرے بالوں والا۔

**نمک بند** : [دیکھیے "زخمِ نمک بند"]

**نہرِ الماس** : ایک دریا کا نام۔

**نیم رس** : ادھ پکا۔

(و)

**وا بوسیدن** : روگردانی کرنا۔ بے دماغ ہونا۔

**وا سوختن** : ۱۔ بیزار ہو جانا۔ ۲۔ منحرف ہو جانا۔

**وا شد داشتن** : کھُل کر ملنا۔ تپاک سے پیش آنا۔

**وا شدن** : [دیکھیے "از سر وا شدن"]

**واکشیدن** : پھیل کر لیٹنا۔

**وَرد** : گلاب کا پھول۔

**ورق برگشتن** : حالات بدل جانا۔

**وقتِ گرگ و میش** : تڑکے کا وقت جب آسمان پر سیاہی باقی ہوتی ہے۔

---

[1] ممنوع۔ کتابوں میں اس کی صراحت نہیں مل سکی۔ ایک صوفی ریاضت کا ذکر البتہ ملتا ہے۔ جس میں مرتاض کنویں میں خود کو سرنگوں لٹکا کر عبادات کرتے تھے۔ ممکن ہے نمازِ معکوس سے یہی طریقِ عبادت مراد ہو۔ (نیر)

(ہ)

ہرزہ چانہ : فضول گو۔
ہوادار : بہی خواہ، عاشق۔
ہوا رسیدن : خواہش پیدا ہونا۔

(ی)

یاری گری : امداد، کام آنا۔
یاقوتِ سوختہ : سفید یاقوت (یاقوت کو آگ پر رکھنے سے اس کا رنگ عارضی طور پر سفید ہو جاتا ہے)
یال و گوپال : قوت و شوکت۔
یک بار : اچانک۔
یک دست : ۱۔ برابر برابر ۲۔ بالکل
یک رہ : ایک بار۔
یک سرمہ داں شراب : بالکل ذرا سی شراب۔
یک کنارہ از خوان رسیدن : [دیکھیے "کنارہ از خواں رسیدن"]
یکہ و جنازہ کردن : ایسا نشانہ لگانا کہ پڑتے ہی شکار مر جائے۔

# اعتراف

مخطوطہ تمام ہوا۔

خدا بھلا کرے ڈاکٹر سید نیر مسعود رضوی کا کہ جنہوں نے مجھے میر صاحب کا فارسی کلام عنایت فرمایا۔ وہ کلام کہ جو غیر مطبوعہ تھا۔ اور تقریباً پونے تین صدیوں سے کسی عشق پیشہ کا منتظر تھا۔

فارسی مخطوطہ کو پڑھنا، پھر اسے مرتب کرنا۔ یہ نیر صاحب کا ہی حصہ تھا جو کہ انہوں نے بڑے سلیقہ سے ادا کیا۔ ادب کے قارئین ڈاکٹر صاحب کا احسان یاد رکھیں گے۔

ایڈیٹر

# مخطوطہ

[عطیہ محمد اکبر الدین صدیقی]

# ایک اور اعتراف

ادب کے ایک اور خدمت گزار کا بھی تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو خاموشی سے اپنی ادبی عاقبت سنوارتے چلے جا رہے ہیں۔ میری مراد محمد اکبر الدین صدیقی سے ہے کہ جنہوں نے ادارۂ ادبیات حیدر آباد دکن سے مخطوطہ کی عکسی کاپیاں حاصل کرنے میں مدد دی جو کہ ہم پیش کر رہے ہیں۔ یوں نقل اور اصل دونوں محفوظ ہو گئے۔ یہ ایک دوسرے مخطوطہ کے عکس ہیں۔ اس کے باوجود اہل علم جب مقابلہ کریں گے تو انہیں ایک نیا لطف ملے گا۔ وہ لطف کہ جو اہل تحقیق پر وارد ہوتا ہے۔

ایڈیٹر

# میر کا کلیاتِ فارسی

محمد اکبر الدین صدیقی

میرؔ سرتاجِ شعرائے اُردو اور خدائے سخن ہیں اور ہر پڑھا لکھا ان کے نام اور ان کے اُردو کلام سے واقف ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ان کے فارسی کلام سے آشنا ہیں اس لیے کہ اس کو طبع ہونے کا موقع ملا اور نہ ان کے مخطوطے ہی زیادہ ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے معارف جون ۱۹۴۳ء میں "میر کا فارسی کلام" کے زیرِ عنوان ایک مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا اور اس میں اس امر کا اظہار کیا تھا کہ سبحان اللہ کا کتب خانہ جو مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ میں داخل ہوا ہے اس کی فہرست مولانا کیفی چریا کوٹی صاحب تیار کر رہے ہیں۔ اس میں ایک قلمی بیاض ہمدست ہوئی یہ اصل میں میر تقی میر کا فارسی کلام ہے۔ بیاض پر تاریخ کتابت اور کاتب کا نام درج نہیں لیکن کاغذ بہت پرانا اور بوسیدہ ہے۔ خط اگرچہ شکستہ ہے لیکن نہایت پختہ اور پاکیزہ ہے اور سوائے دو چار مقامات کے اشعار ہر جگہ بخوبی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اس کے بعد فاضل مضمون نگار نے میرؔ کے ایسے اُردو اشعار کا انتخاب بھی دیا جن کے مرادف اشعار فارسی کلام میں بھی ملے ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ میں بھی میرؔ کا فارسی کلیات موجود ہے جو ۹½ × ۵½ سائز کا ہے جس میں ۱۸۸ اوراق ہیں اور ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں اور اکثر جگہ ہر مقطع دو سطروں میں لکھا گیا ہے تخلص سُرخ روشنائی سے تحریر ہے۔ ردیف کا حرف بھی سُرخ روشنائی میں لکھا گیا ہے۔ اس نسخہ کے ساتھ میر تقی میر کا اُردو دیوان دوم اور مثنویاں اور قصائد بھی شریک ہیں۔

صفحہ اوّل پر "دیوان میر تقی" تحریر ہے اور پہلا شعر ہے

اے ز انعام تو وا شد غنچۂ امکان ما
آب در جو دارد از لُطف تو باغ جان ما

ہر ردیف کے ختم پر متعلقہ ردیف کے قطعات اور فردیات ہیں۔ اس طرح آخری غزل صرف تین شعر کی ہے جس کا مطلع ہے

بر زماں غم می خوری، ہر دم ملامت میکشی
اے مسرت کہ دم نمی دانم چہ حالت میکشی

اس کے ۵ قطعے ہیں اور پانچ ابیات دیوان کی آخری بیت ہے۔

خدا ناکردہ شاید ربط دل با چوں نخودی داری — کہ بیتابانہ چوں من ہر زماں آمد شدی داری

اس طرح یہ دیوان ۸۰ اوراق پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں لکھا ہے

تمام شد دیوانِ فارسی بہر "منہ" لکھ کر اُناسی (۷۹) سے مزید ولہ، من الرباعیات

سُرخی سے لکھ کر رباعیات شروع کی ہیں۔ پہلی رباعی ہے

| | |
|---|---|
| گر بخت شود یار روم در کعبہ | از شوق بہر سوئے دوم در کعبہ |
| بر قوت پا ضعف چو غالب آید | رو سوئے خدا خاک شوم در کعبہ |

کُل ننو رباعیاں ہیں آخری رباعی ہے

| | |
|---|---|
| دل را کہ دمے بہ رنج بگذاشتہ ایم | او شد ہمہ خوں و دست برداشتہ ایم |
| وایں چشم کہ چشمۂ روانی بود است | از خاک سرِ راہ تو ابناشتہ ایم |

اس کے بعد چھ اشعار کا ایک مستزاد ہے اوراق ۸۵ سے ایک مثنوی شروع ہوتی ہے جس کا عنوان ہے

مثنوی در فراق شہر ہند ــــــ مشتمل بر قصایص عجیب و پند

دہلی سے جُدا ہونے کے بعد میر نے خون کے آنسو روئے ہیں اس سے ان کے رنج وغم کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ اشعار ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں۔ ابتدائی پانچ شعر ملاحظہ ہوں۔

| | |
|---|---|
| اے صبا گر سوئے دہلی بگذری | ہمچو صرصر آہ مگذر سرسری |
| بوسہ دہ بر ہر قدم از سوئے من | بود بر آں خاک عمر روئے من |
| بر مقابر آیۂ رحمت بخواں | در مساجد خدمتے از من رساں |
| ہم بکن پیدا جبین تازۂ | سجدۂ بر ہر سرِ دروازۂ |
| وقفۂ بر ہر سر کو ساعتے | بادر و بامش نگاہِ حسرتے |

۱۱۶ اشعار کے بعد اس آخری شعر پر یہ مثنوی ختم ہوتی ہے

این بگفت و خضر جا نگذاشتہ

شاہ شد درویش و دل برداشتہ

اٹھاسی ویں ورق کے دوسرے حصّہ پر ابتدائی دو سطروں میں ذیل کا ترقیمہ ہے۔

تمت تمام شد دیوانِ فارسی از میر تقی بدست لالہ دولت رائے بتاریخ چہارم ذیقعد ۱۱۹۲ھ موافق سنہ ۲۰ جلوس والا بحسب الفرمائش شیخ محمد شکر اللہ تحریر پذیرفت۔

اس کے ساتھ ہی اُردو[1] دیوان شروع ہوا ہے۔ اس کے ایک گوشہ پر لکھا ہے:

[1] اب اُردو اور فارسی دیوان علیحدہ کر کے ان کی جلد بنا دی گئی ہے۔

ع۳۴ ورق - دیوانِ حال الجزء الاوّل من دیوان میر تقی بتاریخ یازدہم شہر شوال سنہ ۱۱۹۲ھ شروع بنوشتن کردن نمودہ شد -

پہلی غزل کا مطلع ہے

ہر ذی حیات کا ہے سبب جو حیات کا
نکلے ہے جی ہی اس کے لیے کائنات کا

اور پچپن ویں ورق پر یہ دیوان ختم ہوتا ہے - آخری شعر ہے

کاش کہ برقع رہے اس رُخ پہ میرؔ
منہ کھلے اس کے چھپا جاتا ہے جی

پھر ترقیمہ ہے -

تمت تمام شد بتاریخ دویم روز یکشنبہ شہر ذیقعدہ سنہ ۱۱۹۲ھ بنوی بحسب فرمائش شیخ محمد شکر اللہ سلمہ بدست میر محمد علی تحریر پذیرفت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ

ورق ع۵۶ سے ولہ من الرباعیات کا عنوان دیکر ۳۲ رباعیات لکھی ہیں پھر مخمس تسمیہ اور مخمس در ہجو لکھا ہے اور ورق ۶۲ کے دوسرے صفحہ پر دیوان ختم ہوتا ہے پھر ترقیمہ لکھا ہے -

تمت تمام شد دیوان میر تقی بتاریخ چہارم شہر ذیقعدہ روز سہ شنبہ بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ بدست میر محمد علی رضوی موافق سنہ ۱۱۹۲ھ تحریر یافت سنہ ۲۰ شاہ عالم بادشاہ غازی

ورق نمبر ۶۳ سے فردیات مخمس اور مثنویاں ہیں - آخر میں منقبت ہے اور ورق ۷۰ پر قصیدہ در مدح بادشاہ ہندوستان ہے جس کا مطلع ہے :

جو بیچ قیامت تو آہ و فغاں ہے
مرا ہاتھ اور دامنِ آسماں ہے

دوسرا قصیدہ در مدح وزیر الممالک ہے جس کا مطلع ہے

ہوا کیے ہیں زبس شکوۂ فلک تحریر
سیہ ہے کاغذ مشقی کی طرح لوح ضمیر

آخری قصیدہ در شکایت نفاق یارانِ زماں ہے جس کا مطلع ہے

جہاں میں کون ہے جس کو کسی سے اُلفت ہے
خراب کوچہ و بازار وہاں محبت ہے

یہ قصیدہ ورق ۴۷ اسے شروع ہوتا ہے ورق ۵۰ اکے دوسرے صفحہ پر ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد پھر ترقیمہ ہے

تمت تمام شد دیوانِ میر تقی بتاریخ بست و نہم شہر شوال روز پنجشنبہ سنہ جلوس شاہ عالم مطابق
سنہ ۱۱۹۲ھ بحسب فرمائش میاں محمد شکر اللہ من مقام دار الخلافہ شاہ جہاں آباد و بخط احقر العباد بندہ
رادھا کشن کاتب تحریر یافت ۔

اختتام پر نواب عنایت جنگ بہادر کی مہر "مصدر الطاف و عنایت حسین" ثبت ہے نواب صاحب مع. نے ہی ادارہ
کے کتب خانہ کو یہ گراں مایہ دیوان عطا فرمایا ہے ۔

یہ دیوان اس وقت لکھا گیا ہے جبکہ میر نے دہلی سے ہجرت نہیں کی ہے ۔ البتہ آگرے اور کامان وغیرہ کا سفر کیا
ہے اس وقت ان کی عمر ۷۰ سال ہے اور اس وقت تک وہ ایک اُردو دیوان مکمل کر چکے ہیں اور دوسرا زیر تدوین ہے ۔ یہ اس
لیے عرض کیا جا رہا ہے کہ اس دیوان پر دیوان حال لکھا ہے اور دوسرے مطبوعہ دیوان دوم سے مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے
کہ مطبوعہ دیوان میں کئی غزلیں ہیں جو اس قلمی دیوان میں نہیں ملیں ۔ محمد شکر اللہ حن کے لیے یہ دیوان تین کاتبوں نے یکے بعد
دیگرے مسلسل لکھا ۔ یہ میر کے معتقدین میں سے ہو سکتے ہیں ۔ جو دہلی ہی کے رہنے والے تھے چونکہ دیوان کی تکمیل
دہلی ہی میں ہوئی ۔

میر نے اس فارسی دیوان کی تدوین کے بعد بھی شعر کہے ہیں جو اس میں شامل نہ ہوئے ۔ اس کا پتہ اس سے چلتا
ہے کہ " ذکر میر" میں بعض مقامات پر انھوں نے میر رضی دانش حکیم شرف الدین شفائی اور صائب مشہدی کے علاوہ اپنے اشعار
بھی استعمال کیے ہیں ۔ اس میں چند ایسے شعر بھی ہیں جو اس قلمی دیوان میں نہیں ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ میر نے انھیں "ذکر میر" کی
تدوین کے وقت (۱۱۹۷) یا اس سے پہلے کہا ہو ۔ لیکن ۱۱۹۲ھ کے بعد ۔ یہ سن کتابت ہے ۔ دیوان اس سے پہلے کسی
سال مرتب ہو چکا ہوگا یا اس سال بھی مرتب ہو سکتا ہے ۔ میر کے اس فارسی دیوان میں غزل کے دو ہزار سے زائد اشعار ہیں
مثنو رباعیات اور ایک مثنوی ۱۱۶ شعر کی ہے جس کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے

میر کی فارسی شاعری کا انداز وہی ہے جو اُردو کا ہے ۔ سوز و گداز، قنوطیت اور رنج و غم کے اظہار میں میر، سادگی
اور پُرکاری کو روبکار لایا ہے ۔

غزل مطلع سے مقطع تک درد میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے، دو چار مطلعے ملاحظہ ہوں ۔

ببیں کہ موسمِ گل شد سبب خزان مرا — بہار آمد و آتش زد آشیان مرا
لختِ دل ہر شب بہ دامانم نمی دانم چرا — ہر سحر سر در گریبانم نمی دانم چرا
در عشق کس نہ گشت حریف نبرد ما — بر روئے ما نیامدہ جز رنگ زرد ما
چند روزی شد کہ اینجا باش و بودے می کنم — در حقیقت نیستم اما نمودے می کنم
گہ سنگ زدن بر سر گہ پارہ جگر کردن — چندے بہ سر کوبش ہر نوع بسر کردن

حافظؒ نے کہا ہے ۔

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

اس درد کی کیفیت میرؔ کی زبان سے سنیے ۔

چہ گویم میر ازاں سوزی کہ با خود داشتم پنہاں
چنار آسا تمامی سوخت آخر برگ و بار ما

ایک شعر میں قاصد سے مخاطب ہیں اور اس میں درد و کرب کی کیفیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ۔

حالِ زار خویشتن قاصد چساں اِنشا کنم
بر سرِ حرفے مرا صد بار می باید گریست

اُردو میں میرؔ نے فرمایا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا

اس خیال کو فارسی میں یوں پیش کیا ہے

نالۂ دل خراشِ میرؔ آخر
خواب از چشمِ دوستاں برداشت

اکثر شعرائے نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے شاعری دردِ دل کے اظہار کے لیے اختیار کی ہے ۔ میرؔ نے یہ خیال یوں ظاہر کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

غم دریں پردہ می کنم اظہار
شاعری را بہانہ ساختہ ام

میرؔ کہتے ہیں کہ زندگی مقدر تھی اس لیے پیدا ہوئے۔ زندگی گذاری لیکن یہ زندگی نمودِ بے بود کی حیثیت رکھتی ہے۔

چند مفلے شد کہ ایں جا باش و بود می کنم
در حقیقت نیستم اما نمودے می کنم

غالبؔ فرماتے ہیں

مگر غبار ہوئے پر ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

اور میرؔ اس سے بہت آگے جا پہنچے ہیں۔ انھیں بے بال و پری کا گلہ نہیں۔ فرماتے ہیں

تسکیں نیافتیم پس از مرگ زیرِ خاک
آخر غبار گشتہ بہ کوے تو آمدیم

میرؔ نے اظہارِ غم کے لیے ایک نہایت بلیغ شعر کہا ہے

میرؔ ز ایام چہ نقصان شدے
گر شبِ ما ہم سحرے داشتے

اپنی ساری زندگی کو ایک طویل شب سے تعبیر کرنا انوکھا خیال ہے۔ اسی خیال کو ایک اور انداز میں بے نظیر شاہ نے پیش کیا ہے اور گلہ کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ انتہائی دلفریب اور دل کش ہے۔ کہا ہے ؎

ازل میں ہر انجام لکھا گیا
شبِ غم کی لیکن سحر رہ گئی

ایسے کئی گوہر شاہوار اس دیوان میں ملیں گے جن کا تعلق میرؔ کے خاص مضمون لذتِ غم اور قنوطیت سے ہے۔
میرؔ نے حیاتِ مستعار کے اظہار کے لیے اُردو میں جو شعر کہا ہے اس کی بلاغت، معنویت اور جامعیت کا جواب نہیں۔ فرماتے ہیں

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سُن کر تبسّم کیا

فارسی میں اس حیاتِ ناپائدار کا تخیّل یوں پیش کیا ہے۔

وقت آں کس خوش کہ گلزارِ جہاں را دید و رفت
ہمچو گل بر بے ثباتی ہائے خود خندید و رفت

ایک اور شعر ہے

کار خود پیش از جوانی کن کہ اے غفلت پرست
چشم تا برہم زنی خوابیست ایام شباب

میر نے جہاں اُردو میں کئی اشعار میں غربت و فلاکت کا اظہار کیا ہے۔ یہ مضمون فارسی میں بھی موجود ہے جو تاثر اُردو اشعار میں ہے وہی تیور اور وہی انداز فارسی اشعار میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

کار با دنیا و ما فیہا نداشت
دیدہ ام من میر را درویش بود

ایک اور شعر ہے

اوج دنیا میر در چشم ندارد اعتبار
ہر زماں باشد جہاں در اختیار دیگرے

ایک شعر کہا ہے

میر نے زور داشتی نے زر
بچہ سرمایہ عشق ورزیدی

میر نے اپنے مذہب کے بارے میں بھی اُردو میں اکثر طنزاً اشعار کہے ہیں اور صنم پرستی کا شیوہ اختیار کرنے کی خبر دی ہے۔ مثلاً ایک مشہور شعر ہے۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

یہ مضمون انھوں نے فارسی میں بھی باندھا ہے۔ کہتے ہیں۔

گاہ در مسجد و گہے در دیر
میر را تا چہ دین و آئین است

دوسرا شعر ہے

روزگارے شد کہ از دینِ قدیم خویشتن
میر در عشقِ بُتاں برگشتہ و زنار بست

میر صاحب کی تعلّی نہایت بلند و بلیغ ہے۔ اردو میں تو انھوں نے :-

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

کہہ دیا۔ فارسی میں بھی کہیں دبی زبان سے اور کہیں علی الاعلان تعلّی کی ہے۔
دبی زبان میں تعلّی کے چند شعر یہ ہیں

تعجب نیست گر اے میر من قادر سخن گشتم — کہ خدمت کردہ ام بسیار مشاقان ایں فن را
خود ستائی خود سری معیوب می دانیم ما — ورنہ طرز شعر گفتن خوب می دانیم ما
طرز گفتار میر را دیدم — بے دماغانہ آرزوئے داشت
میر بر شعر تر خویش مکن ایں ہمہ ناز — دیگراں نیز غزل را بہ صفا می گویند
در رہ شعر کسے راہنما نیست مگر — حرف چندیست بیارم و سخندانے چند

اب علی الاعلان تعلّی ملاحظہ ہو۔

پہلوانم بہ فن شعراے میر — ہر کہ شد روکشم بر و افتاد
در بزم مطربے غزل میرؔ خواندہ بود — زاہد بہ سرور آمد و صوفی زپا فتاد
با میر دوش صحبت شعر اتفاق شد — بیخود شدیم از غزل عاشقانہ اش
دوش بر شعر ترے در رقص آمد جان ما — چوں نظر کردیم بود آں شعر از دیوان ما

حافظؔ نے کہا تھا۔ دور مجنوں گذشت و نوبت ماست
ہر کسے پنج روزہ نوبت اوست

میرؔ صاحب فرماتے ہیں

گذشت نوبت قدسی و صائب و طغرا
درایں زماں ہمہ دیوان میرؔ می خوانند

غرض یہ چند اشعار میں نے ہدیہ ناظرین کئے ہیں۔ اگر خدائے سخن میر تقی میر کا یہ دیوان طبع ہو تو یہ گوہر آبدار محفوظ رہیں گے اور تشنگانِ علم کی سیرابی کا باعث ہوں گے۔ ورنہ پتہ نہیں یہ دیوان جو اس وقت اچھی حالت میں ہے کب کیڑوں کی نظر ہو جائے۔

---

# دیوان میر تقی

تحفہ نواب عنایت جنگ بہادر

سید علی اکبر بہادر

اردو ۷ رمضان ۱۳۶۰ھ

ورود ام زباغ بد آنگونه نضارت که گل — سبزه خجل گلستان نزد چشم تر است

تا در سینه خروشی شنیدم زین تیغ — مدتی است در آن عالمی زیر و زبر است

میکنم یاد فغان گوش تو و میگریم — دارم از ناله من اندیشه افغان که کراست

میر را وسیع کاشی نمی آوردم

درد دل کو تجدی که مرا در جگر است

بی تو ای مهر من همه کین است — دشمن جان و رہزن دین است

جان تلخی کشنده می داند — که کباب دلبران چه شیرین است

از خرامش بهار می ریزد — رفتن یار لیک رنگین است

قامتت را زتخیلی نمودم — آفت روزگار جز آن است

گاه در مسجد است و گه در دیر

میر را تا چه دین و آئین است

طور ها شد مختلف دور زمان دیگر است — آن زمین برباد رفت این آسمان دیگر است

مهر شد مفقود یا زینجا محبت رفته است — یا رواج ما دگر شد یا جهان دیگر است

کذب هر کس را شعار حرف هر یک بی جواز — ما نمی فهمیم گویا این زمان دیگر است

مردم این ایام بی لطفی کمی از خیر بود — میل طبعم جانب نا مهربان دیگر است

سرگذشت ما مصیبت دیدگان عشق زار — قصه مجنون جدا این داستان دیگر است

یک زبان در روی هم کم ناله ام صحبت دیده ام — خستهٔ عمر و ناله کاو دلستان دیگر است

گشته تیغ تو ز نازم چاکر
مستم چه دانم راه و رسم خانقاه
بود در هر گوشه آتش بیگانه
پا سر سنگ ز جراحتی نی سگا

قصه شد رسوا ده و از خانه رفت
عمر من در خدمت میخانه رفت
مسجد مرکم رونق و ویرانه رفت
از سر خاکم چه مرحمانه رفت

نیست شور میر در بازارها
غالبا از شهر آن دیوانه رفت

مشنو سخن شیخ که از بی‌بصران است
صیاد حبیبی در مکه و دهر ندارد
با صحف زبانی هم از و کار ندیدیم
در مسلمانی برزده چون شمع سحر بس

رو شکر و دیدار رخ خوش پسران است
آنکس که نگاه تو نه حیف زبان است
دیریست که روی سخنش با دگران است
لیکن بزم دل افروز جهان گذران است

آئینه مگر دیده میر است که هر صبح
در صحبت خوب تو بحیرت نگران است

شبنم که بهنگام سحر چشم تری داشت
زین خسته زدن خیال نمود است که هر یک
مستان محبت همه هشیار برگشتند
از دل چه حکایت کنم اکنون که بجا نیست
مردیم و مغان هم شده ویران بگذشت

شاید که برخساره آن گل نظری داشت
شایسته بروز زلفش بال و پری داشت
هر بیخبری عشق تو با خود خبری داشت
زین بیشتر این قطره خون هم جگری داشت
گاهی ره گذر تکیه دریوزه گری داشت

ودیعه بر در قفس پریشان آمد — مرغ روح که بر قفسش نشان شده است
در بهاران دل پری دارم — رنگ گل برق آشیان شده است

کس چه داند غبار کیست که میر
گفته هات کاروان شده است

چه ظلمها که نه بر من در آرزوی تو رفت — دلی که رفته او هم به جستجوی تو رفت
نسیم صبح پی رنگ گل به کوی تو رفت — مگر ز راه چمن نامه بسوی تو رفت
به هر کجا که رسیدیم گریستیم چو ابر — به باغ رفتیم و فرصت به یاد روی تو رفت

ز چند روز دل تنگ یکقلم باز
ملالم میر تنگ آمده ز گوی تو رفت

ز ما که خسته ایم مپرس سرگذشت — میری فکند عشق بسی کار گذشت
آن غنچه ام که آخر موسم رسیده ام — تا چشم وا کنم که بهار از نظر گذشت
یا شور بود یا که من ایم خیال قسم — سیلاب عمر من چقدر تیز برگذشت
زین آمدن چه لطف کز آن باده خوار ماند — روز قال یک آن وفا بخبر گذشت

یک گفتنی که درد تو درمان پذیر نیست
دیدی که میر آخر ازان درد درگذشت

زین زمان بر دلم ز درد تو حسابی دگر است — نحوی شود و بود که گرانی دگر است
لطف از تو نخستین نداری که تو هم اول — دل بجای دگر و دیده بجای دگر است

اے بہ قربانت رَوَم بسیار رنگیں میروی

ازخرامِ تو بہ ہر گامے بہارے ماندہ است

تا چشم خونی باز نماید زرشت | بنیاد قصر عمر چه ناپایدار بود

کردی جفا و جور بطرحی که شد بلند
هر چند میر طرح کشش زور کار بود

مستمند عشق میدانند که سودا میکند | دیدن طفلان تماشا بازار ریوز میکند
کعبهٔ خود در ره طلب کاندر بیابان را قعت | کام هیچ یک دل از دل نمی جا میکند

دل از این است کار زندست خواهد رست میر
در طپیدن هر نفس هنگامه برپا میکند

زیر سر مژگان نه تنها در غم سخن می رود | رنجه در بعل بدنیم از دیده مردان میرود
گریه هر لحظه من شکوهٔ دیرینه ایست | نیم جان بی دردم از تن هم بنواکنون میرود

نه زبان عاشقی ستم آخر چه میخواهد که میر
سنگ‌ها از رسوایی و مجنون میرود

زندگانی که اعتباری بود | در فراقش هدیش ما ربی بود
شد تبه شاخ ماتم بلبل | شاخ گوئی که سبز واری بود
کوهکن صفت جان شیرین داد | سخت ناآزموده کاری بود
گر دلیلان بخاک گور مرا | زان کف خاک یادگاری بود
نی طپیدی و نی گذشته شدی | هستش از این دل عزیز یاری بود
ساعدی آن نهال گلشن حسن | گو نما سیم شانه داری بود

بشکند این کاسه در یوزه دیدار میر
در همه عالم شدم رسوا ز چشم گریه ناک

تنها نیم ز شوق تو ای ناتوان هلاک — خلقی است از ادای تو ای کام جان هلاک
زنهار روزگار موافق نشد به میر — شد تلخ از جفای فلک این جوان هلاک

## ردیف اللام

عهد کردم یا نکردم در ره ناکام دل — یا همان کردم که در طالع بود ارام دل
چشم و دل خصم اند خواهم شد نهانی کار زرد — کس نه بیند روی چشم و کس نگیرد نام دل
طوف دل را بر طواف کعبه نتوان حمل کرد — سعی بیهوده است قصد حج نه کار احرام دل
اینکه سرگرم محبت باد کسی هست زیست — تجربه ها بس نیامد در خیال خام دل
اضطراب بی غرض مست بی تحریک شوق — میرسد در گوش جانم هر نفس پیغام دل
هر کرا باشد نه بسیار تحرکش باشد که هست — باده از خون کبوتر شیشه تر و جام دل

گر طپید بیها باین رنگست در آغاز عشق
من نمیدانم چه خواهد گشت میر انجام دل

روی یا سخن وصف ز حسنش نیست سوی گل — ان نازکی کجاست به بینید روی گل
در روند عندلیب زبان را لگام دار — نازک تر است خوی تو گلندام ز خوی گل

بیزار نیست ز گلستان ملک که میر
بسیار بر دماغ تو خورد است بوی گل

هر لحظه آن قیامت قد و بالای دل
صد ها ز شعبده عرض دهد از برای دل

خون گشت و مسخ گشت و تماشی که در گذشت
لیکن ترددیست مرا در وفای دل

هر چند در عذاب الیمم ز دل ولے
کز آمدم به دست نیفتم به پای دل

یک چند ترک بر دل و لیها ضرورت است
اکنون نمانده در شکن زلف جای دل

خیری که دل کشد به جهان میر آن دلست
بجهدی نما و تو قدری ز تمنای دل

حرف از لگد در طوف نکردند سوی دل
زین قوم آن شکسته عزیز آوری دل

در کوچه تو فان لبے دردمند نیست
تا حشر خورد بر تلاطم خاک کوی دل

خواهش نوشت میر ولیکن نه آنقدر
ز حرف ملک رو ترد زرد روی دل

آمد ستم سنگ ز دلجوی دلداری دل
آه تا چند خورد کس غم بیماری دل

یاد باشد که کس انس نگیری زنهار
جان فنس عبدار منیست گرفتاری دل

یک لمحه بنشین بهلیش تنها دم سکین
خود پسندان نمودند خریداری دل

رنجی دل که منش خواستے دست نداد
صرف شد عمر گرامی به طلبکاری دل

هر کجی پای نهی بر سر دل می آید
ره بکو لیشی مخن بر در بسیاری دل

ورنه در روی قر زیش چه شکیب و چه توان
کس الذین هر دو نیا مد که کند یاری دل

میر در وقت شعلم باری آه سحری
حکم نیست که آید ز تسخیر وری دل

گر نبودم گشته زبان زرنگ الم چون شمع
این سخن میر بخاطر خموشان دارم

شب و روز در جستجوی دلم
در حیرت جستنش آئینه کرد
که از نیست با چشم بر در نشسته
بفریاد در کوشش و در رم مدام

من از حال خوبان گوئی دلم
بسوئی کسی نیست روئی دلم
نگاهی نکردی به سوی دلم
چه دارد فتنه های و هوی دلم

بلے لعل او میر جان میدهد
جدا چون شد از آرزوی دلم

چون از ... ت بیجا گرفتار بودم
با هر که مهر ورزم بند دگر بگیرم
زان شوخ از نازم مغرور تر شد آخر
مشتاق قصه من بسیار بود مجنون

عمری بدین گلستان چشم آب داده بودم
در عشق بخت خود را صد بار آزمودم
هرگز نزد نبودم هر چند جبهه سودم
چون سر گذشت گفتم هوش از سرش ربودم

این گل نهال دلکش یکسر ندیده بود
من میر کاش اینجا چشمی نمی گشودم

بخود دیگری باده فروشان فتاده ام
میدانستم رسید وصالش ازین سبب
در من چو کار مطلب شود بکند زم جانی

لذت تیغ بجرم مست باده ام
جانی زدم بدر و کار صدائی نزده ام
کارم عجیب است که گزاف زده ام

آں غنچہ ام کہ آخرِ موسم رسیدہ ام
تا چشم وا کنم کہ بہار از نظر گزشت

آئینہ مگر دیدۂ میر است کہ ہر صبح
بر صورتِ خوبِ تو بحسرت نگراں است

از دم تو رحوال خزان دور بود — گل دریغا بود و دیگر نابود

گرچه اکنون باغ صحرا شد ولی — سرو اینجا بود و ورنی جا ولی

چشمک نرگس دل از کف می ربود — زلف را از تار سنبل میگشود

گلرخان دف و جام می‌زدند — هر طرف مستانه گامی میزدند

چشم ساقی فتنه می انگیختی — خون مینا و صد دم میریختی

وقت خود احباب خوش بنشستند — این روش دیدند و جا بگذشتند

ناگهان آن بزم خرم برنگشت — آن سرزب افتاد و این ساعت نگشت

چشم گل پوشیده شد هم آب رفت — سبزه تر زیر شد در خواب رفت

نی نهال و نی اندر و نی سرو باغ — مانده ام من با هزاران درد و داغ

ناله را از درد گاهی میکشم — گاه گاه از سینه آهی میکشم

کار در دم با سکوت و خامشی — دمکشی کو تا شنایم دمکشی

من هم از شوق وطن دلخسته ام — ورنه عمری شد که لب را بسته ام

کو دماغ و دل کی و وقت گو — تا کنم دیگر نه در هم گفتگو

شهره شهر است استغنای من — شور در دیده با شیخهای من

دل ز جوشش درد و غم خون میکنم — مصرعی را گاه موزون میکنم

رفته عشقم تخم من وا فرست — هر که واندیشد عزم باش خوب است

شنیده بد چراغش در دیده شهر — از پی لسان کن بر یاد خیر

زیں لطف و خضر چا بکند رشته
شاه شد در درویش و دل هر دو رشته

تمت تمام شد دیوان فارسی از میر تقی بدست
بتاریخ چهارم ذی قعده سنه ۱۱۹۲ هجری موافق سنه ۲۰ جلوس
بحسب الفرمایش شیخ محمد شکر الله تحریر پذیرفت

کیا آپ کو معلوم ہے؟

کہ

غالب نمبر حصہ دوم

میں

غالب کا تمام کلام بخط غالب ہے؟

جو

ادارہ "نقوش" نے پہلی بار پیش کیا تھا۔

جس میں

غالب کی اپنے کلام پر اصلاحیں بھی موجود ہیں۔

یہ ایک نایاب

دستاویز ہے۔ جسے زمانہ کبھی بھلا نہ سکے گا

یاد کیجیے

اقبال نمبر حصہ اول میں

علامہ کی متعدد گمشدہ دستاویزات کو پہلی بار پیش
کیا گیا تھا۔

علاوہ ازیں

اقبالیات کے نامور نقادوں کے مضامین

مثلاً

پروفیسر رفیع الدین ہاشمی ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ، مولانا امتیاز علی عرشی
ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، ڈاکٹر عبدالحق ، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ، ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ، جگن ناتھ آزاد
ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، ڈاکٹر وزیر آغا ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، میکش اکبر آبادی ، پروفیسر اسلوب احمد انصاری
ڈاکٹر نذیر احمد ، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، پروفیسر عبدالقوی دسنوی

○

# مضامین

## اردو مخطوطات سے متعلق

## یاد کیجئے

### اقبال نمبر حصّہ دوم میں

علامہ کے سات غیر مطبوعہ خطوط

کے علاوہ

مندرجہ ذیل نقادانِ فن نے مضامین لکھے تھے

ڈاکٹر وحید قریشی ، ڈاکٹر اکبر حیدری ، مولانا امتیاز علی عرشی

پروفیسر رشید احمد صدیقی ، محمد ہادی حسین ، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

پروفیسر کرار حسین ، سید نذیر نیازی ، فیض احمد فیض

ڈاکٹر محمد اجمل ، رفیع الدین ہاشمی ، محمد طاہر فاروقی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، ڈاکٹر محمد حسن ، پروفیسر محمد منور

پروفیسر عبد القوی دسنوی ، ڈاکٹر سلیم اختر ، ابو الاثر حفیظ جالندھری

ڈاکٹر ابو الخیر کشفی ، ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، ڈاکٹر نجم الاسلام

# میر کے دیوان سوم کا ایک نادر قلمی نسخہ

ڈاکٹر حنیف نقوی

میر کے مختلف دواوین اور کلیات کے جتنے قلمی نسخے ہند اور بیرون ہند کے کتب خانوں میں دستیاب ہیں، ان میں دیوان چہارم کا نسخۂ محمود آباد کئی لحاظ سے بہت اہم خیال کیا جاتا ہے۔ یہ نسخہ میر کے بھلنجے، داماد اور شاگرد میر حسن علی تجلی کا لکھا ہوا ہے اور لکھنؤ کے ایک مقتدر ہم عصر رئیس زین الدین احمد خاں عرف مرزا محمد محسن[1] کی ملکیت میں رہ چکا ہے۔ دوسرے امتیازات سے قطع نظر اس نسخے کی اہمیت کی بنیادی وجہ محسن کی وہ تحریر ہے جو اس کے سرورق کی زینت ہے۔ محسن نے اس تحریر میں میر کی تاریخ وفات، سن عمر، تدفین کے وقت اور مقام نیز دیوان کی کتابت اور ملکیت کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے ماہنامہ "نیا دور" کے جنوری ۱۹۷۴ء کے شمارے میں اس نسخے کے تعارف کے ضمن میں صفحۂ اول کی اس تحریر کا عکس بھی شائع کیا ہے جس کے مطابق اس کا مکمل متن حسب ذیل ہے :-

> "بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقت شام ۱۲۲۵ھ یکہزار و دوصد و بیست و پنج ہجری بود، میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹھی بعد طے نہ عشرۂ عمر بجوارِ رحمتِ ایزدی پیوستند و روز شنبہ بیست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقتِ دو پہر در اکھاڑۂ بھیم کہ قبرستان مشہور است، نزدیک دیگر قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوانِ خود را کہ ایں دیوانِ چہارم ہم از انجملہ است بمحرر سطور محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد تجاوز اللہ من سیاتہ در عین حیاتِ خویش بکمالِ رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدا ایش بیامرزد۔ آمین۔ حررۂ محمد محسن عفی عنہ، روز جمعہ بیست و ہفتم ماہ شعبان سنہ الیہ بوقت دو گھڑی روز باقی ماندہ۔ ایں دیوان از دستخط میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور است۔
>
> المحررہ محمد محسن عفی عنہ

---

[1] زین الدین احمد خاں عرف مرزا محمد محسن لکھنؤ کے مشہور ذی علم رئیس فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر، جعفر تخلص (متوفی ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء) کے صاحبزادے اور قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی متخلص بہ قمر (متوفی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۰ء میں وفات پائی۔ رشک نے "با علم و مورخ و محقق بودہ" سے تاریخ نکالی۔

محمد تقی میرؔ شاعر کہ بود — مسلم ورا تخت و تاجِ سخن
باقلیم معنی زار بابِ شعر — ستانندہ او بود باجِ سخن
ز فوتش چو بے نور شد شعر سال — نوشتم "بمردہ سراجِ سخن"

۱۲۲۵ھ

---

میر تقی استادِ فنِ شعر — مرد و ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر — "میر تقی استاد" رقم شد

"۱۲۲۶ھ - ۱ = ۱۲۲۵ھ"

دیوانِ میرؔ کا یہ نسخہ مہاراجہ محمود آباد کے کتب خانے میں پہنچنے سے قبل شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے چنانچہ اس کے پہلے اور آخری صفحات پر نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہریں ثبت ہیں جو اس کے امتیاز و اعتبار کی توثیق کرتی ہیں۔ موجودہ تحقیق کے مطابق مرزا محمد محسن کی منقولہ بالا تحریر وہ پہلی اور آخری مستند دستاویز ہے جس نے میرؔ کے سالِ ولادت، تاریخِ وفات اور مدفن وغیرہ کے بارے میں صحیح معلومات فراہم کر کے تمام ظنی و تخمینی اندازوں اور محققانہ قیاس آرائیوں کا سدِ باب کر دیا ہے۔ اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ صاحب نے اس دیوان کے ساتھ ہی پہلے تین دیوان بھی مرزا محسن کو نذر کیے تھے۔ ظاہر ہے کہ کلامِ میرؔ کے مستند ترین متن تک رسائی کے نقطۂ نظر سے دیوانِ چہارم کے اس نسخے کی طرح ان تینوں دیوانوں کے متذکرہ نسخے بھی غیر معمولی اہمیت کے حامل ہوں گے اور ان کی بازیافت میرؔ کے قدر شناسوں کے لیے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہو گی۔ ان سطور میں دیوانِ میرؔ کے جس قلمی نسخے کا تعارف مقصود ہے وہ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے۔

دیوانِ میرؔ کا زیرِ بحث مخطوطہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی گائیکواڑ لائبریری کے ذخیرۂ لالہ سری رام سے تعلق رکھتا ہے۔ کتب خانے کی فہرست مخطوطات میں اس کا نمبر اندراج $\frac{U \times 0.1 \times 0.3}{5/4/2}$ ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۳ سطری مسطر پر لکھے ہوئے ۹" × ۸ و ۳"۶ سائز کے ۱۲۱ اوراق پر مشتمل ہے اور اوسط درجہ کے رواں نستعلیق خط میں لکھا گیا ہے۔ پہلے ورق کے دوسرے صفحے سے ورق ۸۲ الف کی پانچویں سطر تک غزلیات درج ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۸۲۸ ہے۔ اس کے بعد چھ رباعیاں منقول ہیں۔ ورق ۸۲ ب کی بارہویں سطر سے "شکار نامہ" کا آغاز ہوتا ہے جس میں سات اشعار کی ایک غزل سمیت کل ۱۸۰ ابیات ہیں۔ ورق ۸۶ الف کی دوسری سطر پر "شکار نامۂ دیگر" کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ اس کے تحت اشعار کی کل تعداد ۲۹۳ ہے جن میں ۵۰ اشعار پر مشتمل ۶ غزلیں بھی شامل ہیں۔ ورق ۹۷ ب کی نویں سطر سے "شکار نامۂ سوم" کے

زیرِ عنوان تیسرے شکار نامے کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے ابیات کی مجموعی تعداد ۹۸ اشعار کی گیارہ غزلوں اور ایک رباعی کو شامل کر کے ۲۲۵ ہو جاتی ہے۔ ورق ۱۱۱ الف کی چھٹی سطر سے "مثنوی" "در تعریفِ شادی کدخدائی" کا آغاز ہوتا ہے جو سات اشعار کی ایک غزل سمیت ۱۶۱ ابیات پر مشتمل ہے۔ ورق ۱۱۳ ب کی پانچویں سطر سے "مثنوی مرغ نامہ" شروع ہوتی ہے جو عام طور پر "مثنوی در بیانِ مرغ بازاں" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مثنوی میں کل ۱۵۲ ابیات ہیں۔ ورق ۱۱۵ ب کی چھٹی سطر سے "مثنوی شیب نامہ" کا آغاز ہوتا ہے جسے دوسرے مقامات پر "مثنوی در بیانِ دنیا" یا "مذمتِ دُنیا" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مثنوی کے ابیات کی تعداد ۵۰ ہے۔ ورق ۱۱۷ ب کی ساتویں سطر سے ورق ۱۱۹ الف کی پہلی سطر تک مرثیہ "فلک قتلِ سبطِ پیمبر ہے کل" نقل کیا گیا ہے جو ۱۷ مربع بندوں پر مشتمل ہے۔ ورق ۱۱۹ الف کی تیسری سطر سے دوسرا مربع مرثیہ "سنو یہ قصہ جانکاہ کربلائے حسین" شروع ہوتا ہے۔ اس مرثیے میں کل ۴۳ بند ہیں۔ آخری شعر ورق ۱۲۱ ب کی پانچویں اور چھٹی سطر پر منقول ہے، اس کے بعد باقی جگہ سادہ چھوٹی ہوئی ہے۔ مخطوطے کے صفحۂ اوّل پر جسے ناقل نے سادہ چھوڑ دیا تھا، مرزا محسن نے میرؔ کی وفات اور دیوان کی کتابت و ملکیت وغیرہ کے بارے میں معمولی لفظی اختلافات کے ساتھ وہی تمام اطلاعات فراہم کی ہیں جو نسخۂ محمود آباد کے پہلے صفحے پر پیش کی گئی ہیں۔ اس تحریر کا مکمل متن حسب ذیل ہے :

## دیوان سیوم میر محمد تقی دہلوی میرؔ تخلص

بتاریخ بیستم ماہ شعبان روز جمعہ سنہ ۱۲۲۵ سنہ یکہزار و دوصد و بیست و پنج در سن نود سالگی بعارضۂ تپ دو گھڑی روز ماندہ وفات یافتند و در اکھاڑۂ بھیم کہ جائے است مشہور در لکھنؤ نزدیک قبرستان برابر قبورِ اقربائے خود مدفون گردیدند و روزِ دفن بیست و یکم ماہِ مذکور روز شنبہ وقت دو پہر بود۔ پروردگار بیامرزد و مغفرت نماید۔ آمین آمین ۱۲

محررہ بیست و ہفتم (ماہ شعبان) سنہ الیہ روز جمعہ چہار گھڑی روز باقی ماندہ۔ حررہ محمد محسن عفی عنہ۔ چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان سیم از انجملہ است، میر صاحب مرحوم در حیاتِ خود در ثباتِ عقل بمن محرر بطوع و رضائے خود بخشیدند، بحل کردند و ہر چہار دیوان دستخطی، میر حسن علی تجلی تخلص اند کہ دامادِ میر صاحب مرحوم و شاعرِ شیریں کلام بودند۔

بتاریخ محررہ محمد محسن عفی عنہ

محمد تقی میر شاعر کہ بود — مسلّم و را تخت و تاجِ سخن
باقلیم معنی ز ارباب شعر — ستانندہ او بود باجِ سخن
ز فوتش چو بے نور شد شعر، سال — نوشتم "بمردہ سراجِ سخن"

دیگر

میر تقی اُستادِ فن شعر　　مُرد و ز دُنیا سوئے عدم شد
گشتہ چو اشعارش ہمہ بے سر　　"میر تقی استاد" رقم شد
۱۲۲۶ھ - ۱ = ۱۲۲۵ھ

نسخۂ محمود آباد کی طرح یہ نسخہ بھی شاہانِ اودھ کے کتب خانوں کی زینت رہ چکا ہے جس کی تصدیق اس کے پہلے اور آخری صفحات پر ثبت مہروں سے ہوتی ہے۔ ان دونوں صفحوں پر جا بجا دبیز کاغذ کی چپیاں چسپاں ہیں لیکن ان کے نیچے چھپائے ہوئے حصے کرم خوردگی سے پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس صورت حال نے محررِ سطور کو اس غیر ضروری احتیاط کے اسباب اور اصل حقیقت کی دریافت کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ سورج کی تیز روشنی میں جب ان حصوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ عمل متذکرہ مہروں کو چھپانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ صفحۂ اوّل پر دو چپیاں محسن کی تحریر کے اوپری حصے میں دونوں سروں پر اور ایک چپی اس کی دائیں جانب بالکل وسط میں چسپاں کی گئی ہے۔ اوپر بائیں جانب کی چپی کے نیچے نصیر الدین حیدر کی مہر ہے جو تیز روشنی کے مقابل واضح طور پر پڑھی جا سکتی ہے۔ اس مہر پر یہ شعر کندہ ہے ؎

خوش است مہرِ کتب خانۂ سلیماں جاہ
بہر کتاب مزیّن چو نقش بسم اللہ

اس کی مخالف سمت میں دوسرے سرے پر امجد علی شاہ کی مہر ہے جو واضح طور پر نہیں پڑھی جا سکتی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر اکبر حیدری کی تحریروں کے مطابق اس مہر پر بصورت ذیل یہ شعر کندہ تھا ؎

ناسخ ہر مہر شد چون شد مزین بر کتا
خاتم امجد علی شاہِ زماں عالی جنا

اس نسخے پر ثبت مہر میں ان دونوں مصرعوں کے پہلے الفاظ "ناسخ" اور "خاتم" اور آخری حرف "ب" کے نقوش نسبتاً واضح ہیں جن کی مدد سے باقی الفاظ کی قرأت کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ محسن کی تحریر کے پہلو میں دائیں جانب سلطان عالم واجد علی شاہ کی مہر ہے جو سائز میں ان دونوں مہروں سے چھوٹی اور شکل میں مختلف ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کی تحریر کے مطابق اس مہر پر مندرجہ ذیل شعر کندہ تھا ؎

خاتم واجد علی سلطانِ عالم بر کتاب
ثابت و پُر نور بادا تا فروغ آفتاب

ڈاکٹر اکبر حیدری نے نسخۂ محمود آباد سے متعلق اپنے مضمون میں اس مہر کی یہ شکل متعین کی ہے :

| ۱۲۶۳ھ ہجری<br>واجد علی سلطان عالم |
|---|
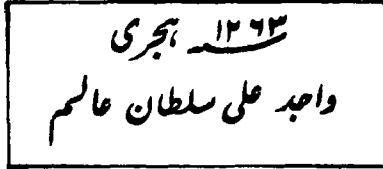
لیکن اس نسخے کے صفحۂ اوّل کا عکس ڈاکٹر اکبر حیدری کی متعینہ شکل کے برخلاف پروفیسر رضوی کی تحریر کا موید ہے۔ اس عکس میں "خاتم واجد علی سلطان عالم .. اور "ثابت و پُر نور" بالکل صاف طور پر پڑھا جاتا ہے۔ باقی الفاظ و حروف مبہم اور غیر واضح ہیں۔ نسخۂ بنارس پر ثبت مہر کی عبارت اگرچہ قرأت سے ماورا ہے تاہم اس کی ہیئت اور بالائی حصّے کے نقوش جو پوری طرح اُبھرے ہوئے ہیں، نسخۂ محمود آباد کی مہر سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مخطوطے کے آخری صفحے کے زیریں حصّے میں نصیرالدین حیدر کی مہر صفحے کے بالکل وسط میں لگی ہوئی ہے اور اس کے دائیں طرف کچھ اوپر امجد علی شاہ کی اور بائیں جانب بالکل برابر واجد علی شاہ کی مہر ہے۔ درمیانی مہر یہاں بھی سورج یا بجلی کی تیز روشنی کے مقابل صاف طور پر پڑھی جا سکتی ہے۔ باقی دونوں مہریں اپنی کیفیت ظاہری کے اعتبار سے صفحۂ اوّل کی مہروں سے مماثلت رکھتی ہیں۔

واجد علی شاہ کی مہر کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ دیوانِ میر کا یہ نسخہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) تک جو ان کا پہلا سال جلوس ہے، اودھ کے شاہی کتب خانے میں موجود تھا۔ اس کے بعد کسی وقت اسے کتب خانے سے چرایا گیا اور خیانت کے اس عمل کو چھپانے کے لیے شاہی مہروں پر چیپیاں لگا دی گئیں، حتیٰ کہ اس کے آخری مالک نے اسی صورت میں اسے لالہ سری رام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ شاہی کتب خانے سے کتابوں کی چوری، غاصبانہ دستبرد اور بے دریغ لوٹ کے متعدد واقعات اس زمانے کی تاریخوں میں محفوظ ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اپنے ایک مضمون "لکھنؤ کا شاہی کتب خانہ" میں اس قسم کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایلیٹ صاحب (جو گورنر جنرل کے سیکرٹری تھے) یکم نومبر ۱۸۴۶ء (۲۱ ذی قعدہ ۱۲۶۲ھ) کو لکھنؤ میں وارد ہوئے اور ریذیڈنٹ کے ساتھ بادشاہ کی ملاقات کو گئے۔ ایک ہفتہ شہر کو دیکھا اور کتب خانۂ سلطانی سے تاریخ وغیرہ کی کتابیں منتخب کر کے لے گئے[1]۔" مارچ ۱۸۴۸ء میں مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر الواس اشپرنگر (۱۸۹۳ء — ۱۸۱۳ء) کو شاہی کتب خانے کی فہرست مرتب کرنے کے لیے لکھنؤ کا ریذیڈنٹ ایکسٹرا اسسٹنٹ مقرر کیا گیا۔ لکھنؤ میں ایک سال دس مہینے کے قیام کے دوران انھوں نے اٹھارہ مہینے اس کام پر صرف کر کے یہ فہرست مکمل کی۔ پیش لفظ میں انھوں نے کتب خانے کے منتظمین کی غفلت اور تحویل داروں کی بددیانتی

---

[1] ماہنامہ "نیا دور"، شمارہ اگست ۱۹۷۰ء، صفحہ ۲

کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"شاہی ملازمین کتابوں کو فقط شمار کر لیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی اچھی کتابیں نکال لی گئی ہیں اور ان کی جگہ بُری کتابیں رکھ دی گئی ہیں۔ توپ خانے میں کم سے کم نو سو نسخے "گلستان" کے اور اتنے ہی "یوسف زلیخا" کے ہیں جو بظاہر قیمتی کتابوں کی جگہ پر کرنے کے لئے رکھ دیئے گئے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک سابق داروغہ نے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے ایک مہینے میں گیارہ ہزار روپے کی کتابیں بیچ ڈالیں[1]"

چوری اور دست برد کے یہ واقعات اس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ واجد علی شاہ برسرِ اقتدار تھے اور کتب خانے کی ترتیب و تنظیم پر ان کی خاص نگاہ تھی۔ ۱۸۵۶ء میں ان کی معزولی کے بعد تباہی و بربادی کا یہ عمل تیز تر ہو گیا۔ چنانچہ سید کمال الدین حیدر کا بیان ہے کہ

"ایک دن چیف کمشنر کپتان ہنیر صاحب بر سبیل تفریح قیصر باغ میں تشریف لائے ..... (اور) ..... متوجہ کتب خانہ سلطانی ہوئے۔ کتابوں کا انبار اور بے ترتیب (کذا) دیکھ کر بہت تاسف کیا اور مفتاح الدولہ سے سبب پوچھا۔ عرض کیا یہ حال میجر کارنیگی صاحب کی بدولت ہوا۔ ایک دن سارا کتب خانہ (جو) فرح بخش کی الماریوں میں بترتیب تھا باہر نکلوا کر پھنکوا دیا۔"[2]

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں جو تباہی و بربادی رونما ہوئی، اس پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے خود واجد علی شاہ اپنے ایک خط موسومہ منشی ظہیر الدین بلگرامی میں لکھتے ہیں کہ

"تالیفات و تصنیفاتِ عمدہ را سیلِ غارتِ باغیاں ہم چو خس و خاشاک در امواجِ تاراج چناں غرق ساختہ کہ اثرِ حرفے ازاں باقی نیست۔"[3]

نسخۂ بنارس شاہی کتب خانے کے نوادرات پر منتظمین کی بے دریغ دست درازی کے ان واقعات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس نسخے کی مدد سے چوری کے بعد کتابوں کی فروخت کے سلسلے میں اختیار کی جانے والی جس احتیاطی تدبیر کی نقاب کشائی ہوئی ہے، وہ بعض دوسرے مخطوطات کی استنادی حیثیت اور قدامت کے تعین کے لیے تحقیق کے ایک نئے طریق کار کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

---

[1] ماہنامہ "نیا دور" شمارہ اگست ۱۹۷۰ء صفحہ ۵

[2] قیصر التواریخ (جلد دوم تواریخ اودھ) صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲

[3] ظہیر الانشاء صفحہ ۶ بحوالہ ماہنامہ "نیا دور" شمارہ اگست ۱۹۷۰ء صفحہ ۵

نسخۂ محمود آباد کی طرح نسخۂ بنارس کے آخر میں بھی کوئی ترقیمہ نہیں، اس لیے ان نسخوں کی کتابت کا زمانہ نامعلوم ہے۔ ان کے ناقل میر حسن علی تجلی[1] کے لکھنؤ میں ورود و قیام اور وفات کا زمانہ بھی متعین نہیں۔ مصحفی کے "تذکرۂ ہندی" کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کے زمانے تک وہ دہلی میں مقیم تھے۔ چونکہ ان کا ترجمہ نسخۂ ندوہ میں جو اس تذکرے کا نقش اول ہے اور متعدد قرائن کی بنا پر مصنف کا اصل مسودہ معلوم ہوتا ہے، بعینہٖ بعد کے نسخے کے مطابق موجود ہے، اس لیے یہ قیاس کرنا غلط نہ ہوگا کہ تجلی اس کی تحریر کے زمانے یعنی ۱۲۰۰ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) تک لکھنؤ نہیں پہنچے تھے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں میں شاہ کمال نے جن کا تذکرہ ۱۲۱۸ھ (۱۸۰۳ء) میں تالیف ہوا ہے، ان کے متعلق یہ اطلاع فراہم کی ہے کہ

"عرصہ پنج سال می شود کہ بمکانِ میر صاحب ..... در لکھنؤ وفات یافت۔"[2]

گویا ۱۲۱۳ھ (۹۹-۱۷۹۸ء) میں ان کی وفات ہو چکی تھی۔ ان شواہد کی روشنی میں تجلی کے لکھنؤ میں ورود و قیام کے زمانے کو ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) اور ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) کے درمیان محدود کیا جا سکتا ہے۔ نسخۂ محمود آباد کی دو مثنویاں "مثنوی در جشن ہولی و کتخدائی" اور "جنگ نامہ" سنہ عیسوی کے بموجب ۱۷۹۴ء کی اور سنہ ہجری کے مطابق بالترتیب ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۰۹ھ کی تصنیف ہیں۔ اول الذکر مثنوی کی تاریخ اس کے آخر میں شامل ایک غزل کے مندرجہ ذیل شعر کے مصرع ثانی سے نکلتی ہے[3] ؎

کی فکر سالِ تاریخ، آوازِ غیب آئی
ہم نے کبھو نہ دیکھی اس رنگ کد خدائی

---

[1] تجلی کے نام کے سلسلے میں تذکرہ نگار متفق اللسان نہیں "تذکرۂ ہندی" میں ان کا ذکر محض ان کی عرفیت "میر جی" کے ساتھ کیا گیا ہے۔ بعد کے لوگوں میں بعض نے انھیں میر محمد حسین (عمدۂ منتخبہ و گلشن بیخار) میر محمد حسن (مجموعہ نغز) اور غلام علی (طبقات سخن و گلستان بیخزاں) جیسے مختلف فیہ ناموں سے یاد کیا ہے اور بعض مصنفین میر حسن (شمیم سخن و سراپائے سخن) میر محمد حسن (طور کلیم) اور میر حسین (خمخانۂ جاوید) وغیرہ ناموں سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ محسن کی زیر بحث تحریروں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل ان کا نام "میر حسن علی" تھا۔ شاہ کمال اور صاحب دستور الفصاحت بھی اسی نام کی تائید کرتے ہیں۔

[2] مجمع الانتخاب مخطوطہ انجمن ترقی اردو ہند، ورق ۱۱۰ ب۔

[3] ڈاکٹر گیان چند جین (اردو مثنوی شمالی ہند میں) اور ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی (اردو مثنوی کا ارتقا) مصرع تاریخ کے اختلافِ متن اور فرقِ املا کی بنا پر اس مثنوی کا صحیح سنہ تصنیف متعین کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ یہاں اس مصرعے کو متداول متن اور املا کے برخلاف اس کی صحیح ترین صورت میں لکھ کر اس سلسلے کے تمام اختلافات اور قیاس آرائیوں کا تصفیہ کر دیا گیا ہے۔ یہ مثنوی نواب وزیر علی خاں کی شادی کی تہنیت میں کہی گئی تھی جو سید کمال الدین حیدر کے بیان کے مطابق ۱۲۰۸ھ مطابق ۹۴-۱۷۹۳ء میں ہوئی تھی اور جس پر تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا تھا۔ تکلفات اور مصارف کے لحاظ سے یہ اس خاندان میں اپنی نوعیت کی واحد شادی تھی۔ (سوانحات سلاطین اودھ جلد اول تواریخ اودھ، ص ۱۱۲)۔ میر صاحب نے قواعد تاریخ گوئی کے برخلاف اس مصرعے میں خدائی کے ہمزہ کو الف قرار دے کر اس کا ایک عدد محسوب کیا ہے۔

دوسری مثنوی کی تاریخ "فتح نواب سے کراب دل شاد" میں "لطف" کے حرف اول یعنی "ل" کے ۳۰ عدد شامل کرکے نکالی گئی ہے۔ اس دیوان میں ان مثنویوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کی کتابت ۱۲۰۹ھ (۹۵-۱۷۹۴ء) کے بعد ہوئی ہے۔ چونکہ میر صاحب کا کوئی دیوان بھی زیادہ ضخیم نہیں اور نہ بظاہر مختلف دیوانوں کے زمانۂ کتابت میں طویل تفاوت کا کوئی امکان نظر آتا ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے کے چاروں دیوان ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) اور ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) کے مابین لکھے گئے ہونگے۔

جناب صفدر آہ نے اپنی کتاب "میر اور میریات" میں نسخۂ محمود آباد کے صفحۂ اول کی تحریر سے دوسرے مصنفین کی طرح متعدد اہم نتائج اخذ کیے ہیں، لیکن نسخۂ بنارس سے متعلق ایک مستقل عنوان کے تحت اس کے سرورق کی تحریر کو "ناقص اور ساقط از اعتبار" قرار دیتے ہوئے کسی "کم پڑھے لکھے آدمی" کی جعل سازی سے تعبیر کیا ہے[۱]۔ یہ فیصلہ اگرچہ یوں بھی غور و فکر کی سطحیت اور مبتدیانہ عجلت پسندی پر مبنی ہے لیکن شاہانِ اودھ کی مہروں کی دریافت کے بعد اس قسم کے کسی اندیشے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ تاہم بزرگ مصنف نے اپنے موقف کی تائید میں جو دلائل پیش کیے ہیں، اتمامِ بحث کے لیے ان کا تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ موصوف کے اعتراضات کا ماحصل یہ ہے۔

۱. "کاتب کوئی ذی علم آدمی نہیں معلوم ہوتا جس کا اندازہ املے (کذا) کی غلطیوں سے ہوتا ہے بمثلاً "ع" "سنویہ قصۂ جانکاہِ کربلائے حسین" پر سرخی میں "مرثیہ" کی بجائے "مرسیہ" "س" سے تحریر ہے۔" (ص ۱۷۸)

۲. "میر کے تین دیوان بلکہ دیوانِ چہارم کا بھی قلیل حصہ ان کے لکھنؤ آنے سے قبل کا ہے۔ اس اعتبار سے آصف الدولہ کے دو شکار نامے اور "مثنوی کتخدائی آصف الدولہ" اس دیوان میں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ یہ تینوں مثنویاں میر کے لکھنؤ آنے کے بعد کی ہیں۔"

۳. "سرورق کی مختصر سی عبارت میں انشاء، زبان اور واقعات کی کافی غلطیاں موجود ہیں۔ محمد محسن ایک ذی علم آدمی تھے[۲]۔ یہ تحریر ان کی قطعاً نہیں ہو سکتی۔"

۴. "اس تحریر میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ چار دیوان میر نے محمد محسن کو دیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر تجلی کے دستخط ہیں مگر زیرِ نظر مخطوطے میں تجلی کے دستخط کہیں نہیں ہیں۔"

۵. "بغلی تحریر میں تاریخ کتابت ۹۔ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ درج ہے اور یہ تحریر اسی قلم کی معلوم ہوتی ہے جس میں سرورق

---

۱۔ "میر اور میریات" ص ۱۸۰۔

۲۔ اس تحریر میں محمد محسن سے مراد محمد محسن نہیں، میر کے بھتیجے محمد محسن محسن مراد ہیں جنہیں بر بنائے غلط فہمی زیرِ بحث تحریر کا کاتب اور دیوانِ میر کے متذکرہ مخطوطات کا اولین مالک سمجھا جا رہا ہے۔

کی شکستہ تحریر ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۲۶۲ھ میں محسن کی ہڈیاں تک قبر میں گل چکی ہوں گی۔" (ص ۱۸۰)

یہ اعتراضات ایک عام قاری کو اپنی جانب متوجہ کر کے اس کی نگاہ میں مصنف کی محققانہ بصیرت کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں لیکن جو لوگ مخطوطات کے مطالعے اور تحقیق سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کو مطمئن اور متاثر نہیں کر سکتے۔ فاضل مصنف کا پہلا اعتراض ان کی اسلاف پرستی یا بزرگوں کے بارے میں غیر معمولی حسن ظن کا آئینہ دار ہے، کیونکہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ متقدمین میں شاہ حاتم سے متوسطین میں مرزا غالب تک ایسے بہت کم لوگ ملیں گے جن کی تحریروں سے املا کی دو چار غلطیوں کی مثالیں نہ پیش کی جا سکیں۔ محمود آباد کے کتب خانے میں "دیوان زادہ حاتم" کا ایک نسخہ مکتوبہ ۱۱۶۹ھ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کے قیاس کے مطابق یہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور تمام نسخوں میں قدیم ترین ہے۔[۱] اس نسخے کی ابتدا میں جو دیباچہ ہے۔ اس میں املا کی مندرجہ ذیل غلطیاں پائی جاتی ہیں:۔

۱. "محاورہ" بجائے "محاورہ" (یہ غلطی تین مقامات پر موجود ہے)

۲. "لاذم" بجائے "لازم"

۳. "کثر" بجائے "کسر"

گزشتہ سطور میں "تذکرۂ ہندی" کے نسخۂ ندوہ کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اس نسخے کے سرورق پر "مسودہ دستخطی" مرقوم ہے اس کے علاوہ حک و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ جیسے متعدد قرائن اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ یہ مصحفی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں املا کی جو فاش غلطیاں موجود ہیں، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل جملوں کے خط کشیدہ الفاظ سے کیا جا سکتا ہے۔

۱. "دیوانے زخیم ترتیب دادہ۔ در قصائد و غزل و مثنوی ماہر۔ خصوصاً مثنوی گنجفہ را بسیار بہ تلاش گفتہ ........ زبانی مرزا ذوالفقار علی.... معلوم شد کہ مشارٌ الیہ عازم لکھنؤ شدہ است۔" (میر امانی اسد)

۲. دیوان زخیم ترتیب دادہ و مثنوی لیلی مجنوں را نیز بنائے خوبے نہادہ۔" (میاں حاجی تجلی)

۳. دیوان زخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام دارد، ید بیضا نمودہ۔" (میر حسن)

رائے بھگوان داس ہندی کے تذکرے "سفینۂ ہندی" کا قلمی نسخہ مخزونہ خدا بخش لائبریری پٹنہ ہندی کے داماد رائے مکھن لال کا لکھا ہوا ہے جو ان کے بقول صغر سن سے تحصیل علوم فارسی میں مشغول رہے تھے اور فارسی میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے[۲] اس نسخے

---

۱. تحقیقی نوادر ص ۸۲۔

۲. سفینۂ ہندی ص ۹۶

سے املا کی غلطیوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ "با میرزا عبدالقادر بیدل اخلاص بسیار داشت۔ دیوانِ ضخیم ترتیب دادہ" (قمرالدین خاں آصف)

۲۔ "نسخۂ معاصرالامرأ در حالات امرا از تالیفاتِ اوست۔" (نواب صمصام الملک صارم)

۳۔ "شیخ محمد علی حزین علیہ الرحمہ طوریف طبعش می فرمود" (صدرالدین محمد خاں فائض)

میر حسن خاصے پڑھے لکھے آدمی تھے انھوں نے اپنی مثنوی "گلزار ارم" کے نام میں "گلزار" کا املا "ز" کی بجائے "ذ" سے لکھا ہے اور اس کے سات سو عدد شمار کر کے مثنوی کی تاریخ تصنیف (۱۱۹۲ھ) نکالی ہے۔ "مجموعہ نغز" کے مولف حکیم قدرت اللہ قاسم بھی جو اپنے دور کے اجلۂ اہلِ علم میں شمار کیے جاتے ہیں "گلزار" کا املا تواتر کے ساتھ "ذ" ہی سے لکھتے رہے ہیں۔

خود میر صاحب کی ایک غزل کا جو اسی دیوانِ سوم میں شامل ہے، مطلع ہے ؎

سیر کی اٹھ کے ہم نے تا صورت
ویسی دیکھی نہ ایک جا صورت

میر صاحب کے برخلاف ان کے اکثر معاصرین نے اوّل الذکر "صورت" کا املا "س" سے لکھا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔

دوسرے اعتراض کے ضمن میں جناب آہ کا یہ دعویٰ کہ "میر کے تین دیوان بلکہ دیوانِ چہارم کا بھی قلیل حصہ لکھنؤ آنے سے قبل کا ہے۔" باوجود اس کے کہ موصوف اسے منجملۂ مسلّمات قرار دیتے ہیں، محتاجِ ثبوت ہے۔ ایک شاعر کے متعدد دیوانوں میں سے کسی بھی دیوان کے مشتملات کو قطعی شواہد کے بغیر حتمی طور پر کسی خاص عہد کے ساتھ مختص نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنیادی اور اصولی نکتے سے قطع نظر "مثنوی کتخدائی آصف الدولہ" کو جسے نسخۂ بنارس میں۔۔۔۔ "در تعریف شادی کدخدائی کہ در فیض آباد اتفاق افتادہ بود" کے زیرِ عنوان نقل کیا گیا ہے، لکھنؤ کے زمانۂ قیام کی تصنیف قرار دینا صریحاً خلاف واقعہ ہے۔ آصف الدولہ کی صرف ایک ہی شادی شجاع الدولہ کی زندگی میں ۱۱ رجب ۱۱۸۳ھ/۱۰ نومبر ۱۷۶۹ء کو فیض آباد میں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کسی اور شادی کا ثبوت موجود نہیں۔ ان کی یہ شریک حیات جن کا نام شمس النساء بیگم تھا۔ قمرالدین خاں وزیر محمد شاہ کی پوتی اور انتظام الدولہ کی بیٹی تھیں اور نواب شجاع الدولہ کی دعوت پر اپنی دادی اور بھائی کی معیت میں تاریخ شادی سے چند دن قبل دہلی سے فیض آباد میں وارد ہوئی تھیں۔ قمرالدین خاں اور ان کے بھانجے رعایت خاں سے میر کے تعلق و توسل کی بنا پر یہ بعید از امکان نہیں کہ وہ بھی اس قافلے کے ہمراہ عارضی طور پر فیض آباد آئے ہوں۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ مثنوی کسی شریک قافلہ کے توسط سے ہدیۂ تبریک و تہنیت کے طور پر نواب کی خدمت میں پیش کی گئی ہو۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ متذکرہ مثنوی بظاہر کسی وقتی محرک اور ہنگامی ضرورت کے تحت ایک قدیم تر مثنوی "در

مبارکبادی کتخدائی بشن سنگھ پسر خورد راجہ ناگر مل" میں ضروری ترمیم و تصرف کرکے تیار کی گئی ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیق کے مطابق ان دونوں مثنویوں میں ۱۳ اشعار مشترک ہیں اور کچھ اشعار الفاظ کے معمولی تغیر و تبدل اور مصرعوں کی تقدیم و تاخیر کے بعد نئی مثنوی میں شامل کر لیے گئے ہیں۔ تازہ اشعار کی تعداد صرف بیس ہے[۱]۔ چونکہ آصف الدولہ کی مدح کے ایک قصیدے سے جو ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد کے مخطوطہ دیوانِ اوّل مکتوبہ ۱۱۹۲ھ (۷۸-۱۷۷۷ء) میں شامل ہے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر صاحب لکھنؤ میں ورود (۱۱۹۶ھ / ۸۲-۱۷۸۱ء) سے قبل دربار اودھ سے توسل کے لیے کوشاں تھے، اس لیے اس مثنوی کو بھی اس سلسلے کی کوششوں میں سے ایک کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک معلوم حقیقت ہے کہ میر صاحب کا تازہ کلام برابر دہلی سے لکھنؤ پہنچتا رہتا تھا۔ میر حسن نے اپنی ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے۔ یہ اشعار درج ذیل ہیں :-

دلی سے تازہ آئی تھی اک میر کی غزل ۔۔۔ جس کا یہ شعر ہوش سے بے ہوش کر چلا
یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رخِ زرد پر مرے ۔۔۔ کہتا ہے میر رنگ تو اب کچھ نکھر چلا

شکار ناموں کے بارے میں جین صاحب کا خیال ہے کہ یہ ۱۷۸۴ء یا ۱۷۸۵ء (۹۹ - ۱۱۹۸ھ) کی تصنیف ہیں۔[۲]
چونکہ دیوانِ چہارم میں ۱۲۰۹ھ (۹۴-۱۷۹۳ء) تک کا کلام شامل ہے اس لیے تیسرے دیوان میں اس سے نو، دس سال قبل کے کلام کی شمولیت پر کسی استعجاب کی گنجائش نہیں۔ مثنوی "مرغ نامہ" بھی جو اس مخطوطے میں "مثنوی کتخدائی آصف الدولہ" کے بعد نقل کی گئی ہے اور جس کا پہلا مصرع "دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے" ہے بالیقین اسی زمانے کی تصنیف ہے۔ اس امر کی مزید تصدیق کہ اس دیوان میں لکھنؤ کے زمانۂ قیام کا کلام شامل ہے، ردیف آتا کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل شعر سے بھی ہوتی ہے ؎

شفق سے ہیں در و دیوار زرد شام و سحر
ہوا ہے لکھنؤ اس رہ گذر سے پیلی بھیت[۳]

---

[۱] اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۲۴۷۔

[۲] اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۲۵۲۔

[۳] جناب صفدر آہ نے اس شعر کو سرزمین لکھنؤ کے "غیر معمولی" حسن سے اثر پذیری کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "۱۱۷۰ھ میں میر جب راجہ ناگرمل اور نجیب الدولہ کے ساتھ اودھ جا رہے تھے تو اس طرف (لکھنؤ) سے گزرے۔ اس واقعے کی یادگار ایک شعر میر کے تیسرے دیوان میں موجود ہے۔ یہ دیوان لکھنؤ کے قیام سے قبل تمام ہو چکا تھا۔ شعر یہ ہے ؎
(باقی صفحہ اگلے پر)

رضا لائبریری رام پور کے مخطوطۂ کلیات میر میں بھی یہ تمام مثنویاں دیوان سوم ہی میں شامل ہیں۔

تیسرے اعتراض کے تحت سرورق کی جس عبارت کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے وہ "میر اور میریات" میں اس صورت میں منقول ہے :

"تاریخ بستم ماہ شعبان روز جمعہ یک ہزار و دو صد و بست و پنجم ہجری در سن نود سالگی بعارضۂ تپ ...؟ .... کہ ....؟ ... وفات یافتند؛ و در اکھاڑۂ بھیم کہ جائے است مشہور در لکھنؤ نزدیک قبرستان ؟ .... برابر قبور اقربائے خود مدفون گردید۔ در روز دیگر و روز ... بست و یکم ماہ مذکور روز شنبہ وقت دو پہر بود۔ پروردگار بیامرزد و مغفرت نماید۔ آمین آمین ۱۲۔ تحریر ہذا بست و ہفتم .... روز جمعہ چہار گھڑی ؟.... روز باقی ماندہ۔

تحریر محمد محسن عفی عنہ

ہر چہار دیوان خود را ایں دیوان سوم ہم از انجملہ است میر صاحب مرحوم بمن محرر .... و رضائے خود بخشیدند و ہر چہار دیوان دستخطی بمیر حسن علی تجلی تخلص داماد مرحوم و شاعر شیریں کلام بودند۔"

المحرر محمد محسن عفی عنہ (ص ۱۷۹)

محسن کی تحریر کی اس مسخ شدہ نقل کا اصل سے مقابلہ کرنے کے بعد بہ یک نظر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انشا، زبان اور واقعات کی جو غلطیاں اس عبارت کے کاتب سے منسوب کی گئی ہیں۔ ان کا ذمہ دار خود فاضل معترض کا عجزِ فہم اور قصورِ نظر ہے۔

سرورق کی تحریر کے جعلی اور مخطوطے کے غیر معتبر ہونے کے ثبوت میں چوتھی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ محسن کے بیان کے برخلاف اس نسخے پر کسی جگہ تجلی کے دستخط نہیں۔ یہ دلیل بھی دوسرے تمام دلائل اور اعتراضات کی طرح بالکل لایعنی

---

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

شفق سے ہیں در و دیوار زرد شام و سحر
ہوا ہے لکھنؤ اس رہ گزر میں پیلی بھیت

"رہگزر" کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ شعر بحالت سفر کہا گیا ہے " (ص ۱۰۶) فاضل مصنف کی یہ نکتہ رسی بھی ان کی بصیرت کا علمی شاہکار کہی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موصوف نے یا ان کے کسی پیش رو نے مصرع ثانی میں لفظ "سے" کو "میں" سے بدل کر اس شعر کو جہلات میں شامل کر دیا ہے۔ میر کا مفہوم لفظ "سے" ہی سے واضح ہوتا ہے۔ جناب آہ کے قول کے برخلاف انھوں نے اس شعر میں لکھنؤ کے حسن کا نہیں، گزرگاہوں سے اٹھتے ہوئے اس طوفانِ گرد و غبار کا ذکر کیا ہے جو در و دیوار کو شفق رنگ بنا دیتا ہے۔ شام و سحر کی تخصیص کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ دھول عام طور پر گرمی کے موسم میں زیادہ اڑتی ہے اور ان دنوں میں سڑکوں پر چہل پہل بالعموم صبح اور شام کے اوقات میں زیادہ ہوتی ہے۔

ہے اور بزرگ محقق کی قلت معلومات پر دلالت کرتی ہے۔ "دستخطی میر حسن علی تجلی" کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ یہ دیوان تجلی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ لفظ "دستخط" کے اس مفہوم میں استعمال کی مثالیں بہت عام ہیں، ان میں سے چند بطور سند یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ "تمام شد بتاریخ غرہ جمادی الاول ۱۱۹۷ھ .... بدستخط احقر العباد فیض اللہ خان بہادر ظفر جنگ غفرلہ ولوالدیہ تحریر یافت۔" (ترقیمہ دیوان تجلی مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو)

۲۔ "تمت بعون الملک الوہاب بدستخط ذوالفقار علی باتمام رسید۔" (ترقیمہ کلیات میر، مخزونہ کتب خانہ آصفیہ)

۳۔ "تمام شد مثنوی نواب محمد خاں .... بدستخط حقیر پر تقصیر لالہ ٹیکارام ولد ڈال چند مرحوم۔"
(ترقیمہ مثنوی "اسرار محبت" مخزونہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، پاکستان)

۴۔ "کتاب قصہ لیلی مجنوں من تصنیف تجلی بتاریخ بست و ششم روز پنجشنبہ ماہ جمادی الثانی ۳۱ جلوس اکبر شاہ در دستخط بندہ رام کشن تحریر یافت۔"
(ترقیمہ مثنوی "لیلی مجنوں" مخزونہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان)

۵۔ "فہرست حاضری ہائے کہ سرکار ذوی الاقتدار میاں فوجدار محمد خاں بہادر .... بدستخط خاص خود تحریر فرمود۔"
(سرنامہ فہرست موجودات مخزونہ مولانا آزاد سنٹرل لائبریری، بھوپال)

رائے بندرابن داس خوشگو علامہ عصر خان آرزو کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ ان کا تذکرہ "سفینۂ خوشگو" آرزو کے زیر اصلاح اور علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کے پیش نظر رہ چکا ہے۔ اس تذکرے میں لفظ "دستخط" متعدد مقامات پر اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:۔

۱۔ "بیاضے بدستخط خود از اشعار غزلیات انتخاب فرمودہ نوشتہ واں را بہ فقیر عنایت فرمودہ۔" (ترجمہ بیدل ص ۱۲۵)

۲۔ "بیاض بدستخط خود ش پیش لالہ ٹھاکرداس بندہ تخلص .... دیدہ بودم (ترجمہ زاہد علی خاں سخن ص ۱۹۳، ۱۹۴)

۳۔ "ہرگاہ بخانہ و میرزا سے مغفور (بیدل) تشریف می آورد .... کتب و سفائن دستخط میرزا با خود می برد۔" (قمر الدین خاں نظام الملک، ص ۲۵۲)

۴۔ "ایں دو بیت روز مشاعرہ بدستخط خود در سفینۂ فقیر نوشتہ۔" (ابو الفیض محبت ص ۲۸۱)

۵۔ "وقتے فقیر از احوال ایشاں دریافت، ایں چند سطر بدستخط خود نوشتہ عنایت فرمود۔" (مرزا مظہر ص ۳۰۲)

نسخۂ بنارس کے استناد و اعتبار کے خلاف جناب آہ کی آخری دلیل بغلی تحریر پر مبنی ہے جسے موصوف نے محسن کی تحریر کی تاریخ کتابت قرار دیا ہے۔ یہ دراصل کتب خانے کے کسی تحویل دار یا منتظم کا نوٹ ہے جو اس نے ۹ ربیع الاول

۱۲۶۲ھ کو درج فہرست کتابوں کے جائزے کے وقت بطور یادداشت تحریر کیا ہے۔ محسن کی لکھی ہوئی عبارت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انھوں نے اپنی تحریر کے پہلے جز کے آخری جملے میں واضح طور پر اس کی تاریخ کتابت ۲۷ شعبان سنہ الیہ (۱۲۲۵ھ) روز جمعہ بتائی ہے۔ کتب خانۂ شاہان اودھ کی فہرست میں دیوانِ سوم کے اس نسخے کا نمبر اندراج ۳۲۵ تھا۔ نسخۂ محمود آباد کے صفحۂ اوّل کے عکس کے مطابق اس کا سلسلہ نمبر ۹۶۸ ہے۔ چنانچہ اس کے صفحۂ اوّل پر جائزے کا نوٹ ایک دن بعد یعنی ۱۰ ربیع الاوّل ۱۲۲۶ھ کو لکھا گیا ہے۔ دیوان افسردہ کے ایک قلمی نسخے پر بھی جو محمود آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ نصیر الدین حیدر، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہروں کے پہلو بہ پہلو ۹ ربیع الاوّل ۱۲۶۲ھ کی ایسی ہی تحریر موجود ہے۔ ان متواتر تحریروں سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس زمانے میں شاہی کتب خانے کے جائزے کا سلسلہ جاری تھا۔ نسخۂ بنارس کی اس سلسلے سے وابستگی اس کے اعتبار کا ایک اور حتمی ثبوت ہے۔

نسخۂ بنارس میں اگرچہ املا کی بعض ایسی غلطیاں تواتر کے ساتھ موجود ہیں جن کی کوئی معقول توجیہہ نہیں کی جاسکتی تاہم اب تک دیوان سوم کے جتنے قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں اس نسخے کا متن کئی لحاظ سے زیادہ معتبر اور قابلِ ترجیح ہے۔ عام طور پر اس دیوان میں غزلیات کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۸۳۳ بتائی گئی ہے[1] فی الوقت تصدیق و تقابل کے لیے کوئی دوسرا قلمی نسخہ یا مطبوعہ ایڈیشن پیش نظر نہیں لیکن مطبع نول کشور کی اشاعت پنجم مطبوعہ دسمبر ۱۹۱۹ء اس تعداد کی مؤید ہے۔ نسخۂ بنارس میں جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے غزلوں کے اشعار کی کل تعداد ۱۸۳۸ ہے۔ پانچ مختلف غزلوں کے پانچ زاید اشعار جو نسخۂ نول کشور میں موجود نہیں، اس نسخے سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

(ردیف الرا، غزل نمبر ا، شعر نمبر ۸)

جرم نبودہ دل سے اس کے کبھو نہ نکلا

اس بدگماں نے مارا آخر مجھے گماں پر

(ایضاً ردیف الرا، غزل نمبر ۹، شعر نمبر ۲)

کن دانتوں کے حضور کرہجر کیا ہے وا

جمہور دانت پیسے ہے گوہر فروش پر

(ردیف النون، غزل نمبر ۶، شعر نمبر ۶)

بے کسی، تنہائی شاید انتہا رکھتی نہیں     کب تلک بے دل رہیں، تا چند بے دلبر رہیں

---

[1] میر اور میریات ص ۲۰۴

(ایضاً ردیف النون، غزل نمبر ۱۴۱، شعر نمبر ۵)

وو راس غیرت خورشید سے بے تاب و تواں

ہم سیہ روز بھی دن اپنے کو شب کرتے ہیں

(ردیف الیاء، غزل نمبر ۲۴۴، شعر نمبر ۱)

گئیں پیشانیاں سجدہ ہی کرتے کرتے سب لیکن

سرحرف آج تک کچھ وا نہیں ان مہ جبینوں سے

مثنویات کے ذیل میں اس نسخے میں شکار ناموں کی تعداد تین ہے۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ان تین شکار ناموں کو ایک مثنوی قرار دیا ہے[1]۔ جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین، جناب صفدر آہ اور دوسرے متعدد مصنفین پہلے دو شکار ناموں کو اصلاً ایک ہی شکار نامے کے دو اجزا شمار کرتے ہوئے انہیں دو مثنویاں مانتے ہیں[2]۔ جین صاحب نے دوسرے شکار نامے کے متداول عنوان "باز قدم رنجہ فرمودن آصف الدولہ روز دیگر برائے شکار" اور مصرع اول "چلا پھر ہے نواب گردوں شکار" میں "باز" اور "پھر" کو سلسلۂ سخن کے تسلسل کی علامت سے تعبیر کیا ہے۔ نسخۂ بنارس میں اس مثنوی کے سرعنوان جین صاحب کی نقل کردہ عبارت کی بجائے "شکار نامۂ دیگر" مرقوم ہے اور اگلی نظم کو واضح طور پر "شکار نامہ سیوم" لکھا گیا ہے۔ اس لیے انہیں علاحدہ علاحدہ مثنویاں قرار دینا ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ "ذکر میر" میں خود میر صاحب نے ان شکار ناموں کے بارے میں یہ اطلاعات فراہم کی ہیں :-

"بندگان عالی برائے شکار تا بہرایچ رفتند، من در رکاب بودم، شکار نامہ موزوں کردم۔ بارے دیگر باز برائے شکار سوار شدند تا دامنِ کوہِ شمالی تشریف بردند .... بعد از سہ ماہ بدار القرارِ خود آمدند۔ فقیر شکار نامۂ دیگر گفتہ بحضور خواند۔ دو غزل از غزل ہائے شکار نامہ انتخاب زدہ خود بدولت مخمس کردند.... در زمینِ غزلِ پسند افتادہ غزلِ دیگر فرمائش نمودند، آں ہم از فضلِ الٰہی گفتہ شد۔ زبانِ مبارک بہ تحسین کشادند و دادِ سخنوری دادند[3]"

اس عبارت میں اگر ایک طرف دوسرے سفر کے ذکر میں "بارے دیگر" اور "باز" جیسے الفاظ کی موجودگی مصرع اول کے

---

[1] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری ص ۴۱۴۔

[2] اردو مثنوی۔ شمالی ہند میں ص ۲۰۳ ۔ میر اور میریات ص ۲۰۷

[3] ذکر میر طبع اول ص ۱۴۷۔

لفظ "پھر" پر مبنی قیاس کی تردید کرتی ہے تو دوسری طرف مبینہ "شکار نامہ دیگر" سے نسخۂ بنارس میں دوسرے شکار نامے کے عنوان کی مطابقت دونوں کے ظاہری تعلق اور معنوی وحدت کی آئینہ دار ہے۔ مختلف مقامات سے انتخاب کیے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار بھی اس شکار نامے کے "سفر تا دامن کوہ" سے تعلق کی نشان دہی کرتے ہیں :۔

پلنگوں نے کہسار سے راہ لی     نہنگوں نے دریا کی جا تھاہ لی
کوئی ڈھونڈتا ہے بیاباں میں جھاڑ     کوئی چاہے ہے پھاند جاؤں پہاڑ

---

نشیب و فراز بیاباں کو سن     جو ذی ہوش ہیں وے تو ہوتے ہیں سن
چڑھو آسماں پر جو آئے چڑھاؤ     پھر اترو تو تحت الثریٰ ہی کو جاؤ

جو اس میں کہیں ہووے لغزش تو خیر
کہ درپیش ہے اور عالم کی سیر

---

ہوا خیمہ گر دامنِ کوہ سب     رہا آکے نوّاب واں تین شب
قریب ایک مٹیا پہاڑی تھی واں     لگا اس سے کم کم تھا آبِ رواں
محاذی تھا اس کوہ کے ایک دشت     کہ دشوار تھا اس میں آدم کا گشت

"ذکر میر" کی منقولہ بالا عبارت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے اس شکار نامے کی دو غزلیں انتخاب کرکے ان کی تخمیس کی تھی اور پسندیدہ غزلوں میں سے ایک غزل کی زمین میں تازہ غزل کہنے کی فرمائش کی تھی جس کی تعمیل کی گئی۔ کلیات آصف مخزونہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کے مطابق یہ دونوں غزلیں اسی "شکار نامہ دیگر" سے متعلق ہیں اور ان مطلعوں سے شروع ہوتی ہیں ؎

نہیں خوں بستگی سے چشم تر بند     جراحت نے کیے ہیں میتے سر بند

---

جگر خوں کن ہیں خوبانِ حنا بند     دل ان کے دستِ رنگیں کا ہے پابند

فرمائشی غزل پہلی غزل کی زمین میں کہی گئی ہے اور اسی دیوان سوم میں شامل ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

زمیں پر میں جو پھینکا خط کو کر بند
بہت تڑپا کیا جوں مرغِ پر بند!

ان قطعی اور حتمی دلائل کی بنیاد پر پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ پہلے اور دوسرے شکار نامے کے درمیان صنفی وحدت کے سوا کوئی معنوی ربط یا واقعاتی تسلسل موجود نہیں۔ اس طرح یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تینوں شکار نامے بجائے خود تین مکمل مثنویاں ہیں۔

تیسرا شکار نامہ آصف الدولہ کی تعریف کے ساتھ ان اشعار پر ختم ہوتا ہے ؎

سراپائے احساں، تمامی ہمم — ہمہ تن مروت، سراسر کرم
ہمیشہ رہے گرم سیر و شکار — یہ حرف و حکایت بھی ہے یادگار
قفائے غزل اک رباعی کہو — سخن آگے موقوف، چپکے رہو
بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس — کہ اللہ بس اور باقی ہوس
جواہر تو کیا کیا دکھایا گیا — خریدار لیکن نہ پایا گیا
متاعِ ہنر پھیر لے کر چلو — بہت لکھنؤ میں رہے گھر چلو

اصولاً اس سلسلۂ کلام کو

بہت کچھ کہا ہے کرو میرؔ بس
کہ اللہ بس اور باقی ہوس

پر ختم ہو جانا چاہیئے۔ اس شعر کے بعد اس غزل اور رباعی کے علاوہ جس کی طرف ماقبل کے مصرعے "قفائے غزل اک رباعی کہو" میں اشارہ کیا گیا ہے، مزید اشعار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس امر سے قطعِ نظر آخری دو شعر نہ تو پچھلے اشعار سے معنوی طور پر مربوط ہیں اور نہ مثنوی کی مجموعی فضا سے میل کھاتے ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند جین نے ان اشعار کی مثنوی میں شمولیت پر اظہارِ حیرت کرتے ہوئے انھیں میرؔ کی جسارت اور احساسِ ناقدری کے ردِعمل سے تعبیر کیا ہے[۱۶] اس کے برخلاف صفدر آہ صاحب انہیں پورے یقین اور قطعیت کے ساتھ الحاقی قرار دیتے ہیں[۱۷]۔ ہمارے نزدیک نسخۂ بنارس میں ان شعروں کی موجودگی ان کے کلامِ میرؔ ہونے کا ایک حتمی ثبوت ہے۔ چونکہ منقولہ بالا اشعار سے قبل کے دو شعروں میں میر صاحب نے فردوسیؔ کی شاہنامہ گوئی اور دربارِ شاہجہانی کے ملک الشعرا، ابو طالب کلیمؔ کے "شاہجہان نامہ" کا حوالہ دیتے ہوئے بقائے نام کی خاطر اپنے آصف الدولہ "صید نامے" تصنیف کرنے کی بات کہی ہے اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی اس کم و بیش

---

۱۶ اردو مثنوی شمالی ہند میں ص ۲۵۳ و ۲۵۴

۱۷ میر اور میریات ص ۱۴۱

فکر کے صلے میں اپنے ممدوح سے کسی غیر معمولی انعام و اکرام یا قدر افزائی کے متمنی ہوں اور ان توقعات کے پورا نہ ہونے کی بنا پر بعد میں کسی وقت جذبات کی رو میں یہ دو اشعار کہہ کر اس نظم کے آخر میں شامل کر دیے ہوں۔

دیوان میر کے متن کی بعض اہم ترمیمیں:

۱۔ شعر :-
چاہیے وہ کہے سو کہے رکھیے
ہر سخن میر کا کتاب ہے میاں

اصلاح:- مصرع اول میں لفظ "رکھیے" قلمزد کر کے اس کے برابر "رکھیں" لکھ دیا گیا ہے۔

۲۔ شعر :-
آگ غیرت سے قفس کو دوں چاروں اور سے
ایک دو گل برگ جب باد صبا لاتی ہے میاں

اصلاح:- مصرع ثانی میں لفظ "صبا" پر "لا، لا" لکھ کر اس کے مقابل لفظ "سحر" لکھا گیا ہے۔

۳ شعر :-
جب یاد آگئے ہیں پائے حنائی اس کے
افسوس تب سے اپنے ہم ہاتھ ہی ملے ہیں

اصلاح:- مصرع ثانی میں "تب سے" کو حک کر کے "سے تب" بنا دیا گیا ہے۔

۴۔ شعر :-
جیسے بجلی کے چمکنے سے کسو کی سدھ جائے
بیخودی آئی اچانک تیرے آجانے میں

اصلاح:- مصرع ثانی میں لفظ "اچانک" کو قلم زد کیے بغیر اس کے اوپر لفظ "یکایک" لکھ دیا گیا ہے۔

۵۔ شعر :-
مصرع کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

اصلاح:- شعر کے کسی حصے پر کوئی نشان لگائے بغیر حاشیے پر "کوئی کوئی کبھو" لکھا گیا ہے جو مصرع اول کے "کبھو کبھو کوئی" کا متبادل ہے۔

میر صاحب کے مرثیے عام طور پر ان کے کلیات و دواوین کے قلمی نسخوں میں شامل نہیں۔ ڈاکٹر شیخ الزماں مرحوم نے اکتوبر ۱۹۵۱ء میں "مراثی میر" کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا۔ اس کے ۲۷ مرثیے اور اسلام پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتب خانے کے قلمی کلیات سے اور دو مرثیے کلیات میر مخزونہ رضا لائبریری رام پور سے لیے گئے ہیں۔ کلیات کے ان دونوں نسخوں میں سات مرثیے مشترک ہیں۔ نسخہ بنارس کا پہلا مرثیہ ۱۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ "مراثی میر" میں اس مرثیے میں کل ۱۶ بند ہیں۔ مندرجہ ذیل پندرہواں بند اس مجموعے میں شامل نہیں:-

فلک حال پر تیرے روتے ہیں آہ     کہاں ہوں گے یہ دیدۂ مہر و ماہ
جہاں اس کی آنکھوں میں ہو گا سیاہ     کرے سوچتا تو تو بہتر ہے کل

مخطوطہ بنارس میں دوسرے مرثیے کے بندوں کی تعداد ۳۴ ہے "مراثی میر" میں صرف تیس بند نقل ہوئے ہیں۔ باقی چار بند یہ ہیں:۔

(چودھواں بند)

حسین ہی کا جگر تھا کہ یہ جفائیں سہیں     بھتیجے، بھائی، پسر، خولیش ان میں کوئی نہیں
کروڑوں اس کی تمنائیں جی کی جی میں رہیں     ہزار و نہ صد و پنجاہ زخم کھائے حسین

(بیسواں بند)

رسن سے ہاتھ بندھے ناتواں کے، روتا ہے     ہمارے شور و بکا سے حواس کھوتا ہے
سکینہ کہتی ہے "بابا" تو داغ ہوتا ہے     کہاں حسین جو اس کو گلے لگائے حسین

(بائیسواں بند)

کوئی کہے تھی کہ احوال اب بہت ہے تباہ     کہاں وہ کوکبہ، کیا حشم، کدھر وہ سپاہ
جہاں ہے آنکھوں میں اپنی بغیر اس کے سیاہ     کوئی طرح ہو کہ منہ ٹک ہمیں دکھائے حسین

(ستائیسواں بند)

کوئی کہے تھی کہ رکھتا نہ تھا حسین نظیر     برابری نہ کوئی کر سکے گا اس کی امیر
دل اس سے لاگ رکھیں، جانیں ہیں اسی کی اسیر     جہاں ہو قتل تو ہو وے نہ خوں بہائے حسین

نسخۂ بنارس میں مطبع نول کشور کی اشاعت پنجم اور "مراثی میر" سے اختلاف متن کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض اختلافات اہم ہیں اور بعض ناقابلِ لحاظ۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس لیے نمونے کے طور پر صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:۔

کب تلک کوئی جیسے صورت ہے
آوے پیار سے بنا بنا صورت     (نسخۂ نول کشور)

کب تلک کوئی جیسے صورت بانہ
آوے پیار سے بنا بنا صورت

(مخطوطۂ بنارس)

۲۔ بہت ہے تن دور پر زرد زرد — اٹھے گی مری خاک سے گرد زرد
(نسخہ نول کشور)

بہت ہے تن درد پر ورد زرد — اٹھے گی مری خاک سے گرد زرد
(مخطوطہ بنارس)

۳۔ پھر امت میر (سر) اپنا گراں گوشوں کی مجلس میں — سنے کوئی تو کچھ کہیے بھی، اس کہنے کا کیا حاصل
(نسخہ نول کشور)

پھر امت میر سر اپنا گراں گوشوں کی صحبت میں — سنے کوئی تو کچھ کہیے بھی، ایسے کہنے کا حاصل؛
(مخطوطہ بنارس)

۴ وہ نہیں جو تیغ سے اس کی گلا کٹوایئے — تنگ آئے ہیں بہت اب آپ ہی جو مر رہیں
(نسخہ نول کشور)

وہ نہیں جو تیغ سے اس کی گلا کٹوایئے — تنگ آئے ہیں بہت اب آپ ہی جو ہر کر رہیں
(مخطوطہ بنارس)

۵ مندیں حسین کی آنکھیں، کہا بلا آئی — تمام فوج مخالف کی اس طرح دھائی
(مراثی میر)

مندیں حسین کی آنکھیں کہاں، بلا آئی — تمام فوج مخالف کی اس طرف دھائی
(مخطوطہ بنارس)

۶ کبھی کہے تھی، زمانہ الٹ گیا اک بار — نہ اس چمن میں رہے کچھ نہال نے تھے خار
(مراثی میر)

کوئی کہے تھی زمانہ الٹ گیا یک بار — نہ اس چمن میں رہے کچھ نہال نے اشجار
(مخطوطہ بنارس)

لفظی اختلافات کے پہلو بہ پہلو اشعار کی سلسلہ وار ترتیب میں فرق کی مثالیں بھی جا بجا موجود ہیں۔ مثلاً ردیف النون کی اکتالیسویں غزل نسخہ نول کشور میں چھ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں سے آخری تین شعر اس نسخے میں اس طرح نقل کیے گئے ہیں۔

تم کبھو میر کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمہیں — اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

ہوں بیحال اس مجوبہ عالم کے لیے (کذا) — حال سُن سُن کے مرا لوگ عجب کرتے ہیں

میرؔ سے بحث یہ تھی کچھ جو نہ تھے حرف شناس
اب سخن کرتے ہیں کوئی تو غضب کرتے ہیں

نسخۂ بنارس میں اس غزل کے اشعار کی تعداد سات ہے۔ پانچواں شعر جو اس سے قبل بھی نقل کیا جا چکا ہے، نسخۂ نول کشور میں موجود نہیں۔ تجلیؔ نے ان اشعار کو اس صورت میں نقل کیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| ہوں جو بے حال اس اعجوبۂ عالم کے لیے | حال اس سن کے مرا لوگ عجب کرتے ہیں |
| دور اس غیرت خورشید سے بے تاب و تواں | ہم سیہ روز بھی دن اپنے کو شب کرتے ہیں |
| مہر سے بحث بھی تھی کچھ جو نہ تھے حرف شناس | اب سخن کرتے ہیں کوئی تو غضب کرتے ہیں |

تم کہو میرؔ کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمہیں
اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

نسخۂ بنارس میں بعض اشعار میں ان کی ابتدائی کتابت کے بعد اصلاحیں کی گئی ہیں۔ یہ اصلاحیں تصحیح اور تغییر دونوں صورتوں کی حامل ہیں اور ان کا خط تجلیؔ اور محسن دونوں کے انداز تحریر سے مختلف ہے۔ چونکہ تجلیؔ کے لکھے ہوئے ان چاروں دیوانوں کے مرزا محسن کی ملکیت میں آنے سے قبل میرؔ صاحب کے پاس رہنے کا واضح ثبوت موجود ہے اس لیے بجا طور پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ اصلاحات خود میرؔ صاحب نے اپنے قلم سے کی ہیں۔ یہاں ان میں سے صرف دو کی تفصیلات پیش کی جاتی ہیں۔

ورق ۲ اب کی پہلی دو سطروں میں ردیف الف کی ایک غزل کا مقطع پہلے ناتمام صورت میں اس طرح لکھا گیا تھا۔

کام اوستے ایک طور پہ لیتے
حیف ہے میرؔ سپہر دوں نے ہم سے اس کو نہ یاد رکھا

بعد کے مرحلے میں "پہ" اور "لیتے" کے درمیان "ہم" کا اضافہ کر کے "لیتے" کو "لیں" بنایا گیا ہے اور ناتمام مصرعے کو مکمل کر کے اس طرح شعر کی تکمیل کر دی گئی ہے ؎

کام اوستے ایک طور پہ ہم لیں، بیطور اس کو ہونے ندیں
حیف ہے میرؔ سپہر دوں نے ہم سے اس کو نہ یاد رکھا

ورق ۱۰۸ ب پر دوسرے شکار نامے کی اٹھارہویں بیت کے مصرع ثانی کی ابتدائی شکل یہ تھی ؎

بن آئی ہے مر رہیں ہیں نمر

یہاں اولاً "مر" اور "رہیں" کے درمیان ایک اور "مر" کا اضافہ کر کے مصرع کی ناموزونیت دور کی گئی ہے، بعد ازاں ابتدائی الفاظ کو نشان زد کر کے حاشیے پر اس صورت میں مکمل مصرع لکھ دیا گیا ہے ع

بن آئے ہی مر مر رہیں ہیں نر

گزشتہ سطور میں فراہم کردہ تفصیلات سے نسخۂ بنارس کے امتیاز و اختصاص اور قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کلام میرؔ کی تدوین کے سلسلے میں اب تک اس نسخے کی طرف رجوع نہیں کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ آئندہ اس کو مناسب اہمیت دی جائے۔ اس کے علاوہ اس نسخے کی بعض داخلی و خارجی کیفیات دیوانِ اول و دوم کے گم شدہ مخطوطات کی بازیافت میں بھی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

---

# میر کا دیوان چہارم (نسخۂ محمود آباد)

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

خدائے سخن میر تقی میر کو مرے ہوئے پونے دو سو سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اس طویل مدت میں کسی صاحب ذوق کو صحیح ڈھنگ سے کلیات میر ایڈٹ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ آفرین صد آفرین لارڈ منٹو گورنر جنرل پر جنہوں نے پہلی مرتبہ کلیات میر ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں میر کے انتقال کے بعد ہی ٹائپ نستعلیق میں شائع کر کے اردو ادب پر گراں بار احسان کیا۔ سہولت کے لیے ہم اسے نسخۂ کلکتہ کہتے ہیں۔ یہ میر کا نقش اول تھا۔ اور اس میں میر کا پورا کلام شائع نہیں ہوا ہے۔ جو خامیاں اس میں رہ گئی تھیں ان کا اعادہ نسخۂ نولکشوری مطبوعہ ۱۸۶۸ء اور اس کے بعد کے ایڈیشنوں میں بھی ہوا ہے۔ نسخۂ کلکتہ اور نسخۂ نولکشوری اب نایاب ہیں۔ مولانا آسی کا مرتب کیا ہوا کلیات میر مطبوعہ مطبع نولکشور ۱۹۴۱ء بھی اب ناپید ہے۔ جو غلطیاں اس سے پہلے کے نسخوں میں ملتی ہیں وہ اس میں بھی موجود ہیں۔ جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ڈی لٹ ڈگری کے لیے کلیات میر (نسخۂ بریلوی) ۱۹۵۸ء میں مرتب کر کے شائع کیا۔ موصوف فرماتے ہیں:۔

"میں نے کلیات میر کے اس نسخے کی ترتیب و تدوین میں ان تمام مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھا ہے۔ اور ان کے علاوہ کلام میر کے تقریباً تمام اہم غیر مطبوعہ نسخوں کو بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ کتب خانہ ریاست رام پور، کتب خانہ سالار جنگ، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اور کتب خانہ محمود آباد کے مخطوطے خاص طور پر میرے پیش نظر رہے ہیں۔ اسی لیے یہ نسخہ اس سے قبل شائع ہونے والے نسخوں سے مختلف ہے۔ اس میں میر صاحب کا تقریباً سارا کلام موجود ہے۔ میں نے کوشش یہی کی ہے کہ میر صاحب کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کلام نئی ترتیب اور صحت کے ساتھ اس میں یکجا ہو جائے"[1]

ڈاکٹر صاحب کے اس دعوے کے باوجود راقم کو ان کے مرتب کردہ کلیات میر میں سب سے زیادہ غلطیاں نظر آئی ہیں۔ اس میں ۳۳ اشعار کی تکرار پائی جاتی ہے۔ یہ تکرار دراصل نسخۂ کلکتہ کے مرتبین کی غفلت کا نتیجہ ہے اور یہ تکرار سبھی مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے۔ ذیل میں نسخۂ بریلوی کی چند غلطیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

---

[1] مقدمہ کلیات میر ص ۳، مطبوعہ ادبی دنیا کراچی ۱۹۵۸ء

صفحہ ۱۶۰ — ہو گیا دل مرا تبرک جب درد نے قطعۂ پیام کیا۔

دوسرے مصرعے میں "نے" کے بجائے "میں" صحیح ہے۔

صفحہ ۲۸۴ — قفس میں میر نہیں جوشش داغ سینے میں
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم میں

صحیح شعر — قفس میں میر نہیں جوشش داغ سینے پر
ہوس نکالی ہے ہم نے بھی گل کے موسم کی

صفحہ ۳۳۹ — اب گریباں کہاں کہ اسے ناصح چڑھ گیا ہاتھ اس دوانے کے
چشم نجم سپہر جھپکی ہے صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

دونوں شعر یوں درست ہیں —

اب گریباں کہاں کہ اسے ناصح چڑھ گیا ہاتھ مجھ دوانے کے
چشم انجم سپہر جھپکی ہے صدقے اس انکھڑیاں لڑانے کے

صفحہ ۴۴۱ — قصہ تمام میر کا شب کو سنا کیا بے درد سر بھی صبح تلک سر دھنا کیا
مل چشم بھی نگہ نے دھتورا دیا مجھے جس پر نہ چھوڑا دل کو میں تنکے چنا کیا

دوسرا شعر یوں ہونا چاہیے تھا —

مل چشم سے نگہ نے دھتورا دیا مجھے
خس بھر نہ چھوڑا دل کو میں تنکے چنا کیا

کلیات میر کی غلطیوں کی بنا پر مولانا عرشی مرحوم نے سالہا سال پہلے اساتذۂ اردو کو بے لوث مشورہ دیا تھا۔ فرماتے تھے:

"دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس کے اساتذہ کا کلام نظم و نثر اپنی صحیح ترین شکل میں شائع نہ ہو چکا ہو۔ اردو باوجود ترقی یافتہ ہونے کے اس معاملے میں بڑی بدنصیب ہے۔ اس کے دلدادہ اپنی آنکھوں کی خاطر تو دو چار خوبصورت کتابیں چھاپ چکے ہیں۔ لیکن خود زبان کی صحیح شکل کی بقا کے لیے کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔ علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ اور الہ آباد کے اردو شعبے بڑے دیدہ ور اساتذہ کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ اگر وہ ادھر توجہ کریں تو چند سال کے اندر میر اور سودا جیسے اساتذہ کا کلام خوب اور خوب تر نہیں بلکہ خوب ترین صورت میں ارباب علم کے ہاتھوں پہنچ سکتا ہے۔ کیا اچھا ہو اگر ان مرکزوں کے اساتذہ مل کر ایک جامع اسکیم

تیار کریں اور پھر تقسیم کار کر کے اپنے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے طلبا سے ایک ایک دیوان ایڈٹ کرا کے حکومت ہند کی مدد سے چھاپ دیں۔" [۱]

راقم کی اطلاع کے مطابق ریاست محمود آباد کے مہاراجکمار محمد امیر حیدر خان صاحب آج سے ۴۲ سال پہلے کلیاتِ میر مرتب کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اچھا خاصا کام بھی کیا تھا، کلیات کا جو نسخہ وہ مرتب کر کے شائع کرنا چاہتے تھے۔ اس میں میر کا بہت سا غیر مطبوعہ کلام بھی شامل تھا۔ اس میں غزلوں کی تعداد ۲۴۳۵ تھی جبکہ مطبوعہ نسخوں میں صرف ۱۸۱۸ غزلیں ہیں [۲] افسوس ہے کہ کلیات کا یہ نسخہ شائع نہ ہو سکا۔ اگر چھپ گیا ہوتا تو ایک مستند نسخہ مع غیر مطبوعہ کلام منظرِ عام پر آ گیا ہوتا۔ اس کے بارے میں مرزا محمد عسکری (مترجم تاریخ ادب اردو) اور بیخود موہانی کی کچھ تحریریں دستیاب ہوئی ہیں جو انھوں نے مہاراجکمار صاحب کو ارسال کی تھیں۔ یہ تحریریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

۵ جولائی ۱۹۳۹ء

حضور والا۔ آداب عرض

کل میں نے جو عریضہ بھیجا تھا۔ اس کی غرض یہ تھی کہ آپ مجھ کو طلب فرما دیں۔ کیونکہ کلیات میرؔ کے متعلق کچھ ضروری باتیں عرض کرنا تھیں۔ افسوس ہے گاڑی نہیں آئی۔ اس کا انتظار سہ پہر کو بہت کیا۔ اس طرف کوئی ٹیکسی نہیں ملتی ورنہ میں ضرور حاضر ہوتا۔ اور گاڑی منگانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ بہر حال آج ۵ بجے سہ پہر کو ضرور موٹر بھیجنے کا حکم فرما دیجئے۔ میں منتظر رہوں گا۔

خادم، محمد عسکری عفی عنہ

عبد العزیز روڈ لکھنؤ

۴ مارچ

حضور والا۔

آداب عرض ہے۔ میں تین مہینے سے سخت بیمار ہوں۔ اب صاحب فراش ہو گیا ہوں۔ گزارش ہے کہ اب کی دفعہ جب لکھنؤ تشریف لائیے تو قدم رنجہ فرمائیے تاکہ کلیات میرؔ کے متعلق جو خطوط اور رائیں آئی ہیں اور میرے پاس موجود ہیں میں ان کو حوالہ کر دوں۔ آپ جیسا تجویز فرمائیں گے اس پر عمل درآمد ہوگا

---

[۱] میر نمبر دہلی کالج میگزین ص ۳۸۰۔

[۲] کلیات میر ص ۱۰۱ مطبوعہ علمی مجلس دلی ۱۹۶۷ء

ضرور توجہ فرمائیے گا

دعاگو

محمد عسکری عفی عنہ

حکیم عبدالعزیز روڈ لکھنؤ

۷ مئی ۱۹۴۰ء

دامت معالیکم

تسلیم عرض ہے۔ حضور نے غالباً سنا ہو گا کہ میں عرصے سے علیل ہوں۔ مگر اس زمانے میں بھی دو عریضہ خدمت عالی میں بھیجے۔ کلیات میر کی اشاعت کے متعلق کہ اس کا کوئی فیصلہ فرمائیے مگر جواب سے سرفراز نہ ہوا۔ اب پھر گزارش ہے کہ جب لکھنؤ تشریف لائیے تو ضرور ضرور اس عقدۂ لاینحل کو کسی طرح حل فرمائیے۔

میں جواب کا منتظر رہوں گا۔ عالی جناب راجہ صاحب بہادر کی خدمت میں دست بستہ تسلیم۔

نیازمند

محمد عسکری

بیخود موہانی کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجکمار صاحب نے کلیات میر کی اشاعت کے لیے کئی لوگوں سے مشورہ کیا تھا۔ اور وہ اس کی اشاعت پر زر کثیر صرف کرنا چاہتے تھے۔ موہانی صاحب کو بعض لوگوں کے طریقہ کار سے اختلاف تھا اور وہ کلیات کو صحت کے ساتھ شائع کرنے کے حق میں تھے۔ موصوف عدم صحت کی بنا پر کلیات میر کو "میر کا قتل نامہ" سمجھتے تھے۔ ان کا ایک خط مہاراجکمار کے نام ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

بجناب معلی القاب جلالت مآب فضیلت انتساب مہاراجکمار صاحب محمود آباد ادام اللہ اجلالہم

آداب ادب پیام کے بعد بکمال ادب التماس یہ ہے کہ میں سرکار سے "کلیات میر" کی اشاعت کے سلسلے میں ملنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ادب کی شریعت کے اعتبار سے میرا فریضہ ہے کہ اپنی سچی رائے جناب پر ظاہر کر دوں۔ میرے نزدیک کلیات کی تصحیح اس طرح غیر ممکن ہے جس طرح کی جا رہی ہے۔ اور اگر کلیات اسی طرح شائع ہو گیا تو میری قوم کے ایک معزز رئیس کا روپیہ اور وقت بڑی طرح ضائع ہو گا۔ مجھے آپ کی سخن سنجی، سخن گوئی اور طبیعت کی گیرائی کے متعلق مدت سے حسن ظن ہے اور میرے اس خیال کی تصدیق و توثیق عزیزی سید علی اختر صاحب بی۔ اے علیگ نے بار بار فرمائی۔ اور مجھے عزیز موصوف کی ذہانت، خیرخواہی اور حق گوئی پر اعتماد سا اعتماد ہے۔ اس لیے کلیات کا اس طرح چھپنا

دانشمندی کے خلاف نظر آتا ہے۔ اگر کلیات یوں ہی چھپ گیا تو اسے میرؔ کا قتل نامہ اور فضلائے ہند کی رسوائیوں کا محضر کہنا زیبا ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل کے لیے غالباً میرا تبصرہ کافی ہوگا۔

میں نے جناب مرزا محمد عسکری صاحب کی طرف سے پہونچنے والے بند سوالات کا جواب ان کی خدمت میں حاضر کرنا بوجوہ مناسب نہیں سمجھا۔ تاریخ اور وقت ملاقات سے مطلع فرمایا جاؤں۔ مجھے تخلیہ کی ملاقات کی ضرورت ہے۔ زیادہ حد آداب۔ فقط

آزادہ مشرب بندہ خاکسار

بیخود موہانی ۲۶ نومبر ۱۹۳۹ء

جناب مہاراجکمار صاحب نے کلیات میرؔ کے لیے جو فہرست اپنے ہاتھ سے ردیف وار مرتب کی تھی اس کی تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

| غزلیات | رباعیات | مفردات | مثلث | مخمس | مسدس | ترکیب بند |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۲۳۴۵ | ۱۰۷ | ۶۴ | ۲۶ | ۱۸ | ۷ | ۷ |

| ترجیع بند | ہفت بند | حکایات | مثنویات | قصائد | مراثی | مذمت کذب |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱۱ | ۷ | ۷ | ۲۱ | ۲ | ۱۰ | ۱ |

| ہجو خانۂ خود | عشق نامہ | ہولی | ساقی نامہ ہولی | بکری نامہ | مطالع |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ۱ | ۱ | ۱ | ۱ | ۴۰ |

مہاراجکمار صاحب کے کلیات کی ترتیب مطبوعہ نسخوں کے مقابلے میں مربوط تھی۔

راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں دیوان میرؔ کے متعدد قلمی نسخے محفوظ ہیں۔ ان کی تعداد گیارہ ہے اور کچھ انتخاب بھی ہیں۔ یہ تمام نسخے مخطوطہ نمبر ۹۴ سے ۱۰۶ تک موجود ہیں اور راقم کی نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں دیوانِ چہارم کے دو نسخے ہیں۔ تفصیلات یہ ہیں۔

دیوان چہارم (نسخہ اول) نمبر مخطوطہ ۵۵/۹۳، سائز ۲ء ۱۲ × ۸ء، خط نستعلیق، فی صفحہ ۱۷ سطر۔ غزلیات — ۲۰۲، رباعیات — ۸، مثنوی ہولی — ۱، بکری نامہ — ۱، ساقی نامہ — ۱۔

دیوان کی ابتدا غزل کے اس مطلع سے ہوتی ہے ؎

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا
سرمایۂ توکل یاں ناؤ ہے خدا کا

خاتمہ مثنوی ساقی نامہ کی غزل پر ہوتا ہے۔

مطلع:۔ اب کی بہار کیا کیا دریا پہ رنگ لائی
اک شہر نکلے لالہ پھر اس میں ہولی آئی

مقطع ؎ گزری جو کچھ کہ گزری یاروں میں دلبروں میں
میر اب کسو سے تم تو کریو نہ آشنائی

دیوان چہارم (نسخہ دوم)

نمبر مخطوطہ ۔ ۴۰۵، سائز ۶"×۹"، سطر ۱۲، خط شکست

یہ نسخہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے میر کے بارے میں بہت سی باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ مصحفی پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے اپنے تذکرہ (سال اختتام ۱۲۰۹ھ) میں میر کے چار دواوین کا ذکر کیا ہے۔ وہ میر کے ترجمے میں لکھتے ہیں:۔

"چہار دیوانِ ریختہ از خامۂ فکرش ریختہ ومثنوی ہائے متعددہ وشکار نامہ ہائے بے نظیر نگاشتہ"[1]

لطف نے بھی انہی چہار دیوان کا ذکر ۱۲۱۵ھ ہجری میں کیا ہے[2]۔ کمال کے مطابق میر نے ۱۲۱۸ھ ہجری تک پانچ دیوان مرتب کیے تھے۔ انہوں نے اپنے تذکرے میں دیوان پنجم کا انتخاب بھی دیا ہے۔ اور بقول صاحب تذکرہ میر نے اس کا نام دیوان زادہ رکھا تھا[3]۔ یکتا میر کا تذکرہ صیغہ ماضی میں کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے میر کا ترجمہ اپنی کتاب میں میر کے انتقال ۱۲۲۵ھ ہجری کے بعد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"سہ چہار سال شدہ کہ در لکھنؤ وفات یافت، شش دیوان ویک دیوانچہ وچند مثنوی و "طیاری ہولی" وغیرہ کہ باشارۂ وزیر مرحوم نوشتہ بود۔ ہمہ در زبان ریختہ"[4]

---

[1] تذکرۃ الشعراء ص ۳۴۵ مرتبہ اکبر حیدری، مطبوعہ اردو پبلشرز لکھنو ۱۹۸۰ء۔

[2] گلشن ہند ص ۲۱۰۔

[3] تین تذکرے ص ۱۳۰۔۱۳۱ مرتبہ نثار احمد فاروقی، مکتبہ برہان اردو بازار دہلی۔

[4] دستور الفصاحت ص ۷۹ مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ نے دیوان چہارم نواب آصف الدولہ کی فتح رام پور کے بعد ۱۲۰۹ھ میں مرتب کیا تھا۔ دیوان میں فتح رام پور کی تاریخ درج ہے۔

دیوان کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ میرؔ نے اسے اپنے داماد میر حسن علی تجلی[1] سے لکھوا کر مرزا محمد محسن[2] کو اپنے دستِ خاص سے عنایت فرمایا تھا۔ دیوان کی ابتدا میں پہلے صفحہ میں میر تقی میرؔ کے مرقد کی نشان دہی اور ان کی تاریخ وفات مرزا محمد محسن نے اپنے ہاتھ سے درج کی ہے۔ ان کی تحریر کے اوپر امجد علی شاہ بادشاہ اودھ (۶۳ - ۱۲۵۸) کے شاہی کتاب خانے کی مہر ثبت ہے۔ نیچے داہنی طرف نصیر الدین حیدر بادشاہ (۵۸ - ۱۲۴۳) اور بائیں طرف سلطان عالم واجد علی شاہ آخری بادشاہِ اودھ کے کتاب خانوں کی مہریں اس طرح لگی ہیں۔

---

[1] تجلیؔ۔ اکثر و بیشتر تذکرہ نگاروں نے ان کا نام غلط لکھا ہے۔ صحیح نام میر حسن علی تجلی ہی ہے۔ یہی نام یکتاؔ لکھنوی نے بھی لکھا ہے۔ میاں حاجی ان کی عرفیت تھی۔ ان کے والد میر محمد حسین تخلص کلیمؔ اردو کے بہت بڑے شاعر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے فصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ سوداؔ کے ہمعصر اور میرؔ کے قرابت دار تھے۔ تجلی فن ریختہ گوئی میں بے نظیر تھے۔ انہوں نے اردو میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا اسے ڈاکٹر مختار الدین آرزوؔ نے شائع کیا ہے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں بھی انہوں نے تصنیف کی تھی۔ مولوی کریم الدین کے اہتمام سے ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب یہ نسخہ نایاب ہے۔ تجلیؔ اور شاہ کمال کے درمیان بڑے اچھے مراسم تھے۔ کمال نے انہیں میرؔ کا خویش لکھا ہے۔ تجلی کا انتقال لکھنؤ میں میر تقی میرؔ کے مکان میں ۱۲۱۳ ہجری میں ہوا۔ کمال کے الفاظ یہ ہیں۔

"عرصہ پنج سال می شود کہ بمکان میرؔ صاحب موصوف بہ لکھنؤ وفات یافت" (مجمع الانتخاب ۱۴۱ ورق ب ۱۲۱۸ سال تصنیف، دستور الفصاحت ص ۷۷، گلشن ہند ص ۲۰۵، تذکرۂ شعرائے اردو ص ۲۴۱ میر حسن مرتبہ اکبر حیدری)

[2] مرزا محمد محسن المخاطب بہ زین الدین احمد لکھنؤ کے مشہور و معروف رئیس اعظم اور امیر عالم مرزا محمد جعفر المخاطب بہ فخر الدین احمد خاں عرف مرزا جعفر تخلص جعفرؔ (متوفی ۱۲۳۰ھ) خلف محسن الزماں ابن فخر الدین احمد خاں ابن زین العابدین احمد خان عالم گیر شاہی کے صاحبزادے اور قمر الدین احمد خاں عرف مرزا حاجی تخلص قمرؔ (متوفی ۱۲۸۵ھ) کے چھوٹے بھائی تھے۔ مرزا محمد محسن کی ملکیت میں ان کے والد بزرگوار کا بہت بڑا کتاب خانہ تھا۔ ان کے پاس عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کا قابل قدر کتاب خانہ تھا۔ لکھنؤ کی تباہی نے اس ذخیرہ کو بھی منتشر کر دیا۔ راجہ صاحب محمود آباد اور رام پور کے کتاب خانے میں اس کتاب خانے کی بہت سی قلمی کتابیں محفوظ ہیں۔ اور ان پر محسن کے ہاتھ کی تحریریں ثبت ہیں۔ مرزا محمد محسن بڑے سخن فہم اور شعر نواز تھے۔ اردو میں شعر کہتے تھے۔ ان کا انتقال لکھنؤ میں ۴ صفر ۱۲۶۰ھ کو ہوا۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

| ۱۲۶۳ ہجری<br>واجد علی سلطان عالم | نوش است مُہر کتب خانۂ سلیماں جاہ<br>بہر کتاب مزین و نقش بسم اللہ<br>۱۲۴۴ ہجری |
|---|---|

اسی صفحے میں کوئی دو اِنچ نیچے داہنی طرف یہ عبارت بھی درج ہے ۔

"بتاریخ دہم ربیع الاول ۱۲۶۲ ہجری بجائزہ رسید"

اب صفحے کو الٹ کر پڑھیے تو مرزا محمد محسن کی تحریر کے نیچے میر حسن علی تجلی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر جلی الفاظ میں نظر آئے گی ۔

یا فتاح

۱۰۲ ورق — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کرتا ہوں اللہ اللہ درویش ہوں سدا کا — سرمایۂ توکل یاں ناؤں ہے خدا کا

میں نے نکل جنوں سے مشق قلندری ا، — زنجیر سر ہوا ہے تھا سلسلہ جو پا کا

پورا دیوان راقم کی نظر سے گزرا ہے ۔ ایک ایک شعر خطِ شکست میں تجلی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ۔ تجلی کے ہاتھ کی کوئی اور تحریر دستیاب نہیں ہے ۔ ذیل میں مرزا محمد محسن کی پوری تحریر درج کی جاتی ہے ۔

"بروز جمعہ بستم ماہ شعبان المکرم وقتِ شام ۱۲۲۵ھ یک ہزار و دوصد و بست و پنج ہجری بودہ ، میر محمد تقی صاحب میر تخلص صاحب ایں دیوان چہارم در شہر لکھنؤ در محلہ سٹہٹی [۱] بعد طے نہ عشرہ عمر بجوارِ رحمتِ ایزدی پیوستند"

---

(بقیہ حاشیہ، صفحہ گزشتہ) رشک نے تاریخ کہی ۔ "با علم و مورخ و محقق بود" (عماد السعادت ص ۔ ۱۵۰ سید غلام علی خان مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۹۴ء) دیوان ساک ریاض الفصحا ص ۲۶۹ مصحفی ، دیوان رشک قلمی جلد نمبر ۲ ، خوش معرکۂ زیبا قلمی سعادت خان ناصر ، تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۱۳۹ نجم الغنی)

[۱] لکھنؤ میں اب محلہ سٹہٹی کا نام و نشان نہیں ملتا ہے ۔ بقول سید مسعود حسن رضوی مرحوم یہ محلہ دریائے گومتی کے جنوبی کنارے پر آباد تھا ۔ غدر میں کھد گیا ۔ محلہ سٹہٹی میں غدر سے پہلے میر انیس بھی رہتے تھے ۔ یہاں ان کا امام باڑہ بھی تھا ۔ چھتے سے آگے بڑھ کر ریل کا جو پل ہے اس سے ملا ہوا تھا ۔ اس امام باڑے میں میر انیس کے والد میر خلیق مرحوم کی قبر تھی ۔ اسی زمانے میں دیانت الدولہ نے امام باڑہ اور مجلسرا انیس کے لیے تعمیر کرایا ۔ لکھنؤ کے مشہور عالم دین اور مجتہد مفتی محمد عباس (متوفی ۱۳۰۵ھ) نے امام باڑے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

روز شنبہ بست و یکم ماہ مذکور سنہ الیہ وقت دوپہر در اکھاڑہ بھیم[1] کہ قبرستان مشہور است نزد قبور اقربائے خویش مدفون شدند و چہار دیوان خود را کہ ایں دیوان چہارم ازاں جملہ است بحرر سطور محمد محسن المخاطب بزین الدین احمد تجاوز اللہ عن سیاتہٖ در حین حیات خویش بکمال رغبت بحل کردہ بخشیدند۔ خدایش بیامرزاد۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی تاریخ۔ "تاریخ بنائے عزا خانہ کہ میر ببر علی انیس ساختہ بود" ۱۵ اشعر میں کہی تھی۔ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے ؎

سال بناش گشت رقم از سر الم

ایں جا مدام نالۂ زہرا تواں شنید

۱۲۷۱ ہجری (۵۵-۱۸۵۴ء)

حوالے۔ عروج اردو از دولہا صاحب عروج بحوالہ دیباچہ حدیث میر مرتبہ مقبول احمد لاری تجلیات ص ۳۴۹ از مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی، واقعات انیس ص ۳۱-۳۲ از میر مہدی حسن احسن لکھنوی۔

[1] : بھیم کا اکھاڑہ۔ اس محلے کا بھی اب نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ لکھنؤ کے لوگ اس نام سے ناواقف ہیں۔ یہ بھی مٹھیٹی کی طرح غدر میں کھد گیا تھا۔ اس محلے کے بارے میں میر مہدی احسن لکھنوی "واقعات انیس" ص ۱۵-۱۱ مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں لکھتے ہیں کہ

"ایک مرتبہ دل میں خیال آیا کہ میر تقی میر مرحوم کی قبر دریافت کرنا چاہیے۔ پرانے لوگوں سے معلوم ہوا کہ میر صاحب کی قبر بھیم کے اکھاڑے میں ہے۔ یہ محلہ عہد شاہی میں بہت مشہور تھا۔ اب وہاں سوائے کھنڈروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ آغا میر کی ڈیوڑھی سے "ریلی گارڈ" کے نیچے نیچے تک اسی محلے کا سلسلہ گیا ہے۔ راستے میں ایک بہت پرانا تکیہ ہے جس کو سیتاپور کی جدید ریلوے لائن نے کاٹ کر قبروں کو متفرق اور پامال کر دیا ہے بیچ میں ایک سڑک گھوڑے گاڑی کے لیے ہے۔ اسی کے اوپر چھتا ہے جس پر سے ریل گزرتی ہے۔ تکیہ کے کئی حصے ہو گئے ہیں۔ ایک ریلوے لائن کے بغل میں ہے اور دوسرا اس کے مقابل میں اور تیسرا مشرق کی جانب کسی قدر فاصلے پر واقع ہے۔ مگر قرینے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں یہ ایک تکیہ ہوگا۔ جس کو اب جغرافیہ نے متفرق کر دیا۔ بہرکیف وہاں تک پہونچا۔ مگر مجبور تھا کس سے دریافت کروں۔ اول تو شہر کا غیر آباد حصہ جہاں انسان کا گذر بھی اتفاق سے ہو جاتا تھا اور اگر کوئی شخص ملا بھی تو میرے سوال کا جواب نہ دے سکا۔ میں نے تینوں قبرستانوں کو چھانا۔ گرمی کی فصل اور دوپہر کا وقت تھا۔ اور لُو چل رہی تھی اور یہاں میر صاحب کی محبت دل میں امنگ پیدا کر رہی تھی۔ میں عالم خیال میں پکار رہا تھا میر صاحب بھلا کب کسی کی سنتے ہیں۔ خدا جانے کس مضمون کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہ کچھ آواز نہ آئی۔ بے نیل مقصود واپس ہوا۔ کئی سال کے بعد اتفاقیہ اس طرف گزر ہوا شام کا جھٹپٹا تھا۔ تاریکی پھیل ہوئی تھی۔ میں گاڑی پر سوار تھا۔ داہنے بائیں دونوں جانب بیہڑ میدان اور چند کھیتوں کے سوا کچھ معلوم نہ ہوتا تھا۔ داہنی جانب کی بلندی پر جہاں اس قبرستان کا ایک حصہ باقی ہے کسی انسان کی پرچھائیں سی معلوم

(باقی اگلے صفحہ پر)

حررہ محمد محسن عفی عنہ روز جمعہ بست و ہفتم ماہ شعبان سنہ الیہ بوقت چہار گھڑی روز باقی ماندہ۔

ایں دیوان از دستخط میر حسن علی تجلی داماد میر مغفور است

بحررہ محمد محسن عفی عنہ

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہوئی۔ مجھ شوریدہ مزاج کو ایسے مقاموں سے دلچسپی ہے۔ گاڑی روک لی۔ اتر پڑا اور ایک ناہموار بلندی کا راستہ طے کر کے ایک قبر کے سرہانے پہونچا تو ایک نیک بخت ضعیفہ کو اس قبر پر جھکے ہوئے اور حصول مدعا کے لیے دعاؤں میں معروف پایا۔ سناٹے کے عالم میں ایک پیرزال کا قبرستان میں گزر حیرت ناک واقعہ خیال کر کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہوگیا کہ آج وہ راز سربستہ کھلا جاتا ہے۔ دل کڑا کر کے اس ضعیفہ سے سوال کیا کہ اس سناٹے کے وقت تم اس قبرستان میں کیا کر رہی ہو۔ اور یہ قبر کس کی ہے جس پر تم جھکی ہوئی ہو؟ وہ بیچاری سہم گئی۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔ مگر خدا میرے اس گناہ کو بخشے کہ میں نے بے ضابطہ دھمکیاں دے کر حال دریافت کیا۔ اس بیچاری غریب عورت نے جواب دیا کہ یہ قبر ایک میرے مورثِ اعلیٰ کی ہے اور وہ ایک درویش صفت سید تھے۔ میرا باپ جب کبھی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا تھا تو اس صاحب قبر سے استدعا کرتا تھا۔ کسی طریق کے موافق میں بھی اپنی مشکلوں میں اکثر صاحب قبر سے امداد طلب کرتی ہوں۔ میں نے پوچھا، ان کا نام کیا ہے۔ اس نے کہا نام میں نہیں جانتی مگر اتنا جانتی ہوں کہ اگلے زمانے میں ایک مشہور شاعر تھے۔ اہا! کیا خوشی کی بات تھی۔ مجھ پر ایک عالم وجد طاری تھا اور اس بیخودی میں بکمال عقیدت سر قبر پر فاتحہ کو جھکایا۔ عورت نے اپنا راستہ پکڑا۔ گاڑی والا چلا چلا کر پکار رہا تھا۔ اس کی یہ آواز سے ہوشیار ہوا تو موقع نکل گیا تھا۔ میں نے تو اپنے دل سے اس مزار کو میر مرحوم کا مزار مقدس طے کر لیا۔"

میر مہدی احسن کے بیان کی تائید دولہا صاحب عروج سے بھی ہوتی ہے۔ وہ عروج اردو میں لکھتے ہیں۔

"میر مرحوم کی قبر آغا میر کی ڈیوڑھی والے اسٹیشن کے پہلو میں رفاہ عام کی عمارت کے سامنے والے قبرستان میں موجود ہے میں نے میر مرحوم کی قبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بلکہ جوان کی قبر بتائی جاتی ہے اس پر اکثر پنج شنبہ کو چراغ روشن ہوتا ہے اور پھول چڑھائے جاتے ہیں اور یہ واقعہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ اکثر پنج شنبہ کو میرا اس راہ سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور میں نے ان کی قبر پر روشنی دیکھی۔"

میر مہدی احسن میر نفیس (متوفی ۱۹۰۰ء) کے شاگرد اور دولہا صاحب عروج (متوفی ۱۹۲۹ء) میر انیس کے پوتے تھے۔ ان دونوں کے بیان سے میر کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

تربت میر پہ ہیں اہل سخن ہر طرف حرف ہے حکایت ہے

تو بھی تقریب فاتحہ سے چل بخدا واجب الزیارت ہے

(باقی اگلے صفحہ پر)

محمد تقی میر شاعرے کہ بود — مسلم ورا تخت و تاجِ سخن
باقلیم معنی نزار بابِ شعر — ستانیدہ او بود باجِ سخن
زمرگش چو بے نور شد شعرِ سال — نوشتم بمردہ سراجِ سخن

۱۲۲۵ ہجری

دیگرے

میر تقی استادِ فنِ شعر — مرد ز دنیا سوئے عدم شد
گشت چو اشعارش ہمہ بے سر — میر تقی استاد رقم شد

۱۲۲۶-۱ = ۱۲۲۵ ہجری

یہ تحریر مرزا محسن نے میر تقی میر کی تجہیز و تکفین کے ایک ہفتہ کے بعد بطور یادداشت درج کی تھی۔ اور یہ ۱۷۶ سال پرانی ہے۔ اسی طرح دیوان بھی ۱۹۲ سال پرانا ہے۔

غرضیکہ میر کا یہ دیوانِ چہارم زیارت کے قابل ہے۔ اسے خدائے سخن میر تقی میر، میر حسن علی تجلی اور مرزا محسن نے مَس کیا ہے۔ راقم الحروف خوش نصیب ہے وہ بھی اس کی زیارت سے فیضیاب ہوا ہے۔

دیوان کے آخری صفحے پر بھی نصیر الدین حیدر، واجد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے شاہی کتاب خانوں کی مہریں ثبت ہیں۔ امجد علی شاہ والی مہر اس طرح لگی ہے۔

گول دائرے کے اندر دو مچھلیوں کے بیچ میں تاج شاہی ہے اور اس کے نیچے مہر کی عبارت سرخ حروف میں درج ہے۔

۱۲۶۰

ناسخ ہر مہر شد چون شد مزین برکت

خاتم امجد علی شاہِ زمان عالی جنا

---

(بقیہ حاشیہ) افسوس کہ اس قبرستان کا اب نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ یہ ریلوے لائن کے نیچے آگیا ہے۔ اس کے بارے میں بھی میر صفحہ گزشتہ کی پیشین گوئی ملاحظہ فرمائیے:۔

کیا خاک میں ملایا ہم کو سپہرِ دوں نے
ڈھونڈا نشانِ تربت باقی نہیں ہمارا

(اکبر حیدری)

دیوان کے شروع میں ص ۱۴۰ اپر میر کے حالات زندگی "سوانح محمد تقی" کے عنوان سے "نوادر الکملا" سے اخذ کرکے درج کیے گئے ہیں۔ اس میں میر کی تاریخ پیدائش ۱۱۲۵ ہجری لکھی ہے۔ میر کے بارے میں دیوان کا یہ صفحہ ایک اہم ترین دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ "نوادر الکملا" نایاب ہے۔ اس لیے ذیل میں اس کی عبارت حرف بحرف درج کی جاتی ہے۔ غالباً یہ تحریر بھی مرزا محمد محسن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔

## سوانح محمد تقی میر

"اصلش از اکبر آباد۔ در اواخر یک صد و یک ہزار و سی و پنج ہجری ولادت واقع شدہ۔ بعد واقعۂ ہائلہ پدر بزرگوار بعمر ہفتدہ سالگی در دہلی رفت و بخانۂ سراج الدین علی خان آرزو اقامت ورزیدہ، تکمیل علوم عقلی و نقلی نمودہ، بعد مرور دہور کہ جدائی فیما بین واقع شد، بر نوسائے عظام درخورد و برخورد و بفراغت تمام و خوبی مالا کلام با عزا و اقربا زندگی بسر می برد۔ تا زمانے کہ آشوب عظیم و فتنہ نمایاں شد۔ بروئے کار آمدند۔ و ہنگامۂ نادری گرم شد۔ کار دیار مردم درہم و برہم شد، خانہا تاراج او باشان رفت۔ بر نجبا و شرفا عرصہ حیات تنگ شد۔ مردمان شاہ جہاں آباد از ہر درسے کہ یافتند از جا بیرون رفتند و رو بہ صحرائے غربت نہادند۔ میر صاحب تا زمانے بے چارہ ماند۔ مگر حیران و پریشان، سراسیمہ و سرگرداں، نہ رفیقے کہ یاری کند و نہ انیسے کہ غمگساری کلفتہا دیدند، و کربہا کشیدند۔ آخر الامر بایمائے نواب وزیر حضرت دہلی را کہ بجائے مالوف بود وداع کردہ بہ بلاد شرقی شتافتند و در بلدۂ لکھنؤ طرح اقامت انداختند و مورد عواطف آصفی شدند۔

شہرۂ حسن کلام زمین و زماں را بر گرفت۔ ذرہ ذرہ روشناس و قطرہ قطرہ محو سپاس۔ چہ تعظیمہا کہ نہ دیدند و چہ آفرینہا کہ نہ کشیدند۔ چونکہ گردون بے مدار فتنۂ اساس و زمانۂ غدار ناسپاس است۔ کسے را نہ بیند کہ بیارامد۔ جگر میر را بحوادث گوناگوں فگار ساخت و آسودہ را شکار افکار کرد۔ در سالے ناز پروردۂ آغوشش ناز دخترے، و در سال دیگر مرحم جگر افگار خلف کامگار و در سالے دیگر اہلیہ عفت شعار بکنج عافیت مزار آسودند۔ قیامت آشکار و محشر پدیدار شد۔ در حواس و مزاج اختلال کلی راہ یافت۔ بہ دا شتگی خاطر از دنیائے ناپائدار از حد افزوں و شوق جاں سپردگی از اندازہ بیروں رفت۔ داماں عزلت مستحکم گرفتند و مجالس و محافل را وداع نمودند۔ مدتے ہمیں نوع گذشت۔

آخر در شہر ربیع الثانی عوارض مزمنہ رو بہ ترقی آوردند۔ درد قولنج کہ جلیس قدیم و ہمراز و ندیم بود ساعتے نہ گذاشت و جمع مفاصل قوائے جسمانی را معطل ساخت، پزشکان شاہی کہ شناسائی قدیم بودند ہجوم

آوردند۔ رائے ہمگنان بر آں قرار یافت کہ چارۂ کار واقعی باید نمود ودارو ئے باید استعمال آورد کہ قبض طبیعت برطرف شود۔ تلیّنے دادند۔ اسہال بود کہ پیام مرگ، جُثہ نحیف و مضغہ ضعیف و اسہال یک روزہ یک صد و پنجاہ وادیلا واویلا، آہ آہ دو سہ روز ہمیں نوبت بود۔ آزار بمرگ انجامید۔ فرشتۂ موت جام ہلاہل کل من علیہا فان پیش نمود و بیا شامید۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ثم انا للہ وانا الیہ راجعون۔
مرحوم مردے بود متوکل، سپاہی پیشہ، رقیق القلب، پابند وضع، جہاں دیدہ سرد وگرم زمانہ چشیدہ، سرآمد سخنورانِ ماضی و حال در سخن سنجی بے مثال، کم اختلاط و با دوستاں سراپا ارتباط، سنجیدہ، از حرص وہوائے دنیا آزاد۔ کسے را بنیاز ردے۔ ہرگز ہرگز حملہ براں نیاوردے۔ کسے را بدنمی گفت و بدنمی شنفت استغنائے بیش از بیش و بہ تعظیم ہر کہ و مہ پیشا پیش، مراختہ و مطارحہ را ترک نمودہ بود، تاہم سخن گوئی را مدارِ حیاتِ خویش افکار کردہ تا دمِ واپسیں گرفتار دامِ طرۂ سخن بود، حرفہا زد و کلامہا می گفت و در آخر بیتش ہمیں مطلع غزل کہ گفتہ اوبود، بود ؎

ساز پسیچ آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے پہلے گیا ہے اب کی ہماری باری ہے

قریب چہار صد کس ہمراہ جنازہ اش بودند۔ و بعد ازاں شنوندگان و عقیدتمندگان جوق در جوق نماز غائبانہ گزاردند۔ ہر صنفِ کلام یادگار اوست۔ مثنوی و غزل و مدح و ذم گرمی بازار اوست پس اللّٰہم اغفرہ .... از نوادر الکلام نقل گرفتہ شد و ثبت دیوانش نمودہ آمد۔"
دیوان میں ص ۲ سے ص ۱۳۹ تک غزلیں ہیں۔ ان کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ ص ۱۴۰ میں "سوانح محمد تقی میر" درج ہیں۔ اس کے بعد ص ۱۴۱ سے ص ۱۴۳ تک رباعیاں ہیں۔ ان کی تعداد ۹ ہے۔ ص ۱۴۴ میں مثنوی ہولی نامہ، ص ۱۴۸ میں مثنوی بزنامہ ص ۱۵۱ میں مثنوی جگر سوز[1] اور ص ۱۶۵ میں ساقی نامہ ہے۔ اس کے بعد مثنوی جنگ نامہ آصف الدولہ ہے۔ اس کے آخری اشعار میں نواب وزیر کی فتح رامپور کی تاریخ بھی ہے۔ نواب کو یہ فتح ۱۲۰۹ ہجری میں ہوئی تھی ؎

بسکہ اب ملک و مال سب نواب — راہ لیتے ہیں لکھنؤ کی شتاب
سال تاریخ کا تھا مجھکو خیال — بطعت کے روسے کی ملک نعمقال

---

[1] نسخۂ کلکتہ ص ۹۵۸ میں اس کا کوئی نام نہیں ہے۔

کائے سخن گستر و یہاں استاد     فتح نواب سے کراب دل شاد

۳۰+ ۱۱۷۹ = ۱۲۰۹ ہجری

یہ امر مسلّم ہے کہ نواب آصف الدولہ (م ۱۲۱۲ھ) اور نواب سالار جنگ (م ۱۲۰۱ھ) لکھنؤ میں میرؔ کے ناز بردار تھے۔ یہ لوگ میرؔ کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ نواب وزیر نے ان کے لیے خاص وظیفہ بھی مقرر کیا تھا۔ اور اس طرح وہ فکر معاش سے آزاد تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ لکھنؤ میں نواب موصوف کی سخاوت کی گنگا بہ رہی تھی۔ ایسے عالم میں میرؔ کو خوش رہنا چاہیے تھا۔ چونکہ طبیعت میں افتادگی تھی اس لیے وہ یہاں بھی اداس رہتے تھے۔ اس کا ثبوت دیوانِ چہارم میں ملتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

لکھنؤ دلّی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میرؔ کو سرگشتگی نے بے دل و حیران کیا

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

خرابہ دِلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

دیوان چہارم بخط تجلی معتبر اور مستند ہے۔ اس میں اور مطبوعہ نسخوں میں اختلاف بھی ہے۔ مثال کے طور پر مطبوعہ نسخوں میں ردیف کاف فارسی کی ایک غزل ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

اس رنگ سے جو زرد زبوں زار ہیں ہم لوگ
دل کے مرضِ عشق سے بیمار ہیں ہم لوگ

غزل میں دس شعر ہیں۔ ساتواں شعر اس طرح درج ہے ؎

ان پریوں سے لڑکوں کے جھپیٹے میں دل آئے
حیرت زدہ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

یہ شعر غیر مربوط اور دو مختلف شعروں سے غلط ترتیب دیا گیا ہے۔ نسخۂ محمود آباد میں غزل کے گیارہ شعر ہیں۔ دیکھیے اوپر کا شعر کس طرح دو شعروں سے غلط مرتب کیا گیا ہے ؎

ان پریوں سے لڑکوں کے جھپیٹے میں دل آئے     بے ہوش و خرد جیسے پری دار ہیں ہم لوگ
در پر کسو کے جا کے کھڑے ہوں تو کھڑے ہیں     حیرت زدۂ عشق ہیں دیوار ہیں ہم لوگ

مطبوعہ نسخوں میں ایک شعر یوں ہے ؎

دوستاں حسن و خوبی ہے کیا چیز
ٹھہری ہے جان سی بھی شے کیا چیز

نسخۂ محمود آباد میں پہلا مصرعہ اس طرح ہے ؎

حسن و خوبی ہے دوستاں کیا چیز

اسی طرح ایک اور شعر ہے ؎

عشق کیا ہے جب سے ہم نے دل کو کوئی ملتا ہے
اشک کی سرخی زردی چہرہ کیا کیا رنگ بدلتا ہے

مصرع اول یوں ہونا چاہیے تھا ؎

جب سے عشق کیا ہے ہم نے دل کو کوئی ملتا ہے۔

مطبوعہ نسخوں میں ردیف طائے کے تحت کل ۳ شعر دو مختلف بحروں میں ہیں۔ نسخۂ محمود آباد میں ۴ شعر ہیں اور ذیل کا شعر زیادہ اور غیر مطبوعہ ہے ؎

بدکرو خوبی سے بقول میر
عیب کرنے کو بھی ہنر چاہیے

نسخۂ کلکتہ اور دوسرے مطبوعہ نسخوں میں دیوان چہارم کا خاتمہ ذیل کی غزل پر ہوتا ہے ؎

آج ہمیں بے تابی سے ہی صبر کی دل سے رخصت تھی
چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تھی

نسخۂ محمود آباد کی غزلیات کا خاتمہ ذیل کی غیر مطبوعہ غزل پر ہوتا ہے ؎

یہ کلول نہیں ٹلتی جی پر سے اس کے — علاقہ ہوا جس کو خنجر سے اس کے
سکھا دے ہے ہجراں کا غم دلبروں کے — اُگے پھول کانٹے ہو بستر سے اس کے
وہ بے رحم گھر سے بھی اپنے نہ نکلا — گئیں نعشیں غم کشتوں کی در سے اس کے
کبھو کہا وے گا آفتاب آفتابا — سحر دیر بڑھتا ہے اب گھر سے اس کے

کہیں میر کی جلتی آنکھیں ہوں ٹھنڈی
کف پا ملو دیدۂ تر سے اس کے

غزلوں کے بعد ص ۴۴۳ سے مثنویاں شروع ہوتی ہیں۔ آخری مثنوی جنگ نامہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس میں

۵۵ شعر ہیں۔ آخری شعر یہ ہے۔

میرؔ کوئی غزل کہو اب تم
لذّت شعر میں رہو خود گم

اس کے بعد غزل دوسری بحر میں شروع ہوتی ہے اور اس طرح پورا دیوان ذیل کی غزل پر ختم ہوتا ہے ؎

رنج سے اس کے جو خبر گزرے          رفتہ وارفتہ اس کا سر گزرے
ایک پل بھی نہ اس سے آنسو پونچھے          روتے مجھ کو پہر پہر گزرے
جوئے خوں آنکھوں سے بہی شاید          خون سے میرے وہ بھی در گزرے
مارے غیروں کو یا مرے عاشق          کچھ نہ کچھ چاہیے کہ کر گزرے
راہِ جاناں سے ہے گذر مشکل          جان ہی سے کوئی مگر گزرے
غنچہ ہو شرم سے ان آنکھوں کی          گل نرگس اگر نظر گزرے

سر کا جانا ہی ہر قدم ہے میرؔ
کیا کوئی اس کی راہ پر گزرے

میرؔ کا دیوانِ چہارم غزلوں کا سراپا انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک ایک شعر میرؔ کی افتادِ طبع اور وارفتگی کا مظہر ہے اس لیے ذیل میں نسخۂ محمود آباد سے۔ نمبرؔ کا چند غزلیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں ؎

۱۔ رفتۂ عشق کیا ہوں میں اب کا          جا چکا ہوں جہان سے کب کا
لوگ جب ذکرِ یار کرتے ہیں          دیکھ رہتا ہوں وے منہ سب کا
مست رہتا ہوں جب سے ہوش آیا          میں بھی عاشق ہوں اپنے مشرب کا
ہم تو ناکام ہی چلے یاں سے          تم کو ہوگا وصول مطلب کا
درس کہیے جنوں کا تو مجنوں          اپنے آگے ہے طفل مکتب کا
لعل کی بات کون سنتا ہے          شور ہے زور یار کے لب کا

زلف سا پیچدار ہے ہر شعر
ہے سخن میرؔ کا عجب ڈھب کا

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا          کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا
کون لیتا تھا نام مجنوں کا          جبکہ عہدِ جنوں ہمارا تھا

کوہ فتنہ باد سے کہیں آ گئے　　سر مرا اور سنگِ خارا تھا
ہم تو تھے محوِ دوستی اس کے　　گو کہ دشمن جہان سارا تھا
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی　　جب تلک لطف کچھ ہمارا تھا
آستاں کی کسو، کے خاک ہوا　　آسماں بھی کیا ستارا تھا
پانو چھاتی پہ میری رکھ چلتا　　یاں کبھو، اس کا یوں گزارا تھا
موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف　　گشت تھا دید تھا نظارا تھا
اس کی ابرو، جو ٹک جھکی ایدھر　　قتل کا تیغ سے اشارا تھا

عشق بازی میں کیا موئے ہیں میر
آگے ہی جی انھوں نے ہارا تھا

۳. جگر خون کیا چشم نم کر گیا　　گیا دل سو ہم پر ستم کر گیا
ان آنکھوں کو نرگس لکھا تھا کہیں　　مرے ہاتھ دونوں قلم کر گیا
شب اک شعلہ دل سے ہوا تھا بلند　　تن زار میرا بھسم کر گیا
مرے مزرع زرد پر شکر ہے　　کل اک ابر آیا کرم کر گیا
نہ اک یار وعدہ وفا کر سکا　　بہت بار قول و قسم کر گیا
فقیری میں تھا شیب بار گراں　　قد راست کو اپنے خم کر گیا

بکائے شب و روز اب چھوڑ میر
نواح آنکھوں کا تو ورم کر گیا

۴. درد سر کا پہر پہر ہے اب　　زندگانی ہے درد سر ہے اب
وہ دماغ ضعیف ہی نہ رہا　　بے دماغی ہی بیشتر ہے اب
کیا ہیں ہم تو ہو چلے ٹھنڈے　　گرم گو یار کی خبر ہے اب
کیا کہیں حال خاطر آشفتہ　　دل خدا جانیے کدھر ہے اب

عزلتی میر جوں صبا اس بن
خاک بر سر ہے دربدر ہے اب

۵. شعر دیوان کے میرے کر کر یاد　　مجنوں کہنے لگا کہ ہاں استاد

خود کو عشقِ بتاں میں بھول نہ جا — متوکل ہو کر خدا کو یاد
سب طرف کرتے ہیں نکویاں کی — کس سے جا کر کوئی کرے فریاد
وحشی اب گرد و باد سے ہم ہیں — عمر افسوس کیا گئی برباد

چاہ دلداری عناصر میرؔ
خوب جاگہ ہے پر ہے بے بنیاد

۶۔ اب نہیں ہوتی چشمِ تر افسوس — بہہ گیا خون ہو جگر افسوس
دیدنی ہے یہ خستہ حالی لیک — ادھر اس کی نہیں نظر افسوس
عیب ہی عیب میرے ظاہر ہیں — مجھ کو آیا نہ کچھ ہنر افسوس

میرؔ ابتر بہت ہے دل کا حال
یعنی ویراں پڑا ہے گھر افسوس

۷۔ دل جگر دونوں پر جلائے داغ — عشق نے کیا ہمیں دکھائے داغ
دل جلے ہم نہیں رہے بیکار — زخم کاری اٹھائے کھائے داغ
جل گئے دیکھ گرمیِ اغیار — آئے اس کوچے سے تو آئے داغ
احتیاطاً صراحی سے سے — ہم نے سجادے کے دھلائے داغ

دیکھے دامن کے میچے کے سے دئے
میرؔ نے گرچہ چھپائے داغ

۸۔ حال تو حالِ زار ہے تا حال — دل وہی بے قرار ہے تا حال
بڑھتی ہے حال کی خرابی روز — گرچہ کچھ روزگار ہے تا حال
خستہ جانی نے ننگِ خلق کیا — پر اُسے مجھ سے عار ہے تا حال
حال فکرِ سخن میں کچھ نہ رہا — شعر میرا شعار ہے تا حال
حالِ مستی جوانی تھی سو گئی — میرؔ اس کا خمار ہے تا حال
آنکھیں بدحالی سے ٹھہرتی نہیں — شوقِ دیدارِ یار ہے تا حال

غم سے حال آنکہ خون دل سوکھا
چشم تر اشکبار ہے تا حال

۹۔
جی رکا رُکنے سے پرے کچھ تو | آسماں آگیا ورے کچھ تو
جو نہ ہووے نماز کریے نیاز | آدمی چاہیئے کرے کچھ تو
طالع و جذب و زاری و زر و زور | عشق میں چاہیئے ارے کچھ تو
جینا کیا ہے جہانِ فانی کا | مرتے جاتے ہیں کچھ مرے کچھ تو

سہمے سہمے نظر پڑے ہیں میرؔ
اس کے اطوار سے ڈرے کچھ تو

۱۰۔
سنو سرگذشت اب ہماری زبانی | سنی گرچہ جاتی نہیں یہ کہانی
بہت نذریں مانیں کہ مانے گا کہنا | ولیکن مری بات ہرگز نہ مانی
بہت مو پریشان کھنچے اس کے غم میں | خدا جانے ہے بید کس کی نشانی
گیا بھول جی شیب میں جو ہمارا | بہت یاد آئی گئی وہ جوانی
توقع نہیں یاں تک آنے کی ان سے | اگر لطف مجھ پہ کریں مہربانی
گریں ضبط گریہ سے دل کی عمارت | ہوئی چشم تر اس خرابے کی بانی
ملا دیتی ہے خاک میں آدمی کو | محبت ہے کوئی بلا آسمانی

گرامی گہر میرؔ جی تھا ہمارا
ولے عشق میں قدر ہم نے نہ جانی

۱۱۔
ہم اس مرتبہ پھر بھی لشکر گئے | تعب ایسی گذری کہ مر مر گئے
نظر اک سپاہی پسر سے لڑی | قریب اس کے تلوار کر کر گئے
ہم ہمہ ورزی کے سرگرم تھے | خدا جانے وہ لوگ کیدھر گئے
لہو میری آنکھوں میں آتا نہیں | جگر کے مگر زخم سب بھر گئے

رباط کہن میں نہیں میرؔ جی
ہوا جو لگی وہ بھی باہر گئے

۱۲۔
موسم ہے نکلے شاخوں سے پتے ہرے ہرے | پودے چمن میں پھولوں سے دیکھے بھرے بھرے
آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز | وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
کیا سمجھے اس کے رتبۂ عالی کو اہل خاک | پھرتے ہیں جوں سپہر بہت ہم ورے ورے

مرتا تھا میں تو باز رکھا مرنے سے مجھے        یہ کہہ کے کوئی ایسا کرے ہے ارے ارے

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

۱۳۔ صبر کر رہ جو وہ عتاب کرے        ورنہ کیا جانے کیا خطاب کرے

عشق میں دل بہت ہے بے آرام        چین دیوے تو کوئی خواب کرے

وقت یاں کم ہے چاہیئے آدم        کرنا جو کچھ ہو سو شتاب کرے

پھاڑ کر خط کو ان نے پھینک دیا        نامہ بر اس کا کیا جواب کرے

ہے برافروختہ جو خشم سے وہ        آتش شعلہ زن کو آب کرے

ہے تو یک قطرہ خون ہی لیکن        قہر ہے دل جو اضطراب کرے

میر اٹھ بت کدے سے کعبے گیا
کیا کرے جو خدا خراب کرے

۱۴۔ آج ہمیں بیتابی سی ہے صبر کی دل سے رخصت تھی        چاروں اور نگہ کرنے میں عالم عالم حسرت تھی

کس محنت سے محبت کی تھی کس خواری سے یاری کی        رنج ہی ساری عمر اٹھایا، کلفت تھی یا الفت تھی

بدنامی کیا عشق کی کہیئے رسوائی سی رسوائی ہے        صحرا صحرا وحشت بھی تھی دنیا دنیا تہمت تھی

راہ کی کوئی سنتا نہ تھا یاں رستے میں مانند جرس        شور سا کرتے جاتے تھے ہم بات کی کس کو طاقت تھی

عہد ہمارا تیرا ہے یہ جس میں گم ہے مہر و وفا        اگلے زمانے میں تو یہی لوگوں کی رسم و عادت تھی

خالی ہاتھ سیہ رو، ایسے کاہے کو تھے گریہ کناں        جن روزوں درویش ہوئے تھے پاس ہمارے دولت تھی

جو اٹھتا ہے یاں سے بگولا ہم سا ہے آوارہ کوئی
اس وادی میں میر مگر سرگشتہ کسو کی تربت تھی

# نکات الشعرار کے مختلف خطّی نسخے

## ڈاکٹر حنیف نقوی

نکات الشعرا اردو کے نامور شاعر اور ممتاز ترین غزل گو میر تقی میر کی تصنیف ہے۔ بقول مصنف یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو شعرائے ریختہ کی یاد صفحۂ روزگار پر باقی رکھنے کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ کتاب میں اس کے زمانۂ تسوید و ترتیب کے بارے میں میر صاحب کا کوئی واضح بیان موجود نہیں لیکن رائے انند رام مخلص کی وفات اور سید عبدالولی عزلت کے ورودِ دہلی کے بارے میں ان کے بیانات بالواسطہ طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ ان دونوں واقعات کے رونما ہونے کے بعد معرضِ وجود میں آیا ہے۔ رائے انند رام مخلص کی وفات لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے بقول ۱۱۶۴ھ میں واقع ہوئی[1] بھگوان داس ہندی کے مطابق یہ حادثہ احمد شاہ کے چوتھے سالِ جلوس یعنی ۷ ربیع الثانی ۱۱۶۴ھ (۴ مارچ ۱۷۵۱ء) اور ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۶۵ھ (۲۲ مارچ ۱۷۵۲ء) کے درمیان پیش آیا تھا[2]۔ عزلت میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان کے بموجب ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۴ھ (۵ اپریل ۱۷۵۱ء) کو دہلی میں وارد ہوئے تھے[3]۔ میر صاحب نے جس زمانے میں ان دونوں شاعروں کے حالات قلمبند کیے ہیں، اسوقت اول الذکر کی وفات کو تقریباً ایک سال ہو چکا تھا اور آخر الذکر "تازہ وارد ہندوستان" تھے۔ ان اشارات کی روشنی میں محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تذکرہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۲ء) میں مرتب ہوا ہے[4]۔ چونکہ دستیاب معلومات کے مطابق اس زمانے تک شعرائے اردو کا کوئی دوسرا تذکرہ مرتب ہو کر سامنے نہیں آیا تھا، اس لیے میر صاحب اپنے اس دعوے میں حق بجانب ہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں یہ اپنی قسم کی اولین تصنیف ہے۔

نکات الشعرار کے دستیاب نسخوں اور دوسرے تذکروں میں اس کے حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چند برسوں کے اندر اس کی نقلیں ملک کے دور دراز شہروں مثلاً جنوب مغرب میں سورت، جنوب میں حیدر آباد اور اورنگ آباد اور

---

[1] گلِ رعنا مطبوعہ عہد آفریں پریس حیدر آباد، ص ۱۲۴

[2] سفینہ ہندی شائع کردہ ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ ص ۱۹۶۔

[3] سروِ آزاد مطبوعہ رفاہ عام پریس، لاہور ص ۲۳۶۔

[4] اس موضوع پر راقم السطور نے اپنی تصنیف "شعرائے اردو کے تذکرے" میں مفصل بحث کی ہے۔

مشرق میں عظیم آباد اور مرشد آباد تک پہنچ چکی تھیں[1] اگرچہ بعد کے بیشتر تذکرہ نگاروں نے بعض شعراء کے بارے میں میر صاحب کے اقوال کی شدید نکتہ چینی کی ہے اور ان کے بیانات کو "کبر و نخوت" کا آئینہ دار اور "بغض و حسد" پر مبنی قرار دیا ہے۔ تاہم بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ انہیں تذکرہ نویسی کی ترغیب اسی تذکرے سے ملی اور بہت سے شاعروں بالخصوص شمالی ہند کے ریختہ گویوں کے بارے میں ان کی معلومات کا اصل ماخذ یہی ہے بحیثیت مجموعی یہ صورتِ حال نکات الشعراء کی غیر معمولی مقبولیت پر دلالت کرتی ہے، لیکن اس قبولِ عام کے باوجود اس تذکرے کے قلمی نسخے حیرتناک حد تک کمیاب ہیں۔

عہدِ حاضر کے اہلِ نظر نکات الشعراء سے عام طور پر اس وقت واقف ہوئے جبکہ اس صدی کے تیسرے عشرے میں انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کر کے عام کیا۔ اس وقت سے اب تک مجموعی طور پر اس کے تین ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو کے سلسلہ مطبوعات کے تحت نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔[2] دوسرا ایڈیشن اس کے چند برسوں کے بعد ۱۹۳۵ء میں مولوی عبدالحق کے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو پریس اورنگ آباد سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبہ اردو، گورکھپور یونیورسٹی نے جنوری ۱۹۷۲ء میں ادارۂ تصنیف، ماڈل ٹاؤن، دہلی سے شائع کیا ہے۔ یہ تینوں اشاعتیں تین مختلف خطی نسخوں پر مبنی ہیں۔ اس تذکرے کا ایک اور خطی نسخہ جس سے تاحال کسی اشاعت کی ترتیب و تدوین میں استفادہ نہیں کیا گیا ہے، رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے۔ ان چار معلوم نسخوں کے علاوہ جناب نثار احمد فاروقی نے مولانا آزاد

---

[1] نسخہ پیرس سورت میں اور نسخۂ انجمن حیدرآباد میں نقل کیا گیا ہے۔ لچھمی نرائن شفیق کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ ۱۱۷۵ھ تک یہ تذکرہ اورنگ آباد پہنچ چکا تھا۔ عظیم آباد میں اس کے نسخوں کی موجودگی کا ثبوت شورش اور امراللہ الہ آبادی کے تذکرے فراہم کرتے ہیں۔ علی ابراہیم خلیل کے ایک خط (بحوالہ معاصر شمارہ ۸، ص ۸۴۱) سے جو انھوں نے غالباً مرشد آباد سے اپنے برادرِ عم زاد خادم حسین خادم عظیم آبادی کو لکھا تھا، اس کے مرشد آباد تک پہنچنے کی تصدیق ہوتی ہے۔

[2] اس ایڈیشن میں کسی جگہ اس کا سالِ طباعت درج نہیں۔ شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی نے "تین تذکرے" کے مقدمے میں (ص ۴) اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے "اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری" میں (حاشیہ ص ۹۵) اس کا سالِ انطباع ۱۹۲۰ء بتایا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاکٹر محمود الٰہی نے طبعِ سوم کے مقدمے میں اسے ۱۹۲۲ء کا مطبوعہ قرار دیا ہے (ص ۱۶)، راقم السطور کی تصنیف "شعرائے اردو کے تذکرے" میں ایک جگہ (ص ۲۱۱) اس کا سنہ طباعت ۱۹۲۲ء اور دوسری جگہ (ص ۸۹۴) ۱۹۲۶ء لکھا ہے۔ یہ اختلاف کاتب کے دخل و تصرف کا نتیجہ ہے جس سے اس کتاب کا کوئی صفحہ محفوظ نہیں، فی الوقت یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سی روایت صحیح ہے اور اس کا ماخذ کیا ہے۔

لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سر سلیمان کلیکشن کے ایک کشکول متفرقات میں شامل چند متفرق اوراق کو نکات الشعراء کے اجزائے پریشاں قرار دے کر اس تذکرے کی "ایک اور روایت" کے وجود کا انکشاف فرمایا ہے۔ پیش نظر سطور میں انہی قلمی نسخوں کا تعارف مقصود ہے۔[1] چونکہ پہلے نسخے کے بارے میں باوثوق طور پر صرف اس قدر معلوم ہو سکا ہے کہ یہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے پاس موجود تھا، اس لیے مجملاً اس کا ذکر نسخۂ شروانی کے نام سے کیا جائے گا۔ دوسرا نسخہ انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں، تیسرا پیرس کے قومی عجائب گھر میں اور چوتھا رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے، اس لیے ان نسخوں کو بالترتیب نسخۂ انجمن، نسخۂ پیرس اور نسخہ رام پور کہا جائے گا، اور فاروقی صاحب کے دریافت کردہ اوراق اشارتاً نسخۂ علی گڑھ سے موسوم کیے جائیں گے۔

**نسخۂ شروانی** مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے نکات الشعراء کا اولین ایڈیشن جس قلمی نسخے کی بنیاد پر شائع کیا تھا۔ وہ سوءِ اتفاق سے ضائع ہو چکا ہے۔ اس نسخے کی عدم موجودگی یا دوسرے لفظوں میں اس کے انفرادی وجود کا کوئی ثبوت نہ ملنے کی بنا پر راقم السطور نے اپنے تحقیقی مقالے "شعرائے اردو کے تذکرے" میں یہ رائے قائم کی تھی کہ اشاعتِ اول و اشاعتِ ثانی کے درمیان بعض بدیہی اختلافات کے باوجود، یہ وہی نسخہ تھا جس پر مولوی عبدالحق نے اپنے مرتبہ متن کی بنیاد رکھی ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے بھی دونوں اشاعتوں کے تقابلی مطالعے کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا ہے، چنانچہ اشاعتِ سوم کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

> "شروانی مرحوم کے مقدمے میں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ یہ نسخہ انجمن کو کہاں سے ملا تھا اور اس کی کتابت کب اور کہاں ہوئی تھی۔ مولوی عبدالحق نے اپنے مقدمے میں نسخے کی تفصیل دی ہے لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اشاعتوں کا متن ایک ہی خطی نسخے پر مبنی ہے۔ نامکمل اور مبہم عبارتیں بھی دونوں میں مماثل ہیں۔ ہاں کہیں کہیں ایسے اختلافات ضرور ملتے ہیں جن سے شبہ ہو سکتا ہے کہ دونوں اشاعتوں کا متن دو مختلف خطی نسخوں پر مبنی ہے۔ لیکن یہ اختلافات الفاظ کے حذف و اضافہ تک محدود

---

[1] نکات الشعراء کے ان نسخوں سے ضروری یادداشتیں ستمبر ۱۹۷۳ء سے اکتوبر ۱۹۷۸ء تک مختلف اوقات میں قلمبند کی گئی ہیں چونکہ اس وقت انہیں کسی مضمون کی شکل میں پیش کرنے کا ارادہ نہیں تھا، اس لیے ان سے متعلق تفصیلات میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی ہے، مثلاً نسخۂ انجمن کے مسطر اور نسخۂ علی گڑھ کے سائز اور مسطر دونوں کے بارے میں اطلاعات موجود نہیں۔ نسخۂ پیرس کی مائکروفلم سے استفادے کا موقع ستمبر ۱۹۷۴ء سے ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کی نوازش سے حاصل ہوا تھا، اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں مائکروفلم ریڈر کا انتظام نہیں تھا، اس لیے مائکرواسکوپ کی مدد سے کچھ نوٹس لے لیے گئے تھے۔ اس مضمون کی تحریر کے دوران ان مختصرات کے علاوہ اشاعتِ سوم

ہیں جنہیں سہو کتابت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے ....

...... دونوں اشاعتوں میں ایک ہی مفہوم کی دو مختلف روایتوں کی مثالیں نہیں ملتیں اور نہ جملوں کی ساخت اور ترتیب کا کوئی فرق ملتا ہے۔ اس لیے یہ گمان ہوتا ہے کہ دونوں اشاعتیں ایک ہی خطی نسخے پر مبنی ہیں۔ ہاں اگر دونوں اشاعتیں دو الگ الگ نسخوں پر مبنی ہیں تو اتنی بات یقینی ہے کہ ان میں سے ایک کو منقول عنہ اور دوسرے کو نقل کی حیثیت حاصل ہے[1]"

ان قیاسات کی بنیاد جن قرائن پر رکھی گئی ہے، وہ چنداں کمزور نہ تھے تاہم مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ مولوی عبدالحق کی ایک تحریر کے مطابق نسخہ انجمن انیس ۱۹۱۸ء میں یا اس سے کچھ پہلے دستیاب ہوا تھا۔ اسی زمانے میں جب کہ وہ اسے شائع کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی کہ اس تذکرے کا ایک نسخہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے، چنانچہ انہوں نے اس کی اشاعت وقتی طور پر ملتوی کر دی اور دسمبر ۱۹۱۸ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ سورت کے موقعے پر انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری کی حیثیت سے اس کی سالانہ رپورٹ میں اپنے اس اشاعتی منصوبے اور اس کے التوا کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا کہ

" حال ہی میں انجمن کو فخر شعرائے اردو، میر تقی میر کے تذکرۂ شعرائے ہندی یعنی نکات الشعراء کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ یہ ایک نایاب کتاب ہے اور خاص وجوہ سے بہت قابلِ قدر ہے۔ یہ تذکرہ اسی سال چھپ کر شائع ہو جاتا لیکن اتفاق سے یہ معلوم ہوا کہ اس کا ایک نسخہ جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کے کتب خانے میں بھی ہے، اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ دونوں نسخوں کی مطابقت کے بعد شائع کیا جائے۔ مولانائے ممدوح نے اپنی عنایت سے یہ نسخہ مستعار دینے کا وعدہ فرمایا ہے اس لیے آئندہ سال ضرور طبع ہو جائے گا[2]"

مولوی عبدالحق کے اس بیان سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انجمن کی جانب سے نکات الشعراء کی اشاعتِ اوّل سے قبل اس کے دو قلمی نسخے دستیاب ہو چکے تھے، اور ان میں سے ایک نسخہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ذاتی ملکیت تھا لیکن کتب خانہ حبیب گنج کی قلمی فہرست سے جو اس کتب خانے کے ساتھ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی تحویل میں آئی ہے، اس اطلاع کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ نسخہ فی الواقع

---

[1] نکات الشعراء طبع سوم ص ۱۶، ۱۷۔

[2] رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹیل ایجوکیشنل کانفرنس مطبوعہ مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۱۹ء ص ۱۰۴۔

مولانا حبیب الرحمٰن خاں کی ملکیت نہیں تھا۔ نظامی پریس بدایوں کے موجودہ مالک جناب جمال الدین مونس نے چند سال قبل ایک ملاقات کے دوران راقم السطور کو بتایا تھا کہ اس کے اصل مالک بدایوں کے ایک علم دوست بزرگ خان بہادر رضی الدین بسمل (متوفی ۱۵ اپریل ۱۹۲۵ء) تھے۔ شروانی صاحب نے ان سے یہ نسخہ عاریتاً حاصل کر کے انجمن ترقی اردو کے لیے اس کی اشاعت کا اہتمام کیا تھا۔ پریس کاپی کی تیاری کے وقت یہ اصل نسخہ نظامی پریس میں موجود تھا اور چند برسوں کے بعد وہیں دوسرے متعدد مخطوطات و مسودات کے ساتھ ضائع ہو گیا۔

اشاعتِ ثانی کے مقدمے میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ اس کا متن اس "مستند قلمی نسخے" کی بنیاد پر طبع کیا گیا ہے جو ۱۱۶۷ھ میں سید عبدالولی عزلت کے لیے لکھا گیا تھا لیکن طبع اول کا مقدمہ نہ تو اپنی اصل کے بارے میں اس قسم کی کوئی معلومات فراہم کرتا ہے اور نہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا متن صرف ایک قلمی نسخے پر مبنی ہے یا مولوی عبدالحق کے منصوبے کے مطابق "فی الواقع اس کی ترتیب و تدوین میں دونوں قلمی نسخوں سے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا دشوار ہے تاہم بعض قرائن اس طرف رہبری کرتے ہیں کہ نسخۂ شروانی نسخۂ انجمن کی بہ نسبت ملخص و مختصر تھا یا کم از کم اس کے بعض حصے ناقص و نامکمل تھے۔ اشاعت سے قبل نسخۂ انجمن سے مقابلہ کر کے ان ناقص یا ضائع شدہ حصوں کی تصحیح و تکمیل کر لی گئی لیکن یہ کام اتنے سرسری طور پر یا بے احتیاطی کے ساتھ کیا گیا کہ تدوین کا حق ادا نہ ہو سکا۔ اشاعتِ اول کے آخر میں شامل "غلط نامہ" بالواسطہ طور پر اس امر کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ متن کی وہ غلطیاں اور ظاہری و معنوی اختلافات جن کا اس میں تذکرہ نہیں، مرتب کے اصل نسخے یا دونوں نسخوں کے مقابلے کے بعد طباعت کے لیے تیار کردہ مسودے میں بھی بعینہٖ موجود تھے۔ مقدمۂ مرتب اور اصل کتاب میں مشترک عبارتوں کے اختلافات اس قیاس کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔ اشاعت اول کے اصل متن اور دوسری دستیاب روایتوں سے تقابل کے ساتھ اس قسم کے اختلافِ متن کی چند مثالیں سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :۔

| مقدمۂ مرتب | طبع اول و دیگر روایاتِ متن |
|---|---|
| خواجہ میر درد۔ "خواجہ ناصر ـ ـ ـ ـ از زبانِ مبارکش فرمود، میر تقی میر، تو میرِ مجلس خواہی شد ـ ـ ـ ـ باطنِ آں حضرتِ قبلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہر طاہر ترست، زود کار کرد۔" (ص ۴) | "خواجہ ـ ـ ـ ـ می فرمود کہ میر محمد تقی تو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ خضرِ قافلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر تراست ـ ـ ـ۔" (طبع اول ص ۵۴، طبع ثانی ص ۵۰) |
| | "... بزبانِ مبارک خود می فرمودند کہ ..." (طبع سوم، نسخۂ پیرس ص ۹۰) |
| | "... باطنِ آں حضرتِ قافلۂ اہلِ عرفاں ..." (نسخۂ رام پور) |

مرزا مظہر: "خوش تقریر بہ مرتبہ ایست کہ در تحریر نگنجد" (ص ۴-۵)

"۔۔۔ بمرتبہ است کہ ۔۔ نمی گنجد" (طبع اول و ثانی ص ۵)

"۔۔۔ بمرتبہ ایست کہ ۔۔ "۔۔۔ (نسخہ رام پور)

سجاد اکبر آبادی: "بسیار آدمی خوبیست۔ سخن او بپایۂ استادی رسیدہ۔ ہر بیتِ خفیفش بر جگر نشتر زدہ" (ص ۵)

"۔۔۔ رسیدہ چنیں خوش گو معنی یاب اگرچہ در بندِ لفظِ تازہ است لیکن بر زبانِ خامۂ او خیل ہائے معنی سیاہی می کند لب و دہن ہر کم بغلے نیست کہ پیش او چوں کاغذ سفید بشود۔ فکر رنگینِ او چمنِ تلاش را سایۂ ابر بہارے ہر مصرع بندش را طرف لطف باچہا رے۔ ہر بیتِ بحر خفیفش بر جگر نشتر زن ۔۔۔۔"

(طبع اول ص ۶۷، طبع ثانی ص ۶۰ و ۶۱)

"بسیار آدمی ۔۔۔ رسیدہ چنیں خوش گو ۔۔۔ می کند و فکر رنگین ۔۔۔ بہارے است و ہر بیت بحر حقیقتش بر جگر نشتر زن" (نسخہ پیرس بحوالہ طبع سوم ص ۶۶)

تاباں: "بافقیر یک صفائے درست داشت" (ص ۱۱)

"بافقیر یک صفائی داشت" (طبع اول ص ۱۱۵، طبع ثانی ص ۱۰۸)

"بافقیر صفائے کلی داشت" (نسخہ پیرس بحوالہ طبع سوم ص ۱۱۰)

عاصمی: "در شمشیر شناسی دستے تمامے دارد" (ص ۱۹)

"در شمشیر شناسی دستِ تمامے است" (طبع اول ص ۱۵۰)

"در شمشیر شناسیش دستِ تمامے است" (طبع ثانی ص ۱۱۸ و نسخہ رام پور)

"در شمشیر شناسی مہارتِ تمام دارد" (نسخہ پیرس بحوالہ طبع سوم ص ۱۱۷)

دونوں اشاعتوں کے درمیان اختلافِ متن کی ایسی مثالیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں جن میں محض سہوِ کتابت کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا. یہ اختلافات بظاہر متن کی ایک مختلف فیہ روایت کی نمائندگی کرتے ہیں. چند اقتباسات کے تقابلی مطالعے سے اس کیفیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

| اشاعتِ اول | اشاعتِ ثانی |
|---|---|
| گرامی: "پسر بیگ کشمیری است کہ قبول تخلص می کرد۔" (ص ۸) | "پسرِ غنی بیگ کشمیری ------" (ص ۸) |
| مضمون: "چوں دندانِ او لبسبب نزلہ ہمہ افتادہ بودند، از دست۔" (ص ۱۶) | "چوں ------ افتادہ بودند، خان صاحب مذبور او را شاعرِ بیدانہ می گفتند. فقیر زمانِ آخر او دریافتہ بودم۔ بسیار گرم اختلاط۔ اگرچہ برودتِ پیری غلبہ داشت اغلب کہ خدا آتش بخیر مبدل کردہ باشد۔ دریں ولد ایں جا یک دیوان روزدہ نوشتہ می شود۔ از دست۔" (ص ۱۵) |
| بے نوا: ع مرتخ پر جو تیز کی خنجر کی اپنے دھار (ص ۳۰) | ع مرتخ پھر کے تیز کیا ہے خنجر کی دھار (ص ۲۹) |
| جعفر زٹلی: "زبانِ گزیدہ داشت" (ص ۳۱) | "زبان گزندہ داشت" (ص ۳۰)، نسخۂ انجمن: زبانِ سوزندہ |
| محمد حسین کلیم: جمعہ کو کہتا تھا واعظ سے کھڑا رندِ مست<br>کچھ نظر میں ترے بھی سود و زیاں ہے کہ نہیں (ص ۵۱) | جمعہ کو --------- کھڑا اک رندِ مست<br>------ تجھے بھی -------- (ص ۴۷) |
| (موخر) یقین: "جدش ------ شعر بطرز نی گوید" (ص ۸۵) | "------ شعر فارسی ------" (ص ۸۱)<br>"------ شعر فارسی بطرز نیکو ------" (نسخہ پیرس) |
| "در بزرگ زادگی و شرافت میاں یقیں سخنے نیست" (ص ۸۶) | "در ---- شرافت و نجابت میاں ----" (ص ۸۳)<br>"در بزرگی و بزرگ زادگی و شرافت و نجابت ----" (نسخہ رامپور) |
| (مقدم) سجاد اکبر آبادی: "بے انصافی امر علیحدہ است وگرنہ تہ داری شعرِ سوختۂ پیچدارش بوئے آتش دیدہ می ماند۔" (ص ۶۲) | "------ تہ داری شعر او نمایاں است۔ ہر کہ واقفِ موشگافی طبعِ او ست می داند کہ شعرِ سوختہ پیچدارش ------" (ص ۶۱) |
| یقین: یہ اشک و آہ سے سودا بگڑ نہ جائے کہیں | اس اشک ---- بگڑ نہ جاوے کہیں |

یہ دل بھی آب رسیدہ ہے اور جلا بھی ہے (ص ۹۱) یہ دل کچھ آب ---- کچھ جلا ---- (ص ۸۳)

اشاعتِ اول و اشاعتِ ثانی کے درمیان متن کے بین فرق کی ان مثالوں کے باوجود اگرچہ وثوق کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ نسخہ شروانی نسخہ انجمن سے کس قدر مختلف تھا لیکن یہ اندازہ بہرحال ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں نسخے بعینہٖ ایک دوسرے کے مطابق نہیں تھے، ورنہ ان اختلافات و محذوفات کو غلط نامہ میں شامل کر کے بہ آسانی ان کی تصحیح و تکمیل کی جا سکتی تھی۔

**نسخہ انجمن** نکات الشعراء کا دوسرا ایڈیشن جس خطی نسخے پر مبنی ہے وہ اس کی تصنیف کے صرف سات برس بعد حیدر آباد میں کسی قدیم تر نسخے سے نقل کیا گیا تھا۔ اس کا ترقیمہ جو اس کے بارے میں نہایت اہم معلومات فراہم کرتا ہے، درج ذیل ہے:۔

"تمام شد نکات الشعراء ہندی من تصنیف میر تقی میر تخلص بحسب الفرمائش حضرت سید عبدالولی صاحب و قبلہ عزلت تخلص۔ کاتب الحروف سید عبدالنبی ابن سید محمد ابن میر محمد رضا اصفہانی غفر اللہ ذنوبہما و ستر عیوبہما۔ در بلدۂ فرخندہ بنیاد ابد بنیاد۔ تحریر فی التاریخ ہفدہم شہر رمضان المبارک ۱۱۷۲ھ یک ہزار و یک صد و ہفتاد و دو من الہجرۃ النبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم۔" (ورق ۵۲ الف)

یہ نسخہ صحیح و سالم حالت میں انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ کتب خانے کی فہرستِ مخطوطات میں اس کا نمبر ۹۲ ہے۔ یہ نسخہ ۵/۱۰×۷ انچ سائز کے ۵۲ اوراق یا ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلا اور آخری صفحہ سادہ ہے۔ دوسرے صفحے کی پیشانی پر کاتبِ متن کے علاوہ کسی دوسرے شخص کی تحریر میں "من تصنیف میر تقی رحمۃ اللہ علیہ" مرقوم ہے۔ اس کے نیچے چند سطروں کے بقدر جگہ خالی ہے۔ بعد ازاں "رب یسر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و تمم بالخیر" کے ساتھ اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سطر میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سیاہ روشنائی سے اور رب یسر و تمم بالخیر شنجرفی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ خط رواں مگر نہایت پختہ اور صاف ہے۔ کاتب اپنے زمانے کی عام روش کے مطابق ک اور گ، ہائے سادہ اور ہائے مخلوط اور یائے معروف و یائے مجہول میں امتیاز کا پابند نہیں۔ تحریر میں بھی حسب دستور قدیم شروع سے آخر تک تسلسل قائم رکھا گیا ہے یعنی دو شاعروں کے تراجم یا نثری عبارات اور انتخابِ کلام کے درمیان کوئی حد فاصل موجود نہیں، حتیٰ کہ اشعار بھی نثر کی طرح مسلسل لکھے گئے ہیں البتہ اشعار سے قبل بیت کی معروف علامت ــہ کا اور دو شعروں نیز ایک شعر کے دو مصرعوں کے درمیان ایک مخصوص نشان ؏ کا التزام رکھا گیا ہے۔ ان دونوں علامتوں کے لیے بالعموم شنجرفی روشنائی استعمال ہوئی ہے۔ امیر خسرو سے محمد حسین کلیم تک پہلے اکیس شاعروں کے نام اور تخلص بھی شنجرفی روشنائی سے لکھے گئے ہیں اس کے بعد باقی شعرا کے نام سیاہ روشنائی سے لکھ کر ان کے اوپر سرخ لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ جلد بندی کے دوران اس مخطوطے کے دو ورق بے ترتیب ہو گئے ہیں چنانچہ موجودہ ورق نمبر ۴۳ اصلاً ورق نمبر ۴۶ اور موجودہ ورق نمبر ۴۶ اصلاً ورق نمبر ۴۳ ہے۔

نسخۂ انجمن کے شروع اور آخر میں دونوں طرف مختلف قسم کے کاغذ کا ایک ایک فاضل ورق ملحق ہے۔ پہلے ورق کے دوسرے صفحے پر "درد" کے نام سے یہ دو شعر منقول ہیں ؎

جس کام کو آئے تھے (ہ)، کام تو کچھ کر لیے — آغاز اگر کھویا انجام تو کچھ کر لیے

ہو جائیے افلاطوں یا عقل کو کھو منتوں — دنیا میں بہر عنواں یک نام تو کچھ کر لیے

ان اشعار کے نیچے "از دستِ امام بخش" لکھا ہوا ہے۔ یہ امام بخش کون ہیں، فی الحال یہ بتانا نہ تو ممکن ہے اور نہ بظاہر اس دریافت سے ہماری معلومات میں کسی اضافے کا امکان نظر آتا ہے۔ آخری فاضل ورق کے صفحہ دوم پر بھی انہی امام بخش کے ہاتھ کی تین متفرق تحریریں موجود ہیں۔ پہلی تحریر اس نسخے کے مالک سید عبدالولی عزلت کے انتقال کی مندرجہ ذیل دو تاریخوں پر مشتمل ہے

بے نظیر بود
۱۱۸۹ھ

رفتند زیں جہان فانی بسوے جنت
افسوس ہائے شاہ عبدالولی عزلت

۱۱۸۹ھ

دوسری تحریر میں "سوز" کا عنوان قائم کر کے یہ دو شعر نقل کیے گئے ہیں ؎

سوزِ دل آگے ترے کر کے بیاں او تہہ جائنگے — جل چکیں دگے جس گھڑی ہم شمع ساں او تہہ جائنگے

دم غنیمت ہے یہ صحبت، پھر خدا جانے میاں — تم کدھر بیٹھو گے جا کر، ہم کہاں او تہہ جائنگے

تیسری تحریر کے تحت نورجہاں بیگم کے نام سے یہ رباعی منقول ہے:-

جس روز کے ہو ئنگا اذا السماء شقت — خورشید سیاہ و اذا "نجوم" کدرت

او سوقت ترا میں پکڑ کر دامن — بلونگی صنما باتی ذنب قتلت (کذا)

پیشِ نظر نسخے اور انجمن کی اشاعتِ ثانی کے تقابلی مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نسخۂ مطبوعہ تدوین و طباعت کے دوران اصلاح و ترمیم اور تحریف و تصرف کے ان تمام مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچا ہے جو کسی متن کی بے احتیاطی اور غیر ذمہ داری کے ساتھ ترتیب و اشاعت کی صورت میں پیش آسکتے ہیں۔ اس مضمون میں نہ تو ان دونوں نسخوں کے تمام اختلافات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے بطور نمونہ صرف چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

| نسخۂ انجمن | اشاعتِ ثانی |
| --- | --- |
| مرزا مظہر: "یقین و حزیں کہ شاعرانِ ریختہ اند" | "یقین و حزیں کہ شاعر ریختہ اند" (ص) |

| متن | اختلافات |
| --- | --- |
| آبرو : ؎ دل کب آوارگی کو بھولا ہے | - - - - - - - - - - - |
| خاک اگر ہو گیا، بگولا ہے | چاک - - - - - - - - (ص |
| ؎ آغوش میں بھواں کی کرتی ہیں قتل آنکھیں | - - - - - - - - - - - |
| کوئی پوچھتا نہیں ہے مسجد میں خون ہو ہے | - - - - - - - - - - خوں ہوا ہے |
| مضموں : متوطن جا جنو | متوطن جا جنو (ص ۱۴) |
| جعفر زٹلی : "زبانِ سوزندہ داشت" | "زبانِ گزندہ داشت" (ص ۳۰) |
| سجاد اکبر آبادی : "ہر مصرعِ بلندکش را طرفِ لطف باچارے" | "ہر مصرعِ بندکش را - - - - - - - -" (ص ۶۱) |
| حاتم : "شعر خوبیست لیکن لطیفۂ مبتذلِ شیداست" | "شعر خوبست - - - تبدل - - - - -" (ص ۷۸) |
| یقیں : شاعریؔ او لعصر دیقینی نیست - - - - - - - | "شاعریؔ او خالی از نقص نیست - - - - -" (ص ۸۲) |
| اکثر شاعرانِ ریختہ را مبتذل بند یا ختتام، تبدل می | - - - - - - - - - - تبذل بند - - - - تبذل |
| گویند و تواردی نامند - - - - - - شعر یقیں | - - - - - - - - - - - - - - - - - - |
| لفظاً لفظاً مبتذلِ رائے انند رام مخلص است۔" | - - - - - - تبدل - - - - - " (ص ۸۴) |
| ؎ دیوانہ ہوں میں جیو سے مجنوں کے سلیقہ کا | - - - - - - - - میں اپنے جیو سے - - - - |
| مرنے لے سے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے | دیوانِ یقیں : میں جیو دینے میں |
| | - - - - - - - - - - - - (ص ۸۸) |
| ؎ نہ دے برباد خارِ آشیاں کو عندلیباں کے | - - - - - - - - - - - |
| صبا لیے بھی (دیہ بھی) ہوا خواہوں میں ہیں آخر گلستاں کے | صبا تو بھی - - - - میں ہے - - - - (ص ۸۸) |
| احمد گجراتی : ؎ نساں بے نساں پاتے ہیں ملکِ یکرنگی | نشانِ بے نشاں ہم ملکِ یکرنگی میں پاتے ہیں |
| خبر چھوڑی دوئی کا سیت نگر نکلے | خبر چھوڑی دوئی کا ہم نے جب سے ست نگر نکلے (ص ۹۹) |
| (نسخۂ پیرس : نشانِ بے نشاں پانے چلیں ہیں ملکِ یکرنگی۔ | خبر سر پاؤں کی چھوڑی، دوئی کا ہم سٹ نگر نکلے) |
| صہبائی احمد آبادی ؎ زر سے ہے آشنائی، زر سے ملے ہے بھائی | مصرعِ ثانی : - - - - - - دنیا جو ہے سو زر ہے (ص ۹۹) |
| زر نہیں تو ہے جدائی دنیا جو ہے زر ہے | نسخۂ رام پور : - - - - - دنیا میں جو ہے، زر ہے |
| تاباںؔ : "ہم چو او شاعر خوش ظاہر از مکمن بطونِ عدم بعرصۂ | - - - - - - - - از مکمن بطونِ عدم - - - (ص ۱۰۹) |
| ظہور جلوہ گر نشدہ۔" | |

نجم الدین علی تسلام ؛ " آدمیت حرمت ، عزمت ہمہ دارد " حرمت ، عظمت (ص ۱۳۲)

میر عبدالرسول نثار ؛ " شعر بشورتِ من می گوید " " بمشورتِ من می گوید " (ص ۱۳۴)

میر سہ برگشتہ بخت دیکھ کہ قاصد سفر میں سی (= سے میں) برگشتہ سفر ہیں سے

سجادہ بھیجا، تھا اس کے پاس سو میرے وطن گیا پہنچا تھا اس (ص ۱۵۷)

نسخۂ انجمن کے کاتب نے بعض الفاظ کا املا غلط لکھا ہے ، فاضل مرتب نے نسخہ مطبوعہ میں بغیر کسی اشارے یا صراحت کے ان تمام غلطیوں کی اصلاح فرمادی ہے ۔اس قسم کے چند الفاظ درج ذیل ہیں ۔

(۱) خشاشس بشاش (بشاشس بشاش) ؛ " حریف ظریف ، خشاش بشاش ، ہنگامہ گرم کن مجلس ہا " (مضمون)

(۲) تحت السریٰ (تحت الثریٰ) ع جو کوئی گرا سو آخر تحت السری کو پہنچا (سجاد اکبر آبادی)

(۳) مذدور (مزدور) ع قیس و فرہاد سادہقانی و مذدور نہیں (محسن)

(۴) اسطبل (اصطبل) ع اگاڑی اسطبل کی جا پچھاڑی (دکترین)

(۵) گلذار (گلزار) ع سرو گلذار حلائی کی قسم (یکدل)

ع عمر گذری کہ وہ گلذار کا جانا ہی گیا (میر)

**نسخہ پیرس :** نکات الشعراء کا یہ قلمی نسخہ پیرس کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے ۔ اس میں اصلاً کل اٹھاون اوراق یا ایک سو سولہ صفحات تھے ۔موجودہ نسخے سے ورق نمبر ۲ غائب ہے ۔اس طرح اب اس کے اوراق کی تعداد ستاون رہ گئی ہے ۔ ورق نمبر ۱ کا بالائی حصہ بھی ضائع ہو چکا ہے لیکن اس کی وجہ سے متن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے ۔اس ورق کے پہلے صفحے پر کتاب کی شناخت اور ملکیت سے متعلق دو تحریریں ملتی ہیں ۔پہلی تحریر میں کتاب کے نام کے بعد کی کچھ عبارت ورق کے دریدہ حصے کے ساتھ تلف ہو گئی ہے اس سے اگلی سطر میں " تلمیذ قدوۂ اہل معانی سراج الدین علی خان صاحب آرزو " لکھا ہوا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ضائع شدہ حصۂ عبارت میں مصنف کا نام لکھا گیا ہوگا ۔دوسری تحریر جو پوری طرح محفوظ ہے ، حسب ذیل ہے ۔

" ایں کتاب تذکرۂ میر را حاجی میر جعفر محمد قبلہ میر گوہر علی مرحمت نمود ۔ بتاریخ بست یکم ماہ شعبان ۱۲۱۴ ہجری کہ از گجرات آمدہ بودند " (بحوالہ طبع سوم ص ۱۹)

ورق اول کا دوسرا صفحہ جس سے کتاب کے اصل متن کی ابتدا ہوتی ہے ، امیر خسرو کے تعارف سے متعلق الفاظ " فضائل او اظہر " پر ختم ہو جاتا ہے ۔ اگلا صفحہ جو اصلاً ورق نمبر ۳ کا صفحہ اول ہے ۔ مرزا مظہر کے ترجمے کے ایک ناقص الاول جملے " از فرط شفقتِ پدری مرزا جانِ جاں می گفت " سے شروع ہوتا ہے ۔ اس طرح ایک ورق کے درمیان سے غائب ہو جانے کی

وجہ سے امیر خسرو اور مرزا مظہر کے تراجم کو جزوی طور پر نقصان پہنچا ہے اور بیدل، آرزو اور مرزا معز کے تراجم یکسر تلف ہو گئے ہیں۔ ورق نمبر ۳ سے آخر تک تمام اوراق مسلسل ہیں البتہ ان کی کتابت کے دوران بعض شعرا کے تراجم کاتب نے قصداً قلم انداز کر دیے ہیں اور بعض کے ترجمے بربنائے سہو نقل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ جن شعرا کو بالقصد خارج کیا گیا ہے، ان میں شعوری جوالا پوری کا نام سرفہرست ہے۔ قاسم میرزا کے بعد ان کا ترجمہ نقل کرنے کی بجائے کاتب نے قارئین کی آگاہی کے لیے اپنی طرف سے مندرجہ ذیل نوٹ کا اضافہ کیا ہے جو اس سلسلے میں ان کے موقف کی وضاحت کرتا ہے :۔

"واکثر مذکورِ شعرائے متقدمین و آیۂ یتبعہم الغاؤن درشانِ شاں ست۔ مولفِ ایں تذکرہ اذکارِ شاں را معہ شعرہائے پر ولوچ لالیعنی نوشتہ بود، چوں کاتب راتعصب بود، اوقات عزیزِ خود راضائع نہ نمود و ہمیں احمد گجراتی و قاسم گجلاتی اکتفا نمود۔ بقول قدیم مشتے نمونہ از خروار" (بحوالہ طبع ثالث ص ۱۹)

نسخۂ انجمن کے مطابق اس تخفیف کی زد میں کل اکیس شاعر آئے ہیں۔ شعوری کے علاوہ باقی شاعروں کے تخلص یا نام درج ذیل ہیں۔

فضلی، مہتابی، محمود، سالک، ملک، لطفی، فخری، ہاشم، ہاتفی، اشرف، غواصی، خوشنود، جعفر، عبدالرحیم عبدالبر، عزیز اللہ، سعدی، بے چارہ، حسن اور داؤد۔

جن شعرا کی اس نسخے سے غیر حاضری سہو کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، ان میں خواجم قلی خاں موزوں، عاجز، (مجہول الاسم) اور میر گھاسی شامل ہیں۔ موزوں کا تخلص موجود ہے لیکن اس کے فوراً بعد میر محمد علی (کذا : محمد باقر) حزیں کا حال شروع ہو گیا ہے یہی صورت عاجز کے سلسلے میں بھی پیش آئی ہے ان کے تخلص کے تحت غلطی سے مشتاق کا حال نقل کر دیا گیا ہے۔ اس سہو کے نتیجے میں عاجز اور ان کے بعد آنے والے شاعر میر گھاسی کے تراجم شامل کتاب ہونے سے رہ گئے ہیں۔ اس طرح نسخۂ پیرس سے اس کی تکمیل کے وقت نسخۂ انجمن میں مذکور ایک سو تین شاعروں میں سے چوبیس شاعر غیر حاضر تھے۔ ورق نمبر ۲ کے اتلاف کی بنا پر یہ تعداد بڑھ کر ستائیس ہو گئی ہے اور دو شاعروں کے تراجم نامکمل رہ گئے ہیں۔ اس نسخے میں ایک شاعر عطا بیگ ضیا کا حال دوسرے نسخوں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ اسے شامل کر کے موجود شاعروں کی مجموعی تعداد ستتر ہو جاتی ہے۔ نسخۂ ہذا کا اختتام مندرجہ ذیل ترقیمے پر ہوتا ہے :۔

"بتاریخ ہفدہم شہر شوال روز چہار شنبہ ۱۱۷۸ھ ہجری در بندر سورت بموجب خواہش جمیع دوستاں بہ اتمام رسید"

شاعروں کی فہرست سے بعض ناموں کے اخراج کے علاوہ مقدارِ کلام کا فرق اس نسخے کی دوسری نمایاں خصوصیت ہے جو اسے نسخۂ انجمن سے ممیز کرتی ہے۔ چنانچہ اس میں جہاں بعض شاعروں کے انتخاب اشعار میں تخفیف کی کارفرمائی نمایاں ہے وہیں بعض شعرا کے نمونۂ کلام میں معتد بہ اضافے کی مثالیں بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک دو اشعار کی کمی بیشی کو ایک اتفاقی امر یا سہو کاتب قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن مقدارِ کلام کا یہ عمومی اور بیّن فرق تحقیق متن کے نقطۂ نظر سے غیر معمولی اہمیت کا حامل

ما خود از صورت گراں بینش از خیالے نیستیم
شاید از دستِ شما صورت بگیرد کارِ ما

ہے۔ یہ طے کرنا بہرحال دشوار ہے کہ ان مختلف فیہ انتخابات میں سے کس نسخے میں شامل کلام مصنف کے اصل انتخاب کیمطابق ہے اور کون سا نسخہ کاتب کی تحریفات و تصرفات سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

نسخہ پیرس میں جن شعرا کے کلام کی مقدار نسخہ انجمن کی بہ نسبت کم ہے، ان میں محمد حسین کلیمؔ، سجاد اکبر آبادی، محمد محسن محسنؔ اور خود مولف تذکرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ نسخہ انجمن میں ان شعرا کے اشعار کی تعداد علی الترتیب چھیاسٹھ، ایک سو تیرہ، بتیس اور دو سو سینتالیس ہے۔ نسخہ پیرس کے کاتب نے ان میں سے کلیمؔ کے اڑتالیس، سجاد کے ستتر، محسنؔ کے سترہ اور میرؔ کے ایک سو پچاس شعر نقل کیے ہیں، اور ان میں کوئی شعر ایسا نہیں جو نسخہ انجمن میں موجود نہ ہو۔ اضافہ اشعار کے لحاظ سے مظہرؔ، ناجیؔ، یک رنگؔ عاجزؔ، حزیںؔ، بیدارؔ اور بسملؔ کے انتخابات اہم ہیں۔ نسخہ انجمن کے مقابلے میں اس نسخے میں مظہرؔ کے کلام میں ایک غزل کے چار شعر، ناجیؔ کے کلام میں پانچ اشعار کی ایک مکمل غزل اور یکرنگؔ کے کلام میں چھ غزلوں کے نو متفرق اشعار زائد ہیں، اور صرف یکرنگؔ کے انتخاب سے ایک شعر حذف ہوا ہے۔ عاجزؔ کے انتخاب میں نسخہ انجمن میں دو شعر منقول ہیں، اس نسخے میں ان شعروں کی بجائے گیارہ نئے شعر شامل کیے گئے ہیں۔ حزیںؔ، بیدارؔ اور بسملؔ کا نمونۂ کلام نسخہ انجمن میں صرف ایک ایک شعر پر مشتمل ہے، نسخہ پیرس میں ان شعرا کے اشعار کی تعداد علی الترتیب دس، اکتالیس اور اکیس ہے اور ان میں سے صرف بسملؔ کا واحد شعر حذف کیا گیا ہے۔ جو اشعار اس نسخے میں زاید ہیں، ان میں سے بعض متعلقہ شاعروں کے دستیاب کلام پر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

نمونۂ کلام کی طرح شعرا کے تعارف میں بھی ترمیم و تصرف اور قطع و برید کے اس عمل کی کارفرمائی نمایاں ہے۔ چنانچہ الفاظ اور فقروں کے معمولی ردّ و بدل کے علاوہ مکمل اور مستقل بالذات عبارات اور جملوں کے حذف اور اضافے کی مثالیں بھی جا بجا موجود ہیں۔ نسخہ انجمن کے مطابق میر صاحب نے انتخاب کلام کے ذیل میں بعض مقامات پہ اشعار کے حسن و قبح کے متعلق اظہارِ خیال کیا ہے اور الفاظ و محاورات کے غلط استعمال پہ گرفت کی ہے، اس نسخے کے کاتب نے اس قسم کی بیشتر عبارتیں حذف کر دی ہیں، صرف سجاد اکبر آبادی ہی کے ترجمے میں اس تخفیف کی تین مثالیں موجود ہیں۔ میر صاحب کے حذف شدہ فرمودات مندرجہ ذیل اشعار سے تعلق رکھتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یھاں کوئی | مرجا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا |
| کس طرح کوہ کن پہ گزریں گی | ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں |
| میرا جلا ہوا دلِ مژگاں کے کب ہے لائق | اس آبلہ کو کیوں تم کانٹوں میں اینچتے ہو |

پہلے شعر کے بارے میں میر صاحب نے فرمایا ہے کہ "اگرچہ باطل باطل است لیکن بجائے کافر کہ اولِ پیش مصرع واقع است، باعتقاد فقیر باطل حق است۔" اس نسخے میں یہ عبارت موجود نہیں۔ دوسرے شعر کے تحت میر صاحب نے یہ لکھا کہ "از مصنف ہم چنیں ہر دو مصرع شنیدہ شد" اس کے متن میں حسب ذیل اصلاح تجویز کی ہے ؎

ہجر شیریں میں کیونکہ کاٹے گا
کوہ کن یہ پہاڑ سی راتیں

اس نسخے کے کاتب نے سجاد کے اصل شعر اور اس کے متعلق میر صاحب کے بیان کو حذف کر کے یہ ترمیم یافتہ شعر بنیادی متن کے طور پر شامل کتاب کر لیا ہے۔

تیسرے شعر کے بارے میں میر صاحب کا ارشاد ہے کہ "ہر چند در مثل تصرف جائز نیست زیرا کہ مثل ایں چنیں است کہ کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہو لیکن چوں شاعر را قادر سخن یافتم، معاف داشتم" نسخۂ پیرس سے یہ عبارت بھی خارج ہے۔

محمد یار خاکسار کے بارے میں میر صاحب کا درج ذیل بیان بھی اس نسخے سے حذف کر دیا گیا ہے۔

"اگر کسے تکلیف شعر کند، گویدکہ وقتے بیمار بودم۔ آہ آہ من ایں رنگ داشت۔ سبحان اللہ مردماں ایں را شعری نامند۔ بابا من شعر نمی گویم و با ایں برادران یوسف کہ ماشاعراں باشیم ربطے ندارم، مرا معاف دارید۔ الغرض بسیار کم ذہمت و بے تہ است۔"

اشرف علی خاں فغاں کے انتخاب کلام میں اس نسخے میں نسخۂ انجمن کی بہ نسبت دو شعر زیادہ ہیں۔ ان میں سے دوسرے شعر سے متعلق ایک واقعے کا مفصل بیان دوسرے نسخوں پر اضافے کی مثال پیش کرتا ہے۔ شعر درج ذیل ہے ؎

شمع رو مت راہ دے خلوت میں پروانے کتیں
اے ترے قربان ہم کیا کم ہیں جل جانے کتیں

متعلقہ واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

"مسموع گشتہ کہ روزے اشرف علی خاں فغاں و نواب امیر خاں مرحوم درخدمت بادشاہ محمد شاہ نور اللہ مرقدہٗ استادہ بودند، بادشاہ از راہ شفقت و مہربانی بہ فغاں فرمودند کہ دریں روزہا اگر شعر ریختہ تازہ گفتہ باشی، بخواں، فغانِ مذکور چوں ایں شعر را کہ تازہ گفتہ بود، بہ عرضِ اقدس اعلا رسانید، بسیار موردِ تحسین گشت۔ نواب امیر خاں گفتند کہ شعر بسیار رنگین و مضمون روشن گفتہ اید اما اگر بجائے لفظ "قربان ہم"، "جل جائیں ہم" می بود، رتبۂ دیگر داشت چوں حرف "جل جائیں ہم" برائے سوختن پروانہ مناسبات کلی داشت، حضرت ظل سبحانی تحسین فرمودند و ہمیں حرف مکرر بر زبانِ مبارک خود خواندند، "اے ترے جل جائیں ہم" گویا جان در قالب شعر دمیدہ شد۔ غفر اللہ لہٗ۔"

(بحوالہ طبع ثالث ص ۷۷،۷۶)

ایک ایک دو دو جملوں، فقروں اور لفظوں کی کمی بیشی، تقدیم و تاخیر اور تغیر و تبدل کی مثالیں اس نسخے کے تقریباً ہر صفحے پر موجود ہیں۔ ان میں سے چند سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔ مقابلے کے لیے اشاعتِ ثانی کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔

| طبع ثانی | نسخہ پیرس |
| --- | --- |
| "از فرطِ شفقت مرزا ------ | مرزا مظہر: "از فرطِ شفقتِ پدری مرزا جانِ جاں می گفت، ازیں سبب |
| --- موسوم است ------ اوشاں رفتہ۔ | بہمیں اسم موسوم گشت۔ بندہ بخدمتِ اوشاں سعادت |
| ------ دیوانِ مختصر فارسی او | اندوز گشتہ است۔ ---- دیوانِ مختصر شعر فارسی اوشاں |
| ------ از سلیم و کلیم --- | بنظر فقیر مولف آمدہ است۔ از شعر سلیم و کلام کلیم پائے |
| ------ شعر گفتن ------ | کمی ندارد۔ اگرچہ شعر ہندی گفتن دونِ مرتبہ است لیکن گاہے |
| ------ می شود۔ انعام اللہ --- | گاہے متوجہ ایں فنِ بے حاصل نیز می شوند و انعام اللہ یقینؔ |
| --- شاعر ریختہ اند، شاگردانِ اویند۔ غرض مرزا | حزیں کہ شاعرانِ ریختہ اند، شاگردانِ اوشانند۔ غرض مرزا |
| عجب کسے است۔" (ص ۵) | جانِ جاں مظہر عجب کسے است۔" |
| "غرض مستغنی وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ باشد | (مرزا) آبرو: "غرض مستثنیٰ وقتِ خود بود و در عہد محمد شاہ بادشاہ |
| ---- بکند۔" (ص ۹) | برفت خدا کش مغفرت کند۔" |
| "ہمیشہ خندان و شگفتہ رو بسر برد | (مقدم) امید: "ہمیشہ خندان و شگفتہ رو ---- اوقاتِ عزیز |
| ------ امرا بود ------ | خود را بخوشی و خرمی بسر می برد۔ داخلِ ذیلِ امراد خوانین |
| ------ و صحبت ہا می داشت۔" | بود۔ در ہر سیر و تماشا می رفت و صحبت ہا با یارانِ یک دل |
| (ص ۷) | و صاحب طبع می داشت۔" |
| "فقیر زمانِ آخر او را دریافتہ ------ اختلاط۔ | مضمون: "فقیر او را در اواخر زمانِ او دریافتہ بودم، بسیار گرم |
| --- دریں ولا ایں جا یک دیوان روز روزہ نوشتہ می شود۔ | اختلاط بود ---- دریں ولا از دیوانِ او منتخب نمودہ |
| (ص ۱۵) | نوشتہ شدہ۔ |
| ------ | اتفاقاً من اشعارِ ایشاں را انتخاب می زدم -- |
| ---- شعر ایں قسم بود۔ | ---- شعر ایں قسم در دیوانش نوشتہ بود۔ |
| میرے ------ | میرے پیغام کو تو اے قاصد |
| ----- کر کر" | کہیو سب سے اسے جدا کر کر |
| (ص ۱۶، ۱۷) | گفتند کہ اگر بجائے پیغام کو، پیغام وصل می گفت، |
| | ایں پست رتبہ اعلیٰ بہم می رسند" و ایں بیت برتبۂ |

اعلیٰ می رسید)

سودا :۔ بسیار خوش فکر و خوش گو است ــ ــ بحضور طبع عالیش طبعِ عالی شرمندہ۔ شاعر ریختہ چنانچہ باید، ملک الشعرا لیست کہ وصفش در تحریر ناید۔ قصیدہ در ہجو اسپ گفتہ مسمّٰی بہ تضحیکِ روزگار ــ ــ ــ ــ واکثر اوقات طرحِ غزلِ فارسی می کند ــ ــ حق تعالیٰ دیر گاہ بسلامت دارد۔"

"بسیار خوش گو است ــ ــ ــ ــ ــ پیش فکر عالیش ــ ــ ــ ــ ــ ــ چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اورا شاید ــ ــ ــ ــ ــ است گفتہ بہ تضحیک ــ ــ ــ ــ اکثر اتفاقِ طرح غزل باہم می افتد ــ ــ ــ ــ حق تعالیٰ سلامتش دارد۔" (ص ۳۱ و ۳۲)

سجاد :۔ "بر زبانِ خامۂ او خیلہائے معنی سپاہی می کند و فکر رنگین او چمنِ تلاشش را سایۂ ابرِ بہاری است و ہر بیتِ بحرِ حقیقتش بر جگر نشتر زن۔ زبان لطافت بیانش رگِ جانِ سخن۔ ہر کہ واقفِ موشگافیٔ طبعِ اوست ــ ــ ــ۔"

"ــ ــ ــ ــ ــ سپاہی می کند۔ لب و دہنِ ہر کم بغلے نیست کہ پیش او چوں کاغذ سفید نشود و فکر رنگین ــ ــ ــ ــ ــ بہارے، ہر مصرعِ بندشش را طرف لطف یا چنارے ہر بیتِ بحرِ خفیفش ــ ــ ــ ــ زبان طاقت بیانش رگ سخن۔ بے انصافی امر علیحدہ است وگرنہ تہ داری شعر او نمایاں است۔ ہر کہ واقفِ موشگافی ــ ــ ــ۔"

(ص ۱۰۰ و ۱۰۱)

کرم اللہ خاں درد :۔ "بسیار خوش فکر و رنگیں گو و عاشق پیشہ کہ سخن او خالی از دردمندی نیست۔ الحق کہ خوب می گوید و خوب می فہمد و طبعِ شور انگیزے دارد، بندہ را یک دفعہ اتفاقِ ملاقات شدہ است و اختلاط بسیار بمیاں آمدہ است۔ مردِ خوبیست۔ خدایش سلامت دارد۔"

"بسیار خوش فکر و عاشق سخن۔ خالی ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ نیست۔ خوب ــ ــ ــ فہمد۔ بندہ بخدمتِ او رفتہ یک ملاقات کردہ ام۔ طبعِ شور انگیزے دارد۔ مرد خوشیست۔ خدایش زندہ دارد۔"

(ص ۴۶ و ۴۷)

"مخفی نماند کہ شاعرانِ سمت ملک دکھن اکثر بے رتبہ اند مگر بعضے چنانچہ ولی محمد کہ صاحب دیوان مشہور و معروف است و سید عبد الولی عزلت و سراج و آزاد کہ ہم عصر ولی بود، عارف علی خاں عاجز کہ سررشتۂ مربوط گوئی بدستِ ایشاں افتادہ است و باقی ہمہ ہا درست حرف زدن نمی دانند تا بشعر گوئی چہ نسبت، لہٰذا بر اشعار اکثر آنہا اکتفا

"مخفی نماند کہ احوال یکے ازیں شاعران سمت دکن کہ پر بے رتبہ اند مگر بعض چنانچہ ولی و سید ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ کہ معاصر ولی بود۔ سررشتۂ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ایشاں یافتہ می شود باقی سر کلافۂ داشت (= درست) حرف زدن ہمہ ہا کم (= گم) است لہٰذا بر تخلص اکثر ــ ــ ــ ــ ــ نوشتہ آمد۔"

کردہ نوشتہ می آید"

عزلت : "مرشد عالم گیر بادشاہ بودند ــــــــ شعر فارسی بسیار
خوب و مربوط می گوید. صاحب دیوانِ فارسی اند المحال مجموعۂ
فضل و کمال اند لیکن مزاج او شاں میلانِ ریختہ بسیار دارد.
از چندے واردِ شاہجہان آباد شدہ اند ــــــــ بہرۂ
وافی از دردمندی دارند ــــــــ با فقیر بسیار محبت
دارند و جوشش ہا می کنند ــــــــ حق تعالی بسلامت
دارد"

عاجز : "فقیر شور او را شنیدہ بودم لاکن بخدمت او نرسیدہ ام
حالا مدت است کہ طرف دکھن رفتہ است۔ اکنوں
از زبانِ سید عبد الولی صاحب شنیدہ شد کہ در اورنگ
آباد است ــــــــ زبانش بزبانِ
او باشاں می ماند۔ خوب می گوید و اکثرے در بحر ــــ
و کتب ریختہ می کند۔ چندے از و نوشتہ می شود و
اکثر قافیہ ہائے نامربوط را خوب موزوں می کند"

بیدار : "میاں محمد علی بیدار، جوانے است بسیار مرد آدمی و خوش
خلق از شاہجہان آباد۔ شعر ریختہ بسیار صاف و شستہ
می گوید صاحب دیوان است۔ از یارانِ مرزا مرتضیٰ قلی
بیگ فراق تخلص کہ بسیار شاعر مربوط فارسی اند ہست
اکثر در صحبت ہا با فقیر بگرمی پیش می آید۔ الحاصل مرد
خوب رنگیں مزاج است۔ خدا سلامت دارد"

تمکین : "جوانِ رنگیں مزاج، شوخ طبع با تمکین است۔ درویش
وضع یکسے کار ندارد۔ بہر طور کہ می گذرد، بسر می برد"

(ص ۸۹)

"مستند عالم گیر بودند ــــــــ مشق شعر
فارسی ہم کردہ اند لیکن مزاج ــــــــ
ــــــــ تازہ واردِ ہندوستاں کہ
عبارت از شاہجہاں آباد است، شدہ اند ــــ بہرۂ
بسیارے از ــــــــ با فقیر جوشش ہا
ــــ خدا ایشاں را سلامت دارد"

(ص ۹۲، ۹۳)

"بندہ شور او شنیدہ بودم۔ از چندیں بسمت دکن رفتہ۔
اکنوں ــــــــ سید
مذکور بوضوح می پیوند کہ در برہان پور است ــــ
ــــ زبانش ــــ او باشاں است
اکثر ریختہ در بحر کبت می گوید"

(ص ۹۶، ۹۷)

"بیدار تخلص جوانے است از یارانِ مرتضیٰ قلی بیگ
فراق مصرع ریختہ درست موزوں می کند و مرزا مرتضیٰ قلی
شاعر مربوطِ فارسی است۔ اکثر در ــــــــ
ــــــــ پیش می آید"

(ص ۱۳۲)

"جوانے بے تمکینے نہ تمکن۔ باصلاح یارانِ شوخ طبع مردیست
درویش وضع ــــ طوریکہ باشد، بسر می برد"

(ص ۱۳۷، ۱۳۸)

بسمل ۱: "میاں بسمل شاعر ریختہ ہندی است۔ از ہست و بود او کما حقہٗ واقف نیستم"

"بسمل تخلص، پیش از نوشتن این مزخرفات آوازۂ او شنیدہ بودم، باز معلوم نشد کہ کجائی بود و کجا رفت" (ص ۱۵۱)

خاتمہ: "بدانکہ بحر دکذا: شعر) ریختہ بر چندیں قسم است ——— یک مصرعش فارسی و مصرع دیگرش ہندی چنانچہ قطعہ از حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ نوشتہ شد۔ دوم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف دیگرش فارسی چنانچہ شعر میر معز موسوی مرحوم کہ نوشتہ آمد۔ سیوم آنکہ حرف و فعل پارسی بکار می برند و آں، سہ قسم است .... ترکیب کہ نامناسب زبانِ ریختہ می باشد، آں معیوب است فقیر ہم ہمیں اختیار کردہ است کہ اگر ترکیب فارسی موافق گفتگو بود، مضائقہ ندارد۔

عرصۂ سخن وسیع است و مصرع

ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است"

"بدانکہ ریختہ ———————— فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ، حضرت امیر علیہ الرحمہ ——————— ہندی و نصف فارسی ———— میر معز کہ ———— فارسی بکار می برند واین قبیح است ———— ترکیبے کہ نامانوس —— مختار فقیر ہم ———— ہمیں است اگر ———— گفتگوے ریختہ بود ———

———— وسیع است و از تلونِ چمنستان ظہور آگہم مصرع ہر گلے را ————" (ص ۱۷۹ اور ۱۸۰)

**نسخۂ رام پور** رضا لائبریری کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں بہ اعتبارِ فن "تذکرہ شعرائے اردو" کے تحت اس مخطوطے کا سینتالیسواں نمبر ہے۔ یہ ۵ × ۷/۲ انچ سائز اور پندرہ سطری مسطر کے چھبیس اوراق یا باون صفحات پر مشتمل ہے۔ اصلاً اس نسخے میں ستائیس اوراق تھے۔ موجودہ نسخے سے ورق نمبر ۲ غائب ہے اور ورق نمبر ۷ (موجودہ ورق نمبر ۶) کا نصف بالائی حصہ بھی ضائع ہو چکا ہے۔ ورق نمبر ۲ مرزا مظہر کے پہلے شعر کے ابتدائی ٹکڑے "خدا کے واسطے" پر ختم ہو جاتا ہے اور اگلے ورق کا صفحہ اول رائے انند رام مخلص کے واحد شعر کے مصرع ثانی "ہاتھ ارگجے کا پیالہ نرگس لیے کھڑی ہے" سے شروع ہوتا ہے۔ اس طرح ایک ورق کے درمیان سے نکل جانے کی وجہ سے یہ نسخہ مرزا مظہر کے نمونۂ کلام اور شاہ ولی اللہ اشتیاق، قزلباش خاں امید، مرزا گرامی اور انند رام مخلص کے مکمل تراجم سے محروم ہو گیا ہے۔ ورق نمبر ۷ کا نصف حصہ تلف ہو جانے کے باعث اس کے صفحہ اول سے بلے نوا کے مخمس کے تیسرے مصرعے کے آخری لفظ "دیندار" سے جعفر زٹلی کے ترجمے میں شامل الفاظ "زبان گزندہ/سوزندہ" تک اور صفحہ ثانی سے جعفر ہی سے متعلق ایک جملے "چوں پیش اعظم شاہ باریاب شد" کے بعد سے سودا کے ترجمے میں شامل الفاظ "نوکر پیشہ" تک اتلافِ متن کے نتیجے میں

مین شاعروں کے تراجم کو جزوی طور پر نقصان پہنچا ہے اور ایک شاعر عطا کا ترجمہ یکسر معدوم ہو گیا ہے۔ علاوہ بریں احمدی (کذا : احمد گجراتی) کے تخلص کے بعد سے ان کے ترجمے کا مکمل متن، حبیب اور بسمل کے ترجموں سے ان کے کلام کے نمونے اور دلاور خاں بیرنگ کے تعارف سے تخلص سے "خوشی کردہ میاں بیرنگ است" تک کی عبارت سہو کاتب کی بنا پر قلم انداز ہو گئی ہے۔ اس طرح بحالت موجودہ اس نسخے سے پانچ شاعروں (اشتیاق، امید، گرامی، مخلص (باستثنائے یک مصرع) اور عطا) کے مکمل تراجم غائب ہیں، ایک شاعر (احمدی) کا صرف تخلص باقی ہے اور سات شاعروں (مظہر، بے نوا، جعفر، سودا، حبیب، بسمل اور بیرنگ) کے تراجم ناقص و ناتمام ہیں۔

نسخۂ انجمن کی طرح اس نسخے میں بھی مکمل متن بلا امتیاز نثر و نظم مسلسل لکھا گیا ہے البتہ تمام شعرا کے تراجم کی ابتدا میں نام و تخلص اور اشعار سے پہلے لفظ "ولہ" شنجرفی روشنائی سے لکھ کر عبارات و اشعار کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی گئی ہے۔ خط معمولی نستعلیق ہے جس میں ہائے سادہ و ہائے مخلوط اور یائے معروف و یائے مجہول کا فرق ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ گاف پر کہیں ایک مرکز لگایا گیا ہے اور کہیں دونوں مرکز موجود ہیں۔ املا کی غلطیاں بھی کم نہیں مثلاً "مثنوی" کو مستقلاً "مسنوی" اور گلزار، کج کلاہ، کوچہ، مجلس اور حمزہ کو گلذار، کج کلاح، کونچہ، مجلص اور ہمزا لکھا گیا ہے۔ مختلف الفاظ کو ملا کر لکھنے کی روش بھی عام ہے مثلاً دلکہاں (دل کہاں)، خلافوعدے (وعدے تھے سب خلاف جو تجھ لب سے ہم سنے)، گلرخانسے، چپکارہ (چپکا رہ) وغیرہ۔ بعض الفاظ کا املا کاتب کے دکنی الاصل ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ ہائے مخلوط کا حرف مابعد کی بجائے حرف ماقبل کے طور پر انضباط (چھڑے بجائے چڑھے یا پھڑا بجائے پڑھا وغیرہ) اس کی واضح ترین مثال ہے۔

اس خطی نسخے کی ایک نمایاں خصوصیت یا نقص یہ ہے کہ اس کے کاتب نے نمونۂ کلام کے نقل کرنے میں بالعموم اختصار و انتخاب سے کام لیا ہے۔ نسخۂ انجمن کے مطابق میر صاحب نے اس تذکرے میں ایک سو تین شاعروں کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چوالیس شاعروں کے نمونۂ کلام میں صرف ایک ایک اور سترہ شاعروں کے دو دو شعر نقل کیے ہیں۔ باقی بیالیس شاعروں میں سے بہ استثنائے اکیس شعرا کے مکمل تراجم نسخۂ رام پور میں موجود ہیں، نسخۂ انجمن کے مطابق ان کے اشعار کی مجموعی تعداد گیارہ سو چھپن[۵۶] ہوتی ہے۔ اس نسخے کے کاتب نے ان میں سے ایک ہزار چالیس اشعار خارج کر کے صرف ایک سو سولہ شعر شامل کتاب کیے ہیں۔ ان میں طویل ترین انتخاب عبدالحئی تاباں کے کلام کا ہے، جن کے گیارہ شعر منتخب ہوئے ہیں۔ مشاہیر شعرا میں سے سودا، درد اور قائم کا انتخاب کلام علی الترتیب دو۔ ایک اور تین شعروں پر مشتمل ہے۔ میر صاحب نے اپنے کلام سے کل دو سو سینتالیس اشعار نقل کیے تھے، اس نسخے کے کاتب نے ان میں سے اپنی پسند کے پانچ شعروں کے علاوہ باقی تمام اشعار ترک کر دیے ہیں۔ انتخاب اشعار میں تخفیف کے اس عمل سے اگرچہ تذکرے کا معنوی پہلو عموماً متاثر نہیں ہوا ہے تاہم سجاد اور یقین کے تراجم میں دو ایسے مقامات پر جہاں میر صاحب نے ان کے اشعار کی نسبت اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس نے

تحریف متن کی صورت اختیار کر لی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے :۔

۱۔ سجاد کے ایک شعر ؎

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے
جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

کے بارے میں میر صاحب کا ارشاد ہے کہ" ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدنِ ایں شعر تواجد دست بہم می دہد۔ از بسکہ از خواندنِ ایں شعر حظے برمی دارم می خواہم کہ بصد جا نولیسم" (طبع ثانی ص ۱۱)، اس نسخے میں یہ عبارت موجود ہے لیکن جس شعر سے اس کا تعلق ہے وہ اور اس سے قبل کے تین شعر حذف کر دیے گئے ہیں اس طرح اس عبارت کا ربط مندرجہ ذیل شعر سے قائم ہو گیا ہے ؎

بے تکلف ہو سبھوں سے وہ ملے ہیں سجاد
دخترِ رز بھی عجب طور کی دیوانی ہے

اس شعر کے متعلق میر صاحب کا یہ بیان اس نسخے میں بھی موجود ہے کہ" اگر شعر من می بود، پیش مصرع ایں قسم می گفتم ع
بے تکلف ہو نپٹ سر پہ چڑھے ہے سجاد"، ظاہر ہے کہ زیر بحث عبارت کا تعلق اس معترض علیہ شعر سے نہیں ہو سکتا۔

۲۔ یقین کے مندرجہ ذیل شعر ؎

کیا دن ہو گا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند
برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

پر میر صاحب نے یہ اعتراض وارد کیا ہے کہ یہ" لفظاً لفظاً مبتذلِ رائے انند رام مخلص است"۔ اعتراض کی عبارت جو کافی طویل ہے بعینہٖ اس نسخے میں بھی منقول ہے لیکن زیر بحث شعر حذف کر دیے جانے کی وجہ سے مندرجہ ذیل شعر سے منسلک ہو گئی ہے ؎

یقین اس کے دُرِ دنداں کی باتیں جو کیا چاہے
صدف کی طرح دھوئے آپ گوہر سے دہن اپنا

تمام موجود شعرا میں سے پیر خاں کمترین کے علاوہ کسی شاعر کے کلام میں کوئی ایسا شعر نقل نہیں ہوا ہے جو نسخہ انجمن میں موجود نہ ہو۔ کمترین کا یہ ایک شعر جو دوسرے دستیاب نسخوں کے انتخابات پر اضافہ ہے، درج ذیل ہے ؎

آنکھوں سے کمترین کی آنسو بہے جو موتی
گر تم کو رولنے ہیں ہم پاس بیٹھ رو لو

ترک و انتخاب کے متذکرۂ بالا عمل کے تحت جس کی بنا پر اس نسخے کے حجم میں نسخہ انجمن اور نسخہ پیرس کی بہ نسبت

تقریباً نصف کے بقدر کمی ہوگئی ہے۔ اقسامِ ریختہ کے ذکر پر مشتمل خاتمہ بھی متن سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ نسخہ میرؔ کے اس شعر پر ختم ہو جاتا ہے ؎

کہاں آتے میسر مجھ کو تجھ سے خود نما اتنے
یہ حسنِ اتفاق آئینہ تیرے روبرو ٹوٹا

اس شعر کے بعد اگلی سطر کے وسط میں سیاہ روشنائی سے "تمام شد" لکھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے دوبارہ شنجرفی روشنائی سے "تمام شد فقط" اور اگلی سطر میں صرف "فقط" لکھ کر کاتب نے اپنے طور پر اس نسخے کے مکمل ہو جانے کی تصدیق کر دی ہے۔

اس نسخے کے کاتب نے انتخابِ کلام کے سلسلے میں قطع و برید کی جو روش اختیار کی ہے، شعرا کے تعارفی خاکے بالعموم اس کی زد سے محفوظ رہے ہیں البتہ سہوِ کتابت یا دوسرے اتفاقی امور پر مبنی الفاظ کے حذف و اضافہ اور تغیر و تبدل کی مثالیں جابجا موجود ہیں۔ سطورِ ذیل میں اشاعتِ ثانی کے واسطے سے ان میں سے بعض قابلِ ذکر مختلف فیہ مقامات کی نشان دہی کی جاتی ہے:

| نسخۂ رام پور | اشاعتِ ثانی |
|---|---|
| آبرو: ع بوسہ لباں سے دینے کہا، کہہ کے پھر گیا | بوسہ لبوں کا — — — — — — (ص ۱۰) |
| ع کوئی پوچھتا نہیں ہے مسجد میں خون ہوئے | — — — — — — خوں ہوا ہے (ص ۱۱) |
| مضموں: متوطن جاجئو کہ قصبہ ایست متصل اکبرآباد — — — | "متوطن جاجمو کہ قصبہ است — — — — — — |
| از شروعِ جوانی با اکبرآباد آمدہ در زینت المساجد سکونت | — — — — — بہ شاہجہان آباد آمدہ — — — — — |
| داشت — — — از احفاد حضرت شیخ فرید گنج شکر بود | — — — از احفاد — — — — شکر گنج — — — |
| — — — شاگرد خاں صاحب سراج الدین علی خاں | — — — — — — — — سراج الدین علی خاں است |
| آرزو است — — — اغلب کہ خدا ایش بخیر مبدل | — — — — — — خدا مآلش — — — — — |
| کردہ باشد۔ دریں ولا اینجا — دیوان اور د، نوشتہ می شود" | — — — ایں جا یک دیوان روزہ " ص ۱۴، ۱۵) |
| "من ایں شعر را پیش مشار، الیہ (محمد حسین کلیمؔ) خواندم گفتند اگر بجائے "پیغام کو"، "پیغامِ وصل" می گفت ایں شعر رتبہ دار می شد۔" | — — — — — — خواندم و شعر ایں قسم بود۔ میرے پیغام کو تو اے قاصد کہیو سب سے اسے جدا کر کہ" (ص ۱۶، ۱۷) |

بے نوا: "سبکرشن[1] نامی جوہری جوتی فروشے را کشت — — — —
بسیارے از طرفین قتل شدند — — — ظفر خاں — —
خفت خوردہ — — آں قصہ را — — — کہ ہنوز بر
السنۂ جمہور است"

سودا: "پیش طبع عالیش فکر عالی شرمندہ — — چنانچہ
باید ملک الشعرائی ریختہ او را شاید۔ قصیدہ در ہجو اسپ
گفتہ مسمّیٰ بہ تضحیک روزگار"

درد: "در چمن بندی شعر کشش لفظ رنگیں چمن چمن — —
گرمیٔ بازار وسعت اوست"

سجاد: "لب و دہن ہر کم بغلے نیست کہ پیش او چوں کاغذ
سفید وا شود — — — — — ہر مصرع بلندش
را طرت لطف باچارے — — — —
— — زبان طاقت بیانش رگ جان سخن"

حاتم: "شعر خوبے است لیکن لطیفہ بتذل شدہ است —"
— — صاحب ہم عزم خود در دیوان من خواہند دید"

یقین: "انعام اللہ خاں یقین — — — تربیت کردۂ
میاں مظہر — — باجدکش در سرہند ملاقات
شدہ بود — — — — — — — — ذائقہ سخن
فہمی مطلق ندارد — — — — شاعری او یقینی نیست
— — — مرزا وست استادی از سر من بر داشتہ است
— — در بزرگی و بزرگ زادگی — — — سخنے نیست"

"سبکرن نامی — — — — — — — —
بسیار از طرفین بقتل رسیدند — — — — — —
خفت کشید — — — — — — —
السنہ مذکور است" (ص ۲۸، ۲۹)

"پیش فکر — — طبع — — — — چنانچہ
ملک الشعرائی — — — — — در ہجو اسپ گفتہ
بہ تضحیک روزگار" (ص ۳۱)

"در چمن شعر کشش — — — — — وسعت
مشرب اوست" (ص ۴۹، ۵۰)

" — — — — — — — سفید بشود۔
— — — — مصرع بندکش را — — — — — —
زبان طاقت بیانش رگ سخن"

(ص ۶۰، ۶۱)

"شعر خولست — — — — تبدل شیداست
— — — — عزت خود — — — " (ص ۸۸)

"انعام اللہ یقین — — — تربیت کردہ مرزا مظہر
— — — — — ملاقات کردہ بودم — — شعر
فہمی — — — — شاعری او خالی از نقص نیست — —
— — — — — — در سر من داشتہ است — — —
— — — در بزرگ زادگی — — — — — ۔

(ص ۱۲۷ تا ۱۳۲)

---

[1] قدرت اللہ شوق نے جوہری مذکور کا نام "سبھ کرن" لکھا ہے (طبقات الشعرا مرتبہ نثار احمد فاروقی ص ۷۱)، اس لیے نسخۂ انجمن کے مقابلے میں نسخۂ رامپور کی روایت قابل ترجیح ہے۔

| | |
|---|---|
| عزلت "سید سعد اللہ ـــ کہ مستند عالم گیر بادشاہ بودند" | "ــــــــ مستند عالم گیر بودند" (ص ۹۲) |
| عاجز: "عارف الدین خاں[1] عاجز۔ وہ دوازدہ سال شنیدہ شد کہ در شاہجہاں آباد تشریف داشت" | "عارف علی خاں ـــــــ سال شدہ باشد کہ ـــــــ" (ص ۹۶) |
| خوشنود: سب رین جاگی سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں<br>چھپ چھپ کے دیکھی باس میں، درشن کو دکھلایا نہیں | ــــــ جاگے سحر پڑہ ــــــ<br>ــــ جپ جپ ــ باٹ میں ــــ (ص ۱۰۲) |
| عزیز اللہ: ع مجھ ناتواں کو کیا سکت، بولوں جو ولیاں کی صفت | ــ مجھ نوجواں میں ـــــ کے صفت (ص ۱۰۳) |
| موزوں: "خواجم قلی خاں موزوں، بہفت ہزاری صوبہ دار برہان پور۔" | "نواب خواجم قلی خاں ہفت ہزاری صوبہ داری برہان پور است" (ص ۱۰۶) |
| تاباں: "ہیچو او شاعر خوش ظاہر از ممکن بطون عدم بعرصۂ ظہور جلوہ گر نشدہ ـــ بسیار برنگینی می گفت۔" | "ـــــ ممکن بطونِ عدم ـــــ<br>ـــــ بسیار برنگیں می گفت" (ص ۱۰۸) |
| خاکسار: خادم درگاہ قدم شریف حضرت نبی الکریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود راہ رازی کشد من .... باایں برادرانِ یوسف ربطے نداریم، مرا معاف دارید۔" | "ـــ نبی کریم ـــ علیہ وسلم ـــ<br>ـــ دور می کشد ـــ<br>ـــ بربطے (ـــ ندارد ـــ)<br>(ص ۱۱۵) |
| سلام: "جوان یار باش ـــ حرمت و عزت ہمہ دارد" | "چوں یار باش ـــ حرمت عظمت ہمہ دارد" (ص ۱۳۲) |
| جگن: "خانہ زادۂ شیر افگن خاں ـــــ" | "خالہ زادۂ ـــــ" (ص ۱۳۸) |
| غریب: "محمد امین خاں ـــ تخلص افگن ہم می آورد۔" | "محمد امان اللہ ـــ گاہے افگن ہم تخلص می آورد۔"<br>(ص ۱۳۸) |
| محسن: "میر محمد محسن سلمہ اللہ تعالیٰ محسن تخلص ـــــ" | "محمد محسن سلمہ اللہ محسن تخلص ـــ" (ص ۱۳۹) |

---

[1] : چار معاصر دکنی تذکرہ نگاروں حمید اورنگ آبادی، فتوت اورنگ آبادی، شفیق اورنگ آبادی اور تمنا اورنگ آبادی کے مطابق عاجز کا صحیح نام عارف الدین خاں ہی ہے۔ (گلشن گفتار ص ۵۹، ریاض حسنی (قلمی) ص ۱۶۰، چمنستان شعرا ص ۳۶۴ و گل عجائب ص ۸۵)۔ تمنا نے یہ بھی لکھا ہے کہ عاجز نے خود ہی "عارف الدین خاں عاجز" سے اپنی تاریخ وفات (۱۱۷۷ھ) بھی نکالی تھی۔ ان شواہد کی بنا پر یہاں بھی نسخۂ انجمن کے مقابلے میں نسخۂ رامپور کی روایت قابلِ ترجیح ہے۔

راقم :- باما شاعراں آشناست گوئی کہ ہم سلیقہ ماست۔" "۔۔۔۔۔۔ ہم سلیقہ است:" (ص ۱۴۲)

قدرت : قدرت اللہ خاں قدرت تخلص ما اگرچہ عاجز است در سخن۔" "قدرت اللہ قدرت ۔۔۔ عاجز سخن است ۔۔" (ص ۱۵۳)

تفصیلاتِ بالا کی روشنی میں متن کی تحقیق و تدوین کے نقطۂ نظر سے اس نسخے کی اہمیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے اس لیے نکات الشعراء کی اشاعت سوم کے مقدمے میں اس کے مرتب ڈاکٹر محمود الہٰی کا یہ ارشاد کہ اس "ناقص نسخے" کو متن کی تصحیح کے لیے ترجیح نہیں دی جا سکتی"[۱] اپنے دائرہ کار کی تحدید اور محققانہ ذمہ داری سے اعراض کے لیے ایک خوبصورت گریز سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

**نسخہ علی گڑھ** یہ متفرق و منتشر اوراق جن کی مجموعی تعداد چھبیس ہے، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرۂ سر سلیمان میں محفوظ ایک کشکول متفرقات میں مجلد ہیں۔ ان کے بارے میں سب سے پہلے جناب نثار احمد فاروقی نے دلی کالج میگزین (۱۹۶۲ء) کے میر نمبر میں ایک تعارفی مضمون لکھ کر یہ تاثر عام کیا کہ "یہ دراصل میر کا تذکرہ نکات الشعراء ہے جسے غور سے پڑھنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ متداول تذکرہ بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا ہے"[۲]۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم نے "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" کے نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں ان اوراق کو "نکات الشعراء کے کسی قلمی نسخے کے بے ترتیب اجزا" سے تعبیر کر کے ان کے مشتملات کی روشنی میں بعض اہم نتائج اخذ کیے اور منجملہ دیگر شواہد کے انہیں اس دعوے کی بنیاد بنایا کہ "نکات الشعراء کا مطبوعہ نسخہ اصل اور مکمل نسخہ نہیں ہے بلکہ اس کی ترمیم اور تلخیص کی ہوئی صورت ہے"[۳]۔ یہ دعوے کس حد تک مبنی بر حقائق ہیں۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تفصیلات سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ اوراق بحیثیت مجموعی پچپن شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ ان شعراء میں سے غلام احمد احمد، احسن الدین خاں بیاں، جودت، غلام مصطفیٰ خاں دل، مہربان خاں رند، محمد رضا رضا، سید علی سید، فتح علی شیدا، عیسوی، غلام محی الدین غلامی، مرزا فدوی، قاسم علی قاسم، شاہ قلندر، مرتضیٰ خاں مرتضیٰ، (میر قمر الدین) منت اور (میر عسکری) نالاں کے تراجم اور دوسرے کئی شعراء کے کثیر التعداد اشعار نکات الشعراء کے متداول نسخوں میں موجود نہیں[۴]۔ بیدار، جودت اور روتی کے اشعار باقی ہیں لیکن تعارفی خاکے تلف شدہ

---

۱۔ نکات الشعراء طبع سوم حاشیہ صفحات ۱۷، ۱۸۔

۲۔ دلی کالج میگزین۔ میر نمبر۔ (مطبوعہ ۱۹۶۲ء) ص ۳۹۲۔

۳۔ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، طبع ثانی (۱۹۶۴ء) ص ۱۲۷۔

۴۔ "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" کے فاضل مصنف نے زائد شعراء کے اس زمرے میں پندرہ نام شامل کیے ہیں (ص ۱۲۶، ۱۲۷) لیکن ان کی پیش کردہ فہرست میں جودت، شیدا، عیسوی اور قاسم کے نام موجود نہیں۔ باقی تین شاعروں میں سے سوز کا ذکر بہ اختلاف تخلص متداول نسخے میں بھی موجود ہے اور دو شاعروں کے تخلص محمدی اور قمری دراصل احمدی اور فخری کی تصحیف ہیں۔ ان دونوں شعراء کے تراجم بھی متداول نسخے میں شامل ہیں۔

اوراق کے ساتھ ضائع ہو چکے ہیں۔ متداول نسخے کے مقابلے میں زاید شعرا کے علاوہ جن سینتیس[1] شاعروں کے مکمل تراجم محفوظ ہیں ان میں سے بعض کے متعلق ان اوراق کے اندراجات بعینہٖ میر صاحب کی متفق علیہ تحریروں کے مطابق ہیں اور بعض جگہ معمولی ترمیم یا تلخیص کی صورت نظر آتی ہے جبکہ بعض مقامات پر عبارات متداول متن سے اس قدر مختلف ہیں کہ میر صاحب کے معروف بیانات اور مخصوص جملوں کی نوعیت صوری و معنوی دونوں اعتبار سے یکسر بدل گئی ہے۔ حتیٰ کہ متداول نسخوں میں ایک شاعر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، ان اوراق میں وہ تمام بیانات کسی دوسرے شاعر سے منسوب کر کے اس کا تعارف بالکل مختلف الفاظ میں قلم بند کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں محض اکثر شاعروں کے اشتراک اور ان کے تراجم کی کلی یا جزوی مطابقت کی بنیاد پر یہ تسلیم کر لینا کہ یہ نکات الشعرا کے اوراق ہیں اور اس کے کسی ضخیم تر نسخے سے تعلق رکھتے ہیں، ایک عاجلانہ اقدام سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ یہ اوراق نکات الشعرا کے کسی مکمل یا قدیم تر نسخے کے باقیات ہیں جس کی تلخیص کے بعد متداول نسخہ معرضِ وجود میں آیا ہے، اسے اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر بہ آسانی رد کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی اہم شہادت میر سوز کا ترجمہ فراہم کرتا ہے۔ متداول نسخے میں ان کا ذکر میر تخلص کے تحت کیا گیا ہے جبکہ ان اوراق میں ان کا حال ان کے معروف تخلص (سوز) کے ساتھ مرقوم ہے۔ اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ سوز نے یہ دوسرا تخلص اپنے پہلے تخلص (میر) سے (میر صاحب کے حق میں) دست برداری کے بعد اختیار کیا تھا۔ معاصر تذکرہ نویسوں کے بیانات کے علاوہ ان کا یہ مقطع بھی تبدیلی کی اس نوعیت کی جانب اشارہ کرتا ہے ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ موئے ہزار حیف
اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

دوسری ناقابلِ تردید شہادت جو ان اوراق کی قدامت کے خلاف بطور ثبوت پیش کی جا سکتی ہے، میر قمر الدین منت کا ترجمہ ہے۔ منت اپنے فرزند میر نظام الدین ممنون کے ایک قطعۂ تاریخ کے مطابق ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے تھے[1]۔ اس کے برخلاف

---

[1] منت کے سالِ ولادت سے متعلق یہ اطلاع ممنون کے ایک قطعۂ تاریخ کے اس آخری شعر پر مبنی ہے ؎

ولادت کو "خورشید والا" سے پوچھ ——— "کواکب" سنِ عمر، رحلت "غروب"
(۱۱۵۸ھ — ۴۹ — ۱۲۰۸ھ)

عمر کے تعین سے متعلق مادہ تاریخ کی روشنی میں ان بیانات پر یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ یہ باہم مطابق نہیں۔ لیکن اگر زمانۂ ولادت اواخر ذی الحجہ ۱۱۵۸ھ اور زمانۂ رحلت اوائل محرم ۱۲۰۸ھ مان لیا جائے تو یہ اشکال دور ہو سکتا ہے۔ ممنون کے بیان کے برخلاف مصحفی کے مستخرجہ مادۂ تاریخ "منت کجا و زمزمۂ شاعری او" (تذکرہ ہندی ص ۲۳۰) سے ۱۲۰۷ھ برآمد ہوتا ہے۔ یہ تاریخ انہوں نے بقولِ خود منت کی وفات کے دو برس بعد کہی تھی۔ اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سانحے کے قریبی ایام میں دوستوں کے انفصال کی وجہ سے وہ صحیح سنہ یاد نہیں رکھ سکے۔

علی ابراہیم خاں خلیل نے جن سے منت کے دوستانہ روابط تھے اور جن کے تذکرے "صحف ابراہیم" کے لیے انھوں نے اپنے خیالات اور اشعار خود لکھ کر دیے تھے ان کا سنہ ولادت ۱۱۵۰ھ بتایا ہے۔ اگر موخر الذکر بیان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے، تب بھی ۱۱۷۰ھ سے قبل کسی تذکرے میں ان کا ذکر کیا جانا ممکن نہیں جب کہ نکات الشعرا کا متداول نسخہ بالیقین ۱۱۶۵ھ میں مرتب ہو چکا تھا۔

فاروقی صاحب اور پروفیسر رضوی مرحوم کے متفق علیہ دعوے کی دوسری اور اہم ترین شق یہ مفروضہ ہے کہ یہ اوراق میر صاحب کے نتائج قلم یا نکات الشعرا کے اجزائے پریشاں ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ خیال بھی سابق الذکر بیان کی طرح نا قابلِ قبول ہے کیونکہ ان اوراق میں ایسے متعدد شواہد موجود ہیں جن کی روشنی میں اضافہ و حذف اور ترمیم و تغیر کے اس عمل میں میر صاحب کے قلم کا دخل صد درجہ مشکوک معلوم ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(الف) مرزا جعفر جھٹلی (کذا) کے بارے میں ان اوراق کے مرتب کا بیان ہے کہ

"مرزا جش لبیار مائل بہ ہزل بود۔ بندہ با اویک ملاقات کردہ ام۔ شعر ہزل خود می خواند و مرد ماں را بخندہ می آورد و خود نمی خندید مگر گاہے تبسمے می کرد۔ وطنش شاہجہان آباد است۔"

قطع نظر اس سے کہ زٹلی اور میر صاحب کی ملاقات قطعاً خارج از مکان ہے، متداول نسخے میں یہ عبارت بعینہ محمد شاکر ناجی کے ترجمے میں موجود ہے اور معنوی اعتبار سے زٹلی کے مقابلے میں ناجی ہی سے اس کی نسبت درست معلوم ہوتی ہے۔ قائم اور گردیزی کے بیانات بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ناجی کی طبیعت ہزل اور ہجو کی طرف بہت زیادہ مائل تھی۔ قریب تر زمانے کے ایک اور دہلوی تذکرہ نگار میر حسن نے بھی ان کی اس کیفیتِ مزاج کا ذکر تقریباً انھی الفاظ میں کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ

"مردے ظریف طبع بود۔ اکثر از لطائف و ظرائف مرد ماں را بخندہ می آورد و خود نمی خندید مگر تبسمے می کرد"[۵۲]

اس مختلف فیہ صورت حال کے علاوہ اس ترجمے کے ذیل میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں، وہ زبان و بیان کے اعتبار سے نہ تو ناجی کے زائیدہ فکر معلوم ہوتے ہیں اور نہ زٹلی کے مخصوص رنگِ سخن سے نسبت رکھتے ہیں۔ بنظرِ اختصار ان میں سے صرف ایک غزل کا مطلع اور مقطع بطور نمونہ سطور ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| طرفہ حالت ہے بتاں بخت گرفتاری ہے | پوچھتا کوئی نہیں کیا تجھے بیماری ہے |
| بسکہ شب آن کے ہاتف نے کہا ہے جعفر | شاد ہو، وصل کی کچھ ان دنوں تیاری ہے |

(ب) سید عبدالولی عزلت کو ان اوراق میں مرزا مظہر کا شاگرد لکھا گیا ہے جو صریحاً خلافِ واقعہ ہے۔ چونکہ میر صاحب عزلت

---

۵۱ صحف ابراہیم مشمولہ خدا بخش اورینٹل لائبریری جرنل، پٹنہ۔ شمارہ نمبر ۲ (۱۹۷۸ء)، ص ۱۲۹۔

۵۲ تذکرہ شعرائے اردو مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، طبع ثانی (۱۹۴۰ء) ص ۱۷۸۔

سے ذاتی طور پر واقف تھے، اس لیے یہ غلط بیانی ان سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔

(ج) سراج اورنگ آبادی کے بارے میں ان اوراق کے مرتب کا بیان ہے کہ "ابتدائے جوانی در شاہجہان آباد آمدہ چنانچہ مشقِ سخنِ ریختہ در پنجابی کرد۔" سراج (۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۶ء تا ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۴ء) میر صاحب کے ہم عصر ہیں اور دہلی میں ان کے ورود اور مشقِ سخن کے متعلق اس بیان کے علاوہ کوئی وقیع یا غیر وقیع شہادت نہیں ملتی، اس لیے اس انکشاف کی میر صاحب کی طرف نسبت درست نہیں بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ عنفوانِ شباب سے تقریباً ساٹھ سال کی عمر تک وہ دہلی کی معاشرتی زندگی اور ادبی سرگرمیوں کے عینی شاہد رہے تھے اور متداول نسخے کی ترتیب کے زمانے یعنی سراج کی وفات سے بارہ سال قبل تک ان سے ذاتی طور پر بالکل ناواقف تھے۔

(د) انعام اللہ خاں یقین کا ذکر ان اوراق میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:۔

"انعام اللہ خاں یقین تخلص پسر اظہر الدین خاں اولاد حضرت مجدد الف ثانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبیرہ حضرت ایشیا (کذا) محمد معصوم عروتیہ الوسقا (کذا) شاگرد مرزا مظہر جانجاناں، خوش خلق، خوش خو سے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روسے، جوشِ بہارِ گلستانِ سخن، عندلیبِ خوش خوانِ چمنِ ایں فن۔ زبانِ گفتگویش گرہ کشائے زلفِ شام مدعا، مصرع نوشتہ اش بر صفحۂ کاغذ از کاکلِ صبح خوش نما، طبعِ سخن پردازِ او سروِ مائلِ چمنستانِ انداز است۔ گاہے در کوچۂ باغِ تلاش بطریقِ گلگشت قدم رنجہ می فرماید۔ در چمن بندشِ شعرش (لفظ) رنگین چمن (چمن)، گل چینِ خیال اور اگل معنی دامن (دامن)۔ شاعرِ زور آور ریختہ، در کمالِ علاقگی وارستہ۔ متواضع، آشنائے درست، بندہ اکثر ملاقات کردم۔ فقیر را اخلاصِ دلی است۔ ہمیشہ اتفاقِ باہم نشستن و فکرِ شعر کردن کہ در عہد عالمگیر بادشاہ باشد۔ خدا مغفرت کند۔"[1]

اس بیان میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں مثلاً "یہ کہ یقین کا انتقال ۱۱۶۹ھ (۵۶-۱۷۵۵ء) میں عینِ عالمِ شباب میں ہوا اس لیے انہیں عہد عالمگیر (متوفی ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء) کا شاعر کہنا درست نہیں پھر خود میر صاحب اورنگ زیب کی وفات کے سولہ برس بعد ۱۱۳۵ھ کے اواخر (۱۷۲۳ء) میں پیدا ہوئے تھے، اس بنا پر اس زمانے کے کسی شاعر کے ساتھ ان کی ہم نشینی اور بزم آرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید برآں جس شخص کے لیے آخر میں دعائے مغفرت کی گئی ہے، اس کے تعارف میں جا بجا صیغۂ حال کا استعمال جس تضاد کا حامل ہے۔ وہ تحریفِ متن پر دلالت کرتا ہے۔

ان داخلی شہادتوں سے قطع نظر نکات الشعراء کے متداول نسخے کے مطابق میر صاحب یقین کی شاعری کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ انہیں ان کی موزونِ طبعی اور سخن فہمی دونوں میں شک تھا۔ بعد کے کئی تذکرہ نگاروں نے

---

[1] چمنستانِ شعراء مرتبہ مولوی عبد الحق ص ۱۶۱۔

اپنے یہاں ان کی اس رائے کے حوالے دیے ہیں اور اس پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے نکات الشعرا کے جو نسخے تھے، ان میں میر صاحب نے اپنے اس موقف سے انحراف نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف منقولہ بالا تحریر یقین کے مذاقِ سخن گوئی اور "ذائقہ شعر فہمی" کے متعلق کسی سوءِ ظن کی نشان دہی نہیں کرتی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ شہ پارہ نہ تو فی الواقع یقین کی شخصیت سے نسبت رکھتا ہے اور نہ اس کا متن بحالتِ موجودہ میر صاحب کی تراوشِ قلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت مختلف شعرا کے تراجم سے متفرق فقرے اور جملے اخذ کر کے ترتیب دی گئی ہے۔ چنانچہ اس میں "خوش خلق" سے شگفتہ روے" تک تمام فقرے سودا کی شخصیت کے خاکے سے ماخوذ ہیں۔ اور ان اوراق میں بھی ان کے ترجمے سے خارج نہیں کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد "جوش بہار گلستان سخن" سے "آشناے درست" تک پوری عبارت متداول نسخے کے مطابق خواجہ میر درد کے ترجمے سے نقل کی گئی ہے جو بعینہٖ انھی الفاظ میں ان اوراق میں بھی ان کے تعارف میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ "چمنستانِ انداز است" تک اس کا تقریباً نصف حصہ "شگفتہ روے" کے مابعد تیسری جگہ سودا کے ترجمے میں بھی منقول ہے۔ باقی ماندہ عبارت میں سے "فکر شعر کردن" تک پہلے ڈھائی جملے شرف الدین خاں پیام کے حالات سے آخری ڈیڑھ جملہ بادشاہ کے نام کے تغیر کے ساتھ شاہ مبارک آبرو کے ترجمے سے مستعار ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مضحکہ خیز تصرفات کی ذمہ داری خود میر صاحب پر عائد نہیں کی جا سکتی۔

(۵) نکات الشعرا اور زیرِ تبصرہ اوراق دونوں میں میاں احسن اللہ احسن کی نمایاں خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ "طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود۔" مرزا کاظم مبتلا نے اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "در دیوانش شعرے یافتہ نمی شود کہ خالی از ایہام باشد۔"[1] مبتلا ہماری معلومات کی حد تک تنہا تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے احسن کے دیوان سے استفادہ کیا ہے اور ان کے اشعار وافر تعداد میں نقل کیے ہیں، اس لیے ان کے اس قول کی صحت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برخلاف ان اوراق میں جو اشعار احسن کے نمونۂ کلام کے طور پر پیش کیے گئے ہیں ان میں ایک شعر کے علاوہ جو تذکروں میں تواتر کے ساتھ نقل ہوا ہے کوئی ایسا شعر موجود نہیں جو ان کے اس معروف رجحانِ طبیعت کا آئینہ دار ہو۔ یہ انتخاب شاعر کے شیوۂ گفتار کی جس عمومی کیفیت کا پتا دیتا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل غزل سے کیا جا سکتا ہے ؎

| | |
|---|---|
| نہ خلوت نہ جلوت کے ہم یار ٹھہرے | فقط دیکھنے کے گنہگار ٹھہرے |
| وہ مشکل ہے راہ محبت کہ جس میں | نہ کافر ہی ٹھہرے نہ دیندار ٹھہرے |
| نہ دیکھا کبھی دل کو آباد ہم نے | ہم اس گھر میں جس دن سے مختار ٹھہرے |

---

[1] تذکرہ گلشن سخن مرتبہ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ص ۵۲

تسلی نہ ہوئی دل کو دیر و حرم میں ترے در پہ ہم آ کے ناچار ٹھہرے
صبا بوئے گل تو نے پہنچائی سب کو ہمیں تیری آنکھوں میں اک خار ٹھہرے
جہاں تک عقوبت ہے، دل دے کے اپنا
ہم اس سب کے احسن سزاوار ٹھہرے

جو لوگ احسن کے رنگِ سخن سے واقف ہیں وہ بیک نظر اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ ان کا کلام نہیں ہو سکتا، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ غزل ایک دوسرے ہم تخلص شاعر مرزا احسن علی احسن لکھنوی کی تصنیف ہے[1] جو میر ضیا اور سودا کے شاگرد تھے اور بہ اعتبار زمانہ میاں احسن اللہ کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

(د) زیر بحث اوراق میں خان آرزو کے نمونۂ کلام میں یہ مطلع بھی شامل ہے ؎

از زلفِ سیاہِ تو بدل دھوم پڑی ہے
در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

خان آرزو کے کلام کے بارے میں کسی شخص کی معلومات میر صاحب کے علم سے زیادہ باوثوق اور معتبر نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اس شعر کو آرزو کی بجائے مرزا معز فطرت سے منسوب کیا ہے۔ قائم اور میر حسن کے تذکرے بھی اسی روایت کی تائید کرتے ہیں[2]، اس لیے انتساب کی متذکرہ غلطی صاحب نکات الشعراء کے تاریخ سہو میں محسوب نہیں کی جا سکتی۔

مختلف شعراء کے تراجم میں ہم مضمون اور ہم الفاظ بیانات کی تکرار، واقعات کی تفصیل میں حقائق سے انحراف اور تحریف و تصرف کی ان چند در چند مثالوں کے باوجود اگر ان اوراق کو "نکات الشعراء کی ایک اور روایت" کے باقیات تسلیم کر لیا جائے تو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ معاصر شعرا کے بارے میں میر صاحب کی معلومات انتہائی ناقص اور ناقابلِ وثوق تھی۔ وہ دو ہم تخلص مگر مختلف العہد اور مختلف المذاق شاعروں کے رنگِ سخن میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور زبان و بیان پر وہ دسترس حاصل نہیں تھی جس کی ان جیسے معروف و ممتاز صاحبِ قلم سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے۔ چونکہ یہ تمام باتیں کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں، اس لیے ہمارے

---

[1] : خوش معرکۂ زیبا مولفہ سعادت خاں ناصر مرتبہ جناب مشفق خواجہ، جلد اول، ص ۵۹۔ اس تذکرے میں زیر بحث غزل کا مطلع اور چوتھا شعر احسن لکھنوی کے انتخابِ کلام میں شامل ہے۔ ایک اور شاملِ انتخاب شعر جو نسخۂ علی گڑھ میں موجود نہیں، درج ذیل ہے ؎

یہ کہنے لگا دیکھ مجھ کو مسیحا
خدا ہی ہے جو اب یہ بیمار ٹھہرے

[2] : مخزن نکات، طبع اول ص ۱۲، تذکرہ شعرائے اردو، طبع ثانی ص ۱۴۴۔

نزدیک یہ اوراق کسی ایسے کم سواد اور ناپختہ کار شخص کے نتائجِ قلم ہیں جس نے شعروں کے انتخاب اور جمع و ترتیب سے اپنی دلچسپی کو عملی شکل دینے کے لیے میر صاحب کی نگارشات پر سارقانہ دست درازی سے کام لیا ہے اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کی ہے کہ یہ سرقہ کسی بھی وقت منظرِ عام پر آکر اس کے لیے رسوائی کا سامان بن سکتا ہے۔ تذکرہ نگاری کی تاریخ میں اس قسم کی خیانتِ مجرمانہ اور تصرفِ بے جا کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر اخذ و اقتباس کے اس عمل میں جس بدسلیقگی اور دیدہ دلیری کا مظاہرہ ان اوراق کے مرتب نے کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔

زیرِ بحث اوراق کی اس بے اعتباری کے باوجود جو بیک نظر سامنے آجاتی ہے، انہیں نکات الشعرا کے مختلف خطی نسخوں سے متعلق اس گفتگو میں شامل کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی تاکہ ایک طرف تو یہ شبہ نہ کیا جاسکے کہ ان سے صرفِ نظر لاعلمی یا تساہل اور زُبیدی پر مبنی ہے اور دوسری طرف ان کی معنوی حیثیت کے بارے میں اس غلط فہمی اور خوش گمانی کا ازالہ ہوجائے جو اردو کے ایک معتبر صاحب قلم کے ارشادات اور ایک بزرگ ادیب و محقق کی طرف سے ان کی تصدیق و توثیق کی بنا پر نو واردانِ بساطِ تحقیق کے لیے گمراہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اس حقیقت سے بہرحال انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نکات الشعرا کا متداول متن اس کے نقشِ اول میں ترمیم و تغییر کے بعد سامنے آیا ہے لیکن بظاہر یہ تبدیلیاں ترتیب سے بالکل متصل زمانے میں کی گئی ہیں اور ان کا دائرہ بہت محدود رہا ہے۔ دستیاب نسخوں میں بعض شعرا کے تراجم موجود نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ نسخہ پیرس اور نسخہ رام پور کی طرح اس بنیادی نسخے سے بھی کوئی ورق ساقط ہوگیا ہو جس سے ابتدا میں اس کی نقلیں تیار کی گئیں اور کاتب نے یہ ضروری خیال نہ کیا ہو کہ ناقص تراجم شامل کتاب کیے جائیں یا بیاض چھوڑ کر اس نقص کی صراحت کر دی جائے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا جاچکا ہے، اب تک اس تذکرے کے تین ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ ان میں سے پہلی دو اشاعتیں ترتیبِ متن کے قواعد و ضوابط سے کلیتاً آزاد ہیں بلکہ اس قسم کے کاموں میں جتنی بے احتیاطیاں اور بے ضابطگیاں ممکن ہوسکتی ہیں، ان میں وہ سب روا رکھی گئی ہیں۔ البتہ اشاعتِ سوم میں اصولِ تدوین کی بڑی حد تک پابندی کی گئی ہے لیکن اس کے فاضل مرتب نے نسخہ پیرس کے علاوہ کسی اور مخطوطے سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ نسخہ انجمن کے وجود سے وہ غالباً باخبر نہیں اور نسخہ رام پور کو انھوں نے ناقابلِ اعتنا سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہے۔ حالانکہ تحقیق کے نقطہ نظر سے یہ دونوں نسخے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور ان کی مدد سے ایک زیادہ صحیح اور معتبر نسخہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

---

استدراک :- سہ ماہی "اردو" اورنگ آباد کے جنوری ۱۹۲۲ء کے شمارے کے ساتھ ملحق دو ورقی فہرست کتب دسلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو) میں نکات الشعرا کا نام موجود ہے جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ یہ تذکرہ اس شمارے کی اشاعت سے قبل شائع ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے "تذکرہ شعرائے اردو مولفہ میر حسن" کے مقدمے میں جو ۱۶ نومبر ۱۹۲۱ء کو حیدرآباد میں لکھا گیا تھا، جس انداز سے جابجا اس تذکرے کے حوالے دیے ہیں، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اشاعتِ اول اس تاریخ سے پہلے منظرِ عام پر آچکی تھی۔ ان شواہد کے پیشِ نظر سرِ دست یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر عطا کاکوی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی روایت کے مطابق ۱۹۲۰ء کو اس کا سالِ طباعت تسلیم کر لیا جائے۔

# میر کی عشقیہ شاعری

رالف رسل۔ خورشید الاسلام

ترجمہ: خالد اقبال یاسر:

میر حسن کی 'سحر البیان' نے اسے جو شہرت بہم پہنچائی اس نے تا دیر دوسرے مثنوی گو شعراء کو دھندلائے رکھا اور اس کے کہیں ایک صدی بعد جا کر اس صنف کو برتنے میں میر کے کمالِ فن کی نئے سرے سے دریافت کا عمل شروع ہوا۔[1] جب ہم میر کی مثنویاں میر حسن کی مثنویوں سے واضح طور پر مختلف پاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی کی کتابی تعریف ضرورت سے زیادہ تفصیل یا اختصار کی عام کمزوری سے نہیں بلکہ اس سے متضاد خامی سے دوچار ہے۔ مثنوی کا مفہوم محض مقفیٰ شعروں کی نظم ہے۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کرنا پڑتا ہے کہ اردو میں ہر لحاظ سے مثنوی کی واحد سب سے بڑی قسم عشقیہ مثنویوں پر مبنی ہے اور اس کی بھی مزید دو مختلف اقسام ہیں، بعض سحر البیان کی طرح طویل رومانی داستانیں ہیں۔ دوسری کہانی کے لوازم کے اعتبار سے بلا واسطہ طور پر حقیقت پسندانہ ہیں اور بلحاظ روایت مختصر نظمیں ہیں۔ میر کی تمام مثنویاں اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان میں سب سے بہتر 'معاملات عشق' ہے۔[2] جس میں وہ اپنے عشق کی المیہ داستان اس بے تکلفی سے سناتے ہیں جس سے زیادہ تر نا قد احتیاط آمیز خاموشی کے ساتھ گزر گئے ہیں۔ میر اس وقت غالباً اٹھارہ سال کے تھے۔ جب وہ ایک ایسی دوشیزہ کے عشق میں گرفتار ہوئے جو پہلے ہی کسی اور سے بیاہی جا چکی تھی۔[3] وہ ان کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہے اور شاید بہت قریبی کیونکہ نظم

---

[1] درحقیقت اس پورے باب کا ماخذ میر کے اپنے کلام کا مجموعہ 'کلیات میر' ہے۔ جس وقت یہ باب تحریر کیا گیا، اس کا سب سے اچھا ایڈیشن عبدالباری آسی (لکھنؤ ۱۹۴۱ء) کا تھا، کراچی سے ۱۹۵۸ء میں شائع ہونے والے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ذرا زیادہ جامع ایڈیشن میں کتابت کی ان گنت غلطیاں ہیں اور چونکہ یہ ایڈیشن اب دستیاب نہیں اس لیے ہم نے آسی کے ایڈیشن کے حوالہ جات کا ڈاکٹر بریلوی کے ساتھ تقابل اور مؤخر الذکر کے حوالے دینے کے وقت طلب عمل کی ذمہ داری اٹھانے کو بے فائدہ خیال کیا۔ میر کی غزلوں کے چھ دیوان ہیں۔ ہم نے رومن ہندسوں میں اس دیوان کا حوالہ دیا ہے جس میں سے اشعار لیے گئے ہیں۔ حوالہ جات ممکن حد تک مختصر کر کے دیے گئے ہیں۔ چنانچہ I - ۱۶۴ - ۱۴ کا مطلب یہ ہو گا کہ شعر کلیات کے آسی ایڈیشن کے پہلے دیوان سے لیا گیا ہے اور اس کے ۱۶۴ ویں صفحہ کی ۱۴ ویں سطر پر ملے گا۔ ان نظموں کے اشعار جو دیوان میں شامل ہیں، ان کا حوالہ اس طرح دیا گیا ہے۔ کلیات صفحہ ۹۲۔ سطر ۱۳۔

[2] کلیات صفحہ ۹۱۸۔ اردو میں ترجمے کے باعث باقی اشاریہ غیر متعلق ہو گیا ہے۔

[3] کلیات صفحہ ۹۲۰، سطر ۱۳ (مترجم)

بتاتی ہے کہ ان کی محبوبہ سے اس قدر شدت کے ساتھ میر سے پردہ کرنے کی توقع نہیں کی جاتی تھی جتنی کہ خاندان کی حدود سے باہر ضروری خیال کی جاتی تھی۔ نظم جو بیان کردہ واقعات سے بہت عرصہ بعد لکھی گئی تمام کہانی نہیں سناتی بلکہ ایک تصویری سلسلے میں ان سارے قصوں کو یاد اور بیان کرتی ہے جن کا نقش میر کے حافظے میں خاص طور پر باقی رہ گیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے خاندان میں اوروں کو اس لڑکی کی صورت، شہرت، اچھے اطوار اور خوش مزاجی پر گفتگو کرتے سنا، میر کو اس کی دید کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اور اُسے دیکھتے ہی وہ ان کی اور میر اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ اگرچہ پہلے پہل اس نے میر سے اس جذبے کو پوشیدہ رکھا، جو کچھ بعد میں بیتی اسے میر کے اپنے الفاظ میں بتانا چاہیے:

میں نظر بچا کر اس کی طرف دیکھتا اور اگرچہ میرا جی بہت چاہتا مگر اس سے بات نہ کر سکتا۔ بعد ازاں ہم موقع محل دیکھ کر جب بھی ممکن ہوا ملتے رہے۔ وہ میرے لیے حد درجہ مہربان اور رحمدل تھی اگرچہ کبھی کبھار مجھے پریشان بھی کرتی۔ طویل عرصے تک بات اس سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن رفتہ رفتہ ہم زیادہ بے تکلف ہوتے گئے اور جب بھی میں اس کے قریب زمین پر بیٹھتا تو وہ مجھے اپنا بازو تھامنے دیتی اور پاؤں چھونے دیا کرتی رہی۔ اس کے بے عیب حُسن کی تصویر نہیں کھینچ سکتا وہ جیسے میری خواہش کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور اس کا عضو عضو پُرکشش تھا۔ اس کی چال بے حد باوقار تھی اور اپنے تمام حُسن کے ساتھ وہ کریم اور مونس بھی تھی۔ اگر وہ کبھی مجھے پریشان بھی کرتی تو اتنے لگاؤ سے کہ مجھے اس سے اور بھی زیادہ محبت ہو جاتی، میں اُس سے اختلاط چاہتا وہ اس پر صرف مُسکرا دیتی اور مجھے پیش قدمی نہ کرنے دیتی۔ ایک روز جب وہ پان نوش جاں کر رہی تھی میں نے اُس سے بوسے کی اور اس کے لبوں کا نشہ اپنے لبوں کو منتقل کرنے کی فرمائش کی، اس پر وہ خنداں ہوئی اور پہلے انکار کیا لیکن بعد میں مجھے ایسا ہی کرنے دیا جیسے میں چاہتا تھا۔ ہماری اُلفت بڑھتی گئی اور میں نے اس سے ایسی جگہ ملنے پر اصرار شروع کیا جہاں ہمیں کسی کی مداخلت کا ڈر نہ ہو۔ اس نے بھی اس پر رضامندی ظاہر کی مگر پھر بھی مجھے ٹالتی چلی گئی اور ایک دن مجھ سے یوں گویا ہوئی "ہماری محبت کا انجام بخیر نہیں ہو سکتا، ہم کب تک اس طرح ایک دوسرے کے لیے گھُلتے رہیں گے۔" میں اس کی محبت میں اس قدر مستغرق تھا کہ اس کے الفاظ کی سچائی نہ پہچان سکا لیکن آج میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں اور روتا ہوں۔

میں کس طرح بیان کروں کہ میں نے اس کی فرقت میں کیا کیا صدمے اُٹھائے۔ شب کو میں تصور کر لیتا کہ وہ میرے پہلو میں ہے مگر دن ناقابلِ برداشت ہو جاتے، برسوں ہم ایک دوسرے کا دوبارہ دیدار نہ کر سکے۔ میں دُنیا سے، اپنے بیوی بچوں سے، اپنے خاندان سے بے نیاز تھا، میں لگاوٹ سے ان دنوں کو سوچتا جب تمام مصائب اور خطرات کے باوصف میں اس سے ملنے آتا اور خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ جاتا، اس کی وجہ سے میرے سارے عزیزوں اور دوستوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا اور وہ مجھے دیوانہ کہنے لگے۔ اور تو اور انتہائی کم ظرف اور شہدے لوگ میرے منہ پر مجھے طعنے دیتے۔ آخر کار فراق کا رنج دونوں کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ ہم ملے اور اس مرتبہ ہم نے دل کی ساری خواہشوں کی تسکین کا سامان کیا۔ ہم کئی روز ایک ساتھ رہے، آخر وہ دن آ ہی گیا جب ہمیں پھر سے جُدا ہونا تھا۔ اس میں تقصیر اس کی بھی نہیں تھی، ہمارا مقدر ہی ہمارے خلاف تھا، اس نے کہا "ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم کچھ عرصہ کے لیے جُدا ہو جائیں۔ محبت میں ایسا مرحلہ آیا ہی کرتا ہے جب ایسی حقیقت کا سامنا

کرنا پڑتا ہے، یہ نہ سوچو کہ میں تم سے رابطہ توڑ رہی ہوں اور اس جدائی پر زیادہ غم نہ کرو، میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ مجھے سب سے پہلے اپنی عزت کی فکر کرنی چاہیے۔" میں جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا، میں نے اس کے سامنے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکا، اور صرف اس کے جواب میں ہوں ہاں کرتا رہا ورنہ خاموش اور گم صم بیٹھا رہا۔ جب رات ڈھلی تو ہم جدا ہوئے اور میں اس کی گلی سے اس تہی دامن شخص کی طرح نکلا جو دنیا کی ہر قیمتی متاع پیچھے چھوڑ آیا ہو۔ میں نے اپنے دکھ تنہا سہے، کوئی نہیں تھا جس سے میں اپنا راز کہہ سکتا۔ کبھی اس کی جانب سے کوئی پیام آتا اور میرے جی اٹھتا لیکن اکثر کوئی نہ آتا۔ میں بھلا اس سے جدا کیسے رہ سکتا تھا، اس کی یاد ہر دم میرے ساتھ رہتی، اس کی دلکشی، میرے لیے اس کی مہربان محبت، دھیمی گفتگو، میری تکلیف پر اس کی افسردگی، مجھے خوش دیکھنے کا اشتیاق، اس کی ہر بات میری آنکھوں میں آنسو لے آتی، میں پھر سے اس کی رفاقت کی آرزو کرتا ہوں، اور اس کے بغیر میں اپنی جان سے چلا جاؤں گا۔

ایسا معاملہ دونوں خاندانوں کو گہری ذلت میں مبتلا کر دیا کرتا اور وہ عام طور پر اس کا انتقام محبت کرنے والوں سے لیا کرتے۔ میر کو انھوں نے اس قدر ایذا پہنچائی کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور یہ تجربہ بھی اس نے اپنی ایک اور مثنوی "خوابِ خیال میر"[1] میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے رات کو چاند کی طرف دیکھنے سے خوف آنے لگا۔ پھر بھی اس کی طرف دیکھنے کی ناقابلِ مزاحمت خواہش محسوس کرتا اور جب دیکھتا تو اسے وہاں ایک دل نشیں عورت کا پرتو دکھائی دیتا۔ اس کا پیکر شب و روز اس کی نگاہوں کے سامنے رہنے لگا اور اس کی وجہ سے نہ وہ کچھ کھا سکتا، نہ سو سکتا۔ کبھی وہ مائل بہ کرم ہوتی کبھی ستم کیش۔ جس قدر اس میں استغراق بڑھتا گیا اسی قدر جنون نمایاں ہوتا گیا۔ اس کے عزیز و اقربا کو اس پر تشویش ہوئی اور وہ اس کی صحت کے لیے کوشاں ہوئے۔ تعویذ گنڈوں اور افسوں سے افاقہ نہ ہوا تو خلافِ مزاج ادویہ استعمال کروائی گئیں اور جب اس نے بے کلی کے باعث فرار کا میلان ظاہر کیا تو میر کے مطابق انھوں نے اسے "گور سے تنگ تر" ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں بند کر دیا جہاں اُسے کبھی کبھار ایک آدھ نان اور گھونٹ بھر پانی دے کر نیم فاقے میں رکھا گیا۔ وہ اس کے قریب آنے سے خوف کھاتے اور اسے پہروں کوٹھڑی میں اکیلے چھوڑ دیا جاتا۔ خون نکالنے کا عمل بھی برابر آزمایا گیا اور وہ اگلے روز تک بیہوش رہا۔ بے محابا شور سے جب اس کی آنکھ کھلی تو وہی فصاد نشتر تھامے سامنے کھڑا تھا مزید لہو لیا گیا۔ یہاں تک کہ اُسے شاذ ہی ہوش آتا اور اس کی زندگی سے مایوسی ہوتی گئی، لیکن جیسے جیسے دن گذرتے گئے طاقت رفتہ واپس آنے لگی اور آہستہ آہستہ دیوانگی نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

میر کی داستان محبت المیہ ہے اور اردو کی حقیقت آمیز عشقیہ مثنویاں ہمیشہ ایسی ہی ہوا کرتی ہیں۔ ایسا اس وجہ سے نہیں ہے کہ شاعر المیہ کہانیوں پر ہی طبع آزمائی کیا کرتے تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جس معاشرے کے پروردہ تھے وہاں محبت ایک المیہ ہی تھی۔ ان کے زمانے میں محبت اور شادی دو علاحدہ چیزیں تھیں اور عام طور پر الگ ہی نہیں باہم اختلافی سمجھی جاتی تھیں جب ایک

---

[1] کلیات صفحات ۹۶۶-۹۷۴

نوجوان شادی کی عمر کو پہنچتا تو اس کے والدین اس کے لیے دلہن کی تلاش میں نکلتے جس کا سماجی لحاظ سے ہم مرتبہ ہونا ضروری ہوتا۔ مناسب امیدوار ملنے کے بعد اس کے والدین سے سلسلہ جنبانی شروع ہوتا۔ اور اگر اس میں کامیابی ہوتی تو شادی کا بندوبست کیا جاتا۔ لڑکا اور لڑکی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو نہیں دیکھتے تھے۔ محبت اس مرتب زندگی کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھی اور معاشرہ اس خطرہ کے تدارک یا اس کے پیدا ہونے کی صورت میں اس سے نمٹنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش کرتا تھا، پردہ اور جلد شادی اس کی بڑی انسدادی تدابیر تھیں۔ پردے کا مطلب دونوں جنسوں کی مکمل علٰحدگی تھا۔ کسی مسلمان لڑکے کو اس لڑکی کا چہرہ دیکھنے کی اجازت نہ تھی جو گیارہ بارہ سال کی عمر کو پہنچ چکی ہو۔ سوائے اس کے کہ جہاں قریبی رشتہ داری عشق میں مبتلا ہونے کے امکانات ختم کر دیتی ہے۔ ہر گھر میں زنانہ کے نام سے عورتوں کا الگ حصّہ ہوتا اور جب کوئی عورت گھر سے باہر جاتی (اور ایسا وہ شاذ ہی کرتی) تو اسے سادہ سا لباس۔ برقعہ پہننا پڑتا جو اسے سر سے لے کر پاؤں تک مکمل طور پر ڈھانپ لیتا۔ چہرے پر آویزاں نقاب یا آنکھوں کے گرد باقی کپڑے سے مہین دھجی دوسروں کو اندر جھانکنے سے روکتے ہوئے اسے باہر دیکھنے کے قابل بناتی۔ جلد شادی بھی محبت کے انسداد ہی کی ایک صورت تھی۔ شادی سے پہلے لڑکے کے لیے اتنی جلد عشق میں مبتلا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اور شادی کے بعد معاشرہ توقع کرتا کہ اسے عشق کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ اس طرح اس معاشرے نے محبّت کے تدارک کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا، جہاں وہ اس کا تدارک نہ کر سکا وہاں اس نے اس جرم پر سزا دی اور سزا بھی بہت کڑی، کوئی لڑکا یا لڑکی جو بدقسمتی سے محبّت کا شکار ہو جاتے، اپنے خاندان کے لیے باعثِ ننگ ٹھہرتے اور اس کا بدلہ انھیں وحشیانہ سزا بلکہ اپنے قتل کی صورت میں ادا کرنا پڑتا کیونکہ عشاق ان قوانین کی سرتابی کے مجرم قرار پاتے، جن پر نظامِ زندگی کی بنیادیں استوار تھیں۔ سزا دہندگان خود بھی اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ محبّت ایک ایسی قوت ہے کہ جس سے معاشرے کی بنیادیں کمزور پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اور معاشرے کو اس خطرے سے اپنی مدافعت کا حق حاصل ہے چاہے وہ خود ہی اس کا نشانہ کیوں نہ بن جائیں۔ محبت کی داستانیں عام تھیں۔ لیکن ایک معقول شخص اگرچہ عاشق کے لیے ہمدردی محسوس کرتا مگر اس مفروضے کی بنیاد پر ردِ عمل کا اظہار کرتا۔ جیسے وہ خود کبھی عشق میں گرفتار نہیں ہوگا۔ عشقیہ شاعروں نے اپنی شاعری میں اکثر اس جذبے کا اظہار کیا ہے:

زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مر جائے
جو دامِ محبت میں گرفتار نہ ہووے (I - ۱۹۵ : ۱۶)

ان صحبتوں میں آخر جانیں ہی جاتیاں ہیں
نے عشق کو ہے صرفہ نے حسن کو محابا (I - ۲۴ : ۲۴)

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ (I - ۱۳۶ : ۱)

قیامت ہی یاں چشم و دل سے رہی
چلے بس تو واں جا کے کریے قیام
نہ دیکھے جہاں کوئی آنکھوں کی اور
نہ لیوے کوئی جس جگہ دل کا نام (I - ۹۰ : ۱۲ : ۱۴)

ایک شعر بستر مرگ پر بوقت نزع ایک نوجوان دوست کو زندگی بھر کے تجربے کا نچوڑ منتقل کرنے سے عبارت ہے۔ یہ تصوّر کرتے ہوئے کہ جب وہ مر جائے گا تو کس طرح وہ لڑکا ذکر کرے گا :

وصیّت میر نے مجھ کو یہی کی
کہ سب کچھ ہونا تو عاشق نہ ہونا (II - ۲۳۶ : ۱۶)

ان مثنویوں میں بھی یہی خیالات دہرائے گئے ہیں۔ عشق ایک آگ ہے جس میں عشاق جل کر راکھ ہو جاتے ہیں یا ایک بلا خیز سمندر جس میں وہ غرق ہو جاتے ہیں[1]۔ ایک مثنوی ان الفاظ پہ اختتام پذیر ہوتی ہے :

محبّت نہ ہو کاش مخلوق کو
نہ چھوٹے یہ عاشق نہ معشوق کو (کلیات صفحہ ۸۹۹ سطر ۱۹ - ۲۰)

بلوغت کو پہنچتا ہوا ایک لڑکا محبّت کے اس خوف کو بہت سوں سے زیادہ محسوس کرتا ہوگا، کیوں کہ وہ عنفوانِ شباب کے ساتھ آنے والی شدید خواہشات سے مجبور ہوتا ہے، پردے کا نظام ان خواہشات کو ان کی تسکین کے راستے بند کر کے اور شدید کر دیتا اور اس تصوّرِ محبّت کی وجہ سے بھی جس پر اس کی بنیاد تھی کیونکہ اس کا بنیادی مفروضہ ہی یہ ہے کہ محبت اس قدر طاقتور ہے کہ اس سے صرف کڑی پابندیوں کے ذریعے ہی نمٹا جا سکتا ہے اور یہ بنیادی مفروضہ ان ضابطوں کو کڑا بنانے میں مدد دیتا ہے چنانچہ ایک نوجوان محبت کی اتنی ہی شدید خواہش رکھتا، جتنا اس سے خوف کھاتا ہے۔ نئے زمانے کا قاری مشکل ہی سے اس شدید جذباتی دباؤ کا اندازہ کر سکتا ہے جو اسے مغلوب کر لیتا ہوگا اسی ہر طرف سرایت کرتے ہوئے خوف سے اُردو شاعری اپنے نوجوان عاشق اور انگریزی ادب کے 'محبّت کے بدلے محبّت' والے نوجوان عاشق کے درمیان امتیاز پیدا کرتی ہے جس کے مقابلے میں بابعبر امکانی عاشق جسے پرستش کرنے کے لیے کوئی بھی میسّر نہیں ہوتا۔ غیر دردمندانہ نہ سہی ذرا مزاحیہ سا لگتا ہے۔ اُردو شاعری میں مزاحیہ پہلو المیہ کے سامنے دب سا گیا ہے۔

میر کی مثنوی دریائے عشق[2] سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسی کیفیت میں مبتلا شخص سے کیا پیش آنے کا امکان ہے، کہانی لڑکے اور اس کی ذہنی کیفیت کے بیان سے شروع ہوتی ہے "ایک دل کش لڑکا سرو کی طرح طویل قامت اور متناسب، اندر

---

[1] کلیات صفحہ ۹۱۶، سطر ۲۳، صفحہ ۹۰۱، سطر ۱۰
[2] کلیات صفحہ ۹۰۰ - ۹۱۰

موم سے زیادہ نرم دل اور وجود کے ریشے ریشے میں عشق لیے ہوئے[1]" اور بتاتی چلی جاتی ہے کہ ایک دن وہ گلی میں سے گذر رہا تھا، کہ اس نے ایک مکان کے دریچے سے ایک لڑکی کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے دیکھا، جیسے ہی دونوں کی نظریں ملیں وہ اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا لیکن اس نے التفات نہ کیا۔ اور اُٹھ کر اپنا لباس سنبھالتی مکان کے اندر گم ہو گئی۔ لیکن وہ جی جان سے فدا تھا۔ اور اس دن کے بعد دوسری جھلک کی آس میں وہ ہر لحہ اس کے گھر کے جوار میں بار بار اس کے دریچے کی جانب نگاہ کرنے میں بسر کرنے لگا جہاں وہ اُسے پہلی بار نظر آئی تھی۔ آتے جاتے لوگ اُسے گھورتے اور جنھیں خیال آتا کہ وہ کسی ذہنی صدمے سے دوچار ہے اس سے اظہار ہمدردی کرتے لیکن جلد ہی سب کو معلوم ہو گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس پر ہر طرف سے الزام تراشی ہونے لگی۔ اس کا اور اس لڑکی کا کنبہ آپس میں ہمسائے تھے اور جلد ہی اس کے والدین اس پر شک کرنے لگے۔ پہلے تو انھوں نے اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے کے لیے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، لیکن پھر اس خیال سے کہ ذمہ داری ان پر آن پڑے گی اور وہ بدنام ہو جائیں گے۔ یہ مشہور کر دیا کہ لڑکے کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے اور لوگوں کو اس پر پتھر برسانے اور اذیت پہنچانے پر اُکسایا، لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، اور اس کی محبت پہلے کی طرح منہ زور رہی۔ آخر کار لڑکی کے خاندان نے لڑکی کو دریا کے پرلے کنارے پر آباد ایک دوسرے شہر میں اپنے رشتہ داروں کے پاس رہنے کے لیے بھیجنا مناسب سمجھا۔ اپنی پرانی دایہ کی معیت میں تیار ہو کر وہ ایک بند پالکی میں سوار ہوئی۔ اس کے عاشق نے جو اپنی جگہ پر اسی گلی میں موجود تھا جہاں وہ رہا کرتی تھی یہ اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی ہے جسے کہیں لے جایا جا رہا ہے اور وہ پالکی کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے اندر موجود لڑکی سے کرم اور التفات کی درخواست کرتا رہا۔ اس نے خود جواب نہیں دیا مگر دایہ نے موقع دیکھ کر اس کی ہمت افزائی کی اور اُمید دلائی کہ لڑکی جلد ہی اس کی محبت کا جواب دے گی اور وہ ایک دن وصل سے ہمکنار ہو جائیں گے۔ وہ دریا پر پہنچ کر کشتی میں سوار ہو گئے جس نے انھیں پار پہنچانا تھا جب کشتی منجدھار میں پہنچی تو دایہ نے لڑکی کی جوتی اتار کر دریا میں پھینک دی اور لڑکے کو آزمانا چاہا کہ اگر اس کا عشق سچا ہے تو دریا میں کود جائے اور اسے واپس لے کر آئے۔ وہ فوراً دریا میں کود پڑا۔ لیکن وہ تیرنا نہیں جانتا تھا اس لیے ڈوب گیا۔ لڑکی جواب تک سارے قصے سے لاتعلق سی تھی، اس کے جذبے سے بے حد متاثر ہوئی، لیکن اس نے فی الوقت کچھ نہ کہا۔

اب چونکہ لڑکا زندہ نہ تھا اس لیے لڑکی کی واپسی میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تھی اور وہ اسی طرح اپنی دایہ کی حفاظت میں واپسی کے سفر پر روانہ ہوئی جب وہ دریا کو واپس عبور کر رہے تھے تو اُس نے دایہ سے دریا کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس بناء پر کہ وہ ساری عمر پردہ نشین رہی تھی اس نے جو کچھ دیکھا اس کے بارے میں بے شمار سوالات کیے اور آخر میں یہ جاننا چاہا کہ وہ نوجوان کس مقام پر دریا میں غرقاب ہوا تھا جب کشتی وہاں پہنچی تو دایہ نے اس جگہ کی نشاندہی کی اور لڑکی نے اچانک خود کو دریا کی لہروں کے حوالے کر دیا۔ اور عین اسی جگہ غرقاب ہو گئی۔ جب دایہ نے گھر پہنچ کر اس کے والدین کو بتایا کہ کیا حادثہ

---

[1] کلیات صفحہ ۹۰۱ سطر ۱۵

گذرا ہے تو وہ روتے پیٹتے دریا کے کنارے پہنچ۔ جب دریا میں جال ڈالا گیا تو دونوں عشاق جنھیں زندگی میں قرب نصیب نہ ہو سکا تھا ایک دوسرے کے بازوؤں میں پیوست صورت میں برآمد ہوتے۔

ایک اور مثنوی گجرات میں آباد ایک افغان کی کہانی بیان کرتی ہے[1]، وہ بے حد وجیہہ و شکیل شخص تھا اور اس پر بھی پاکبازی، سادگی اور مذہب سے لگاؤ کی وجہ سے نیک نام تھا۔ میر کہتا ہے کہ وہ اس قدر حیادار تھا کہ اگر حوران بہشت میں سے کوئی بھی اس کی جانب ملتفت ہوتی تو وہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرتا۔ لیکن ایک دن ایسا آیا کہ وہ بھی ایک نوخیز ہندو خاتون کے عشق میں گرفتار ہو گیا جس نے اُسے گلی میں سے گذرتے ہوئے دیکھا اور جیسے ہی اس نے آنکھ ملائی تو نوجوان نے بھی جھجکتے ہوئے اس پر نظر ڈالی، وہ اسی لمحے اس کی چاہت میں مبتلا ہوئی لیکن دونوں میں سے کسی نے دوسرے سے اظہار مدعا نہ کیا، جب وہ پانی بھرنے سڑک پر نکلتی تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیتے اور بس، مختصر یہ کہ اُنھوں نے سچے عاشقوں کا وطیرہ اپنایا۔ اور ایسی کوئی حرکت نہ کی جس سے ان کی نیک نامی پر حرف آتا۔ ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ عورت کا خاوند بیمار پڑا اور مر گیا، وہ ہندو رسم ستی کے مطابق خاوند کی چتا میں جلنے کے لیے چلی، جب اس کے عاشق نے سُنا تو وہ مرگھٹ کی طرف دوڑا اور اپنے آپ کو شعلوں کے سپرد کر دیا لیکن قریب کھڑے لوگوں نے اُسے آتش زدہ مگر زندہ صورت میں باہر نکال لیا۔ وہ اُسے اس کے گھر لے جانے کے لیے روانہ ہوئے جہاں اُس کے زخموں کا علاج ممکن تھا، لیکن ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ اس نے انھیں خود کو ایک درخت کے سائے میں لٹانے کے لیے کہا تاکہ اس میں مزید سفر کے لیے توانائی بحال ہو سکے۔ وہ سارا دن شام تک وہیں پڑا رہا اور اس کی آنکھیں مُندی رہیں، اور جب بھی اس کی آنکھیں کھلتیں تو اُسی راستے کی جانب دیکھتیں جس طرف سے وہ آئے تھے۔ جیسے ہی شام ڈھلی ایک عورت کو اس راستے پر آتا دیکھا گیا۔ جب وہ قریب آئی تو لوگوں نے پہچانا کہ وہ اسی شخص کی بیوہ تھی جس کا صبح کریا کرم ہوا تھا وہ بالکل ایسے لگ رہی تھی جیسے دنیا میں اس کا معمول تھا۔ جب اُس نے لڑکے کے پاس جا کر اُسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو ہر کوئی یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اُسی راستے پر چلتے گئے اور پھر کبھی دکھائی نہ دیئے[2]۔

---

[1] کلیات۔ صفحات ۹۱۱ - ۹۱۷

[2] پردہ کے نظام کا ایک لازمی نتیجہ ہم جنسیت تھی اور میر نے یہاں پر بھی تبصرہ کے بغیر محبت کی عام صورتوں میں سے ایک کی حیثیت سے اس کی تصویر کھینچی ہے۔ کچھ جدید اُردو ناقدین خاص طور پر وہ جو مغربی ادب اور اس کے ذوقی معیاروں کی سمجھ بوجھ کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ اُردو ادب کی محض اس رجحان کی وجہ سے مذمت کرتے ہیں جو ان کے مطابق اُسے اچھے ادب کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے لیکن نقاد یا تو اس طرف توجہ ہی نہیں کرتے یا بھول جاتے ہیں کہ مثلاً شیکسپیئر کے ۱۵۴ سانٹس ( SONNETS ) میں سے ۱۲۶ سانٹس ایک خوبصورت نوجوان کی محبت کے بارے میں ہیں۔ ناقدین کے اس دبستان میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کے نظریات کی تطبیق اسی ادب کے کثیر حصّے کو رَد کر دیتی ہے جس سے وہ یہ نظریات مبینہ طور پر اخذ کرتے ہیں۔

شعلۂ عشق کی کہانی اٹھارھویں صدی عیسوی کی زندگی اور ادب دونوں میں عام طور پر پیش آنے والی صورتِ حال کی عکاسی کرتی ہے۔ یہاں عاشق میاں بیوی ہیں مرکزی کردار ایک نوجوان ہندو کا ہے جو ایک خوش شکل لڑکا تھا اور اس کے اکثر دوست اس سے لگاؤ رکھتے تھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ ان میں سے ایک ساتھی ایسا بھی تھا جس کی محبت کا جواب پرس رام نے محبت سے دیا اور دونوں اپنا زیادہ وقت ایک دوسرے کی صحبت میں صرف کیا کرتے لیکن ایک روز ایسا آیا کہ پرس رام نے اپنے دوست سے ملنا جلنا چھوڑ دیا اور مسلسل کئی دن تک اس کی خبر نہ لی۔ جب آخر کار دونوں ملے تو پرس آ کے عاشق نے اس اچانک بے اعتنائی کا شکوہ کیا اور اس کی وجہ دریافت کرنا چاہی، پرس رام نے جواب دیا کہ اس کی حال ہی میں شادی ہوئی ہے۔ اور وہ اپنی بیوی کو اس قدر چاہتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ایک لمحہ بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا وہ بھی اس سے اتنی ہی شدت کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ اس قدر کہ اسے یقین ہو چکا ہے کہ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اس کا عاشق لہ اٹھا کر اسے اس بات کا یقین نہیں ہے۔ یہ محض عورت کا فریب ہے اس پر مت جانا کون عورت محبت میں ہمیشہ وفادار رہی ہے اور کون عورت اپنے رفیقِ حیات کی موت کے صدمے سے جی اٹھنے میں ناکام رہتی ہے۔ بظاہر ہر عورت بڑی شائستہ ہوتی ہے لیکن اندر مہلک زہر بھرا ہوتا ہے۔ خدا خود ان کی ریاکاری کا ذکر کرتا ہے اور کوئی جاندار اس سے زیادہ بے وفا نہیں۔ پوری دنیا اُن کی دھوکے بازی سے واقف ہے اور ان کا فریب ہر مرد کی زبان پر ہے[1] اس نے یہاں تک کہا کہ اگر پرس رام کو اس کی باتوں پر شبہ ہے تو وہ اس کی بیوی کا امتحان لے کر دیکھے کہ اس نے سچ کہا ہے کہ نہیں، پرس رام اس پر رضامند ہو گیا اور ایک شخص کو اس کے گھر پر یہ بتانے کے لیے بھیجا گیا کہ پرس رام دریا میں نہاتے ہوئے ڈوب گیا ہے جب اس کی بیوی نے یہ خبر سنی تو اس نے ایک افسردہ نظر اس دروازے کی طرف ڈالی جس طرف سے پرس رام آیا کرتا تھا اور پھر غش کھا کر گر پڑی اور مر گئی جب پیامبر اس خبر کے ساتھ واپس پہنچا کہ کیا پیش آ چکا ہے تو پرس رام صدمے سے نیم پاگل ہو گیا اور اس کا دوست شرمساری اور افسوس سے چور، ایک روز بے مقصد گھومتے ہوئے پرس رام نے خود کو دریا کے کنارے پایا جہاں ایک مچھیرا اور اس کی بیوی آپس میں محوِ گفتگو تھے۔ اور بیوی میاں سے اس بات پر تکرار کر رہی تھی کہ پچھلے چند دنوں سے اس نے بہت کم مچھلیاں پکڑی ہیں اور گھر والوں کو اس وجہ سے بھوکا رہنا پڑا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ آج کل وہ رات کو مچھلیاں پکڑنے سے ڈرتا ہے کیونکہ ہر رات کو دریا کے کنارے ایک شعلہ ظاہر ہوتا ہے اور ایک پکار آتی ہے "پرس رام تم کہاں ہو؟" پرس رام اس روز بظاہر چلنے والا پرس رام بن گیا۔ وہ اپنے دوست کے پاس گیا اور اس سے کہا سو گذر گئی سو گذر گئی اور اب اس کے افسوس سے کچھ حاصل نہیں۔ کیوں نہ وہ اور اس کے چند دوست شام کو دریا کی سیر کو چلیں، اس کا دوست اسے پُرسکون دیکھ کر بہت خوش ہوا، اور فوراً مان گیا جب شام پڑی تو وہ اس ماہی گیر کے ہمراہ کشتی میں سوار ہوئے جسے پرس رام نے اپنی بیوی کے بارے میں گفتگو کرتے سنا تھا۔

---

[1] کہنے والے کا مطلب ہے کہ خدا نے ایسا قرآن میں کہا ہے (تاہم درحقیقت قرآن میں عام طور پر کوئی آیت عورت کے ساتھ فریب کی خصلت کو منسوب نہیں کرتی)۔

کیونکہ انھیں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی دریا جس کا دیکھا بھالا ہوتا کہ وہ اندھیرا چھٹنے پر کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں، پرس رام اس کے قریب ہو بیٹھا اور اس نے اس شعلے اور اس اصل مقام کے بارے میں جہاں وہ ظاہر ہوتا تھا اس سے سوال کیا۔ وہ ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ شعلہ ظاہر ہوا، اور پکار سنائی دی "پرس رام تم کہاں ہو؟" باقی مسافروں کی لاعلمی میں پرس رام شدید اضطراری کیفیت میں کشتی سے اتر گیا۔ ماہی گیر نے اسے شعلہ سے گفتگو کرتے دیکھا جو ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔ پھر وہ بھڑکا اور اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گیا اور پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔ ظاہری اختلافات کے باوجود میر کی مثنویاں ایک انگریزی غنائیے ( BALLAD ) کی یاد دلاتی ہیں۔ دونوں سادہ شعری ساخت میں سیدھا سادہ قصہ بیان کرتے ہیں، جن کی صورت احوال اور کردار اس قسم کے ہیں کہ جو سامعین کے لیے مانوس ہیں تاکہ متکلم کی چند ہلکی سی جنبشیں پوری تصویر کو اجاگر کردیں اور مکالمے کے چند الفاظ سے مکمل کردار اُبھر کر سامنے آجائے۔ دونوں میں اصل کہانی حقیقت آمیز ہے اور مافوق الفطرت عنصر نمایاں ہونے کے باوجود باقی کہانی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے اور پوری فضا کو رفعت عطا کرتا ہے، اس پر مستزاد دونوں کے ماحول کا بیک وقت المیہ اور طربیہ ہونا ہے کیونکہ دونوں کا مرکزی خیال اس عورت اور مرد کی کہانی ہے جو مقدر کے نوشتے کا ہمت اور وقار سے سامنا کرتے ہیں۔

ان کی یکسانیت اسلوب تک پھیلی ہوئی ہے۔ بے شک مثنوی غنائیہ اور ہومری رزمیہ تمام میں ایک مؤثر خاصیت مشترک ہے یعنی سب میں وہ روایتیں تصنع سے بالکل مبرا اور واشگاف انداز میں استعمال ہوتی ہیں جو ساخت کے لحاظ سے مناسب سمجھی جاتی ہیں مثلاً محفوظ اقوال کی مسلسل تکرار، اوصاف، تشبیہات جو اپنی تازگی کبھی ضائع نہیں ہونے دیتیں کیونکہ ان میں شاعرانہ قوت کی رفعتوں تک اُٹھنے کی صلاحیت بھی ساتھ ساتھ ملتی ہے۔ جن سے ایک صریح بیان سادہ ترین الفاظ کے ذریعہ ناقابل فراموش حد تک واضح نقش چھوڑتا ہے، جیسا کہ ہومر کے ہاں سمندر ہمیشہ شراب ایسا تاریک، صبح صادق، گلاب جیسی اُنگلیوں والی، اور مویشی لڑکھڑاتے ہوئے ملتے ہیں ایسے ہی غنائیہ میں کھلتا ہوا سُرخ یا نقرئی رنگ، یا اعداد تین سات نو وغیرہ اکثر ایک سی تاثیر لیے ہوتے ہیں۔ ایسی تاثیر جس میں کھلے بازوؤں والی انسیت جیسے لامختتم شگفتگی میں گھل مل جاتی ہے۔ مثنوی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے اور اس کی چاند سے چہرے والی حسینائیں سرو کی طرح طویل قامت اور طرح دار ہیں جن کی زلفیں شبِ ہجراں کی طرح طویل اور سیاہ ہیں، جن کے ابرو تلوار کی طرح خمدار اور خطرناک ہیں، یہ وہ تشبیہات ہیں جو اُردو کی عشقیہ شاعری کی روایت میں شامل ہیں اور جنھیں شعراء سادہ اور فطری انداز میں برتتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بعض مخصوص اوزان مثنوی کے لیے خاص طور پر مناسب خیال کیے جاتے ہیں جیسا کہ نصابی کتابوں میں مذکور ہے۔ اوپر بیان کردہ پانچ مثنویوں میں سے تین میر حسن کی سحر البیان کی طرح اسی گیارہ حرفی متقارب میں ہیں۔ دوسری دو ایک دوسرے وزن میں ہیں جو مثنوی میں عام طور پر مستعمل ہے اور میر کے نزدیک پسندیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی اکائی ذرا کم متواتر مگر ترنم کا سختی سے پابند (خفیف) دس حرفی مصرع ہے۔ اس وزن میں بہت سے اوزان کی نسبت زیادہ زحافات کی اجازت ہے اور اگر ایک بار اس کی نسبتاً پیچیدہ ترتیب سمجھ میں آجائے تو اس میں بہت زیادہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے میر کی اپنی داستان محبت "معاملات عشق" اسی وزن میں ہے۔

مثنویاں میرؔ کی عشقیہ شاعری کے نسبتاً مختصر حصے کا احاطہ کرتی ہیں اور اس کا بقیہ اظہار غزل میں ہوا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کی شاعری کا غالب بلکہ بہترین حصہ ہے۔ وہ جدید قاری کی حسِ ادراک کے لیے مثنویوں سے زیادہ مشکل ہیں۔ ایک تو اس لیے کہ غزل کی صنف اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ وہ چست بُنت والی باقاعدہ اکائی سے ہمارا انداز فکر مرکزی خیال کی یا کم از کم مزاج کی مجموعی وحدت کا تقاضا کرتا ہے اور غزل اس سے محروم ہوتی ہے۔ دوسرے غزل محبت کے جس قسم کے تجربوں سے معاملہ رکھتی ہے اکثر و بیشتر جدید معاشرے میں رہنے والے کے لیے ناقابلِ فہم ہیں تیسرے غزل کی صنف کا اختصار جس آزادانہ تجربے کے اظہار کا واحد شعر میں تقاضا کرتا ہے اس نے اُسے بے حد اشاراتی کر دیا ہے۔ مغل ہندوستان کے سماجی حالات کا اور اس سے اُبھرنے والی صورتِ حال کا مکمل علم ہر جدید جس کا حامل نہیں ہوتا شاعر اپنے قاری کو بعینہٖ اس کا حامل تصور کر لیتا ہے۔ مثنوی میں شاعر جن معاملات کو تفصیل سے بیان کر سکتا ہے غزل میں ان کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنے سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تصویر کی تکمیل وہ قاری کی قوتِ متخیلہ پر چھوڑ دیتا ہے جس قدر وہ اپنے طور پر کر سکتا ہے۔ اختصار کی اسی خاصیت نے غزل کی مخصوص زبان پیدا کی ہے۔ اس میں الفاظ کے ضیاع کی گنجائش نہیں ہوتی اور ہر لفظ وہ تمام تعبیرات رکھتا ہے جن کی اس میں صلاحیت موجود ہوتی ہے اور جو غزل لکھنے والوں کی کئی مسلسل نسلوں نے اسے بخشی ہیں، اور آخراً غزل کی زبان اور اس کے لہجے کی مبالغہ آرائی کو چھوتی ہوئی جذباتیت اور غیر معقولیت جسے جدید قاری قبول کرنے میں دقت محسوس کرتا ہے۔

ان مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے اگر ایک بار ان کا پس منظر سمجھ لیا جائے۔ مگر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ ان میں سب کے ساتھ ایسا نہیں، غزل کی غیر مانوس خصوصیات میں سے بعض کو روایات کے طور پر قبول کرنا ہو گا جن کا قاری کو خود عادی بننا چاہیے۔ ادبی ذوق کی اکثر روایات کی طرح انھیں پہلے تعارف ہی میں قبول کر لینا آسان نہیں مگر ان کے جواز تلاش کرنے سے قبول کر لینا اکثر زیادہ آسان اور سُود مند ہوتا ہے۔ آج کل ذو معنی جگت بازی مزاج کی معیوب ترین صورت سمجھی جاتی ہے مگر شیکسپیئر اور اس کے سامعین نے محسوس کیا کہ اس نے المیہ جذبات کو زیادہ گہرا کر دیا ہے۔ اس نے اس کی وضاحت نہیں کی کہ اسے کیوں بعینہٖ سمجھا جائے جس طرح جدید شخص بھی اپنے رقیب کو موزوں ثابت کرنا اس قدر آسان نہیں پائے گا۔ اسی طرح اُردو غزل پر دسترس حاصل کرنے کے لیے اسے اس کی باقاعدہ وحدت کی کمی کو بہر حال قبول کرنا پڑے گا اور اس بات کا احساس کرنا ہو گا کہ جس طرح ہمارے ہاں ساخت کی وحدت نفسِ مضمون کی وحدت کی متقاضی ہے اٹھارہویں صدی کے مغل ہندوستان میں ایسا نہیں تھا شاعر اور اس کے سامعین اس نظم پر نامطمئن نہیں ہوتے تھے جس کا ہر شعر اگرچہ قافیے کے واسطے سے ایک دوسرے سے منسلک تھا، مگر ایک علیحدہ اکائی تھا[1]

غزل کی حد سے تجاوز کرتی ہوئی شدتِ جذبات ایک اور امر ہے، یہ صرف ادبی روایت ہی نہیں زندگی کا سچا اظہار

---

[1] بلاشبہ اس حقیقت کا کہ اُردو شاعری اولاً دوسروں کے سامنے نغمہ سرائی کے لیے تصنیف کی جاتی ہے نہ کہ نجی محفل میں پڑھنے کے لیے صنف غزل کی اس خاصیت پر بڑا اثر ہے۔

بھی ہے جیسا کہ میر کی مثنویوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے عورت کے ہجر کا پروردہ، اپنے جذبات اور معاشرے کے ہاتھوں محبت کی بے پایاں قوت پر ایمان کی تعلیم پایا ہوا، عشق میں گرفتار ہونے پر اس شدید انتقام سے جس کا اسے نتیجۃً سامنا کرنا ہے خوف کھایا ہوا عاشق اور اس پر خود بھی ایمان رکھے ہوئے کہ محبت معاشرے کے لیے خطرہ ہے۔ اس تشنج سے ہار جاتا ہے جو اکثر اوقات ناقابلِ برداشت ہو جاتا اور اسے دیوانگی کا شکار بنا دیتا۔ ایسے تمام بے حد و حساب تیز و تند جذبات غزل میں بے کھٹکے اظہار پایا کرتے ہیں اور یہ بے روک اور مسلسل خود ترحمانہ اظہار جدید قاری کے لیے ایک اور رکاوٹ ہے جسے اس قسم کی چیزوں کو غیر مرد آنہ سمجھنے کی تربیت ملی ہوئی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کی فرانسیسی شاعری کی ایسی ہی خصوصیات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈوروتھی سیئرز نے یہ نکتہ بہتر طور پر اٹھایا ہے: "ہر دوسری چیز کی طرح جیسٹن میں رواج چلتا ہے۔" وہ لکھتی ہے "یہ نظریہ کہ ایک توانا شخص کو عظیم ذہنی اور ذاتی آفات میں سے ہونٹوں کی معمولی جنبش اور سگریٹ کو خاموشی سے انگیٹھی میں پھینک کر گزر جانا چاہیے زمانۂ حال کی اختراع ہے۔"[1] کسی کو اس کی صداقت جانچنے کے لیے انگریزی ادب سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ شیکسپیئر کی رومیو جولیٹ اُردو غزل کی طرح اسی شدید اور بے پایاں جذبات سے لبریز ہے اور صرف یہ حقیقت رومیو کو ایک پُرجوش، جری اور ثابت قدم شخص ہونے کے باوجود اپنی جلاوطنی کی خبر کا ایک تقریر میں جواب دینے سے نہیں روک سکتی جو اپنی تندی و تیز خود رحمی میں اُردو غزل کا مقابلہ کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ اُردو غزل کی قدر پہچاننے کے لیے دو باتیں ہمیشہ ذہن میں رکھنی چاہئیں۔ پہلی یہ کہ غزل کی اپنی روایات ہیں اور اگر ان میں سے بعض ہمارے لیے اجنبی ہیں تو ضروری نہیں کہ وہ اس سے مہمل بن جائے، دوسری یہ کہ کئی خصوصیات جو پہلی نظر میں چاہے خالصتاً روایتی محسوس ہوتی ہیں درحقیقت جذبات کا براہِ راست فطری اظہار ہیں اور ہمیں صرف اس لیے اجنبی محسوس ہوتی ہیں کہ اب اس صورت احوال سے مانوس نہیں رہے جس سے انھوں نے جنم لیا ہے۔

آدمی عشقیہ اُردو شاعری کے آغاز پر ہی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو جاتا ہے، اُردو غزل کی محبت ہمیشہ پہلی نظر کی محبت ہوتی ہے۔ جدید شخص جو اسے رومانوی نامعقولیت گردانتا ہے سچی زندگی سے بہت دُور ہے۔ وہ سچی زندگی جسے وہ جانتا ہے شاید اس کے لیے بہت پیش پا افتادہ چیز ہے کیونکہ وہ ایسے معاشرے میں رہتا ہے جہاں لڑکے لڑکیاں آزادانہ میل جول رکھتے ہیں جہاں شادی دونوں فریقوں کے باہمی آزادانہ انتخاب سے کی جاتی ہے اور محبت شادی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اسے علم ہے کہ شدید فوری کشش جو چاہے اس کے تجربے کے مطابق بھی کسی لڑکے اور لڑکی کے مابین محسوس کی جاتی ہو گی شاذونادر ہی شادی کے لیے کافی بنیاد فراہم کر سکتی ہے اور کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ سمندر میں اس کے لیے ابھی کافی تعداد میں اور مچھلیاں موجود ہیں، اس لیے وہ اپنی اہمیت جتلاتا ہے۔ لیکن مغل ہندوستان میں اس کا عاشق بالکل مختلف صورتِ حال سے دوچار ہے ہو سکتا ہے وہ طوفانی محبت کے تجربے کے بغیر یہاں تک کہ اپنی برادری میں اس لڑکی کو دیکھے بنا ہی زندگی سے گزر جائے جس سے وہ محبت کرتا تھا اور اگر قسمت کا ایک اچانک پھیر اسے اس قابل بنا بھی دے تو اس پر اس کا اثر شدید ہو سکتا تھا

---

[1] دی سانگ آف رولینڈ (ہرمنڈز ورتھ، ۱۹۵۷ء) کے ترجمہ کے تعارف میں۔ صفحہ ۱۵۔

ممکن ہے شادی کے تصورات اس کا رویہ متاثر نہ کرتے ہوں کیونکہ وہ ہر حالت میں اس کے ساتھ صرف عشق ہی کر سکتا تھا، شادی نہ کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کے نزدیک پہلی نظر کی محبت کوئی دور از کار رومانوی نامعقولیت نہیں بلکہ اس زمانے کی حقیقی زندگی کی کیفیات میں محبت کا حسبِ معمول آغاز تھا، چنانچہ یہ ایک حقیقی اور مشترک تجربہ ہے جو میر بیان کرتا ہے جب وہ اپنی محبوبہ کو دیکھتا ہے[1]:

زلفیں کھولے جو تو ٹک آیا نظر
عمر بھر یاں کام دل برہم رہا (I-۴۰ : ۲۵)

یا جب وہ کہتا ہے:

ہوش و صبر و خرد و دین و حواس و دل و تاب
اس کے اک آنے سے کیا کیا نہ گیا مت پوچھو (I-۱۳۳ : ۱۹)

یا ایک شعر جو ایک ہی استعارے میں ایک عورت کے حسن کے ساتھ ساتھ اس بھیانک خطرے کو بھی ظاہر کرتا ہے جس کا سامنا کرنے کے لیے اس کے عاشق کو تیار رہنا چاہیے:

میر تلوار چلتی ہے تو چلے
خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور (I-۷۱ : ۱۵)

یا اس طرح کے شعر میں:

آنکھیں جنھوں کی زلف و رخِ یار سے لگیں
وے دیکھتے نہیں سحر و شام کی طرف (II-۲۷۸ : ۸)

---

[1] ہم نے اس باب کے دوران اس مفروضہ پر لکھا ہے کہ میر کی غزلوں کا محبوب ''معاملاتِ عشق'' میں اس کی محبوبہ کی طرح پردہ سوسائٹی کی مخصوص عورت ہے۔ خود معاملاتِ عشق اس نقطۂ نظر کا خاصا معقول ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ میر کی غزلوں کی بابت یہ مفروضہ درست ہے، لیکن کسی اور معاشرے کی طرح پردہ سوسائٹی میں کہ جہاں دونوں جنسوں کے درمیان شدید علیحدگی موجود ہے اور مرد و عورت کی معاشرتی حیثیتوں میں واضح تفریق پائی جاتی ہے، عشق ہم جنسیت میں بھی اور مہذب ہواؤں کی طرف رجوع میں اپنے نکاس کے راستے تلاش کر لیتا ہے۔ چنانچہ نوخیز لڑکے اور ہوائیں پردہ نشین خواتین سمیت اردو غزل میں محبوب کے کردار میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بعض صورتوں میں اظہار اس قدر عمومی ہو گیا ہے کہ محبوب کے طبقے اور جنس کی پہچان نہیں ہو سکتی بہرحال اردو کی عشقیہ شاعری کے فلسفے میں حسن کی تمام صورتیں عشق کو اپنے اپنے طبعی اور موزوں جواب کے طور پر وجود میں لاتی ہیں اور ہواؤں سے عشق یا جنسی تعلق پر کوئی قدغن نہیں ہے اور نہ ہی وفاداری کا تصور یک زوجی ہے کسی کی اپنے محبوب سے وفاداری سے مراد اس کی یا اس کی آرزو کی کامل اطاعت ہے۔ اس کا ضروری نہیں یہ مطلب ہو کہ ایک سے زیادہ محبوب نہیں رکھ سکتا۔ میرا اپنے زمانے کے بیشتر تہذیب یافتہ افراد کی طرح ہواؤں سے آزادانہ گھلا ملا ہو گا (اوپر درج شدہ پیرے میں صفحہ ۳۵ پر۔ وہ خوبصورت عورتیں۔۔۔۔ جن کی لمبی زلفوں نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا۔ یقیناً ہوائیں ہی ہو سکتی ہیں) کتاب کے پہلے صفحات (مترجم)

اس شعر کی فریب آسا ظاہری سادگی غزل کی رمزیاتی تکنیک کی اچھی طرح وضاحت کرتی ہے۔ اس کا پہلا اور صاف مطلب تو یہ ہے کہ زلف و رُخِ یار کی ایک جھلک نوجوان عاشق کو ہمیشہ کے لیے جکڑنے کے لیے کافی ہے لیکن استعمال کردہ الفاظ اس سے کہیں زیادہ گہرے مفاہیم کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ غزل میں عام طور پر شب سیاہ سے محبوب کی زلفوں کا تقابل کیا جاتا ہے۔ سورج یا روزِ روشن اور اس کے چہرے کی جیرہ کن ضوفشانی کی بات بھی کچھ اسی طرح کی ہے۔ چنانچہ شعر کا ایک مفہوم یہ ٹھہرتا ہے کہ سحر و شام کی خوبصورتی زلف و رُخِ یار کی خوبصورتی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے لیکن ان الفاظ کے معنی یہ بھی ہیں کہ عاشق کے لیے وقت کا تسلسل عزا ہم ہے۔ محبت نے اسے عمر بھر کے لیے خود میں جذب کر لیا ہے اور اس کی شدت میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ تیسرے اس شعر سے ایک مراد یہ بھی لی جا سکتی ہے کہ سچی محبت نہ صرف یہ کہ وقت بلکہ رنج اور خوشی میں اسی طرح کسی تغیر کے بغیر جاری رہتی ہے جہاں ساری محبت ہی چوری چھپے کی ہو اور عاشقوں کو شادی کے قابل لڑکے لڑکیوں کے درمیان رابطے کو نا ممکن بنانے کی خاطر گھڑے ہوئے نظام میں سے ہی راہ نکالنا پڑتی ہو تو جیسے بھی ہو ایسی خفیہ ملاقاتیں دن میں ہی ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ دن نشاط وصل کی علامت بن جاتا ہے اور راتیں (ان کی لمبائی محبوب کی زُلفوں کی طوالت کا استعارہ بھی ہے) جبری فراق کے اندوہ کی۔ معانی کے یہ سارے رنگ شعر کے فہم سے متعلق ہیں اور اگر جدید قاری معترض ہو کہ یہ تو شعر کی شعریت لکھے ہوئے سے زیادہ تفسیر ہے تو غزل کا شاعر اور اس کے سامعین اولیو شرائنر کے الفاظ میں یہ جواب دے سکتے ہیں کہ یقیناً تمام کہانی بیان بیان نہیں کی گئی لیکن اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور سچے فن کی خاصیت ......." یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ کہتا ہے جو وہ بظاہر بیان کرتا ہے اور خود سے تمھیں کہیں دُور لے جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا دروازہ ہے جو لا محدود احاطے میں کھلتا ہے۔ جہاں تم وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہو جو تمھیں مسرور کر دے۔" اولیو شرائنر ایک اور مثال سے اس نکتے کی وضاحت کرتا ہے: "اگر ہم ایک اصل آدمی کا ناخن اور انگلی لے لیں تو ہم اس سے پوری داستان جوڑ سکتے ہیں۔ انسان کو دوبارہ سر سے پاؤں تک نئے سرے سے بنا سکتے ہیں۔"[1] اس مثال کو اسی مناسبت سے غزل پر چسپاں کیا جا سکتا ہے جس کے بہترین شعروں میں سے کئی ایک بلاشبہ اسی "اصل انسان کے ناخن اور انگشت" کا کام دیتے ہیں۔

اس شعر کی طرح سارے شعر ہی داد خواہی کے لیے پس منظر کے اسی سطح کے علم کا تقاضا نہیں کرتے کئی ایسے بھی ہیں جن میں شاعر اپنی محبوبہ اور اجمالاً ایک حسین کے حُسن میں لطف کے احساس کا اظہار کرتا ہے۔ ایسے سروں میں جو کسی بھی ملک اور کسی بھی زمانے میں قابلِ فہم ہوں :

جمع خوباں میں مرا محبوب اس مانند ہے
جوں مہِ تابندہ آتا ہے کبھو تاروں کے بیچ (II - ۶۴ : ۱۶)

سرگرم جلوہ اس کو دیکھے کوئی سو جانے
طرزِ خرام کیا ہے حُسن و جمال کیا ہے (II - ۲۵۷ : ۱۲)

---

[1] دالعت آئرن (اولیو شرائنر) دی سٹوری آف این افریقن فارم (لندن ۱۸۹۳ء) صفحات ۱۷۱ - ۱۷۲

آنکلتا ہے کبھو ہنستا تو ہے باغ و بہار
اس کی آمد میں ہے ساری فصل گل آنے کی طرح (II - ۲۶۰ : ۱۱)

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں (III - ۴۱۲ : ۲۴)

اتنی سڈول ویسی دیکھی نہ ہم سنی ہے
ترکیب اس کی گویا سانچے میں گئی ہے ڈھالی (VI - ۶۲۴ : ۹)

ساتھ اس حسن کے دنیا تھا دکھائی وہ بدن
جیسے جھلکے ہے کھڑا جوھر تن پانی میں (II - ۲۹۴ : ۱)

گوندھ کے گویا پتی گل کی وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں (IV - ۵۰۳ : ۲۴)

تنگی جامہ ظلم ہے اے باعث حیات
پاتے ہیں لطف جان کا ہم تیرے تن کے بیچ (III - ۳۹۲ : ۱۲)

لطف اس کے بدن کا کچھ نہ پوچھو
کیا جانیے جان ہے کہ تن ہے (II - ۳۶۰ : ۱۲)

چشم مشتاق اس لب و رخ سے لمحہ لمحہ اٹھتی نہیں
کیا ہی لگے ہے اچھا اس کا مکھڑا پیارا پیارا آج (II - ۵۵۲ : ۵)

میر ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے (I - ۱۵۹ : ۴)

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے (I - ۱۵۸ : ۲۱)

گلبرگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹھ لعل ناب سا (I - ۹ : ۸)

یاقوت کوئی ان کو کہے کوئی گل برگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے (I - ۱۸۱ : ۲۰)

ایک طرف میر اپنی محبوبہ کا حسن ایسی تشبیہوں سے سمجھاتا ہے دوسری طرف وہ محسوس کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اس کے حسن کی بے پناہ تاب دوسروں تک پہنچانے کے لیے کافی نہیں۔ وہ کہتا ہے :

اے گلِ نو دمیدہ کی مانند
تو ہے کس آفریدہ کی مانند (I - ۹۳ : ۱۹)

جس گھر میں تیرے جلوہ سے ہو چاندنی کا فرش
واں چادرِ مہتاب ہے مکڑی کا سا جالا (I - ۳۹ : ۱۶)

مشک و سنبل کہاں وہ زلف کہاں
شاعروں کے یہ شاخسانے ہیں (II - ۲۹۷ : ۷)

سرو و گل اچھے ہیں دونوں رونق ہیں گلزار کی لیک
چاہیے رو اس کا سا رو ہو قامت ویسا قامت ہو (I - ۱۲۹ : ۱۵)

اُردو شاعری کی روایت کے تحت وہ اکثر ان چیزوں کی تشبیہ دیتا ہے جو اپنے حسن کے باعث ضرب المثل بن چکی ہیں لیکن جب حسن کے تقابل کا موقع آتا ہے تو اس پر اسے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ نازاں گلاب، بلبل، طویل قامت، نازک اندام، سرو کی طرح متناسب جو اپنے احساسِ حسن سے سرشار باقی چمن سے الگ انفرادی آن بان سے کھڑا ہو۔ شمع جس کے شعلۂ روشن کی طرف اس کا عاشق پروانہ جان کی قیمت پر بھی بے اختیار کھنچا چلا جاتا ہے :

قدِ یار کے آگے سرو چمن
کھڑا دور جیسے گنہگار تھا (II - ۲۴۷ : ۱۳)

بلبل خموش و لالہ و گل دونوں سرخ و زرد
شمشاد محو ہے کسی اک نسترن کے بیچ
کل ہم بھی سیر باغ میں تھے ساتھ یار کے
دیکھا تو اور رنگ ہے سارے چمن کے بیچ (II - ۲۵۸ : ۱۹-۲۰)

آگے جب اس آتشیں رخسار کے آتی ہے شمع
پانی پانی شرم مفرط سے ہوئی جاتی ہے شمع (III - ۳۰۱ : ۱۷)

بالفرض فطرت ایسی دلفریبی کی حامل ہے بھی کہ اس کے حسن کے ساتھ تشبیہ دی جا سکے تو وہ بھی اس وجہ سے ہے کہ اس کی دلکشی کا مخرج بھی اسی کا حسن ہے :

چشمکِ انجم میں اتنی دلکشی آگے نہ تھی
سیکھ لی تاروں نے اس کی آنکھ جھمکانے کی طرح (II - ۲۹۰ : ۱۲)

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے (I - ۲۰۷ : ۲۳)

اب جو نسیم معطر آئی شاید بال کھلے اس کے
شہر کی ساری گلیاں ہوگئیں گویا عنبر سارا آج (۷ : ۵۵۳ - II)

ایک لڑکا جب جذبات کی رَو میں آکر پہلی پہلی بار محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کے لیے یہ حقیقت پوشیدہ رکھنا مشکل ہوجاتا ہے اور اسے اس پر معاشرے کی نافذ کردہ سزا کو بھگتنے کے لیے خود کو تیار بھی کرنا پڑتا ہے۔ جو رفتہ رفتہ پہلے شبہے سے پیدا ہونے والی عداوت سے بڑھ کر جسمانی تشدد تک پہنچ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی کے لیے خطرہ بن جاتی ہے لیکن کئی اعتبار سے یہ اس کے خائف ہونے کے لیے کم از کم خدشات ہیں اور اتنا وہ ضرور جانتا ہے کہ اس کے مقدر میں کیا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے بدترین امر یہ بے یقینی ہے کہ جس لڑکی سے وہ محبت کر رہا ہے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔ اکثر اوقات پردہ دار معاشرے میں لڑکی نے اسے دیکھا بھی نہیں ہوتا۔ وہ سوائے ان حالات میں کہ جن میں کوئی دوسرا شخص اسے نہیں دیکھ رہا ہوتا۔ اس بے خبری میں کہ اسے دیکھا جا رہا ہے برقعے کے بغیر نہیں ہوتی۔ لیکن چاہے لڑکی نے اُسے دیکھ لیا ہو اور اس کا جذبۂ محبت بھانپ لیا ہو پھر بھی وہ اس سے بے اعتنائی برت سکتی ہے بلکہ عداوت پر آمادہ ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ پہلی نظر کی محبت دو طرفہ ہو۔ وہ چاہے بے نیازی دکھائے یا نہیں۔ عموماً اپنے حُسن پر غرور اور حُسن کے تازہ شعور کے ساتھ اس پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتی ہے اور اپنے محبوب پر اختیار کے احساس کے ساتھ اس اختیار کو استعمال کر کے مسرت حاصل کرتی ہے۔ یہ سب کچھ بعید از فہم نہیں اور اس کا فہم دوچند ہوجاتا ہے۔ یہ معلوم کر کے کہ مغل معاشرے میں عورت کس قدر کم ایسی طاقت استعمال کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی پروردہ ہے جہاں مرد ہر میدان اور زندگی کے ہر مرحلے میں اس کا آقا ہے۔ بچپن میں وہ اپنے باپ کے اختیار میں ہوتی ہے۔ شادی ہونے کے بعد خاوند کے بڑھاپے میں بیٹوں کے اور اسی پر بس نہیں ہے۔ ہندوستان کے مشترکہ خاندانی نظام کے تحت اسے شادی کے فوراً بعد اپنے میاں کے گھر رہنے کے لیے جانا ہوتا ہے جہاں اُسے اپنے سے بڑوں کی ایک پوری ٹولی کی ماتحتی کرنا پڑتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی ساس ہی کی نہیں اپنے سے بڑی نندوں اور جیٹھانیوں کی بھی۔ وہ سب جن کا عمر بھر کا تجربہ اسی کی طرح مردوں کی غلامی رہا ہو، اکثر اس پر حکم چلا کر اس کی تلافی کرنے میں تسکین محسوس کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ بے حد معمولی باتوں میں بھی نوجوان دلہن اسے ایک معمول سمجھ کر قبول کرتی ہے کہ نئے گھر میں اس کی زندگی کے کم از کم ابتدائی مرحلے صبر آزما تجربہ ہوں گے۔ اٹھارہویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایک اُردو ناول نگار نے اس کی ہیئت کذائی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے :

"ماں باپ کے گھر میں جو آزادی تھی وہ باقی نہ رہی۔ یہاں سسرال آتے ہی اس کی ہر ایک بات کو لوگ دیکھنے اور تاکنے لگے، کوئی منہ دیکھتا ہے کوئی چوٹی کی لمبان ناپتا ہے۔ کوئی قد کی اُٹھان کو تاڑتا ہے، کوئی زیور ٹٹولتا ہے کپڑے پہچانتا ہے، کھاتی ہے تو لقمے پر نظر، نوالہ کتنا بڑا لیا، منہ کتنا کھولا، کیوں کر چبایا، اور کس طرح نگلا، اُٹھتی ہے تو دیکھتے ہیں کہ دوپٹہ کیوں کر اوڑھا، پائنچے کس طرح اُٹھائے، سوتی ہے تو وقت پر نگاہ ہے کہ کس وقت سوئی، کب اٹھی، الغرض جملہ حرکات و سکنات اس کی

زیر نظر تھیں"۔[1]

مغل ہندوستان کی عورت اس کے علاوہ کسی اور طرز زندگی سے واقف نہ تھی اور اس پر اعتراض نہ کرتی تھی مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے طبقے کے مصائب کو محسوس نہیں کرتی تھی، بلکہ وہ اپنی باری آنے پر ایک روز اپنے سے کم عمروں کو تکلیف پہنچاتی جب بڑا ہونے پر اسے آخرکار اس کا حق حاصل ہو جاتا، یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ کسی کو تکلیف میں مبتلا کر کے تسکین حاصل کرتی ہو۔ اور وہ بھی ایک مرد کو جسے تقدیر کے ایک ہی جھٹکے نے اس کے رحم و کرم پر لا ڈالا ہو۔ اُردو غزل اس ستم گری سے بھری پڑی ہے جو عاشق اس کی جانب سے سہتا ہے تاہم اس کے خود نسرانہ تفاخر اور تمکنت کی غیر ارادی تعریف کی آمیزش سے جس کے ساتھ وہ اس پر مشق ستم فرماتی ہے۔ یہی خصوصیات جو اس کے لیے باعثِ رنج و الم ہیں محبوب کو اس کی نظر میں اور دلکش بناتی ہیں، وہ اس کی طرف نظر کرتا ہے اور سوچتا ہے :

مر جاؤ کوئی پروا نہیں ہے
کتنا ہے مغرور اللہ اللہ (۴۳ : ۱۳۷ - I)

جی گیا یاں بے دماغی سے انہوں کی اور واں
نے جبیں سے چین گئی نے ابروؤں سے خم گئے (۲ : ۳۵ - II)

فلک نے بہت کھینچے آزار لیک
نہ پہنچا ہم اس دلآزار سا (۸ : ۲۴۰ - III)

اور ان سے نمٹنے کے لیے وہ آخری جتن کے طور پر اپنے آپ کو الزام دیتا ہے کہ اس پر یہ بات کھولنا ہی نہیں تھی کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا ہے کیونکہ اسی محبت نے اسے پہلی بار حسن اور اس سے حاصل ہونے والی قوت کا شعور دیا ہے :

میرا اظہار محبت میں گیا جی تیرا
ہائے ناداں بہت تو نے چھپایا ہوتا (۸ : ۲۳۳ - II)

اس کا اپنے نودریافت حسن میں مکمل انجذاب بہت سے شعروں کا مرکزی خیال ہے، بعض اوقات لہجہ تلخ ہو جاتا ہے :

وہ محوِ جمال اپنے ہے پروا نہیں اس کو
خواہاں رہو تم اب کہ طلب گار رہو تم (۷ : ۴۰۷ - III)

وہ حسین ہے اور حسین عورتیں اپنا ضابطہ خود ہوتی ہیں :

کرتے ہیں جو کہ جی میں ٹھانے ہیں     خوب رو کس کی بات مانے ہیں (۲۵ : ۲۹۴ - II)

---

[1] نذیر احمد، مرآۃ العروس (دہلی ۱۸۹۹ء ایڈیشن) صفحہ ۷۸۔ جی ای وارڈ، دی برائڈز مرر (لندن ۱۹۰۳) صفحہ ۹۳ (انگریزی ترجمہ) یہاں پر اُردو متن لاہور ایڈیشن (۱۹۷۱) کے صفحہ ۷۰ سے لیا گیا ہے۔ (مترجم)

بعض اوقات اس غیر ارادی تعریف میں طنز و مزاح کا رنگ بھی ملتا ہے۔

تناسب پہ اعضا کے اتنا تبختر
بگاڑا تجھے خوبصورت بنا کر (III - ۳۹۶ : ۲۰)

اور کبھی کبھی تو شاعر ایسی زبان میں بات کرتا ہے جو شاید قصداً دوسرے کو مخمصے میں ڈالنے کے لیے ہوتی ہے کہ وہ اس کی کیا توضیح کریں:

ناگہ جو وہ صنم ستم ایجاد آگیا
دیکھے سے طور اس کے خدا یاد آگیا (III - ۲۲۸ : ۱۵)

اس کی بہت سی توضیحات ممکن ہیں۔ یہ شعر محبوب کی براہِ راست توصیف بھی ہو سکتا ہے یعنی اس کا وجود اس قدر پُر جلال ہے کہ اس کو برداشت کرنے کے لیے خدا کو یاد کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ کوئی شدید دباؤ کے لمحات میں کیا کرتا ہے یا پھر یہ کہ وہ اس قدر باوقار ہے کہ خود خدا کی تمکنت یاد آجاتی ہے یا پھر میر طنزیہ لہجے میں کہہ رہا ہے کہ وہ جو خود کو اتنا ہوا دے رہی ہے تو آخر وہ خود کو کیا سمجھے ہوتے ہے؟ خدا تعالیٰ، اس پر مستزاد پہلے مصرعے کے صنم اور دوسرے مصرعے کے خدا کے درمیان تقابل ہے جو خیال کے دوسرے راستے سجھاتا ہے اور جو یکسر غزل کا تلازمہ ہے۔ اس پر اس کی محبوبہ کا ارادی ظلم بالتجبر ہے جس سے ہر عاشق کو گذرنا پڑتا ہے لیکن صرف اور صرف بے اعتنائی کے علاوہ کئی دوسرے عوامل اس کی تحریک کا باعث ہو سکتے ہیں وہ لڑکی بھی جس نے اسی قدر والہانہ شیفتگی سے جواب دیا جس قدر اس کی محبت والہانہ اور بھرپور تھی، اس سے اسی قسم کا سلوک کر سکتی ہے کیونکہ اس لڑکی کے لیے محبت کی سزائیں اور جزائیں دونوں اس کی بہ نسبت زیادہ ہوتی تھیں، ایک مرد عالمِ شباب میں گرفتارِ محبت ہونے کے بعد بھی معاملہ ٹھنڈا پڑ جانے پر معاشرے کی فطری زندگی میں اپنا مقام دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا تھا مگر ایسا کسی عورت کے لیے ممکن نہ تھا اور اگر ایک بار اس کی محبت افشا ہو جاتی تو معاملات عموماً اس کی خودکشی پر منتج ہوتے تھے۔ پھر بھی اس کی زندگی کے معمولات میں کسی شخص کے اس کے ساتھ سچی محبت کے امکانات اس قدر واضح طور پر مختلف تھے کہ اس یقینی حمایت کے باوجود جو کسی نہ کسی روز ادا کرنا پڑتا اس میں اسے بے حد کشش محسوس ہوتی تھی۔ اس کی جگہ پر موجود کسی کے لیے بھی سارا مسئلہ یہ جاننا ہوتا کہ اس کے عاشق کا عشق صادق ہے اور کیا اس میں ہر آزمائش کے مقابلے میں سچا رہنے کی ہمت اور جاں نثاری موجود ہے تاکہ جیسے بھی حالات اس پر گزریں وہ ان کا بار اٹھا سکے۔ اس لیے اس سے ہو سکے تو وہ اپنی محبت عاشق سے پوشیدہ رکھے اور ہر طرح سے اس کی دلشکنی کرتے ہوئے اسے امتحان میں ڈالے جب تک وہ مطمئن نہ ہو جائے کہ اس کی استقامت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے حسن پر اترائے، اس کی تباہ حالی سے مسرت کشید کرے اس کا عاشق سب کچھ اچھی طرح سے سمجھ رہا ہوتا اور تسلیم کر لیتا کہ اسے ہی اپنی جاں نثاری کا ثبوت دینا ہے اور اس کا ثبوت دینے کے لیے ہر کوشش کر دیکھتا اس امید میں اس کی بے پروائی محض تصنع ثابت ہو گی اور اگر حقیقی بھی ہو تو ہو سکتا ہے اس کی مسلسل وفاشعاری اسے کسی روز

محبت میں تبدیل کرے وہ اس جذباتی دباؤ کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا جو اس وجہ سے اس پر غلبہ حاصل کر لیتا جدید انگریز شخص اس قسم کی باتوں کے بارے میں فطرتاً کم گو ہے لیکن غزل کا شاعر بھی اتنا ہی فطری طور پر بھرپور مبالغے کے ساتھ سارا کچھ اسی طرح اُگل دیتا ہے جس طرح وہ محسوس کرتا ہے۔ اس کی محبت کی سختیاں اور الم خود رحمی اور ذلت، غصہ اور تلخی، وہ اور تمام سچے عاشق جیسا محسوس کرتے ہیں ویسا ہی بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

عشق و محبت کیا جانوں میں لیکن اتنا جانوں ہوں
اندر ہی اندر سینے میں میرے دل کو کوئی کھاتا ہے (I - ۶۰۹ : ۲۲)

گھبرا کے یوں لگے ہے سینے میں دل تڑپنے
جیسے اسیر تازہ بے تاب ہو قفس میں (II - ۴۲۰ : ۱۰)

دل جلتے کچھ بن نہیں آتی حال بگڑتے جاتے ہیں
جیسے چراغ آخر شب ہم لوگ نبڑتے جاتے ہیں (I - ۵۸۸ : ۱۶)

صرف ان کے اپنے احساس کی شدت ہی اسے تباہ نہیں کرتی بلکہ اسے معاشرے کی طرف سے دی گئی سزا کو بھی برداشت کرنا ہوتا ہے جس کا ایک عاشق کو سامنا کرنا پڑتا ہے:

اس کی طرف جو لی ہم نے ہے اپنی طرف سے پھرا عالم
یعنی دوستی سے اس بت کی دشمن ساری خدائی ہوئی (I - ۶۰۲ : ۸)

کرے ہے جس کو ملامت جہاں وہ میں ہی ہوں
اجل رسیدہ، جفا دیدہ، اضطراب زدہ (I - ۱۳۸ : ۴۰)

کیا جانئے ہوتے ہیں سخن لطف کے کیسے
پوچھا تو نہیں ان نے ہمیں پیار سے اب تک (I - ۸۲ : ۲۱)

دوستی یاری الفت باہم عہد میں اس کے رسم نہیں
یہ جانیں ہیں مہر و وفا اک بات ہے گویا مدت کی (III - ۴۳۷ : ۱۴)

لطف و مہر و وفا وہ کیا جانے
ناز ہے خشم ہے عتاب ہے یاں
مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے (II - ۶۰۷ - ۵ : III - ۴۱۷ : ۱۲)

محبوب اور اس کے رویے کے درمیان تطابق کس قدر مکمل ہے۔

میں جو سنبھالتا ہوں وہ ہنس کے ٹالتا ہے یاں مشکلیں ہیں ایسی واں یہ مسالے ہیں (III ۳۰۵ : ۵)

واں سے جز ناز و تبختر نہیں کچھ یاں سے میر
عجز ہے دوستی ہے عشق ہے غمخواری ہے (۲۱ : ۶۱۷ - II)

اور اس کے باوجود وہی ہے کہ جسے معاشرہ اور محبوبہ مل کر گنہگار ٹھہراتے ہیں :

یاں جہر تھی و ناکشی واں جور بیٹھے ستم بیٹھے
پھر نکلے بھی تو میرے یہی گناہ نکلے (۹ : ۳۴۳ - II)

بعض شعروں میں وہ اسے براہ راست مخاطب کرتا ہے اُسے ملامت کرتے ہوئے، اس کی حسِ عدل اور جذبۂ ترحم سے استدعا کرتے ہوئے یہ تک سمجھاتے ہوئے کہ اس میں اس کا بھی نقصان ہوگا اور میرا بھی :

بن کچھ کہے سنا ہے عالم سے میں نے کیا کیا
پر تو نے یہ نہ جانا اے بے وفا کہ کیا تھا (۴ : ۴۷ - I)

کرتا ہے کون منع کہ سج اپنی تو نہ دیکھ
لیکن کبھی تو میر کے کر حال پر نظر (۱۴ : ۶۵ - I)

دشمن ہیں اپنے جی کے تمہارے لیے ہوئے
تم بھی حقوق دوستی کے کچھ ادا کرو (۲۲ : ۳۱۶ - III)

پامال کر کے ہم کو پچھتاؤ گے بہت تم
کمیاب ہیں جہاں میں سر دینے والے ہم سے (۱۰ : ۱۵۵ - I)

کبھی خیالوں میں اس کی ہم جولیوں کو اس کے سامنے اپنی وکالت کرتے ہوئے دیکھتا ہے :

تم کبھو میر کو چاہو سو کہ چاہیں ہیں تمھیں
اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں (۱۱ : ۴۲۳ - III)

ان شعروں کے ساتھ ساتھ جن میں اس کے تمام بھرپور جذبات کا اظہار ہوا ہے۔ ایسے دوسرے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں ایک مخصوص تیکھا مزاج نمایاں ہے۔ اس کو احساس ہے کہ اس کے اور اس کی محبوبہ کے مرتبے اور پوری صورتِ حال میں کہیں کوئی چیز ایسی ہے جو کسی دوسرے کو ذرا مضحکہ خیز لگ سکتی ہے۔ یہ نکتہ کئی ایک جگہوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی ساری وفا شعاری بے سود ثابت ہو رہی ہے وہ اس کی محبت تو کیا اس کی ہمدردی تک نہیں جگا سکی اور وہ خود کلامی کرتا ہے :

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانیے یہ کب کی بات (۱۰ : ۵۹ - I)

وہ تصور کرتا ہے کہ لوگ اس کے سادہ ستمگر محبوب کو بنا رہے ہیں :

حسن تو ہے ہی کرو لطف زباں سے پیدا    میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں (۸ : ۲۹۰ - II)

اس جیسی دوسری تمام مثالوں سے ناواقف لوگ اسی کو بُرا بھلا کہیں گے لیکن کوئی مثال بھی اس سے زیادہ نامناسب نہیں کہ سب سے بڑھ کر خود وہی تو ہے جو اسے ستم پر اُکساتا ہے۔

بعض اوقات وہ اپنی محبوبہ کی قیمت پر خوش مذاقی کر جاتا ہے ہر سچے عاشق کی طرح وہ جانتا ہے کہ اس کی محبوبہ بے حد حساس ہے۔ وہ بہت معمولی بات پر برانگیختہ ہو جاتی ہے اور اس خاصیت کو اس کے استحقاق کے طور پر قبول کرتا ہے لیکن اسے یہ سمجھانے میں باک نہیں کہ ایک وہی نہیں بلکہ وہ خود بھی اسی طرح حساس ہو سکتا ہے اور اُسے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ وہ اُسے بتاتا ہے:

دل کی کچھ قدر کرتے رہیو تم
یہ ہمارا بھی ناز پرور تھا (۲۰ : ۴۲ - I)

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا (۱۰ : ۱۷ - I)

اس قسم کا کسی قدر تیکھا مزاج میرؔ سے مخصوص ہے۔ وہ آخری جتن کے طور پر یقینِ ذات سے اعتماد حاصل کرتا ہے اور حوصلہ ہارے بغیر عشق کے تمام امتحانوں میں ثابت قدم رہنے کی قوت رکھتا ہے اور اس لیے ان امتحانوں اور عشق کو اور اپنی محبوبہ اور اپنے آپ کو بغیر کسی فریبِ نظر کے دیکھ سکتا ہے۔ بلکہ جو کچھ دیکھتا ہے اس پر ہنس بھی سکتا ہے۔ بعض شعروں میں وہ بحیثیت شاعر اپنی شہرت پر تاسف کا اظہار کرتا ہے اور اس شہرت کی بطور عاشق اپنے مرتبے سے قابلِ رحم بے ربطی پر ہنستا ہے:

کچھ وسیلہ نہیں جو اس سے ملوں
شعر ہو یار کا شعار لے کاش (۱۳ : ۴۸۵ - I)

دکھن پورب پچھم سے لوگ آ کر مجھ کو دیکھیں ہیں
حیف کہ پروا اُس کو نہیں ہے مطلق میری صحبت کی (۱۲ : ۴۳۷ - III)

اپنے مرتبے کی یہ خاموش خوش دلانہ قبولیت مکمل طور پر اسی مرکزی خیال پر مبنی ایک مختصر غزل میں بہتر طور پر بیان ہوئی ہے۔ میرؔ کہتا ہے کہ محبت کے اس مرحلے پر اس کی طرف سے مکمل وفا شعاری اور اس کی کامل بے اعتنائی عناصر کی فطری ترتیب کا حصّہ ہیں اور اس کے اُلٹ کچھ کہنا دروغ گوئی کرنا ہے:

ہم اور تیری گلی سے سفر دروغ دروغ
کہاں دماغ ہمیں اس قدر دروغ دروغ

تم اور ہم سے محبت ہمیں خلاف خلاف
ہم اور الفت خوب دگر دروغ دروغ

غلط غلط کہ رہیں تم سے ہم تنک غافل
تم اور پوچھو ہماری خبر دروغ دروغ
کسو کے کہنے سے مت بدگماں ہو میرؔ سے تو
وہ اور اس کی کسو پر نظر دروغ دروغ (I - ۴۸۰، ۴۸۰، ۵، ۶، ۸، ۹)

اس بربادی کو نظر انداز کرتے ہوئے جو اس کا ستم اس پر ڈھا رہا ہے اس کا مزاحیہ پن جاری رہتا ہے اور وہ خاموشی سے اس کی محبت کا اعتراف کیے جاتا ہے اس پر زور دیتے ہوئے کہ یہ کوئی جرم نہیں ہے اور اس کی محبوبہ کو اس پر سزا دینے کا کوئی حق نہیں۔

کچھ تمہیں ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ
دوستی ننگ نہیں عیب نہیں عار نہیں (III - ۴۱۵ : ۲۰)

یا اگر یہ جرم ہے تو اسے نہیں بلکہ اس کی محبوبہ کو جواب دہ ہونا چاہیے اس لیے کہ اگر وہ اس سے محبت کرتا ہے تو اس لیے کہ اس کا حسن اُسے اس پر مجبور کرتا ہے :

ٹھہرے ہیں ہم تو مجرم ٹک پیار کر کے تم کو
تم سے بھی کوئی پوچھے تم کیوں ہوئے پیارے (II - ۶۱۵ : ۷)

وہ اس کے باوجود اس سے کچھ طلب بھی نہیں کرتا وہ کسی چیز کے لیے صرف سوال کرتا ہے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ وہ اس کی محبت نہیں چاہتا بلکہ اپنے آپ کو اس کے حضور پیش کرتا ہے اور اُسے بتا دیتا ہے کہ وہ اُسے رد کرنے کا آزادانہ اختیار رکھتی ہے لیکن اسے غور ضرور کرنا چاہیے کہ وہ کس قدر بیش قیمت چیز کو ضائع کر رہی ہے، یہ نکتہ بھی وہ کافی غیر سنجیدہ لہجے میں اُٹھاتا ہے۔ تمام محبوباؤں کے سامنے تمام عاشقوں کی نمائندگی کرتے ہوئے وہ کہتا ہے :

دل بیاں دل جنس ہے گنجائشی
اس میں کچھ نقصاں نہیں سرکار کا (II - ۶۶۳ : ۲۲)

جو کچھ بھی وہ کہتا ہے اس سے اس کی مراد بھی وہی کچھ ہوتی ہے اور جو کچھ یہاں قریب قریب مزاحیہ انداز میں پیش ہوا ہے کہیں اور خالصتاً سنجیدگی کے ساتھ بیان ہوا ہے :

آئینے کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو
حیران چشم عاشق دیکھے ہے جیسے ہیرا (II - ۲۲۹ : ۲۱)

یہاں صنعت غزل کی تمام رمزیاتی قوت استعمال کی گئی ہے تاکہ "وہ اس سے زیادہ بیان کرے جو وہ بظاہر کہہ رہی ہے اور خود سے نہیں دور سے لے جائے۔" پہلے درج شدہ شعر کی طرح اس کا کہنا ہے کہ عاشق کے خیال میں اس کی محبوبہ کا اپنی خوبصورتی پر ناز بے جواز نہیں اور اپنے لیے اس سے بس کبھی کبھی کی ایک نگاہ کی خواہش کرتا ہے لیکن اگلے ہی مصرعے میں واضح مراد یہ ہے کہ

اگر وہ صرف اسی کی راہ دیکھے تو وہ جو کچھ آئینے میں دیکھتی ہے اس سے زیادہ پُرکشش اور قابلِ قدر شے کا دیدار کرے گی اور یہ مفہوم اس قسم کے الفاظ کے استعمال سے زیادہ مستحکم ہوتا ہے جو رمز و کنایہ کی وسیع فضا رکھتے ہیں۔ خود آئینہ، ایسا ہی لفظ ہے۔ آئینہ عموماً خوبصورتی کے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ مجازی معنوں میں محسوسات کے حسن کے بارے میں برتا جاتا ہے کیونکہ شاعروں کے نزدیک کائنات خدا نے ایک عظیم آئینے کے طور پر اس لیے تخلیق کی تھی تاکہ اس کا اپنا الوہی حسن منعکس ہو سکے اور مزید بنیادی سطح پر جیسا کہ سحرالبیان میں ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بڑی عوامی تقریبات کے موقعوں پر آئینے سجائے جاتے ہیں۔ چنانچہ آئینہ بذا محبوبہ کی بینائی کے لیے بہت خوبصورتی کا حامل ہے اور اس سے بڑھ کر وہ اسے اس کے اپنے بے عیب حسن کی جھلک دکھاتا ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود اس سے اپنے عاشق کی آنکھوں میں جھانکنے کی فرمائش ہوتی ہے اور پہلا لفظ ہی اس امر کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ وہ آئینے کو شرماتی ہیں۔ لفظ حیران کا بنیادی مطلب جس کا ترجمہ یہاں منہمک ( INTENT ) کیا گیا ہے، زیاں کاری کا ہے زیاں کاری اس لیے کہ کسی جذبے کے غلبے کے باعث اور اس بارے میں اس حسن کے جو وہ دیکھتا ہے، جذباتی دباؤ کی وجہ سے، اور یہی آئینے کا بنیادی وصف ہے۔ اس کا انہماک اس قدر والہانہ ہے کہ جیسے وہ اس میں منعکس ہونے والے چہرے سے مسحور ہو گیا ہو۔ جب ایک بار آئینے سے مماثلت ٹھہر جاتی ہے تو شاعر مزید پیش قدمی کرتے ہوئے چشمِ عاشق کو دمکتے ہوئے ہیرے کے مشابہ ٹھہراتا ہے جو آئینے سے کہیں زیادہ چمک دار، خوبصورت اور بیش قیمت ہوتا ہے، وہ ایسا محض اس لیے نہیں ہے کہ وہ محض وفاداری کے ان تمام وعدوں کی پاسداری کرتا ہے جو عاشق اپنے محبوب سے کر سکتا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ وہ ان وعدوں کو وفا بھی کر سکتا ہے اور اصلی مجسم آئینے سے زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے، اگر وہ آئینے میں دیکھتی ہے تو وہ اُسے صرف وہی کچھ دکھائے گا جو کچھ وہ اس میں داخل کرتی ہے یعنی اس کا اپنا حسن اور اس کی خود وقعتی، اگر وہ اپنے عاشق کی آنکھوں میں دیکھتی ہے تو اسے وہاں اپنے حسن کی بہتر عکاسی ملے گی کیونکہ اس میں یہ بھی منعکس ہوگا اس کا حسن اس کے عاشق کے لیے کیا قدر و قیمت رکھتا ہے اس پر اس کا اندازہ خود اپنے بارے میں اس کے اپنے اندازوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

اگر جدید قاری کو ایک بار پھر یہ سب کچھ زیادہ الوکھا لگتا ہے تو یہی دہرایا جا سکتا ہے کہ جو کوئی غزل کی روایت میں گہرا اُترتا ہے اس پر یہ تمام بلند نوائیاں فوراً اپنے آپ کھلتی چلی جاتی ہیں، عاشق کا مخربہ زبانی اور عملی اظہار کہ اس کی محبت بے لوث ہے اور یہ اس کے محبوب کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ اسے قبول کر لے اس کی مؤثر ترین توجیہہ ہے اور اگر وہ صابر ہے اور ان تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہتا ہے جس میں اس کا محبوب اُسے مبتلا کر دیتا ہے تو وہ دن آ سکتا ہے جب وہ اس کی محبت کے جواب میں حوصلہ افزا علامتیں ظاہر کرنے لگتی ہے۔ وہ اپنے حسن کو ناقابلِ دسترس رکھتے ہوئے اب بھی اسے تڑپاتی ہے لیکن کبھی کبھار ایسے اشارے کے ساتھ کہ وہ اس کی وفاشعاری کا اعتراف کرتی ہے اور اس وجہ سے اسے پسند کرتی ہے۔ اس پر شاعر کا پہلا ردِ عمل حیرانی کا ہوتا ہے:

پوچھا تھا راہ جاتے کہیں اس نے میرؔ کو  
آتا ہے اس کی یاد کا اب تک عجب مجھے

(ج ۔ ۱۹۶ : ۳)

وہ محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے کہ اس کا حسن کس قدر بے پناہ ہے :

چشمک غمزہ عشوہ کرشمہ آن انداز و ناز و ادا
حسن سوائے حسن ظاہر میر بہت ہیں یار کے بیچ (I - ۵۵۶ : ۱۶)

خندہ و چشمک و حرف و سخن زیر لبی
کہیے جو ایک وہ افسوں ہوں دلدار کے پاس (II - ۲۷۳ : ۸)

وہ پوچھتی ہے کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے تو وہ جیسے اپنے آپ سے کہتا ہے :

دل میر دلبروں سے چاہا کرے ہے کیا کیا
کچھ انتہا نہیں ہے عاشق کی آرزو کو (III - ۵۰۰ : ۱۱)

اور اسے بے تکلفی سے جواب دیتا ہے :

کیا کہیے کیا رکھیں ہیں ہم تم سے یار خواہش
یک جان و صد تمنا یک دل ہزار خواہش (II - ۲۷۵ : ۳)

لیکن خواہش کا مطلب سوال کرنا نہیں بلکہ ضرورت سے کم طلب کرنا ہے اور وہ اسے یہ یقین دلانے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے کہ اس کے التفات کا ہلکا سا اشارہ بھی اس کے لیے بہت قیمت رکھتا ہے اور اسی لیے وہ کہتا ہے :

صبر کہاں جو تم کو کہیے لگ کے گلے سے سو جاؤ
بولو نہ بولو بیٹھو نہ بیٹھو کھڑے کھڑے ٹک ہو جاؤ (III - ۵۱۱ : ۷)

بہار آئی گل پھول سر جوڑے نکلے
رہیں باغ میں کاش اک رنگ ہم تو (III - ۶۵۹ : ۵)

یک نگاہ ایک چشمک ایک سخن
اس میں بھی تم کو ہے تامل سا (II - ۲۲۷ : ۲)

ایک وہ بات کبھو ہم سے کہو یا نہ کہو
قدر کیا اپنی ہمیں اس لیئے تکرار نہیں (III - ۴۱۵ : ۲۱)

گرچہ کب دیکھتے ہو پر دیکھو
آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو (I - ۱۲۴ : ۲۲)

کون کہتا ہے نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھو یاد کرو (I - ۱۳۰ : ۱۴)

اگر وہ ان التجاؤں سے اثر قبول کرتی ہے تو ایسا مرحلہ بھی آتا ہے جب اس کے لیے جذباتی تناؤ ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔

وہ اس کی محبت چاہتی ہے اور اس کے بدلے اسے اپنی محبت دینا چاہتی ہے لیکن اتنا کامل یقین محسوس نہیں کرتی جتنی شدت کے ساتھ وہ یقین سے درکار ہوتا ہے وہ یہ نہیں جان پاتی کہ وہ اس قیمت جتنی قدر رکھتی ہے جو اسے ادا کرنی ہے۔ کیا وہ اس پر اعتماد کر سکتی ہے کہ وہ آخر تک اس کا ساتھ دے گا یا اُسے خود وہ حوصلہ اپنے لیے پیدا کرنا چاہیے جس کا محبت کی کٹھنائیاں اس سے تقاضا کریں گی اور جس قدر اُسے خود پر ضبط حاصل ہوگا اسی قدر فوری اضطرار میں اس کی پس قدمی کے امکانات بڑھ جائیں گے اس سے پہلے کہ زیادہ دیر ہو جائے۔ ایسی ذہنی کیفیت میں ہر بے ساختہ اُبال اس پر غالب آتا ہے مگر وقتی طور پر تا کہ ایک لمحے وہ محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور اگلے ہی لمحے خوف سے پیچھے ہٹ جائے۔ اس لمحے ہمیشہ کے لیے سچا رہنے کی قسمیں کھائے اور اگلے ہی لمحے تمام وعدے بھول بھال کر عاشق سے لاتعلقی پر ڈٹ جائے۔ احساس کے یہ ہیجانی تغیرات لمبے عرصے تک جاری رہ سکتے ہیں۔ درحقیقت اتنی دیر تک جب تک پسپائی کا معمولی سا امکان بھی اس کے پاس باقی رہتا ہے۔ ٹامس ہارڈی نے قریباً ایک صدی پہلے کے دیہی انگلستان پر اپنے ناول "انڈر دی گرین وڈ ٹری" میں ایک لڑکی فینسی ڈے کے کردار کی عکاسی کی ہے۔ جو کئی پہلوؤں سے اُردو غزل کی ہیروئن سے ملتی جلتی ہے، کہانی کے نقطۂ عروج پر وہ بتاتا ہے کہ فینسی کس طرح اضطراریت کی رُو سے ایسا قدم اُٹھاتی ہے جو اس کے عاشق سے مکمل طور پر بے وفائی کے مترادف ہوتا ہے اور زندگی بھر کے لیے اس کی مسرت کو غارت کر سکتا تھا، لیکن ہارڈی نے اس کا اتنا عمدہ نقشہ کھینچا ہے کہ قاری سمجھ جاتا ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ اور اس کے لیے اپنی ہمدردی واپس نہیں لیتا۔[1] غزل کی ہیروئن کے معاملے میں زیادہ تر پس منظر قاری کی قوت متخیلہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ فینسی ڈے کی تفہیم کر سکتا ہے تو یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ کس طرح مغل ہندوستان کی لڑکی جو فینسی ڈے سے کس قدر پیچیدہ اور شدید طور پر مختلف اختیاری صورتوں سے دوچار تھی تو وہ یہی کچھ کر سکتی تھی جو اس نے کیا، اس سے خیالی ہمدردی برقرار رکھنے کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ ہم غزل میں اسے روبرو دیکھنے کی بجائے اس کے عاشق کے زاویۂ نظر سے دیکھتے ہیں جس کی نظر میں اس کے محبوب کا برتاؤ لازمی طور پر زیادہ خود سرانہ اور اس کے ستم ہمیشہ سے زیادہ متلون ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کہ وہ اس ذہنی کیفیت کو سمجھتا ہے جو اس کا باعث ہوتی ہے وہ اس کلفت کا اظہار اور اس پر احتجاج کئے بغیر نہیں رہتا جو ایسے رقیبے پر اسے محسوس ہوتی ہے:

ملنا نہ ملنا ٹھہرے تو دل بھی اپنا ٹھہرے
اقرار ہے ہمیشہ انکار ہے ہمیشہ
(۱۵ : ۶۶۱ - III)

اکثر اس کی مجبوری سے مکمل ہمدردی اور بے چینی کو بہلانے کے لیے مزاحیہ عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔

ہے عشق میں صحبت مرے خوباں کی عجب کچھ
اقرار سے بے زار ہیں انکار سے ناخوش
(۸ : ۴۸۶ - III)

---

[1] انڈر دی گرین وڈ ٹری حصہ چہارم باب ۶

کیا کریں نیچی نظر کرنے سے غصہ کھائے وہ
اور مجلس میں جو رہیے دیکھ تو شرمائے وہ (III - ۴۳۵ : ۵)

جو چپکے ہوں کہے چپکے ہو کیوں تم
کہو جو کچھ تمھارا مدعا ہے (II - ۳۵۵ - ۲۳ - ۲۴)

سخن کریے تو ہووے حرف زن یوں
بس اب منہ موند لے میں نے سنا ہے (II - ۳۵۵ - ۲۳ - ۲۴)

جب وہ اُسے جان بوجھ کر نظر انداز کرتی ہے تو وہ اسے ہلکے سے استہزا کے ساتھ بتاتا ہے :

ورنہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں (III - ۴۱۳ : ۱۱)

وہ ہمراہ بیٹھتے ہیں یہ جانے بغیر کہ ایک دوسرے سے کہنا کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ آخرکار اس سے استفسار کرتی ہے کہ وہ کچھ بولتا کیوں نہیں تو وہ بہت سنجیدگی سے جواب دیتا ہے :

ہم تو تمھارے حسن کی حیرت سے ہیں خموش
تم ہم سے کوئی کرتے نہیں بات کیا سبب (II - ۵۴۹ : ۴)

جیسے جیسے وہ ایک دوسرے سے زیادہ گھلتے ملتے ہیں اور اس کی کبھی کبھی کی چھیڑ چھاڑ اُسے غصے پر اُبھارتی ہے تو وہ اکثر اسی بھولپن سے اس کی بدگمانی دُور کرتا ہے :

بوسہ لبوں کا مانگتے ہی منہ بگڑ گیا
کیا اتنی میری بات کا تم کو بُرا لگا (II - ۲۱۶ ۰ ۴)

بوسہ لبوں کا مانگتے ہی تم بگڑ گئے
بہتیری باتیں ہوتی ہیں اخلاص پیار میں (III - ۴۲۰ : ۱)

آنکھیں غصے میں ہو گئی ہیں لال
سر کو چھاتی پہ رکھ کے خواب کرو (VI - ۶۵۸ : ۱۸)

وہ اسے راضی کر سکے یا نہیں چاہے وہ اُسے سمجھ سکے یا نہیں اس مرحلے پر محبوب اپنی طبیعت میں جس قدر بھی نامناسب اور متلون ہو، وہ اس کی محبت سے مجبور ہے۔

دیر بہ عہد وہ جو یار آیا
دُور سے دیکھتے ہی پیار آیا (VI - ۶۳۲ : ۸)

جیسے جیسے وہ اس کی طرف مزید مائل ہوتی ہے اُسے اُمید بندھتی ہے کہ وہ جذبۂ محبت سے مکمل طور پر مغلوب ہو جائے گی۔

اور جتنی رکاوٹیں اس نے اتنی دیر اس کے راستے میں کھڑی کی تھیں ختم ہو جائیں گی:

لطف سے لبریز ہے اس کا م جاں کا سب بدن
مختلط ہو جائے ہم سے جو کبھو تو پا سکے ووہ (III - ۴۳۵ : ۸)

چاہتا ہے جی کہ ہم تو ایک جا تنہا ملیں
ناز بے جا بھی نہ ہووے کم نگاہی بھی نہ ہو (I - ۱۳۵ : ۶)

گر میاں متصل رہیں باہم
نے تساہل ہو نے تغافل ہو (II - ۳۱۱ : ۸)

ہوتا ہے شوق حاصل کا انکار سے زیادہ
کب تجھ سے دل اٹھاتے ہیں تیری نہیں سے ہم (II - ۲۸۹ : ۲۱)

اقرار میں کہاں ہے انکار کی سی خوبی
ہوتا ہے شوق غالب اس کی نہیں نہیں پر (III - ۴۶۴ : ۵)

رانوں پاس گلے لگ سوتے ننگے ہو کر ہے یہ عجب
دن کو بے پردہ نہیں ملتے ہم سے شرماتے ہیں ہنوز (II - ۵۶۶ : ۱۷)

آخر کار وہ اس کی رفاقت میں جھجک محسوس نہیں کرتی اور اس کے اپنی سادگی اور سارے بہانوں سے نہتے ہونے پر وہ اس میں ہمیشہ سے زیادہ ناقابلِ برداشت حد تک دلکشی محسوس کرتا ہے:

ایک فقط ہے سادگی تس پہ بلائے جاں ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں ناز نہیں ادا نہیں (I - ۱۱۰ : ۳)

اور اگرچہ وہ اس کے عشق میں سب کچھ قربان کر چکا ہے مگر سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ اب بھرپور جواب دے گی جب وہ یہ کہتا ہے:

آج ہمارے گھر ہے تو آیا، کیا ہے یہاں جو نثار کریں
اِلّا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں (II - ۲۹۸ : ۲۲)

اس قسم کے اشعار اس مرحلے کا نقشہ کھینچتے ہیں جہاں عشق تہِ مشکل پر آخر کار فتح حاصل کر لیتا ہے لیکن اس جیسے اشعار غزل میں نسبتاً شاذونادر ہی ملتے ہیں اس لیے کہ غزل زیادہ تر مثنوی سے مختلف بے لوث محبت کی شاعری ہے۔ دونوں طرح کے تجربات حقیقی زندگی میں کثرت سے ملتے ہیں اور پہلی نظر میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مثنوی اور غزل حقیقت کی غلط تصویر پیش کرتی ہے اس لیے کہ ہر مثنوی میں محبوبہ ایک بار محبت کرتی ہے تو آخر تک نباہتی ہے جبکہ غزل میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ لگتا ہے کہ دراصل ہم یہاں ایک بار پھر ایک ایسی روایت کے مقابل ہیں جسے ہمیں من وعن تسلیم کر لینا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ صرف ایک شعری صنف

ہی دونوں تجربات میں سے ایک کی عکاسی کے لیے موزوں خیال کی جاتی تھی۔

اسے جوں کا توں رہنے دیں تو بھی غزل اَن گنت شعروں میں ایک ایسی دوشیزہ کی تصویر کشی کرتی ہے جو اپنے محبوب کی جانب سے سرد مہر ہوتی جا رہی ہے اور ان بندھنوں کو توڑنے کی کوشش میں ہے جنھوں نے اسے جکڑ رکھا ہے۔ ہمیشہ کی طرح غزل وہی کچھ بیان کرتی ہے جو عاشق اس وقت محسوس کرتا ہے جب اس کے ساتھ ایسا پیش آتا ہے، لڑکی کے سلوک کے محرکات قوت متخیلہ کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ بلاشبہ اس میں وہ سب کچھ شامل ہوتا ہے جو ایک آفاقی انسانی تجربے کے مطابق محبت کی سرد مہری میں تبدیل ہونے کے باعث واقع ہوتا ہے لیکن اس میں مغل سماجی نظام کی نافذ کردہ پابندیوں کا اضافہ بھی کر لینا چاہیے اخفا کو برقرار رکھنے کی ضرورت اور افشا کا ہمہ وقت خوف اور اس افشا کے ہمراہ آنے والی سزا سارے تعلق کو بے انتہا دباؤ میں مبتلا رکھتی ہے۔ عام طور پر ان کا ملاپ غیر متواتر، مختصر اور خطرناک ہوتا ہے اور تشنج کی فضا غلط فہمیوں اور تکرار کا سبب بن جاتی ہے جو دونوں کے لیے ہولناک تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ آخرا یہ کہ ایک احساس عورت کے بارے میں سدا موجود ہوتا تھا کہ اس کا رویہ باعث ننگ اور بے وفائی ہے۔ اگر وہ اتنی مشکلات کا سامنا کرتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ وہ ان کے ساتھ نہیں چل سکتی تو بات سمجھ میں آتی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ عام زندگی میں اسی قسم کی صورتِ حال بسا اوقات بلکہ زیادہ تواتر کے ساتھ عاشق کے نقطۂ نظر سے اسی پر منتج ہوتی ہے لیکن غزل ہمیشہ ایک ثابت قدم عاشق کو پیش کرتی ہے۔ وہ اپنے لیے اپنی محبت کو دم توڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک روز اس کی محبت کا اس کے محبوب کی طرف سے آزادانہ اور بھرپور جواب صرف یادوں میں ہی زندہ رہ جاتا ہے:

ہر آن تھی سرگوشی یا بات نہیں گاہے
اوقات ہے اک یہ بھی اک وہ بھی زمانہ تھا
(III - ۳۷۵ : ۱۳)

وصل میں اس کے روز و شب کیا خوب گزرتی تھی اپنی
ہجراں کا کچھ اور ہے ساماں اب وہ لیل و نہار نہیں
(III - ۶۵۳ : ۲۱)

اب وہ سماں نہیں ہے کہ وہ کام جان خلق
مغموم ہم کو دیکھ کے دوڑا لپٹ گیا
(II - ۲۴۲ : ۹)

لیکن اس کی یادیں بہت شفاف ہیں اور رنج میں اسے حوصلہ دیتی ہیں:

یہ بھی سماں خوش ترکیبوں کا میرزا اپنے دل سے گیا
سوتے سے اٹھ کر آنکھیں مل مل لی انگڑائی جما ہیں ہیں
(II - ۵۸۷ : ۲۱[۱])

بہتے ہو نم آنکھوں میں پھیرتے ہو تھیں دل میں
مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو
(II - ۳۱۲ : ۸)

---

[۱] - اردو میں ترجمے کا باعث یہ اشارہ غیر متعلق ہو گیا ہے (مترجم)

روز آنے پہ نہیں نسبت عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی آتی ہے (II - ۱۹۷ : ۱۵)

جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں وہ بے تکلفی اور اعتماد جو دونوں کے مابین موجود تھا دھم پڑتا جا رہا ہے اور اعتدال واپس آتا جا رہا ہے۔ اب اگر وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے جو وہ اس کے لیے محسوس کرتا ہے، تو وہ سننے پر ہی آمادہ نہیں ہوتی:

سن سن کے درد دل کو بولا کر جاتے ہیں ہم
تو اپنی یہ کہانی بیٹھا ہوا کہا کر (III - ۴۸۲ : ۱۳)

وہ اپنی کہانی اس طرح سنانے کی کوشش کرتا ہے جیسے وہ کسی اور کی کہانی ہو اور اس اُمید میں کہ شاید اس کی سمدردیاں پھر حاصل ہوں اس سے پہلے کہ اسے پتہ چلے کہ دراصل وہ اپنے ہی بارے میں گفتگو کر رہا ہے اس لیے کہ اس کے بعد اس کے لیے پلٹنے کی راہ نہ ہو لیکن اس کی یہ تدبیر بھی ناکام ہو جاتی ہے:

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق[1]
وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہکے جو رویا تو لگا کہنے نہ کہہ میر
سُنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی (II - ۱۰۵ ؛ ۲۰ : ۲۱)

دونوں اشعار ایک مبہم صورتِ حال کو بیان کرتے ہیں اور اس بے یقینی کا اظہار ہیں جو عاشق خود محسوس کرتا ہے، وہ اسے کیوں نہیں سُنے گی؟ شاید وہ اب اس میں مزید دلچسپی نہیں رکھتی یا شاید رابطہ منقطع کر لینے کے قطعی ارادے نے اس کے اپنے احساسات مجروح کر رکھے ہیں اور خود پر اسے اعتماد نہیں کہ وہ اس پر ثابت قدم رہ سکے گی۔ اگر اس نے سوچا کہ یہ اس کے لیے رنج کا باعث ہوگا۔ اگلے شعر میں جو صورتِ حال بیان ہوئی ہے یہ ہے کہ جتنا اس کا شعور بتاتا ہے اتنا ہی اس کی آنکھوں کے آنسو بتا رہے ہیں کہ کہانی المیہ رُخ اختیار کرنے والی ہے اور اس کے درد رسیدوں کی کہانی برداشت نہ کر سکنے کی وجہ پھر گومگو میں چھوڑ دی گئی ہے۔ اس کا عاشق ایک بار پھر اسی بے یقینی کا شکار ہے جیسی اس کی پہلی جھلک دیکھنے پر اس نے محسوس کی تھی، وہ دیکھتا ہے کہ اس کا محبوب اسے پھر یہ یقین دلانا چاہتا ہے کہ اسے اب اس سے پہلے والی محبت نہیں رہی اور وہ یہ نہیں جانتا کہ اس نے واقعی التفات ترک کر دیا ہے یا محبوب کی اپنی خواہشات اور تحریک کے خلاف اس کا اپنا خوف ہے جو محبت کے رستے میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ جہاں اس کی اُمیدیں اور خدشات ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں وہاں وہ دسترس کے لیے ہر طریقہ آزماتا ہے جو اس کے دل میں نرمی پیدا کر سکے، وہ حاسدانہ شکایت کرتا ہے:

---

[1] پہلے مصرعے میں ہم نے عاصی کے متن سے مختلف تحریر کی پیروی کی ہے۔

یا ساتھ غیر کے ہے تمھیں ویسی بات چیت
سو سو طرح کے لطف ہیں اک اک سخن کے بیچ
یا پاس میرے لگتی ہے چپ ایسی آن کر
گویا زباں نہیں ہے تمھارے دہن کے بیچ (II - ۲۸۵ - ۲۱ - ۲۲)

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے (I - ۱۹۶ : ۱۲)

کٹی عمر ہماری ساری جیسے شمع باد کے بیچ
یہی رونا جلنا گلنا یہی اضطراب تجھ بن (I - ۱۱۷ : ۲۴)

یا وہ خلیق اور خاطر نشیں ہے :

دیر سے ہم کو بھول گئے ہو یاد کرو تو بہتر ہے
غم حرماں کا کب تک کھینچیں شاد کرو تو بہتر ہے (III - ۵۱۸ : ۹)

یا وہ اسے انتباہ کرتا ہے کہ اس کو ٹھکرانے سے وہ آئندہ دنوں میں خوش نہیں رہ سکے گی ؛

اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے
پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے (I - ۱۶۹ : ۱۱)

لیکن جیسے ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ جو نہی وہ اسے دیکھتا ہے اس سے کچھ کہہ نہیں سکتا تو وہ خود کو اکساتا ہے کہ ایسا اس لیے ہے کہ ان کے درمیان ملاقاتیں ہی بہت مختصر ہوتی ہیں۔

دیر کھینچی تو کہتے بھی ملاقات کی بات
ملنا اپنا جو ہوا اس سے سو بات کی بات (II - ۲۵۴ : ۱۳)

یا اس وجہ سے کہ وہ اس سے موزوں کیفیت میں نہیں مل سکا :

نکالی سرکش نے چال ایسی کہ دیکھ حیرت سے رہ گئے ہم
دلوں میں کیا کیا ہمارے آیا کریں سو کیا بس چلا نہ اپنا (III - ۶۳۳ : ۱۹)

کچھ کہنے کا مقام نہ تھا وہ واں ہوتا تو کہتے کچھ
آنا نہ آنا یکساں تھا واں ہونے ادھر ہم گو آئے (I - ۶۰۳ : ۲۴)

لیکن وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اصل وجہ کیا ہے۔ اب جب کہ وہ اس سے ہاتھ دھو بیٹھنے کی فکر میں مبتلا ہے اس کا اشتیاق اس لیے زیادہ ہے کہ اسے کچھ کہنے کے لیے بھی خود پر اعتماد نہیں رہا :

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر (I - ۷۰ : ۷)

وہ اپنے آپ کو بتاتا ہے :

کہنے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا

یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا (II - ۲۳۷ : ۲)

وہ اس کی طرف پیام بھیجتا ہے اور وہ جواب تک نہیں دیتی :

نہ کہا کچھ نہ آچھرا نہ مارا

کیا جواب نہ میرے سوالوں کا (III - ۳۸۴ : ۴)

لیکن وہ اب بھی اُمید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا ، اس کی بے اعتنائی ظاہری ہو یا اصلی غصے میں بدل جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ ابھی سب کچھ ضائع نہیں ہوا ، اس لیے ہی وہ اسے بتاتا ہے :

رہتے ہو بے دماغ تو دیکھو ہی ٹک ادھر

غصہ ہی ہم پہ کاش کہ اکثر رہا کرو (II - ۳۱۶ : ۱۸)

دوسرے لفظوں میں وہ اب بھی اس کے لیے اتنا اہم ہے کہ اس کی نظروں میں رہے ، چاہے جس بھی جذباتی سیاق وسباق میں ہو مگر ایک ایسی بنیاد ضرور موجود ہے جس پر وہ اُمید کا قصر تعمیر کر سکتا ہے اس لیے وہ اب بھی اس کی گلی میں آتا ہے ، اتنی اُونچی اُمید کے ساتھ نہیں جس کے ساتھ دوسرے آتے ہیں بلکہ اس کی معمولی سی توجہ کی خاموش اُمید کرتے ہوئے :

میر صاحب بھی تیرے کوچے میں شب آتے ہیں لیک

جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں (II - ۹۴ : ۱۱)

وہ اس سے کم از کم انسانی مروّت سے زیادہ کی توقع نہیں رکھتا مگر یہ اُمید بھی پوری نہیں ہوتی :

اتنا کہا نہ ہم سے تم نے کبھو کہ آؤ

کاہے کو یوں کھڑے ہو وحشی سے بیٹھ جاؤ (II - ۳۰۸ : ۱۹)

کیا ہوتا جو پاس اپنے اے میر کبھو وے آجاتے

عاشق تھے درویش تھے آخر بیکس بھی تھے تنہا تھے (II - ۵۲۸ : ۷)

اور چونکہ اس کی اس قدر معمولی اُمید بھی پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنے آپ کو دلاسا دیتا ہے : اس خیال سے کہ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو اس کی جانب سے محبت کے ہلکے سے شائبے کے مترادف بھی نہ ہوتا :

ہم تو عشق میں ناقص ٹھہرے کوئی نہ ادھر دیکھے گا

آنکھ اُٹھا کر وہ دیکھے تو یہ بھی اس کی مروّت ہے (II - ۶۰۸ : ۱۴)

اور اگر وہ ناکام رہتا ہے تو وہ بہتر لوگوں کی فہرست میں ہے ۔ اس لیے کہ عربی اور فارسی کی داستانوں کے عظیم عاشقوں نے بھی اس سے بڑھ کر کچھ نہیں کیا : فرہاد[1] و قیس و میر یہ آوارگانِ عشق یوں ہی گئے ہیں سب کی رہی من کی من کے بیچ (II - ۲۵۸ : ۲۳)

---

[1] فرہاد جسے کوہکن یا پہاڑ کھودنے والا بھی کہا جاتا ہے ۔ فارسی داستان کے مطابق خسرو پرویز (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

عشق نے اسے اپنی شکست پر مسکرانے کا حوصلہ سکھایا ہے :

دیکھا کروں تجھی کو منظور ہے تو یہ ہے
آنکھیں نہ کھولوں تجھ بن مقدور ہے تو یہ ہے
(ک ۔ ۱۹۰ : ۷)

اور آخر اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ کوئی اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکتا کہ اس نے عشق کرنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی اسے انجام تک اور لامختتم شدت کے ساتھ محبت کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اس میں کوئی حرج نہیں کہ اُسے اپنے محبوب کی رفاقت میسر ہو یا ساری عمر اس کی جُدائی میں کٹ جائے۔ وہ ہر آزمائش، مصیبت اور ستم کو خوش آمدید کہتا ہے کیونکہ یہ عشق کی صلاحیت کو اس طرح صیقل کرتی ہے کہ اس کی محبت موت کو مغلوب کرنے کے قابل ہو جائے اور وہ ایسا کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہو۔ عشق اس کے لیے طرزِ زندگی کی حیثیت حاصل کر چکا ہے اور اس کی تمام خوابیدہ صلاحیتیں جگا چکا ہے۔ اسے صحیح معنوں میں انسان بنا چکا ہے۔ کوئی مصیبت اس کے لیے مہنگی نہیں ہے۔ جس شخص نے عشق نہیں کیا اس پر رشک نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہمدردی کی جانی چاہیئے۔ وہ اپنی محبوبہ کو بتاتا ہے :

ظلم و جور و جفا ستم بیداد
عشق میں تیرے ہم پہ کیا نہ ہوا
ہم تو ناکام ہی جہاں میں رہے
یاں کبھو اپنا مدعا نہ ہوا
میرؔ افسوس وہ کہ جو کوئی
اس کے دروازے کا گدا نہ ہوا
(ک ۔ ۵۴ : ۱۰)

وہ شخص جس نے عشق نہیں کیا ہوتا غزل میں ناصح یعنی نصیحت کرنے والے کے رُوپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) (وفات ۶۲۸ء) کی ملکہ شیریں سے عشق کرتا تھا اور اس سے بادشاہ نے شیریں کا وعدہ بھی کر لیا۔ اس شرط پر کہ وہ چٹان سے نہر کھود کر دکھا دے۔ بادشاہ کی توقعات کے برعکس عشق نے اُسے مقررہ کام کرنے کی طاقت بخش دی۔ لیکن بادشاہ نے اسے شیریں کے مرنے کی جھوٹی خبر بھیج دی۔ اور وہ دل شکستہ ہو کر مر گیا۔ جہاں تک قیس کا تعلق ہے۔ وہ عربی داستانوں کے ابتدائی مجموعے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیس لیلےٰ کے عشق میں مبتلا تھا، لیکن اُسے جیتنے میں ناکام رہنے کے باعث اپنے حواس کھو بیٹھا اور صحراؤں اور پہاڑوں میں آوارہ پھرنے لگا۔ اس لیے مجنوں یعنی دیوانے کے نام سے مشہور ہوا۔ فرہاد اور قیس دونوں کامل عشق کی علامت بن چکے ہیں اور ان کے انجام کو عظیم فارسی شاعر نظامی اور امیر خسرو دہلوی سے لے کر اب تک کے کئی فارسی اور مسلم ہندوستانی شاعروں نے لافانی بنایا ہے۔ (ر۔ الیں)

شخص کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ وہ عاشق کا نقطۂ نظر سمجھتا ہے۔ اس سے ہمدردی کرتا ہے اور اس کی مدد کرنا چاہتا ہے اور آخر جب اُسے علم نہیں ہو سکتا کہ محبت ہے کیا چیز تو عاشق کے ایذا رسانوں سے مل جاتا ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف اتنا ہے کہ جو کام وہ تشدد سے کرتے ہیں یہ شیریں دلائل بازی سے کرتا ہے، محبت کا تجربہ تو کیا اس کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اس کی نصیحت مہمل حد تک غیر متعلق اور بے اثر ہوتی ہے عاشق کا لہجہ اس کی جانب با مروت برداشت اور غصیلی تلخی کے بین بین رہتا ہے کبھی کبھی اس کی نصیحت کسی تبصرے کے بغیر درج ہو جاتی ہے :

قدم ٹک دیکھ کر رکھ میرؔ سر دل سے نکالے گا
پلک سے شوخ تر کانٹا ہے صحرائے محبت کا (I ۲۸ : ۱۹)

ناصح سر راہے کھڑے ہوئے کسی شخص کو مخاطب کرنے کے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے جیسے عاشق اس سے کم جانتا ہے :

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھی میرؔ بلاکش ادھر آوے
مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے (II - ۱۹۷ - ۴ : ۵)

کہیں ناصح کی مذہبی نصیحت بالکل احمقانہ ہو جاتی ہے :

چاہت روگ بُرا ہے جی کا میرؔ اس سے پرہیز بھلا
اگلے لوگ سنا ہے ہم نے دل نہ کسو سے لگاتے تھے (I ۶۱۳ : ۵)

اگر عاشق اس کی نصیحت پر اس کے باوجود کان نہیں دھرتا کہ اسے اتنی بہترین سند کا حوالہ میسر ہے تو ناصح اس بات پر اس کی نوجوانی اور ناتجربہ کاری کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے :

اب نوجوانی کا یہ نشہ ہے بے خود تجھ کو رکھے گا
ہوش گیا پھر آوے گا تو دیر تلک پچھتاوے گا (III - ۴۹۷ ، ۲)

اور اسی طرح نصیحت اور انتباہ کرنے پر ہمہ دم تیار ناصح کے ساتھ چلتا رہتا ہے :

چھوڑ دو اس او باش کا ملنا ورنہ سر کٹواؤ گے
چاہ رہے ہوئے بہتیروں کو سر جو میرؔ سلامت ہے (II - ۶۲۱ : ۱۸)

ضعف بہت ہے میرؔ تمہیں کچھ اس کی گلی میں جاؤ
صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو (III - ۴۲۵ : ۲)

اور آخر کار :

میر سدا بے حال رہو ہو مہر و وفا سب کرتے ہیں
تم نے عشق کیا سو صاحب کیا یہ اپنا حال کیا (II - ۴۶۶ ، ۷)

میر اسے بالکل خشک جواب دیتا ہے اور کبھی کبھی بے صبری کے ساتھ لیکن کسی پراگندگی کے بغیر لعن طعن کی بجائے اس پر مذاق کو ترجیح دیتے ہوئے :

طنز ہی عبث کرو ہو غش رہنے پہ ہمارے
دو چار دن کسو سے دل کو لگا تو دیکھو (II - ۳۱۰ : ۱۶)

رفتۂ عشق کسو کا یار دو راہ چلے ہے کس سے کہے
کون رہا ہے آپ میں یاں تم اپنے تئیں سمجھاتے ہو (III - ۵۰۹ : ۵)

اور اس کے بعد خود بھی کہتا ہے :

کیا جاتا ہے اس میں ہمارا چپکے ہم تو بیٹھے ہیں
دل جو سمجھنا تھا سو سمجھا ناصح کو سمجھانے دو (III - ۴۲۵ : ۱)

اکا دکا شعر اس کے بظاہر معقول مگر دوسرے کردار کا مضحکہ اڑاتے ہیں جو قوت فکر سے اس قدر محروم اور اپنے معمولی مسائل میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ عاشق کی پروا ہی نہیں کرتا اور اگر اس طرف توجہ کرتا بھی ہے تو جو کچھ اسے دکھائی دیتا ہے اس کی بے حد مبتذل تفسیر اس سے منسوب کرتا ہے۔ وہ صرف یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ اگر ہم دونوں فرہاد یا کوہکن اور قیس کا زمانہ پاتے وہ بھلا مجھ سے کیا کہتا :

کوہکن و مجنوں یہ دونوں دشت و کوہ میں سر مارین
شوق نہیں ملنے کا ہم کو میر ایسے آواروں سے (III - ۵۱۴ : ۲۵)

فرہاد اور مجنوں کی طرح بعض حلقوں میں میر بھی ایک عشق پیشہ شخص کی حیثیت سے شہرت رکھتا تھا مگر اس قسم کے عامی اور لغو لوگ زیادہ بہتر معلومات رکھتے ہیں ایک دوسرے سے کہتا ہے :

ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو (II - ۳۱۷ : ۱۷)

پہلا مصرعہ تلازمۂ غزل کی ایک مؤثر مثال ہے اس کا پہلا مطالعہ کافی سادگی سے یہ فوری تاثر منتقل کرتا ہے کہ اس کے دنیا دار ناقدین جب اسے دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک آرام طلب شخص ہے جسے کوئی پروا نہیں کہ وہ کہاں پڑا ہے جب تک، وہاں اسے سایہ میسر ہے۔ لیکن صاحب فکر اور ہمدرد لوگوں کے لیے لفظ صحیح صورتِ حال کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اس کی کوئی محبوبہ ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کیوں وہاں موجود ہے۔ کیونکہ غزل کی رمزیت کے مطابق عاشق کی وفاداری کو محبوب کی گلی یا چوکھٹ پر مسلسل انتظار کھینچنے اور نگاہ جمائے ہوئے عاشق کی کردار نگاری کے

ذریعے سمجھایا جاتا ہے۔ وہ سایہ کے لفظ کی تمام معنوی پرتیں بھی اخذ کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ اس کے ظاہری معانی کے علاوہ کئی دوسرے معانی ہیں۔ ٹھنڈی چھاؤں انگریزی میں ایک خوش گوار تصور دیتی ہے لیکن ایک ایسے ملک میں یہ تصور اور بھی خوشگوار ہوتا ہے جہاں سال کے بعض حصوں میں گرمی کی شدت زیادہ نا قابلِ برداشت ہو جاتی ہے اور اُردو میں اس کا وسیع علامتی استعمال اسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ مثلاً جب کسی بچے کا باپ اُسے غیر محفوظ اور بے یار و مددگار چھوڑ کر مر جاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ بچہ سایۂ پدری سے محروم ہو گیا ہے جس کے نیچے وہ آرام کر سکتا تھا۔ زندگی کی تپش اور گرد سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس شعر میں یہ لفظ دونوں باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اولاً ایک تلخ صورتِ حال جس میں دوسروں کے نزدیک درخت کے نمناک سائے میں راحت و آرام کی زندگی بسر کرنے کے تصور سے درحقیقت ایک عاشق کی تمام ناگزیر اور لامختتم مصائب سے پُر زندگی کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے لیکن ثانیاً سائے کے ساتھ منسلک تمام خوشگوار تعبیرات کی تجزیہ قبولیت کی طرف بھی ان کا ایک سچے عاشق کی زندگی کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے، اس لیے کہ تمام مصائب کے ساتھ ساتھ یہ عشق کی نا قابلِ شکست استقامت ہی ہے جو عاشق کی زندگی کا پورا مواد اور اسے معانی فراہم کرتی ہے اور عاشق کو ایک گہری روحانی خوشی عطا کرتی ہے۔

اپنے نیک نیت ناقدین کے لیے عاشق کا جوابی لہجہ عام طور پر معتدل ہوتا ہے لیکن ایسا وقت بھی آتا ہے کہ ان کے معاملے میں صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، وہ طے کر لیتا ہے کہ آخر کار ان کے اور کھل کر غیر مصالحانہ حد تک مخاصمانہ رویہ رکھنے والوں کے درمیان انتخاب کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا اور اسے پتہ ہے کہ اگر اسے ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے تب بھی وہ انھیں بدلنے کی امید نہیں رکھ سکتا اس لیے وہ انھیں بدلنے کی بجائے خود کو ان کی ہتک سے مسرت حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اپنے ناصح کے اس الزام پر کہ اس کا عشق مذہب کے خلاف ایک گناہ ہے وہ جواب دیتا ہے:

مذہب سے میرے کیا تجھے تیرا دیار اور
میں اور یار اور مرا کاروبار اور (III - ۴۹۷ : ۷)

ایسا جواب اس کے نکتہ چینیوں کو دانستہ یہ کہنے پر اُکساتا ہے کہ عاشق کا مذہب عشق ہوتا ہے اور وہ اس الزام کو بالکل سرِ عام اور بلا شبہ فخر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ ان اصطلاحات میں کہے ہوئے دوسرے شعر جنھیں صرف وہی جانتا ہے، اس کے مخالفین کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی محبوبہ سے کہتا ہے:

سجدہ اس آستاں کا نہ جس کو ہُوا نصیب
وہ اپنے اعتقاد میں انسان ہی نہیں (I - ۱۰۰ : ۱۱)

لفظاً مفہوم دیتے ہیں اور ان کا بامعنی ہونا ہی راسخ العقیدہ مسلمان کے نزدیک کفر ہے مثلاً یہ کہ اپنی محبوبہ کی پرستش کرنا خدا کی پرستش کرنے سے بہتر مذہب ہے، اگرچہ جیسا کہ ہم بعد میں دیکھتے ہیں، شاعر درحقیقت عشقِ صادق کا تقابل سچے مذہب سے نہیں بلکہ جھوٹ موٹ قیاس کیے ہوئے خدا کی رسمی بے روح عبادت سے کر رہا ہے جس کے بیشتر مسلمان ساتھی شکار ہو چکے ہیں، یہی تقابل وہ اس وقت بھی کرتا ہے جب وہ مسلمانوں کی بُت پرستی سے شدید نفرت کا اپنے جیسے عاشقوں کے بہانے

تمسخر اُڑاتا ہے :

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بتاں کے لوگ
(II - ۲۸۲ : ۱۲)

بُت پرستی غزل میں عاشق کے عام ہر دائمی انسان کے ساتھ تعلق کے اظہار کے لیے عام طور پر مستعمل استعاروں میں سے ایک ہے۔ ایسا انسان محبت کو ایک جنون سمجھتا ہے اور عاشق اپنے آپ کو ناصح اور روایتی شہری کی قدر کی نگاہوں کی دیکھی جانے والی پاکبازی سے ممیز کرنے کے لیے اس جنون کو نشانِ عزت کے طور پر طاری کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کا پاگل پن اس پر عشق کے مکمل غلبے کی علامت بن جاتا ہے اور اسے اس طرح گھلاتا ہے کہ مادی راحتیں، سماجی روایتیں، محبوب کی ستم شعاری اور معاشرے کی کڑی سزائیں اُسے اس کے راستے سے ہٹانے میں ایک سی بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔ وہ جنون میں سب کچھ گنوا دیتا ہے گھر کو تباہ و برباد ہونے دیتا ہے۔ اپنے کپڑے چاک کر دیتا ہے، صحراؤں میں بھٹکنے کی خاطر شہروں اور آبادیوں کو خیرباد کہہ دیتا ہے جہاں گرم تپتی ہوئی ریت سے اس کے پاؤں میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور خار اس کے جسم کو چیر کے لگاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ زخموں سے چور اور خون میں تر ہو جاتا ہے اس طرح وہ قیس یا مجنوں کی پیروی کرتا ہے جس نے جنونی کیفیت میں عشق کی حقیقت کو پا لیا تھا۔ صحرا اس کے لیے دنیا کی علامت بن جاتا ہے جس میں وہ رہ رہا ہے۔ اس کے زخم معاشرے کے ہاتھوں اٹھائے ہوئے مصائب کی علامت ہیں اور اس کی جانب سے ان کا ارادی انتخاب اور اسی میں شاداں و فرحاں رہنا عشق پر ایک عظیم نصب العین کی حیثیت سے جو کوئی بھی شخص حاصل کرنے کی آرزو کر سکتا ہے، گہرے یقین کا استعارہ ہے۔ لیکن عاشق اپنے دشمنوں کی اقدار پر حملہ کرنے سے زیادہ اپنی اقدار کے ادعا سے واسطہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس عقیدے کا اعلان کرتا ہے کہ صرف عاشق ہی جانتا ہے کہ اصل میں زندہ رہنا کیا ہوتا ہے وہ حظ جو وہ عشق کی کربناک اذیتوں میں محسوس کرتا ہے اگرچہ وہ اسے خاک کر کے رکھ دیتی ہیں، اس کو ایک عام شخص سے ماورا کر دیتا ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے تو سارے عاشقوں کی ہی نمائندگی کرتا ہے :

اب بھی دماغ رفتہ ہمارا ہے عرش پر
گو آسماں نے خاک میں ہم کو ملا دیا
(II - ۲۱۴ : ۲)

صرف آزمائش کی زندگی ہی وہ زندگی ہے جو بسر کرنے کے قابل ہے کسی کے عشق میں بے انجام مصائب جھیلنا اور اُن مصائب پر مسلسل فتح پانا ہی زندگی کو معنی بخشتا ہے :

ہے عاشقی کے بیچ ستم دیکھنا ہی لطف
مرجانا آنکھیں موند کے یہ کچھ ہنر نہیں
(II - ۳۰۰ : ۵)

تاہم اعلیٰ ترین مسرت کسی کے عشق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ اس راستے میں مرجانا عمرِ خضر پانے سے بہتر ہے۔ میر اس کو زیادہ مؤثر طور پر سمجھانے کے لیے اسلامی داستان استعمال کرتا ہے۔ داستان اس طرح سے ہے کہ خضر اور سکندر (سکندرِ اعظم) اس چشمے کی تلاش میں نکلتے ہیں جس میں آبِ حیات بہتا ہے، انھیں وہ چشمہ اتنی مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنے

کے بعد ملتا ہے کہ سکندر اسے پینے سے پہلے ہی جان دے دیتا ہے لیکن خضر[1] اسے پینے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اس لیے وہ کبھی نہیں مرتا، میر کہتا ہے :

آبِ حیات وہی نا جس پر خضر و سکندر مرتے رہے
خاک سے ہم نے بھرا وہ چشمہ یہ بھی ہماری ہمت تھی (III - ۶۰۹ : ۳)

عاشق بھی عیسیٰ کی طرح اسی حلقے میں شامل ہیں جس کی مسلمان عظیم پیغمبروں میں سے ایک کی حیثیت سے تکریم کرتے ہیں :

اب جو عیسیٰ ہے فلک پر وہ بھی
شوق میں برسوں خاک چھان گیا (III - ۲۴۱ : ۶)

لیکن وہ عیسیٰ سے بھی زیادہ خوش نصیب ہے جنھوں نے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق صلیب پر جان نہیں دی بلکہ وہ زندہ اُوپر اُٹھا لیے گئے، جہاں وہ ابھی تک جنت میں موجود ہیں۔ اس لیے وہ عشق میں جان قربان کرنے کے لطف سے کبھی واقف نہ ہوئے :

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا (III - ۲۱۱ : ۱۵)

مسیحا کے معنی کرائسٹ ——— مسیح کے ہیں اور وہ ایسے شخص کے مسلسل قائم شدید لطف و نشاط کو جو اپنی زندگی عشق میں گرفتار رہتے ہوئے گذارتا ہے مؤثر کرنے میں ملخص کرتا ہے۔ خون کے آنسو اردو اور انگریزی دونوں استعاروں میں کوئی اُس وقت بہاتا ہے جب درد اور مصائب اپنی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ اردو شاعری کے تلازمے میں دل کی صورت میں دراتے ہیں جو مسلسل اذیت رسانی سے لہولہو ہو گیا ہے اور اس پر میر کہتا ہے :

عمر بھر ہم رہے شرابی سے
دل پر خوں کی اک گلابی سے (III - ۲۰۷ : ۲۱)

اس طرح کے اشعار اس شخص کے روحانی انبساط کو ظاہر کرتے ہیں جو مسلسل تزکیہ نفس سے عشق کی تمام آزمائشوں سے کامیابی کے ساتھ گذر چکا ہو، اپنی منزل کے حصول کے لیے اُسے طویل راستہ طے کرنا ہے۔ راستہ اور بھی کٹھن ہے کیونکہ اس کا تصورِ عشق راہبانہ نہیں ہے جو عشق کو روحانی سطح کے علاوہ ہر لحاظ سے ترک کر دیتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کو باہوں میں لینے اور اس سے اختلاط کے لیے اسے جسمانی طور پر بھی جتنا چاہتا ہے اور اس کے حصول کی اُمید کبھی مکمل طور پر اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ لیکن اس اُمید میں اسے یہ واضح فہم بھی آمیز کرنا پڑتا ہے کہ اس اُمید کو شاید کبھی بھی پورا ہونا نصیب نہ ہو اور اپنی محبت کو خود کفیل بنانے کی صلاحیت کے ساتھ بھی تاکہ اس کی شدت اور اُسے قائم رکھنے کی قوت اُسے روحانی

---

[1] خضر ایک افسانوی شخصیت ہے اور ان مسافروں پر ظاہر ہوتا ہے جو اپنا راستہ کھو بیٹھتے ہیں اور انھیں صحیح راستے پر ڈال دیتا ہے۔

سکون عطا کرے چاہے اُسے جو بھی صورت درپیش ہو۔

یہ میر کا فخریہ دعویٰ ہے کہ وہ اس میں کامیاب رہا۔ "معاملات عشق" میں ہم اسے ایک کامیاب شخص کے روپ میں دیکھ چکے ہیں کہ محبت کی جسمانی راحتوں پر اس کی مسرت بے تکلفانہ اور غیر پشیمانہ ہے اور پھر بھی وہ جب تک زندہ ہے ایک ایسی عورت سے عشق کر سکتا ہے جس کو کبھی دوبارہ دیکھنے کی اُسے توقع ہی نہیں ہے:

عشق میں وصل و جدائی سے نہیں کچھ گفتگو
قرب و بعد اس جا برابر ہے محبت چاہیے (I - ۱۶۰ : ۱۶)

اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے عاشق کو چیزوں کو انہی کی طرح دیکھنے کے مستحکم عزم اور محبت کے تمام ممکنہ معلومات سے نمٹنے کی تربیت کے لیے تصوراتی علم کے پیشگی حصول کی ضرورت ہے۔ میر اس نوجوان عاشق کو تنبیہ کرتا ہے جو عشق کی ابتدائی آزمائشوں کو زیادہ محسوس کرتا ہے:

شکوۂ آبلہ ابھی سے میر
ہے پیارے ہنوز دِلّی دُور (I - ۷۱ : ۲۱)

جہاں تک کہ محاورہ جا سکتا ہے وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ آنسوؤں کو اس قدر سستا نہیں بہانا چاہیے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا[1] (I - ۲۹ : ۱۱)

اور وہ اپنی مثال دیتے ہوئے زور دیتا ہے کہ انجام پر نظر رکھنی چاہیے اور اس خوف یا جھجک کے بغیر تسلیم کر لینا چاہیے اس سے بھی پہلے کہ وہ عشق کے طویل سفر پر روانہ ہو:

جب جی سے گذر گئے ہم اے میر
اس کوچے میں تب ہوا گذارا (III - ۳۸۲ : ۱۶)

اور نیم مزاحیہ انداز میں اضافہ کرتا ہے:

درد سر اب جو عشق کا ہے گو رنگ ہے ساتھ
کچھ یہ نشہ ہی اور اس کا خمار اور ہے (III - ۳۹۷ : ۱۳)

وہ انتباہ کرتا ہے:

عشق میں گام اوّل اپنے جی سے گذرنا پیش آیا
اس میداں میں رکھ کے قدم کیا کیجے ڈر جا دیں ہم (III - ۴۹۳ : ۱۱)

---

[1] یہ شعر وہی ہے جو عام طور پر میر سے منسوب ہے لیکن حامی کہتا ہے کہ اصل عبارت میں پہلے الفاظ مختلف ہیں۔

لیکن وہ اسے خوش دلی سے بتاتا ہے کہ صرف پہلا قدم ہی بدترین ہوتا ہے :

گذر جان سے اور ڈر کچھ نہیں
رہ عشق میں پھر خطر کچھ نہیں (I - ۱۱۹ : ۲۲)

وہ اس پر بھی زور دیتا ہے کہ جان دینے کے لیے تیار رہنا ہی کافی نہیں ہے، عشق کرنا ایک فن ہے اور اسے بھی کسی دوسرے فن کی طرح سیکھنے کی ضرورت ہے :

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے (I - ۱۵۸ : ۲۲)

جن بحرانوں سے اُسے گذرنا ہوگا وہ کئی اور مختلف النوع ہوں گے، اسے سیکھنا ہوگا کہ ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے اور جب تک اسے زندہ رہنا ہے سیکھتے چلے جانا ہے سب سے بڑھ کر اپنی ناکامیوں سے :

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر ناکامیوں سے کام لیا (I - ۱۲ : ۱۰)

جو ہنر اسے سیکھنے ہیں ان میں سے ایک اپنے نفس پر ضبط ہے کیونکہ جو کچھ بھی وہ کرتا ہے اس سے اس کے محبوب کی شخصیت کا راز نہیں کھلنا چاہیے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جہاں وہ تنہائی میں یا اپنے با اعتماد دوست کی معیت میں جذبات کی ساری بے احتیاطی کو راہ دیتا ہے وہاں ایسی محفل میں جہاں اس کا محبوب بھی موجود ہے اس کا رویہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہلکا سا شائبہ بھی پیدا نہ ہو یہ اس کی عزتِ نفس اور محبوب کی نیک نامی کے حد سے زیادہ لحاظ کی خاطر سخت ترین آزمائش ہے :

آنسو گرا نہ رازِ محبت کا پاس کر
میں جیسے ابر برسوں تئیں دل بھرا پھرا (II - ۲۳۰ : ۹)

تا لوگ بدگماں نہ ہوں آتے نہ اس کی اور
ہم تو کیا ہے عشق میں دور از قیاس پاس (II - ۲۷۴ : ۴)،

وہ تصور کر سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد لوگ کیا کہیں گے :

مرتا تھا جس کی خاطر اس کی طرف نہ دیکھا
میر ستم رسیدہ ظالم غیور کیا تھا (III - ۴۹۲ : ۲)

اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے وہ ایک اصلاً سنجیدہ نکتہ مزاح کی آمیزش کے ساتھ بیان کرتا ہے جب وہ کہتا ہے :

عزت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر
آگے خدا کے جب ہم محوِ دعا ہوئے (III - ۸ ۶۵۸)

اس ضبطِ نفس کی ضرورت اس لیے ہے کہ عاشق وہ سب بغیر کسی جھجک اور شکایت کے قبول کرے جو کچھ کرنا اس کا

محبوب مناسب خیال کرے وہ اُسے بتاتا ہے :

لطف و مہر و خشم و غضب ہم ہر صورت میں راضی ہیں
حق میں ہمارے کر گزرو بھی جو کچھ جانو بہتر تم (III - ۴۹۳ : ۲۳)

اور اگر اس کا غضب اسے برباد کر دے تو اس پر شکایت کا کوئی جواز نہیں ہوتا ۔ ستم پرور ہونا حسن کی فطرت ہے اور اس معاملے میں وہ اس سے زیادہ مجبور ہے جتنا ایک گلاب اپنی محبت میں دم توڑتی بلبل سے محبت کرنے سے قاصر ہے یا جتنا برق آشیانے پر گرنے سے مجبور ہے :

آتشِ رنگِ گل سے کیا کہیے
برق تھی آشیاں پر آئی (I - ۱۴۱ : ۲۵)

وہ ہر تلخ تجربے پر اپنی ثابت قدمی برقرار رکھنے کے لیے ہر وہ تقصیر اپنے سر لے لیتا ہے جس کا پہلی نظر میں محبوب ذمہ دار محسوس ہوتا ہے :

مجھی کو ملنے کا ڈھب کچھ نہ آیا
نہیں تقصیر اس ناآشنا کی (III - ۶۷۰ : ۷)

میر صاحب بھی چوکے اے بدعہد
ورنہ دینا تھا دل قسم لے کر (I - ۷۳ : ۹)

وہ خود کو تلقین کرتا ہے کہ اگر وہ اس کی جانب اپنے فرض میں ناکام رہتا ہے تو بہتر ہے کہ وہ آپس میں نہ ملیں :

ہے فرق ہی میں خیر نہ کر آرزوئے وصل
مل بیٹھیے جو اس سے تو شکوہ دراز ہو (I - ۱۲۷ : ۳)

اگر موت اسے آ لے اور ابھی تک اس نے ملنے کا وعدہ وفا نہ کیا ہو تو وہ اس کا جواز اپنی طرف سے یوں دیتا ہے :

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے
عمر نے ہم سے بے وفائی کی (I - ۱۴۱ : ۱۴)

اگر وہ خود کو کبھی اس کو داؤ پر لگا کر بے تاثر چہرے کے ساتھ مذاق کرنے کی اجازت دیتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کا رویہ بدل گیا ہے بلکہ اس اُمید میں کہ اس کا مصنوعی غیر اشتیاقی بیان اس کے دل میں احساسِ جرم پیدا کرے جو اس کی طرف التفات کا باعث ہو اور وہ بجا طور پر اس کے مشورے کا غصے سے جواب دیتا ہے یا شاید وہ اس کے خلاف شکوہ طراز ہے :

شکوہ کروں ہوں بخت کا اتنے غضب نہ ہوتیاں
مجھ کو خدانخواستہ تم سے تو کچھ گلا نہیں (I - ۱۰۹ : ۲۳)

اور وہ اپنے دوستوں کی طرف سے اس اشارے کا جواب دیتا ہے کہ اس کا محبوب سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں :

جھوٹ ہر چند نہیں یار کی گفتار کے بیچ
دیر لیکن ہے قیامت ابھی دیدار کے بیچ (ز - ۲۸۵ : ۲۸)

ایک لاجواب کر دینے والی دلیل۔ اس لیے کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ روزِ قیامت تمام بنی نوع انسان میدانِ حشر میں خدا کا فیصلہ سننے کے لیے اکٹھے ہوں گے :

وہ اس کی مسلسل ستم کیشی کے ہاتھوں اٹھائے ہوئے زخموں کی وجہ سے جان سے جانے کی توقع رکھتا ہے — ایک صورت جس میں غزل کی روایتی منظر نگاری کے مطابق محبوب اپنی تیغ نظر سے عاشق کا سر قلم کرتی نظر آتی — اور وہ اس قدر سکون اور اطمینان سے اسے اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرتا ہے کہ وہ اس بارے میں بھی خود کلامی کرتے ہوئے مذاق کر سکتا ہے :

تلوار کے تلے بھی ہیں آنکھیں تری ادھر
تو اس ستم کا میرؔ سزاوار کیوں نہ ہو (ز - ۱۳۱ : ۱۸)

یا وہ عشق کے ہاتھوں جان دے دیتا ہے اور اس کے دوست بحث کرتے ہیں کہ یہ محبوب کے ہاتھوں اس کے قتل کے مترادف ہے یا نہیں۔ وہ قبر کے دوسری طرف سے بے صبری کے ساتھ قطع کلامی کرتا ہے :

خواہ مارا انہیں نے میرؔ کو خواہ آپ موا
جانے دو یارو جو ہونا تھا ہوا مت پوچھو (ز - ۳۳ : ۲۲)

وہ اپنے محبوب سے سچی محبت کرتا ہے۔ اور سچی محبت اس کے نزدیک لازمی طور پر بے خطا احترام و تکریم سے مملو ہوتی ہے۔ اس کا آخری ثبوت اس کے تصور میں اس طرح سے آتا ہے کہ وہ اس کی گلی میں جان دیتا ہے اور خاک ہو جاتا ہے، پھر بھی جب غبار ہوا چلنے سے اُڑتا ہے تو اپنے محبوب کے گھر سے ایک احترامانہ دوری پر بیٹھتا ہے۔ اس کے دوست یہ دیکھتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں :

دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اس سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا (ز - ۱۳۱ : ۲۱)

مافوق الانسانی ضبط، اپنے محبوب کی انا کے سامنے کامل سپردگی اس کے لیے بے خطا احترام اور کامل ثبات اور سب سے بڑھ کر استقامت وہ خوبیاں ہیں جو عاشق کو ضرور سیکھنا ہوتی ہیں۔ میرؔ اس پر لیبا اوقات براہِ راست اپنے بارے میں اور بعض اوقات دوسروں کی گواہی سے شعر اندر شعر غلو کرتے ہیں :

گلی میں اس گیا سو گیا پھر نہ بولا
میں میرؔ میرؔ کر اس کو بہت پکار رہا (ز - ۲۶ : ۲۳)

جو اُسے لوٹ آنے کے لیے انتباہ کرتے ہیں اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے انھیں وہ سنگین مزاح کے ساتھ جواب دیتا ہے :

گلی تک تیری لایا تھا ہمیں شوق
کہاں طاقت کہ اب پھر جائیں گھر تک (I - ۸۴ : ۵)

یا وہ کھلے دل سے اعتراف کر لیتا ہے کہ یہ خالص ضد ہے جو اُسے وہاں رہنے پر مجبور رکھتی ہے :

اپنے مزاج میں بھی ہے میر ضد نہایت
پھر مرکے ہی اٹھیں گے بیٹھیں گے ہم جو اڑ کر (I - ۷۰ : ۱۹)

مختصراً یہ کہ وہ اس قدر مستقل مزاج ہے کہ اسے اپنے اطوار بدلنے کی نصیحت پر بھی اتنی سنجیدگی سے جواب دینے کی زحمت نہیں دی جا سکتی چاہے وہ نصیحت کتنی ہی ہمدردانہ اور نیک نیت کیوں نہ ہو، اس نے اپنا راستہ متعین کر لیا ہے۔ اب چاہے شمشیر اس کے سر پر لٹک رہی ہو وہ ایک طرف نہیں ہو گا، اس کے لیے صرف وہی شمشیریں اور خنجر اہمیت رکھتے ہیں جو اس کے محبوب کے قبضۂ اختیار میں ہوں :

چبھیں تھیں جی میں وے پلکیں گئیں تھیں دل کو وے بھوویں
یہی شمشیر چلتی تھی یہی خنجر جہاں میں تھا (III - ۳۹۷ : ۵)

لیکن اس کے اسلحہ خانے میں ایسا کوئی ہتھیار نہیں جس کی وہ تاب نہ لا سکتا ہو :

تیرے ناز کے جو یہ ہدف ہوتے ہیں ظالم
گر آہنی تو سے ہیں جگر بیاز ہنداں (I - ۹۹ : ۶)

وہ جانتا ہے کہ اسے اس سے کس سلوک کی توقع رکھنی چاہیے اس کے باوجود کہ اس نے خود کسی اور سلوک کا وعدہ کر رکھا ہو :

کہتے تو ہیں کہ ہم بھی تمھیں چاہتے ہیں میر
پر اعتبار کس کو ہے خوباں کی چاہ پر (III - ۶۴۳ : ۹)

اور وہ اپنی محبت میں اس قدر گم ہے کہ وہ اور کچھ بھی محسوس نہیں کرتا، رنج اور راحت اس پر یکساں بے اثر ہیں :

ع خوش ہیں گل تر سے نہ ہم خار سے ناخوش (III - ۴۸۶ : ۶)

اس کا سلوک جیسا بھی ہو اس کی محبت ہر دم تازہ رہتی ہے اور وہ زندگی بھر کے ہر روز اس کے سامنے حاضری دینے کے وعدے کی تجدید کرتا ہے :

وہ سرکشی سے گو متوجہ نہ ہو ادھر
ہم عاجزانہ کرتے ہیں اس کو سلام روز
منظور بندگی نہیں میری تو کیا کروں
حاضر ہے اپنی اوسے یوں تو غلام روز (III - ۲۶۲ : ۱۵، ۱۶)

اور اسے جی توڑ کر اس کی خدمت کرنی چاہیے :

عشق میں کیا دخل ہے نازک مزاجی کے تئیں
کوہکن کے طور سے جی توڑ کے محنت کرو (III - ۴۲۷ : ۱۵)

ایک شعر جو اپنے اندر یہ مفہوم رکھتا ہے کہ تم فرہاد کوہکن (پہاڑ کھودنے والا) کی طرح آخر میں ناکامی سے دوچار ہونے کے لیے محنت کرتے رہو

عشق اور صرف عشق ہی اسے ان خطرات سے نپٹنے کا حوصلہ اور قوت دے سکتا ہے جس میں اقلیم محبت جکڑی ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب وہ دشت محبت میں گھومتے ہوئے خضر سے ملتا ہے تو وہ اسے انتباہ کرتا ہے "یہ وہ جگہ ہے جہاں شیر گھومتے ہیں۔" (III - ۶۳۲ : ۱۹) اور اس کی عافیت کے بارے میں فکر کا اظہار کرتا ہے اس کے باوجود کہ خضر موت سے محفوظ ہیں :

ملا جو عشق کے جنگل میں خضر میں نے کہا
کہ خوف شیر ہے مخدوم یاں کدھر آیا

اسے موت کا سامنا کرنے اور کبھی نہ جھکنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے :

برسوں سے مری اس کی رہتی ہے یہی صحبت
تیغ اس کو اٹھانا تو سر مجھ کو جھکا جانا (II - ۲۱۲ : ۴)

وہ نہ صرف مرنے کے لیے تیار ہے بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لیے بے قرار ہے کہ وہ ایسا کر سکتا ہے وہ عشق کے راستے میں اپنا سب کچھ فدا کرنے کی تسکین کے حصول کے لیے بے قرار ہے :

نظر میں آوے گا جب جی کا کھونا
ملے گا نیند بھر تب مجھ کو سونا (II - ۲۳۶ : ۱۵)

اس لیے کہ :

جی دیتے ہیں مرنے پر سب شہر محبت میں
کچھ ساری خدائی میں یہ طور نیا تھا (II - ۲۲۸ : ۱۲)

اور اگر وہ آخر تک مائل نہیں ہوتی تو اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا :

وقت قتل آرزوئے دل جو گئے پوچھنے لوگ
میں باشارت کی ادھر ان نے کہا مت پوچھو (I - ۱۳۳ : ۲۱)

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا (I - ۲۷ : ۹)

اور اس طرح عاشق ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ تعزیت کرتے ہیں یاد دلاتے ہوئے جان دیتا ہے :

عشق جاناں تھا مار رکھنے کا
ابتدا میں تھی انتہا معلوم (II - ۲۸۶ : ۴)

مرنے سے کیا میر جی صاحب ہم کو ہوش تھے کیا کرتے
جی سے ہاتھ اٹھاتے کیسے پر اس سے دل نہ اٹھائے گئے (I - ۲۰۷ : ۱۲)

اس لیے کہ عشق کے لیے مرنا محبوب کی گلی میں مسلسل موجود رہنا یہاں تک کہ بکھر خاک ہو جانا سچے عاشق کا نشانِ امتیاز ہے:

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں
مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا (I - ۵۴ : ۲۳)

---

# میرؔ کی اصلاحیں

## کِسریٰ منہاس

استادی اور شاگردی کی روایت اُردو شاعری میں ایک مدت سے چلی آرہی ہے مبتدی اپنا کلام کسی مستند استاد کی خدمت میں پیش کرکے طالبِ اصلاح ہوتے تھے ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کہیں سے ان کے کلام پر انگلی نہ اُٹھے کسی محفل شعر و سخن میں اُن کو ٹوک نہ دیا جائے جو ان کے لیے باعثِ سبکی یا موجب ندامت ہو ۔ یہ روایت کوئی معمولی رسم نہیں ۔ استاد کا انتخاب شاگرد کے لئے دُور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے ۔ استاد جس قدر نامور ہوگا ۔ شاگرد کو اسی قدر اس کی شاگردی پر ناز ہوگا ۔ بعض شاگردوں نے اپنے نامی استادوں کا نام روشن کیا اور فخرِ استاد کہلائے بعض اساتذہ اپنے ہونہار شاگردوں کی ترقی میں ہمیشہ کوشاں رہے ۔ استاد اور شاگرد دونوں کے لیے یہ انتخاب بڑا اہم ہوتا ہے ۔ استاد کے لیے لازمی ہے کہ وہ زبان و بیان ، روزمرہ ، محاورہ ، الفاظ اور تراکیب کے استعمال پر پوری قدرت رکھتا ہو ۔ عروض و قوافی کی لغزشوں سے آشنا ہو ۔ کیونکہ عروضی غلطی اور قافیہ کے غلط استعمال سے شعر دائرۂ شاعری سے خارج ہو جاتا ہے ۔ استاد وہ ہے جو شعر و سخن کی مبلہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہو ۔ جب بھی شاگرد کے کسی لفظ ، ترکیب یا مصرع کو بدلے اس کی وجہ شاگرد کو سمجھائے تاکہ آئندہ کے لئے وہ محتاط ہو جائے اور وہ ایسی غلطی کا دوبارہ ارتکاب نہ کرے ۔ بعض استاد اپنے شاگرد کی قابلیت کے پیشِ نظر اشارے ہی میں وجہ اصلاح ایک دو لفظوں میں لکھ دیتے ہیں جیسے اس مصرع میں تعقید ہے ۔ تنافر ہے ۔ ثقتہ گرہ ہے ضعفِ تالیف ہے ۔ یا محاورہ صحیح نہیں ۔ ٹکسال باہر ہے ۔ یہ اشارے بھی ایک لائق اور ہونہار شاگرد کو وجہ اصلاح سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ استاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شاگرد کے اصلاح میں پیدا ہونے والے شبہات کو خندہ پیشانی سے دور کرنے میں مدد دے اس سے شاگرد میں ذوقِ تحقیق اور وسعتِ نظر پیدا ہوتی ہے ۔ شاگرد کو چاہیے کہ وہ استاد کے بتائے ہوئے رموز و نکات کو فقط سمجھے ہی نہیں بلکہ عملی طور پر انھیں اپنائے اور ہمیشہ یاد رکھے اور جو کچھ حاصل کرے وقت آنے پر وہ آئندہ اپنے شاگردوں کو بھی یہ دولت منتقل کرے تاکہ جو شمع اس کے استاد نے روشن کی ہو کبھی بجھنے نہ پائے اور ذوقِ سلیم رکھنے والے بھی ہمیشہ اس سے فیض یاب ہوتے رہیں ۔

میر تقی میرؔ ان اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص اندازِ فکر میں اس روایت کو برتا جس کے نقوش نکات الشعرا[1] میں ملتے ہیں ۔

میرؔ نے جب اپنی شاعری کا ڈنکا بجایا اور اپنا وطن ثانی دہلی بنایا تو دو پہلوانانِ سخن اپنے اپنے شاگردوں کے ساتھ اس میدان میں موجود تھے ۔ "اُن میں سے ایک حلقہ خان آرزو کے تلامذہ پر مشتمل تھا اور دوسرے حلقے میں وہ لوگ شامل تھے جو یا تو مرزا مظہر جانجاناں کے شاگرد تھے یا ان کے معتقد" میرزا مظہر جانجاناں دلی کے مشہور اساتذۂ سخن میں سے تھے ۔ ریختہ کے استاد تھے ان کے شاگردوں اور مقلدین کی تعداد خاصی تھی ۔ ان کے سلسلے کے شعرا میں خواجہ احسن اللہ بیانؔ ، انعام اللہ یقینؔ ، میر محمد باقر حزیںؔ ، مصطفیٰ خان یک رنگؔ ۔ فقیر صاحب دردمندؔ ، سیتارام

---

[1] نکات الشعرا مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب طبع جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۔ اشاعت اول جنوری سنہ ۱۹۷۲ء

عمدہ کے نام تذکروں میں محفوظ ہیں۔ میرؔ نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں مظہر جانجاناں کے متعلق لکھا ہے:

"بندہ بخدمتِ او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است۔ اکثر اوقات در یادِ الٰہی صرف می کند۔ خوش تقریر مرتبۂ است کہ در تحریر نمی گنجد۔ دیوانِ مختصرِ شعرِ فارسیٔ او بنظرِ فقیر مؤلف آمدہ است، از سلیم و کلیم پاسے کمی ندارد۔ اگرچہ شعر گفتن دونِ مرتبۂ است لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل نیز می شود۔ انعام اللہ یقین و حزین کہ شاعرِ ریختہ اند شاگردانِ اویند[1]۔"

[بندہ ان کی خدمت میں جا چکا ہے اور شرفِ سعادت حاصل کر چکا ہے۔ زیادہ تر وقت یادِ خدا میں صرف کرتے ہیں۔ اس قدر خوش تقریر ہیں کہ تحریر کرنا ممکن نہیں۔ آپ کے فارسی اشعار کا ایک مختصر دیوان فقیر مؤلف کی نظر سے گزرا ہے سلیم و کلیم سے کم مرتبہ نہیں ہیں۔ حالانکہ شعر کہنا ان کے مرتبہ کی توہین ہے لیکن کبھی کبھی اس بے مصرف فن کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ انعام اللہ یقینؔ اور حزیںؔ جو ریختہ کے شاعر ہیں ان کے شاگرد ہیں[2]۔]

لیکن میرؔ اس حلقے سے تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ مظہرؔ کے ارشد تلامذہ جن کی شاعرانہ عظمت کو دوسرے تذکرہ نویسوں نے سراہا ہے کہا جاتا ہے کہ ان سے بھی میرؔ نے اپنے تذکرے میں انصاف نہیں کیا۔ انعام اللہ یقین مظہر کے فارغ التحصیل شاگردوں میں سے تھے۔ ان کو بھی میرؔ خاطر میں نہیں لاتے تھے اس حلقے کے شعرا پر میرؔ نے اپنے تذکرے میں قسم قسم کے الفاظ لکھے ہیں۔ ان کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں۔ بلکہ بعض کو ان کے مرنے کے بعد بھی نہیں چھوڑا ہے جس کے اشارے نکات الشعرا میں ملتے ہیں۔ دوسرا حلقہ سراج الدین خان آرزو کا تھا۔ ان کا شمار عمائدین میں ہوتا تھا۔ آرزو فارسی زبان کے زبردست عالم تھے کسی وجہ سے شیخ محمد علی حزیںؒ سے خفا ہو گئے اور دیوانِ حزیں سے کچھ اشعار انتخاب کر کے ان کے عیوب ظاہر کئے اور "تنبیہ الغافلین" اس کا نام رکھا۔ اس کا جواب مولوی امام بخش صہبائی نے رسالہ "قولِ فیصل" میں بڑی قابلیت سے دیا اور خان آرزو کے اکثر اعتراضات کا تجزیہ کیا اور نتیجہ نکالا۔ فنِ معانی میں "موہبتِ عظمیٰ" اور "عطیہ کبریٰ" دو رسالے لکھے۔ اصطلاحات میں "چراغِ ہدایت" کے نام سے ایک نسخہ تالیف کیا۔ سکندر نامہ، قصائد عرفی اور گلستان سعدی کی شرحیں لکھیں۔ ایک تذکرہ فارسی گو شعرا کا مجمع النفائس کے نام سے لکھا۔ فارسی زبان میں کئی ہزار شعر ان کی یادگار ہیں۔ زبانِ ریختہ میں بھی گاہ گاہ شعر کہتے تھے۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"شاعرِ زبردست، قادرِ سخن عالم فاضل تا حال ہم چو ایشاں بہ ہندوستانِ جنت نشاں بہم نرسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود بشہرۂ آفاق در سخن فہمی طاق، صاحبِ تصنیفات دہ پانزدہ کتب رسالہ و دیوان و مثنویات حاصل کمالاتِ او شان از حیزۂ بیان بیرون است ہمہ استادانِ مضبوطِ فنِ ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوار اند۔ گاہے برائے تفننِ طبع دو سہ شعرِ ریختہ فرمودہ ایں فنِ بے اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند[3]۔"

---

[1] نکات الشعرا مصنفہ میر تقی میر صہ طبع ثانی (۱۹۳۵ء) طبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)
[2] تذکرہ میر (ایم کے فاطمی) صنا طبع لکھنؤ — [3] نکات الشعرا صہ۳
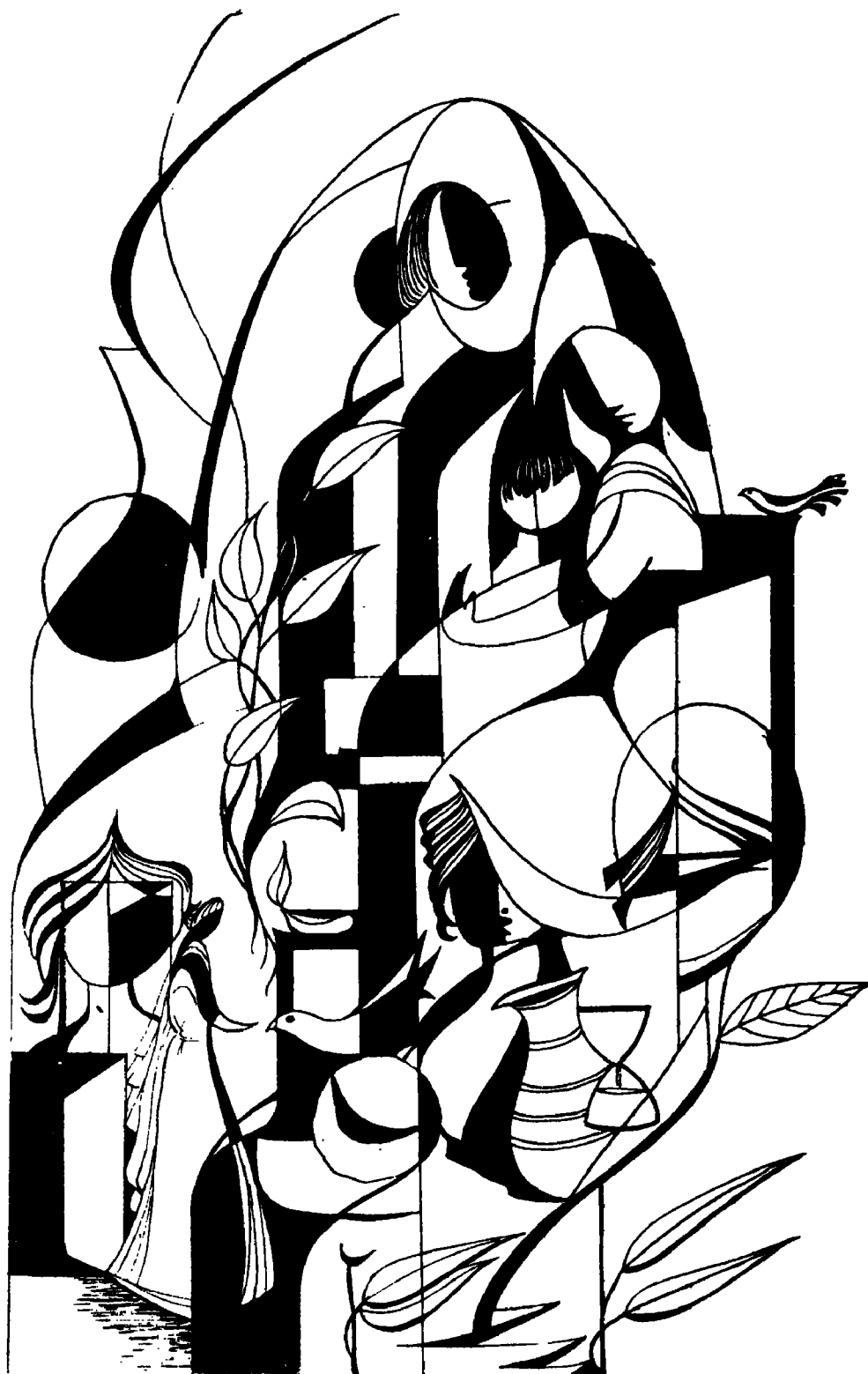
دادے کنم اے لالہ رُخاں بادلِ پُر داغ
انصاف اگر شہرِ شُما داشتہ باشد

[ اُن کا سا زبردست شاعر، قادر الکلام اور عالم فاضل اب تک ہندوستان جنت نشان میں پیدا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ اُن کی شہرت کا چرچا ایران تک ہے۔ ساری دنیا میں مشہور اور سخن فہمی میں کامل ہیں دس پندرہ دواوین، کتابوں، رسالوں اور مثنویات کے مالک ہیں۔ ان کے کمالات کا تفصیلی ذکر احاطۂ بیان سے باہر ہے۔ فنِ ریختہ کے تمام بڑے بڑے اساتذہ ان بزرگ کے شاگرد ہیں۔ آپ نے بھی تفریحِ طبع کے طور پر کبھی کبھی ریختہ کے دو تین شعر کہہ کر اس بے وقعت اور بے اعتبار فن کو جسے ہم لوگوں نے اپنا رکھا ہے اہمیت اور اعتبار بخشا ہے[1] ]

میر چونکہ سراج الدین خان آرزو کے قریبی رشتہ دار تھے۔ انہوں نے خان آرزو کے حلقے سے اپنے مراسم استوار کئے۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب والد خواجہ میر درد کے یہاں بھی آمد و رفت کا سلسلہ تھا۔ ان کے یہاں پندرھویں کو جو مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں شرکت کرتے اور دادِ سخن دیتے۔ ناصر عندلیب کے بعد بھی مشاعرے خواجہ میر درد کی سرپرستی میں منعقد ہونے لگے لیکن ان مشاعروں کا سلسلہ کسی وجہ سے درہم برہم ہوگیا۔ تو میر درد نے میر کو کہا کہ تم اپنے ہاں یہی مشاعرہ کیا کرو۔ اس ارشاد کی تعمیل میں ہر مہینہ کی پندرھویں تاریخ کو میر کے ہاں مشاعرے ہونے لگے۔ جن میں خواجہ درد خود بھی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ میر نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ بتاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بذات ہمیں بزرگ است زیرا کہ پیش ازیں ایں مجلس بخانہ اکش مقرر بود از گردشِ روزگارِ بے مدار برہم خورد۔ از بسکہ بایں احقر اخلاص دلی داشت گفت کہ ایں مجمع شما اگر بخانۂ خود معین کنید بہتر است۔ نظر بر اخلاص آں مشفق عمل کردہ آمد[2]" میر نے اگرچہ خانِ آرزو کو اپنا پیر و مرشد لکھا ہے لیکن کھل کر کہیں ان کی شاگردی کا اعتراف نہیں کیا خان آرزو کے دوسرے تلامذہ رائے ٹیک چند بہار، حسن علی شوق، رائے انند رام مخلص، میاں شرف الدین مضمون، شاہ مبارک آبرو وغیرہ ایسے نامور شاعر گزرے ہیں جن کو ریختہ گوئی میں بلند مقام حاصل ہے۔ یہ سبھی مشاعروں میں اکٹھے ہوتے تھے اور ان مراختہ[3] کی مجلسوں میں معاصرین کے اشعار پر نکتہ چینی کی جاتی ہوگی اور نجی ملاقاتوں میں بھی ان کا ذکر چھڑ جاتا ہوگا۔ بزم مراختہ میر علی نقی اور مشاعرہ حافظ حلیم کا بھی ذکر ملتا ہے۔ افسوس یہ تمام نوک جھونک تذکرہ نویسوں کی بے توجہی سے قلم بند نہ ہو سکی ورنہ اس سے بہت سے نکات آج ہمارے سامنے آتے۔ چند ایک اصلاحیں میر کے نکات الشعرا میں محفوظ ہیں لیکن ان کو مشتے نمونہ از خروارے سے زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

میر کی اصلاحوں پر تنقید کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار بھی لازمی ہے کہ شمالی ہند میں تین تذکرے "نکات الشعرا" "تذکرہ ریختہ گویاں" اور "مخزن نکات" یکے بعد دیگرے منصۂ شہود پر آئے۔ ان تینوں میں سے اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ کون سا ہے۔ اس ضمن میں تذکرہ نگاروں کے متضاد بیان ملتے ہیں۔ میر "نکات الشعرا" کی تسوید کے متعلق فرماتے ہیں۔

---

۱؎ "تذکرۂ میر از فاطمی ص۵۷۔

۲؎ نکات الشعرا ص۵۱-۵۰۔

۳؎ مراختہ کہ ایں لفظ بروزن مشاعرہ تراشیدہ اند (نکات الشعرا ص۱۴۷)

"پوشیدہ نماند کہ در فنِ ریختہ کہ شعریست بطورِ شعرِ فارسی بزبانِ اُردوے معلیٰ شاہ جہاں آباد دہلی، کتابے تاحال تصنیف نشدہ کہ احوالِ شاعرانِ ایں فن بصفحۂ روزگار بماند۔ بناءً علیہ ایں تذکرہ کہ مسمّیٰ بہ نکات الشعرا است نگاشتہ می شود[1]"

[فنِ ریختہ میں جو فارسی کی طرح اردوے معلیٰ شاہ جہان آباد دہلی کی زبان میں شعر کہنے کا انداز ہے کوئی کتاب اس وقت تک نہیں لکھی گئی ہے تاکہ اس فن کے شاعروں کے حالات اس روے زمین پر باقی رہ جائیں۔ اسی غرض سے یہ تذکرہ موسومہ نکات الشعرا لکھا جا رہا ہے[2]]

اس عبارت سے مترشح ہوتا ہے کہ نکات الشعرا اُردو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے جو ۱۱۶۵ھ میں مکمل ہوا۔ دوسرا تذکرہ سید فتح علی حسینی گردیزی کا "تذکرہ ریختہ گویاں" ہے۔ گردیزی کے اس تذکرے کے اختتام پر یہ عبارت ملتی ہے:

"ختم اللہ بالحسنیٰ فی خامس محرم الحرام المنتظم فی عام سنہ وستین ومائۃ بعد الالف من الہجرۃ المبارکۃ"[3]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ پانچ محرم الحرام ۱۱۶۶ھ کو پایۂ تکمیل کو پہنچا جو نکات الشعرا سے تقریباً ایک سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

تیسرا تذکرہ شیخ محمد قائم الدین قائم کا "مخزنِ نکات" ہے۔ مخزنِ نکات میں قائم نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

"در ذکر و بیان اشعار و احوال شعرائے ریختہ کتابے تصنیف نگردیدہ و بایں نہاں ہیچ انسانی از ماجراے شوق افزاے سخنورانِ ایں فن سطرے تالیف زبانیدہ"[4]

لیکن مولوی عبدالحق نے قائم کے اس بیان کو کہ اس سے قبل کوئی تذکرہ شعراے اردو کے بیان میں نہیں لکھا گیا اتفاق نہیں کیا اور اس کی تردید میں فرمایا۔

"یہ دعویٰ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس سے دو چار سال قبل میر تقی میر اور علی الحسینی گردیزی نے اپنے تذکرے لکھے تھے معلوم ہوتا ہے کہ قائم کو ان تذکروں کی اطلاع نہ تھی لیکن ڈاکٹر اشپرنگر کا یہ کہنا کہ قائم نے جو اقتباسات ریختے کے شاعروں کے دیئے ہیں — وہ وہی ہیں جو گردیزی کے تذکرے میں پائے جاتے ہیں صحیح نہیں ہے۔ دونوں تذکرے ہمارے سامنے ہیں اشعار کے انتخابات اور حالات

---

1۔ نکات الشعرا ص۱

2۔ تذکرہ میر ص۵۳ ۔ از مصطفیٰ کمال فاطمی۔

3۔ تذکرہ ریختہ گویاں ص۱۹۰ طبع انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) (۱۹۳۳ء)

4۔ مخزنِ نکات ص۱ طبع انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن) (۱۹۲۹ء)

دونوں مختلف ہیں۔"[1]

"مخزنِ نکات" کے صفحہ ۷ پر ایک قطعہ تاریخ خواجہ اکرم کا کہا ہوا ملتا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں مکمل ہوا۔ قطعہ تاریخ یہ ہے ؎

قائم رکھے ہمیشہ خدا تیرے نام کو ۔۔۔ کرنے سے ذکرِ خیر کے ہے موجبِ نجات

تاریخ اس کتاب کی میں نے کی جب تلاش ۔۔۔ پیرِ خرد نے مجھ سے کہا مخزنِ نکات

۱۱۶۸ھ

تقدمِ زمانی کے اعتبار سے میر کا تذکرہ ۱۱۶۵ھ، گردیزی کا تذکرہ ۱۱۶۶ھ اور قائم کا تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں علی الترتیب لکھے گئے۔ ان تینوں تذکروں میں اوّلیت کا شرف میر کے تذکرہ "نکات الشعرا" کو ہے۔ ۱۱۶۵ھ میں "تحفۃ الشعرا" از افضل بیگ خان قاقشال مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل اور "گلشنِ گفتار" از خواجہ حمید اورنگ آبادی مرتبہ سید محمد ایم۔ اے کے نام بھی ملتے ہیں لیکن ان تذکروں کے مرتبین نے میر کے تذکرہ نکات الشعرا کی اولیت کو چیلنج نہیں کیا۔ اسی طرح محمد یار خان خاکسار عرف کلو نے ایک تذکرہ "معشوقِ چہل سالہ خود" کے نام سے ۱۱۶۵ھ میں مرتب کیا اس تذکرہ کا ذکر میر نے نکات الشعرا کے صفحہ ۱۴۱ پر کیا ہے لیکن اس تذکرہ کا عدم اور وجود برابر ہے۔ تین اور تذکروں کا ذکر بھی تذکرہ نگاروں نے کیا ان میں سے ایک تذکرۂ خان آرزو، دوسرا تذکرہ سودا اور تیسرا تذکرہ سید امام الدین کا ہے۔ آرزو کا تذکرہ فارسی گو شعرا سے متعلق ہے دوسرے دونوں تذکرے ہماری دسترس سے آج بھی باہر ہیں اور ان کا پتا نہیں چلتا۔

اس مختصر بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میر کا تذکرہ "نکات الشعرا" ان تذکروں میں اولیت کا شرف لئے ہوئے ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "نکات الشعرا" اور "تذکرہ ریختہ گویاں" سے معاصرانہ چشمک کے سوتے بھی پھوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے اس کا تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے۔

> "یہ دونوں تذکرے معاصرانہ چشمک کے مظاہر ہیں اور ایک کا مطالعہ دوسرے کے مطالعہ کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ان دونوں کو صدائے احتجاج کی حیثیت حاصل ہے میر نے نکات الشعرا کے ذریعہ انعام اللہ یقین اور مظہر جانِ جاں کے دوسرے تلامذہ کو ان کی حیثیت سے بلند مقام دیئے جانے پر احتجاج کیا ہے اور گردیزی نے تذکرہ ریختہ گویاں میں میر کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی ہے۔ ہمعصروں پر اظہارِ رائے کرنا یوں بھی بڑا نازک کام ہے! اور جب اظہارِ رائے میں معاصرانہ چشمک کا عمل دخل ہو تو اس میں عدمِ توازن کا راہ پا جانا ناگزیر سا ہو جاتا ہے یہی سبب ہے کہ نکات الشعرا اور تذکرہ ریختہ گویاں دونوں میں اعتدال و توازن کی کمی ملتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ میر کا موقف بڑی حد تک صحیح تھا اس لیے عدمِ توازن کے باوصف ان کے تذکرے میں ایک وقار ملتا ہے۔ گردیزی کا احتجاج

---

[1] مخزنِ نکات صفحہ ۶ طبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) (۱۹۲۹ء)

انفعال آشنا ہے اور یہ اپنی شکست کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ وہ شاعری کی بساط پر جن مہروں کی مدد سے میر کو مات دینا چاہتے تھے وہ درماندہ و پاشکستہ ہیں یہی وجہ ہے کہ گردیزی کے تذکرے کی قدر و قیمت کم سے کمتر ہوتی گئی اور میر کا نکات الشعرا زیادہ سے زیادہ اہمیت حاصل کرتا گیا[۱]۔"

میر کی خردہ گیری اور عیب چینی کا گردیزی کے علاوہ حکیم قدرت اللہ شوق نے مجموعہ نغز میں، لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی نے تذکرہ چمنستان شعرا میں، مولوی کریم الدین نے طبقات الشعرا میں اور مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ:

"میر کے ذہن میں نکات الشعرا کی تالیف کا ادبی مقصد بھی ہو لیکن اس کی تالیف کا بڑا مقصد مظہر گروہ کی مخالفت تھا[۲]۔"

جس معاصرانہ چشمک کی طرف اجمالی طور پر اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اور جن شعرا پر نکات الشعرا میں نکتہ چینی کی گئی ہے اور جن کے کلام پر اصلاحیں دی گئی ہیں ہم ان کو تذکرہ ریختہ گویاں میں آگے چل کر خاص طور پر تلاش کرتے ہیں۔ میر نے نکات الشعرا میں شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی ان کی سیرت اور شخصیت کے ساتھ ان کے کلام کے انتخاب میں اپنے ذوقِ سلیم کا جو اظہار کیا ہے وہ معیاری بھی ہے اور حقیقت پر مبنی بھی اسی ذوق و وجدان نے میر کی اصلاحوں کے چند نمونے تنقید نگاروں کے سامنے رکھے ہیں۔ اب میر کی اصلاحوں کو جانچا جائے۔ اگر ان پر کوئی اعتراض ہو تو کھل کر بیان کیا جائے۔ تاکہ اصل شعر اور دی گئی اصلاح کا فرق معلوم ہو سکے۔ ان کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور خامی ظاہر کی جائے کیونکہ ایک اصلاح کو وجہِ اصلاح کے آئینے میں دیکھنے سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

'نکات الشعرا' میں مختلف شعرا کے کلام پر جو اصلاحیں ملتی ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ جن شعرا کے کلام پر اظہار خیال کیا ہے وہ بھی گنتی کے چند شاعر ہیں شلاً آبرو، مضمون، یک رنگ، ناجی، یقین، خاکسار، بہار، حاتم وغیرہ۔ کسی شاعر کے دو شعر ہیں اور کسی کے ایک شعر پر اصلاح دی گئی ہے یہ اصلاحیں میر نے اپنا تذکرہ نکات الشعرا مرتب کرتے وقت اشعار کے انتخاب کے پیش نظر دی ہیں انہوں نے شعروں کے انتخاب کے وقت جو شعر کھٹکا اس کو بنا دیا۔ جس شعر میں کوئی سقم نظر آیا۔ اس کو دور کر دیا۔ وہ معیوب شعروں کے دشمن تھے نہ کہ شاعر کے جہاں بھی ان کو فنی غلطی نظر آئی یا محض فصاحت لفظ دیکھا۔ اُسے زیورِ اصلاح سے آراستہ کر کے پیش کر دیا۔ زبان و محاورہ کی اصلاح اُس دور کے امتیازی خصوصیات تھے۔ میر نے اصلاح شعر میں اس کا پورا پورا خیال رکھا۔ اب ہم میر کی اصلاحوں کے نمونے پیش کرتے ہیں:۔

## شاہ مبارک آبرو

نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو تخلص کرتے تھے۔ حضرت محمد غوث گوالیاری کے نواسے تھے۔ جوانی میں شاہ جہان آباد آئے۔

---

[۱] نکات الشعرا مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی ص۱۱ (۱۹۷۲ء)۔

[۲] مرزا مظہر جانِ جاناں دہلی یونیورسٹی ۱۹۷۰ء ص۱۵۱۔

خان سراج الدین علی خان آرزو کے شاگردوں میں سے تھے۔ میر نے نکات میں ان کو عمدہ اور شوخ طبع شاعر کہا ہے:۔

"مشاعرے نادرہ گوے ریختہ، می گویند کہ طبع شوخ داشت[1]"

گردیزی کا قول ہے:

"بزم آرائے معانی است و خاطرش گنجینۂ گوہر سخن دانی[2]"

میر نے نکات الشعرا میں ان کے مختصر حالات قلم بند کئے ہیں اور ان کے کلام کا کچھ حصہ اپنے تذکرے میں منتخب کیا ہے۔ انتخاب کلام میں آبرو کا ایک شعر کھٹکا۔ شعر یہ تھا ؎

اصل ؎

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
اس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

اصلاح ؎

نہیں تارے بھرے ہیں شک کے نقط
کس قدر نسخۂ فلک ہے غلط

وجہ اصلاح: "اگر بجائے 'اس قدر' 'کس قدر' می گفت ایں شعر بآسماں می رسید" (نکات ص۱۱)

ہو سکتا ہے کہ یہ شعر خان آرزو کے ملاحظے سے بھی گزرا ہو، آبرو خود بھی کہنہ مشق شاعر تھے۔ لیکن میر کی ژرف نگاہی نے 'اس قدر' کو 'کس قدر' سے بدل کر اپنی استادی کا جو ثبوت دیا ہے۔ اس میں کلام نہیں فقط ایک لفظ کے بدلنے سے شعر کا پایہ بہت بلند ہو گیا۔

## شرف الدین مضمون

شرف الدین نام تخلص مضمون۔ اکبر آباد (آگرہ) کے نزدیک ایک قصبہ جاجمئو ان کا وطن تھا، نوکری پیشہ تھا۔ ظریفانہ انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ بھری محفل کو گرما دینا ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ خوش فکر اور تازہ مضمون تلاش کرتے تھے۔ بابا فرید الدین شکر گنج کے پوتوں میں سے تھے ؎

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مرید
کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید

زینت المساجد میں رہتے تھے اور وہیں سے سفر آخرت اختیار کیا۔ خان آرزو اور مظہر جانجاناں سے تلمذ تھا۔ نزلے سے ان کے دانت گر گئے تھے۔ خان آرزو ان کو دل لگی میں "شاعر بیدانہ" کہتے تھے۔ دور اوّل کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ صاحب دیوان تھے۔ میر نے اپنے تذکرے میں ان کے منتخب دیوان کا نمونہ دیا ہے۔

"حریف ظریف، ہشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلس ہا۔ ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ زیادہ

---

[1] نکات الشعرا طبع ثانی ۱۹۳۵ء ص۹۔

[2] تذکرہ ریختہ گویاں طبع اول (۱۹۳۳ء) ص۸۔

".... شاگرد خان صاحب سراج الدین علی خان است[1]۔"

گردیزی فرماتے ہیں :

" از شعرائے قرار دادۂ ریختہ است۔ مشق سخن از مظہر دخان آرزو کردہ است از نبائر حضرت گنج شکر است[2]۔"

میرؔ نے مضمون کے دو شعروں کو قابلِ اصلاح سمجھا :

اصل ؎ میرے پیغام کو تو اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کر

اصلاح ؎ میرا پیغام وصل اے قاصد
کہیو سب سے اسے جدا کر کر[3]

وجہ اصلاح : میرؔ نے اس شعر کی اصلاح کے متعلق خود نکات الشعرا میں لکھا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اتفاق سے وہ مضمون کے اشعار کا انتخاب کر رہے تھے۔ محمد حسین کلیم بھی ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ جب مذکورہ شعر کلیم کے سامنے پڑھا تو کہا: "چوں ایں حرف موافق سلیقۂ شعرا بود لہٰذا ہم چناں نوشتہ آمد"

(نکات ص ۱۷)

میرؔ نے "میرے پیغام کو تو" کو "میرا پیغام وصل" سے بدل دیا۔ اس تبدیلی سے 'جدا' اور 'وصل' میں صنعتِ طباق پیدا ہو گئی! "اے قاصد" کے ہوتے ہوئے "تو" کے تخاطب کی ضرورت نہ تھی۔ یہ بھرتی کا لفظ بھی فاضل مصلح نے نکال دیا۔ اب شعر معنوی لحاظ سے بے عیب ہو گیا۔ اور آج بھی کوئی مشاق شاعر اس مصرع کو بدل کر کوئی دوسرا اس سے بہتر مصرع تلاش کرے تو شاید وہ کامیاب نہ ہو۔ اس استادانہ اصلاح کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

انتخاب اشعار کے وقت میرؔ نے مضمون کے ایک اور شعر کو بھی جانچا ہے وہ شعر یہ ہے ؎

اصل ؎ مضمون توں[4] شکر کر کہ ترا نام سن رقیب
غصہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

اصلاح ؎ مضمون توں شکر کر کہ ترا اسم سن رقیب
غصہ سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

وجہِ اصلاح :- دوسرے مصرع کی رعایت سے "نام" کے بدلے "اسم" کا معنی خیز لفظ رکھ دیا۔ دوسرا مصرع اس

---

[1] نکات الشعرا ص ۱۴ و ۱۵۔ [2] تذکرہ ریختہ گویاں ص ۱۲۴، ۱۲۵

[3] 'کر کر' اس زمانے کی زبان ہے آجکل "کر کے" لکھتے اور بولتے ہیں۔

[4] 'توں' آجکل کی زبان نہیں۔ اب 'تو' بولتے اور لکھتے ہیں۔

لفظ کا محتاج تھا۔ اب شعر کی زبان اور محاورے کے لحاظ سے اور ہی شان ہو گئی۔

اس شعر کے متعلق میر کا اپنا قول ہے :۔

"شاعر مسطور بجائے اسم "نام" موزوں کردہ بود اسم اصلاح خان صاحب است وہ چہ اصلاح زیرا کہ اہلِ دعوت اسم می خوانند نہ کہ نام فافہم" (نکات ص۱۱)

## مصطفیٰ خان یکرنگ

مصطفیٰ خان نام تخلص یک رنگ۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاہ نجم الدین آبرو کے معاصر اور دہلی کے مشہور شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا مِنظہر جانجاں سے شرفِ تلمذ خاص تھا۔ طبقۂ اوّل کے شعرا میں ان کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ مشاقِ سخن ور تھے۔ اور بقول آزاد "تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یک رنگ یکتا تھے"۔ (آب حیات ص۱۰۱)

میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے :۔

"یک رنگ شاعر ریختہ، معاصر میاں آبرو۔ می گویند کہ بسیار چسپاں اختلاط و آشنائے درست بود۔ بندہ از احوال او خوب اطلاع ندارم[1]"

ان کے متعلق گردیزی کا خیال ہے :

"مصطفیٰ خان یک رنگ با آبرو نیک طرح بود و تلاشِ معنیٰ تازہ نمودہ رتبۂ سخنش بلند است و پایۂ شعرش ارجمند[2]۔"

نکات الشعرا میں میر نے جو چند شعر یک رنگ کے منتخب کیے ہیں۔ میر نے ان اشعار میں سے فقط دو شعروں کو زیورِ اصلاح سے آراستہ کیا ہے۔

۱۔ اصل

سچ کہے جو کوئی سو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

اصلاح

حق کہے جو کوئی سو مارا جائے
راستی ہے گی دار کی صورت

وجۂ اصلاح : اس شعر میں میر صاحب نے مصرعِ اولیٰ کے پہلے لفظ 'سچ' کی بجائے 'حق' کو رکھ دیا۔ لفظ 'سچ' اور 'حق' معنی کے اعتبار سے ایک دوسرے کے معنوی مفہوم کو یکساں طور پر واضح کرتے ہیں۔ لیکن میر نے اس لفظ کے بدلنے کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے :

"باعتقادِ فقیر بجائے "سچ" "حرفِ حق" اولیٰ است" (نکات ص۱۰)

---

[1] نکات الشعرا ص۱۸۔

[2] تذکرہ ریختہ گویاں ص۱۶۴۔

لفظِ حق سے واقعۂ منصور کی یاد بھی تازہ ہو جاتی ہے ! اور بقول صفدر مرزا پوری (یہ) اصلاح نہیں اعجاز ہے
(مشاطۂ سخن دوم صہ۴)

۲۔ اصل ؎ اُس کو مت پوچھو سخن اوروں کی طرح
مصطفٰی خاں آشنا یکرنگ ہے

اصلاح ؎ مت تلون اس میں سمجھے آپ سا
مصطفٰی خاں آشنا یکرنگ ہے

وجۂ اصلاح: مصطفٰی خان یکرنگ نے اپنے مخاطب کو اس شعر کے پردے میں یہ سمجھایا ہے کہ اے دوست مجھکو اوروں کی طرح نہ سمجھئے۔ میں گرگٹ کی طرح رنگ نہیں بدلتا کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ۔ میں تو جو کہتا ہوں اس میں دوغلاپن نہیں ہوتا یکرنگی ہوتی ہے۔ میر نے جب شعر کے مفہوم کو بغور دیکھا تو انھیں مصرع اولیٰ کے کھردرے پن کا احساس ہوا۔ تو انہوں نے پہلے مصرع کو بدل دیا۔
مت تلون اس میں سمجھیں آپ سا

میر نے لفظِ "تلون" رکھ کر مصرع کی معنوی حیثیت کو زیادہ قابلِ فہم بنا دیا ہے۔ "تلون" کے معنی لغت میں "رنگ برنگ اور رنگا رنگ" کے ہیں اب۔ اس لفظ "یک رنگ" سے جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ شعر اب معنوی لحاظ سے بھی مکمل ہو گیا اور ہم اسے ضرب المثل کے طور پر بھی دوسروں کو سنا سکتے ہیں۔ دوسرے اُس زمانے میں "مت اور سخن" کا استعمال عام تھا۔ میر کی اصلاح نے اسے اس دَور کا شعر بنا دیا۔ اصلاح سے شعر میں بے ساختہ پن پیدا ہو گیا اور تاثیر بھی بڑھ گئی۔ اس اصلاح کی وجہ میر صاحب خود یہ فرماتے ہیں :

"اگر شعر من می بود پیشِ مصرع ایں قسم موزوں می دادم" "مت تلون اس میں سمجھیں آپ سا" (نکات صہ۲۳)

## محمد شاکر ناجی

محمد شاکر نام تخلص ناجی۔ شاہ جہاں آباد (دہلی) کے رہنے والے تھے۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ پیشہ سپاہ گری تھا۔ حضرت شاہ مبارک آبرو کے ہمعصر تھے۔ قدیم شعرا کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ چنانچہ ایہام گوئی میں نام پیدا کیا۔ خوش طبعی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ ہجو کرنا ان کا شعار تھا۔ تیز مزاج اور شوخ طبع تھے۔ بقول آزاد :

"راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جس کے گرد ہو جاتے اُسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔"
(آبِ حیات صہ۱۰۳)

افسوس جوانی میں انتقال ہو گیا۔

نکات الشعرا میں میر کے الفاظ یہ ہیں :۔

"جوانے بود آبلہ رو، سپاہی پیشہ، مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود۔ معاصر میاں آبرو بندہ با وے ملاقات کردہ اند۔ شعر غزل خوب می داند و مردماں را بخندہ می آورد و خود نمی خندد۔ مگر گاہے تبسم می کرد وطنش شاہ جہاں آباد۔ جواں از جہاں رفت[۱]۔"

---

۱ نکات الشعرا صہ۲۳

گردیزی رقم طراز ہیں :-

"محمد شاکر ناجی تخلص، گویند روے بزدہ داشت و بہ عنوان سپہ گری علم می افراشت۔ طبعش اکثر مائل با ہا جی بود[1]۔"

"نکات الشعرا میں ناجی کے کلام کا جو انتخاب شامل ہے۔ اس میں ایک شعر پر میر نے اظہار خیال کیا ہے۔ یہ شعر نکات الشعرا کے صفحہ تیئس[23] پر موجود ہے ؎

اصل ؎ دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

اصلاح ؎ مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خورد کی
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

وجۂ اصلاح : ناجی کے شعر کا پہلا مصرع اپنے مفہوم کو جو دوسرے مصرع میں 'صدف' کے لفظ سے پیدا ہو رہا تھا، ادا نہیں کر رہا تھا۔ 'ہم صحبت' سے وہ تخصیص ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ جو لفظ "صدف" اور "گوہر" کے الفاظ چاہتے تھے۔ میر نے 'ہم صحبت' کے لفظ کو نکال کر لفظ 'خورد' بنایا۔ پہلے شعر کے مفہوم میں لطافت نہ تھی۔ اب مصرعے کی ترمیم نے شعر کے مفہوم میں وسعت پیدا کر دی۔ اب دونوں مصرعے ہم آہنگ ہو گئے اور شعر کا مضمون واضح ہو گیا۔ "صدف" کے مقابل لفظ 'خورد' کی ترمیم استادانہ اصلاح ہے۔ میر نے وجۂ اصلاح میں اس تبدیلی کا یوں اظہار کیا ہے۔

"بر متامل پوشیدہ نیست کہ پیشِ مصرع ایں چنیں می بایست :
مت رکھے چشم کرم دولت سے اپنے خورد کی " (نکات ص[24])

## میر سجاد

میر سجاد نام تخلص سجاد۔ اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کا وطن آذربائیجان تھا لیکن تربیت شاہ جہاں آباد میں پائی۔ شاعرانہ ذوق فطری تھا۔ مبارک آبرو جو اس دور کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے اپنے ذوق کی تکمیل کے لئے انھیں انتخاب کیا۔ پے در پے ترقی کے منازل طے ہوتے گئے۔ آبرو کی توجہ سے شعر گوئی میں نام پیدا کیا۔ طرزِ ایہام میں اپنے استاد بھائیوں سے سبقت لے گئے۔ صاحب دیوان تھے۔ ذہین اور بلند استعداد کے مالک تھے۔ گردیزی نے ان کے اشعار کو آبرو سے بہتر کہا ہے۔

میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے۔

"سخن از پایۂ استادی رسیدہ۔ چنیں خوش گو و معنی یاب اگرچہ در بند لفظِ تازہ است لیکن بزبان خامۂ او

---

[1] تذکرہ ریختہ گویاں ص[141]۔

خیلہاے معنی سپاہی می کند . . . . . . فکرِ رنگین او چمن تلاش را سایۂ ابر بہارے' (است ) ہر مصرع بندش را طرف لطف با چنارے - ہر بیت بحرِ خفیفش بر جگر نشتر زن - زبان طاقتِ بیانش رگ سخن قبل ازیں بخانۂ او مجلس یاران ریختہ می شد"[1]

[ ان کا کلام پایۂ استادی تک پہنچا ہوا تھا - ان کے اشعار بہت پر مغز ہیں - اگرچہ محفلِ سخن میں نو وارد ہیں - لیکن ان کے قلم کی زبان پر معنی کی فوج کا ہجوم رہتا ہے - چمن تلاش کرنے والوں کے لئے ان کی رنگین فکر ابرِ بہار کا سایہ ہے اور ان کے ہر مصرع کی بندش چنار کی تازگی کا لطف رکھتی ہے - بحرِ خفیف میں ان کا ہر شعر جگر پر نشتر چلاتا ہے اور ان کی طاقتِ بیان کی زبان سخن کی روح رواں ہے - کچھ عرصہ پہلے ان کے مکان پر یاران ریختہ کی مجلس ہوتی تھی[2] ]

گردیزی نے ان کے تعارف میں کہا ہے :-

"والا ذہن بلند استعداد میر سجاد در معنی یابی رتبہ اش بلند است و پایۂ اش ارجمند - ہر چند از تربیت یافتگان میاں آبرو است لیکن شعرش در چشمِ منصفان حق بین بہتر از اوست[3]"

نکات الشعرا میں میر نے میر سجاد کے دو شعروں پر اصلاح دی ہے :

(۱) اصل :-

کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی[4]
مر جا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہو

اصلاح :-

باطل بتوں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی
مر جا ستم سے ان کے تو کہتے ہیں حق ہوا

وجہِ اصلاح : مصرعِ ثانی میں لفظِ 'حق' نے لفظِ 'کافر' کو بدلنے کی تحریک کی اور میر صاحب کے احساس پر لفظ 'کافر' مصرع اولیٰ میں گراں گزرا ۔ حق اور باطل میں جو تطابق ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں - میر صاحب نے خود اپنے تذکرے میں اس کی توجیہہ یوں بیان فرمائی ہے :-

"اگرچہ 'باطل' باطل است ، لیکن بجائے 'کافر' کہ اول پیشِ مصرع واقع است - باعتقادِ فقیر لفظِ 'باطل' 'حق' است ۔" (نکات ص۶۱)

(۲) اصل :-

ہجرِ شیریں میں کیونکہ کاٹے گا
ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

اصلاح :-

کس طرح کوہکن یہ گزریں گی
ہجر کی یہ پہاڑ سی راتیں

---

[1] نکات الشعرا ص۶۰-۶۱ ۔ [2] تذکرہ میر مرتبہ مصطفیٰ کمال فاطمی ص۹۴ ۔ [3] تذکرہ ریختہ گویاں ص۸۲ ۔

[4] جس دور کا یہ شعر ہے اس زمانے میں شعرا "یہاں اور وہاں" شعروں میں لکھتے تھے لیکن یاں اور واں پڑھتے تھے - یہ شعر بھی اسی اور کی غمازی کرتا ہے ۔

وجۂ اصلاح: دونوں مصرعوں میں "ہجر ہجر" آگیا۔ جو مخل فصاحت تھا۔ میر نے اس غلطی کو بھانپ لیا۔ شعر کا دوسرا مصرع چونکہ رواں اور بے عیب تھا اُسے نہیں چھیڑا۔ بلکہ مصرع اولیٰ کے بدلنے کی احساسِ اصلاح نے سفارش کی۔ اس شعر میں ایک اور نقص بھی تھا کہ شعر میں فاعل موجود نہ تھا۔ کون کاٹے گا؟ اس کا جواب شعر میں موجود نہیں تھا۔ مصرع اولیٰ میں 'کیونکہ' 'کیونکر' کی جگہ استعمال ہوا تھا۔ زبان اس کی بھی متحمل نہ تھی۔ میر نے پہلے مصرع میں 'ہجر' کے لفظ کو خارج کر دیا اور 'کیونکہ' کی جگہ 'کیونکر' رکھ کر زبان صحیح کر دی اور لفظ 'کوہکن' کہہ کر فاعل کی نشاندہی بھی فرما دی۔ اس اصلاح سے شعر دلکش اور بیان پُر زور ہو گیا۔ اہلِ نظر کے نزدیک یہ اصلاح اعجاز سے کم نہیں۔

صفدر مرزا پوری نے مشاطۂ سخن جلد دوم کے صفحہ (۴) پر اس شعر کی توجیہہ اس طرح کی ہے "میر صاحب نے اپنی زبان میں یہ شعر کہہ دیا اور لطف یہ ہے کہ شعر کا مفہوم وہی رہا، ہم ان اصلاحوں کی کس زبان و قلم سے داد دیں"

## انعام اللہ یقینؔ

انعام اللہ نام۔ تخلص یقینؔ۔ میرزا مظہر جانجاں کے شاگرد تھے۔ مشہور ہے کہ میرزا مظہر کے منظورِ نظر تھے۔ ان کی علمی استعداد کے متعلق بھی تذکرہ نگار متفق نہیں۔ مجدد الف ثانی کے نواسے تھے۔ ایک باوقار اور معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن کسی امرِ شنیع کے ارتکاب سے جوانی میں اپنے والد کے ہاتھوں قتل ہوئے۔

یقینؔ کی شعر گوئی کے متعلق محمد حسین کلیم نے اپنے ایک قصیدہ "روضۃ الشعرا" میں ایک شعر کہا ہے ؎

یقینؔ کے شعروں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں
غلط ہے ہم نے بوجھا ہے کہ مرزا جانِ جاناںؔ[1] کو

یہ شعر کنایہ کا پہلو لئے ہوئے ہے اسے سخن فہم حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرؔ نے بھی یقینؔ کی شعر گوئی کے متعلق کہا ہے کہ وہ شعر سمجھنے کی صلاحیت قطعاً نہیں رکھتے ان کی شاعری نقائص و عیوب سے پاک نہیں۔ کیونکہ اس قسم کے شاعر کو کم فہم نہیں ہونا چاہیے۔ (نکات ص۸۲) لیکن تذکرہ ہندی (مصحفی) ص۲۷۵، دستور الفصاحت (یکتا) ص۶۹ مخزن نکات (قائم) ص۳۳ تذکرہ ریختہ گویاں (گردیزی) ص۱۲۶ اور مجموعہ نغز (قاسم) ص۲۵۵ میں یقینؔ کے کلام کی تعریف کی گئی ہے۔

نکات الشعرا سے چند جملے ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں:۔

---

[1] میر نے نکات الشعرا میں 'جان جاناں' پر اعتراض کیا ہے اور کہا ہے کہ مرزا کا نام "جانِ جاں" ہے چونکہ زیادہ تر عوام غلطی سے مرزا کا نام 'جانِ جاناں' لیتے ہیں اس لیے شاعر مذکور نے بھی اسی شہرت کی بنا پر اسی طرح موزوں کر دیا۔ حالانکہ یہ نہیں سمجھا کہ میری گفتگو خواص سے ہو رہی ہے (نکات صفحہ ۸۳)
"مرزا جانجاں اور تخلص مظہر تھا۔ بعد میں 'جانِ جاں' بگڑ کر 'جانجاناں' ہو گیا اور یہ نام اتنا مقبول ہوا کہ مرزا صاحب اپنے خطوط میں خود بھی یہی نام لکھنے لگے۔ ۱۱۵۴ھ سے قبل ہی ان کا نام بدل چکا تھا۔" (مظہر جانجاناں کے خطوط مرتبہ و مترجمہ خلیق انجم طبع برہان دہلی ص۱۳)

"ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔ شاید ازہمیں راہ مردماں گمان ناموزونیت درحقِ او داشتہ باشند۔ جیسے برایں اتفاق دارند کہ شاعری او خالی از نقص نیست۔ چرا کہ شاعر ایں قسم کم فہم نمے باشد۔ در بزرگ زادگی وشرافت ونجابت میاں یقینؔ سخنے نیست از خانوادہ بزرگیت یابندہ ہم آشنائی سرسری دارد[1]۔"

تذکرہ ریختہ گویاں میں ہے:۔

"شہباز خیالش بصیدِ معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ اش بر قلہ قافِ سخن بر پر فشانی ممتاز بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گذاشتہ و تخمِ معنی در زمین سخن کاشتہ و انچہ از طبعش سرزدہ از فرطِ شیوع وحسنِ قبول در تمام ہندوستان بر افواہ السنہ جاری است۔ افادۂ سخن از افادت گاہ میرزا جان جاناں مظہر گرفتہ[2]۔"

میرؔ نے نکات الشعرا میں بہت سے یقینؔ کے اشعار منتخب کئے ہیں ان کے ایک شعر پر اصلاح دی ہے۔

اصل ؎ مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

اصلاح ؎ مجنوں کی خوش معاشی کرتی ہے داغ مجھ کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں

وجہ اصلاح: یقینؔ نے شعر میں یہ مفہوم رکھا تھا کہ مجنوں کی خوش نصیبی پر ان کو رشک آتا ہے کہ اُس نے دیوانہ پن میں کیا کیا مزے لوٹے 'خوش نصیبی' میں قسمت اور تقدیر کا مفہوم ہے۔ لیکن میرؔ نے 'نصیبی' کو 'معاشی' سے بدل دیا۔ یہ لفظ 'زندگی بسر کرنے' اور 'جگہ زندگی کی' یا 'دنیا کے معنوں' میں استعمال ہوتا ہے۔ میرؔ نے یہ اصلاح دیتے وقت 'نصیبی' اور 'معاشی' کے معانی کے فرق کو پیشِ نظر رکھا۔ اس اصلاح کے متعلق ان کا اپنا قول ہے:۔

"اگر بجائے خوش نصیبی، خوش معاشی' می گفت ایں شعر بسیار بامزہ می شد" (نکات ص۸۶)

## محمد یار خاکسار

محمد یار نام، خاکسار تخلص عرف کو۔ شاہ جہان آباد کے رہنے والے تھے۔ قدم شریف کے خادموں میں سے تھے۔ زبانِ ریختہ کے مشاق شاعر تھے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ خوش فکری ان کے اشعار میں جھلکتی ہے۔ میر تقی میرؔ سے نوک جھونک رہتی تھی۔ تذکروں میں ہے کہ میرؔ نے خاکسار سے شروع شروع میں اصلاح لی تھی۔ لیکن میرؔ نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ البتہ خاکسار کے غرور اور سرکشی کا ذکر میرؔ کے ہاں

---

[1] نکات صفحہ ۸۲ و ۸۳۔ [2] تذکرۂ ریختہ گویاں ص۱۴۶۔

ملتا ہے۔ میر اور خاکسار کا مقابلہ ہی کیا؟

خاکسار نے ایک تذکرہ "معشوقِ چہل سالہ خود" لکھا جس میں اپنے حالات اس تذکرے کے شروع میں لکھے اور اس میں اپنا خطاب "سید الشعرا" لکھا۔ خاکسار کو یہ خطاب کہیں سے نہیں ملا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو دوسرے تذکرہ نویس اس کا بیان کرتے۔ خان آرزو نے میر کی تعلیم و تربیت میں حصہ لیا اس کا ذکر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ میر نے خان آرزو[1] کو اپنا پیر و مرشد کہا ہے۔ اس کے علاوہ میر جعفر اور سعادت[2] خان کے فیضان اور ترغیب کا حال بھی ملتا ہے۔ لیکن خاکسار کے متعلق ایسی کسی شہادت کا ذکر میر نے کہیں نہیں کیا مصحفی نے لکھا ہے "گویند میر در عالم شباب منظور نظر او بوده[3]" خاکسار کو میر نے جانجاناں کا شاگرد لکھا ہے۔

نکات الشعرا سے ایک مختصر اقتباس ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے میر کی ناراضگی ظاہر ہے:۔

"شعر ریختہ می گوید و خود را دو رمی کشد و بسیار سفلگی می کند، بلکہ از تنک آبی بنائے ریختہ را بآب رسانیدہ، چنانچہ علی الرغم ایں تذکرہ نوشتہ است۔ بنام معشوقِ چہل سالۂ خود، واحوال خود را اوّل از ہمہ نگاشتہ و خطاب خود سید الشعرا پیش خود قرار دادہ، آتش کینہ کہ بے سبب افروختہ است۔ چوں کباب بوی دہد۔ ایں قسم پئے من ریسماں می تابد کہ گوئی پسر رسن تاب است، محمد معشوق کنبوہ کہ مردے است نائب میر بحر بسیار گرم جوش و یار باش چوں شنید کہ خاکسار کلو نام دارد بداہتاً گفتہ۔

کتا ہے در یار کا کلو ہے جس کا نام[4]"

["ریختہ کے اشعار کہتے ہیں اور خود پر بہت غرور کرتے ہیں اور بہت بیہودگی کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی کم ظرفی کی وجہ سے ریختہ کی بنیاد کو بھی لے ڈوبے ہیں چنانچہ اس تذکرے کے مخالف میں ایک تذکرہ لکھا ہے جس کا نام "معشوقِ چہل سالہ خود" ہے۔ اس میں اپنا حال سب سے پہلے درج کیا ہے اور اپنا خطاب خود ہی "سید الشعرا" قرار دیا ہے۔ انہوں نے بغض و حسد کی آگ جو بلا وجہ اپنے دل میں جلا رکھی ہے۔ اس سے کباب کی بو آتی ہے۔ میرے سامنے اس طرح اینٹھتے ہیں گویا کوئی رسّی باں کے لڑکے ہیں۔ محمد معشوق کنبوہ نے جو نائب امیر بحر ہیں اور بہت یار باش اور جوشیلے آدمی ہیں جب سنا کہ خاکسار کا نام کلو بھی ہے فوراً کہا ع

کتا ہے در یار کا کلو ہے جس کا نام[5]"]

گردیزی نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:۔

"غرور را در ذی شعرائے مسلم محسوب می کند۔ بہر حال شعرش از موزونیت خالی نیست و آں کہ بعض اعزہ سر بہ انکار موزونیت او برآوردہ و او را از زمرۂ شعرا خارج می کند فاش از ستم ظریفی و بے انصافی است[6]۔"

---

[1] نکات ص۳۱۔ [2] ذکرِ میر ص۶۶ طبع انجمن اردو پریس اورنگ آباد (دکن)۔ [3] ذکرِ میر ص۶۷۔

[4] تذکرہ ہندی ص۸۰۔ [5] نکات ص۱۱۴-۱۱۵۔ [6] تذکرہ میر مترجمہ ایم۔ کے فاطمی ص۱۴۱۔ [7] تذکرہ ریختہ گویاں ص۵۲

[ خاکسار اپنے کو مانتے ہوئے شعرا میں شمار کرتے ہیں۔ بہرحال ان کے اشعار موزوں ہوتے ہیں۔ بعض شعرا کو ان کے اشعار کی موزونیت سے انکار ہے اور ان کو شعرا کے زمرے سے خارج کرتے ہیں۔ یہ ان کی ستم ظریفی اور بے انصافی ہے ]

نکات الشعرا میں میر نے خاکسار کے چند اشعار منتخب کئے ہیں ان منتخب اشعار میں سے ایک شعر پر میر کی اصلاح ہے:

اصل ؎ خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں ہی نے بیمار کیا

اصلاح ؎ خاکسار اس کی تو آنکھوں کے کہے مت لگیو
مجھ کو ان خانہ خرابوں نے گرفتار کیا

وجۂ اصلاح : اس اصلاح کے متعلق میر اپنے تذکرے میں یہ توجیہہ فرماتے ہیں :

" بر متبع این فن پوشیدہ نیست کہ بجائے بیمار کیا 'گرفتار کیا' می بایست " (نکات صفحہ ۱۱۶)

[ اس فن کی پیروی کرنے والوں پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ بیمار کیا کی جگہ گرفتار کیا ہونا چاہیے ] (نسخہ ناظمی ص ۱۴۹)

لیکن میر کی اس توجیہہ سے میر حسن کو اختلاف ہے وہ تذکرہ شعرائے اردو کے صفحہ ۱۶ پر فرماتے ہیں :

" میر تقی می گوید کہ بہ جائے 'بیمار کیا'، 'گرفتار کیا' می شد بہتر می بود۔ لیکن در عقل فقیر چنیں می گزرد کہ اگر چشم خود می بود گرفتار مناسب بود۔ چوں ایں جا چشم معشوق است بیماری صحت دارد۔"[1]

دستور الاصلاح[2] مصنفہ سیماب اکبر آبادی کے صفحہ ۵۲ پر یہ اصلاح میر حسن کے حوالے سے درج ہے اور کہا ہے کہ شعر علی حالہ درست تھا۔ اصلاح سمجھ کر نہیں دی گئی۔ اس پر آبر احسنی گنوری نے اپنی تصنیف اصلاح الاصلاح[3] میں لکھا ہے کہ اصلاح بجائے خود نہ صرف صحیح ہے۔ بلکہ اس سے شعر کی معنویت بھی بڑھ گئی اور جدت بھی پیدا ہو گئی سیماب صاحب کا اعتراض کہ چشم محبوب صرف بیمار کر سکتی ہے اور اپنی آنکھیں گرفتار خود نہیں کرتیں بلکہ حسن کو دیکھ کر گرفتار کرا دیتی ہیں۔ محبوب کی آنکھیں عاشق کو بیمار کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں۔ مگر ایک طالب کو گرفتار محبت ضرور کر لیتی ہیں پھر اساتذہ کا مسلمہ یہ ہے کہ محبوب کی آنکھیں بیمار ہوتی ہیں نہ یہ کہ وہ ہر کسی کو بیمار کر دیتی ہیں اگر ذرا دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اصلاح کی صحت اور عظمت مسلم ہے۔ 'چشم محبوب' کو خانہ خراب کہا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ عاشق کا خانۂ دل خراب کر دیتی ہے۔ دنیا میں ایسے مشاہدات اکثر ہیں کہ جس کی گرفتاری ہوتی ہے اس کا گھر بھی لوٹ لیتے ہیں۔ عشق اور حسن میدان میں آئے تو ہر قدم پر یہ مثالیں ملیں گی کہ چشمان محبوب نے عاشق کو گرفتار کیا اور اس عشق کی بدولت اس کا گھر برباد ہو گیا۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو طبع انجمن ترقی اردو ہند دہلی (۱۹۴۰ء) ص ۱۶۔ [2] دستور الاصلاح طبع رفاہ عام برقی پریس آگرہ ۱۹۴۰ء ص ۵۲
[3] اصلاح الاصلاح طبع مرتضیٰ پریس رام پور اسٹیٹ (طباعت کا سال ندارد) ص ۲۹

اثر صاحب کی توجیہہ در توجیہہ سے مذکورہ میر کی اصلاح پر روشنی پڑتی ہے "بیمار اور گرفتار" کے الفاظ بھی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ لیکن جس توجیہہ پر اعتراض کیا گیا ہے وہ میر حسن کی ہے سیماب صاحب کی نہیں۔

ٹیک چند بہار

نام ٹیک چند، تخلص بہار، عربی و فارسی کے اجل عالم تھے۔ اصطلاحات فارسی پر عبور کلی تھا۔ سیاحت ایران کے لئے گئے بہار عجم فارسی زبان کا جو مستند لغت ہے اس کے مصنف تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو کے دوستوں میں سے تھے۔ بڑے طباع اور تحقیقی ذہن کے مالک تھے۔ فارسی زبان میں ان کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے کبھی کبھی ریختہ میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔

میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے۔

"بہار تخلص، مرد مستعد یست، از یاران سراج الدین علی خان، صاحب تصانیف بسیار، دماغ تفصیل ندارم، برہمن رنگین بہار سخن از نقطہ لفظ ہزار ہزار رنگ معنی گل میکند۔ با فقیر ہم آشنا است[1]"

[بہار تخلص ہے اور بہت مستعد آدمی ہیں۔ سراج الدین علی خان (آرزو) کے دوستوں میں سے ہیں۔ بہت سی تصانیف کے مالک ہیں جن کی تفصیل کا مجھ کو دماغ نہیں ہے۔ رنگین برہمن ہیں۔ سخن کی بہار ان کے ایک ایک نقطہ سے ہزار ہزار معانی پیدا کرتی ہے۔ فقیر سے بھی جان پہچان ہے[2]]

گردیزی کا کہنا ہے:

"ہندوی باین کمالات کم بہ نظر درآمدہ۔ در تحقیق ہائے لغت ہاے فارسی و مواقع استعمال آں کتابے ضخیم مسمی بہ بہار عجم تالیف نمودہ[3]"

میر نے نکات الشعرا میں بہار کے چند شعر درج کئے ہیں۔ ان میں سے ایک شعر پر اظہار خیال کیا ہے:

اصل ؎
تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
یہ عجب مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

اصلاح ؎
تھی زلیخا مبتلا یوسف کی اور لیلیٰ کا قیس
حسن کیا مظہر ہے جس کے مبتلا ہیں مرد و زن

وجہ اصلاح: اس اصلاح کے متعلق میر کی توجیہہ یہ ہے:۔

"باعتقاد بندہ بجاے اشارت قریبہ وکلمہ استعجاب کہ اوّل مصرع دوم بکار بردہ است اگر "حسن کیا" می گفت، ایں شعر واضح ترمی شد[4]"

[بندہ کے خیال سے اشارت قریبہ اور کلمۂ استعجاب کی جگہ جو کہ دوسرے مصرع کی ابتدا میں استعمال کیا گیا

---

[1] نکات صفحہ ۱۳۳۔ [2] تذکرہ میر ترجمہ فاطمی صفحہ ۱۹۵۔ [3] تذکرۂ ریختہ گویاں صفحہ ۲۱۔ [4] نکات صفحہ ۱۳۳ و ۱۳۴۔

ہے اگر "حسن کیا" کیا ہوتا تو یہ شعر بہت واضح اور صاف ہو جاتا[1]

بہار ایسے مشہور شاعر پر میرؔ کی اصلاح سے یہ واضح ہوتا ہے کہ میرؔ نے جہاں اوسط درجے کے شعرا کے کلام کو بنایا ہے وہاں انہوں نے مشہور اور کہنہ مشق پڑھے لکھے شعرا کے کلام کو بھی جانچا ہے اور خامی کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ مذکورہ مصرع میں ذرا سی ترمیم نے شعر کا پایہ بلند کر دیا اور جس مفہوم کو ٹیک چند بہار نے پیدا کیا تھا۔ اس کی میرؔ کی اصلاح سے وضاحت ہو گئی۔

## ظہور الدین حاتمؔ

ظہور الدین نام تخلص حاتمؔ۔ پہلے رمزؔ تخلص کرتے تھے۔ سپاہی پیشہ اور عمدۃ الملک امیر خان کے مصاحب۔ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ بڑے متین اور مہذب بزرگ تھے۔ قلعہ کے نیچے شاہ تسلیم کا تکیہ ان کی نشست گاہ تھا۔ شعر و ادب کی محفلیں یہیں جمتی تھیں۔ وؔلی کے دیوان سے متاثر ہو کر کوچۂ شعر و سخن میں آئے۔ طبقۂ اول کے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کلیات ضخیم تھا۔ اسی سے ایک مختصر دیوان انتخاب کر کے "دیوان زادہ" کے نام سے مرتب کیا۔ سوداؔ ایسے نامور شاعر کے استاد تھے۔ محاورہ اور روزمرہ ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور صاحبِ دیوان تھے۔ کلام عارفانہ تھا۔ عشقیہ اشعار بھی مزے کے کہتے تھے۔ میرؔ سے عمر میں بڑے تھے۔ میرؔ نے شیخ محمد حاتمؔ کے نام سے ان کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے:۔

شاہ حاتمؔ سے متعلق میرؔ کے تاثرات :۔

"حاتمؔ تخلص از شاہ جہاں آباد است۔ می گوید کہ من با لیاں آبرو ہم طرح بودم۔ مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع دیر آشنا، عناندار دو دریافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بسببِ شاعری، است کہ ہم چوں من دیگرے نیست۔ یا وضع او ہمیں است، خوب است مارا بایں ہا چہ کار۔ شعر بسیار دارد، دیوانش تا ردیف میم بدست آمدہ بود و پارۂ اشعار آں نگاشتہ می شوند۔ با من ہم آشنائے بیگانہ است[2]"

[تخلص حاتمؔ اور وطن شاہ جہاں آباد ہے۔ کہتے ہیں کہ میں (حاتمؔ) اور میاں آبرو ایک ہی طرح میں کہتے ہیں۔ جاہل مغرور، مقطع وضع اور دیر آشنا شخص ہیں اور استغنا سے بالکل دور ہیں۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی یہ بدخوئی کہ جو میں ہوں۔ دوسرا نہیں، ان کی شاعری کی وجہ سے ہے یا ان کی وضع ہی ایسی ہے اچھا ہے، ہمکو ان تمام باتوں سے کیا غرض! اشعار بہت سے کہے ہیں۔ ان کا ایک دیوان میم کی ردیف تک مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں سے بعض حصے یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔ مجھ سے بھی تھوڑی آشنائی ہے[3]]

"شاہ حاتمؔ کے متعلق میرؔ کی رائے کے بعد دوسرے تذکرہ نگاروں کی رائے ملاحظہ فرمائیے۔ حاتمؔ تخلص..... ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میرزا رفیع سودا کا۔ شاعر خوش بیان تھا۔ صاحب دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خرچ ابہام کیا اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے[4]"

---

[1] ترجمہ خالطی ص۱۶۵ [2] نکات ص۶۰ [3] تذکرۂ میر ترجمہ ایم۔ کے خالطی ص۹۹ (۱۹۶۲ء) [4] تذکرہ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند طبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ص۱۰۲ (۱۹۰۶ء)

"شاعرے ست صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت معاصر آبروؔ دو دیوان ترتیب دادہ - یکے بزبان قدیم بطور ایہام و دوم بزبان حال ادائیہ۔ شہرۂ اشعارش بسیار ست[1]"

"کلیاتش ضخیم است و ابیات دیوانش قریب چہار ہزار بیت از نظر گذشتہ، شعر خوب خوب جستہ جستہ برآید[2]"

شاہ حاتم کے منتخب اشعار جو میرؔ نے اپنے تذکرے میں لکھے ہیں ان میں سے دو شعروں کو میرؔ نے پرکھا ہے :

(۱) اصل ؎
ہائے بے درد سے ملا کیوں تھا
آگے آیا مرے کیا میرا

اصلاح ؎
مبتلا آتشک میں ہوں اب میں
آگے آیا مرے کیا میرا

وجہ اصلاح : حاتمؔ کے مذکورہ شعر کے متعلق میرؔ کی توجیہہ یہ ہے :

"اگر شعر من می بود ایں چنیں می گفتم" (نکات الشعرا صہ۷۶)

اس سے قبل جتنی اصلاحیں میرؔ کی نکات الشعرا سے اخذ کی گئی ہیں ان میں سے یہ اصلاح میرؔ کی سنجیدگی سے لگا نہیں کھا رہی۔ یہ اصلاح نہیں بلکہ حاتمؔ کا مذاق اڑایا گیا ہے جو میرؔ ایسے عظیم شاعر کے شایانِ شان نہیں اور اس پر طرہ یہ کہ اصلاحِ شعر کے بعد فرماتے ہیں :

پیش کرمی ایں مصرع و خنکی آں شعر روشن است (نکات الشعرا صہ۷۷)

میرؔ نے شاہ حاتمؔ کے متعلق 'نکات' میں تذکرہ نویس کی حیثیت سے اظہارِ خیال نہیں کیا۔ یا تو یہ ایک معاندانہ جذبہ کا اظہار ہے۔ یا میرؔ کی صاف گوئی۔ البتہ حاتمؔ کو جاہل تک کہا ہے۔

ایک دوسرے شعر پر بھی میرؔ نے توجہ مبذول فرمائی شعر یہ ہے :-

(۲) اصل
دیکھ طور اس دور کا حاتمؔ نیں کی ترک شراب
یاد کر کر سبز رویاں کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

نکات الشعرا کے صفحہ ۸۰ پر یہ شعر جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے درج ہے۔ لیکن لچھمی نرائن شفیقؔ نے اپنے تذکرے چمنستان شعرا کے صفحہ ۱۴۲ پر اس شعر کا دوسرا مصرع اس طرح لکھا ہے :[3]

یاد کر کر خط کی سبزی کو وہ اب پیتا ہے بھنگ

میرؔ نے اس شعر کی پہلی حالت پر یہ اعتراض کیا ہے کہ لفظ "سبز رویاں" تامل کردن ضرور است زیرا کہ آشنائے گوش ایں ہیچمداں نیست"۔ (نکات صہ۸۰)

---

[1] تذکرہ شعرائے اُردو طبع انجمن ترقی اُردو ہند صہ۴۶ (۱۹۴۰ء)

[2] مخزنِ نکات طبع انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد (دکن) صہ۲۳ (۱۹۲۹ء)

توجیہہ واضح ہے۔ میر کو 'سبز رویاں' کے لفظ پر اعتراض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے کان اس لفظ سے قطعاً نا آشنا ہیں۔

میر کی اصلاحوں کے جو نمونے ہم نے اوپر پیش کئے ہیں۔ ان کا جائزہ لیتے وقت یہ ملحوظ رکھا ہے کہ میر نے اپنے بلند شعری ذوق کے پیشِ نظر ان ہی اشعار کو بدلا ہے۔ جن میں ان کو کوئی سقم نظر آیا۔ جس لفظ یا مصرع کو تبدیل کیا ہے۔ اس کی توجیہہ بھی ساتھ ساتھ کر دی ہے تاکہ قاری اس تبدیلی کے سمجھنے میں دقت محسوس نہ کرے۔ غیر جانبدار ناقدین ان اصلاحوں کی قدر کریں گے۔ میر نے اپنے تذکرے میں جن شعرا کے کلام میں خوبیاں نظر آئی ہیں ان کی تعریف کی ہے۔ اور جن کے کلام میں کوئی خامی دیکھی ہے اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ میر اپنے ضمیر کی آواز کے تابع تھے جو کچھ انہوں نے لکھا اُسے ان کے دل کی آواز کہنا چاہیے۔ بعض شعرا سے ان کے ذاتی اختلافات بھی 'نکات' میں موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے ان کے کلام کو اختلافات کی وجہ سے ہدفِ تنقید نہیں بنایا۔ بلکہ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو ان کے کلام کے آئینے میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ کیونکہ تنقید میں جب ذاتیات شامل ہو جائیں تو اس کی قدر و منزلت اہلِ نظر کی نظروں میں گر جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ میر نے جو اصلاحیں دی ہیں۔ اصلاح کے نقطۂ نظر سے یہ کہاں تک صحیح ہیں اور ان کا کیا درجہ ہے؟ نکات الشعرا کو سامنے آئے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔ لیکن ناقدین نے ان کی کسی اصلاح پر اعتراض نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا۔ کہ یہ شعر ایسا ہوتا یا یہ لفظ یا ٹکڑا جو تبدیل کیا گیا ہے معنی کے لحاظ سے صحیح نہیں۔ یہ اصلاحیں اگرچہ زیادہ تر لفظی ہیں لیکن بڑے غور و فکر کے بعد دی گئی ہیں۔ اُس زمانہ میں زبان' محاورہ اور عروض کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا اور یہی اصول میر کی اصلاحوں میں جاری و ساری ہیں۔ ان کا جائزہ اسی اصول کو سامنے رکھ کر لینا چاہیے افسوس میر کے تلامذہ[1] کی اصلاحوں کے نمونے ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں' ورنہ ان سے زبان و بیان کے کتنے علمی و ادبی محاسن آج ہمارے سامنے آتے اور ان کے مطالعہ سے مبتدی و منتہی دونوں یکساں طور پر مستفیض ہوتے۔

---

(۲)

## میر کی اپنے کلام پر اصلاحیں

میر نے دوسروں کے کلام پر جو اصلاحیں دی ہیں ان کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ میر نے اپنے کلام پر جو اصلاحیں دی ہیں ان پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ میر نے کس ماحول میں پرورش پائی۔ ان کے اساتذہ میں کون کون بزرگوار تھے۔ ان کا میلانِ طبع کس طرف تھا اور انہوں نے میر کو کیا کچھ دیا؟ میر نے جب آنکھ کھولی تو ان کو ماں باپ کی آغوشِ تربیت میسر آئی۔ ان کے والد میر محمد علی متقی صوفی منش، عاشق پیشہ، کشادہ قلب اور کم آمیز درویش تھے۔ استغراق اور مجاہدے ان کی زندگی کا جزو تھے۔ جب کبھی طبیعت شگفتہ ہوتی تو نصیحت فرماتے کہ "بیٹا! عشق اختیار کرو" جس کا ذکر میر نے اس طرح کیا ہے ؎

مرے استاد کو فردوسِ اعلیٰ میں ملے جاگہ  نہ سکھلایا بغیر از عشق مجھ کو تو ردِ سالی میں

---

[1] امداد صابری نے "تلامذۂ میر" میں میر کے تلامذہ کی تعداد ۳۲ بتائی ہے۔

عشق ورزی کی تعلیم ان کو والد ماجد کی طرف سے عطیہ میں ملی تھی۔ ابھی وہ سات ہی برس کے تھے، کہ میر نے قرآن شریف کی تعلیم سید امان اللہ سے حاصل کرنا شروع کی۔ سید امان اللہ میر کے والد کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ میر بھی ان سے بے حد مانوس تھے۔ ذکر میر میں ان کا ذکر اس طرح ہے :۔

من دراں ایام ہفت سالہ بودم۔ با خودم مانوس ساخت و دگر بیانم انداخت یعنی با مادر و پدرم نگذاشت و بفرزندی خویشم برداشت۔ روز و شب با او ماندم و قرآن شریف بہ خدمت اومی خواندم[1]"

قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ میر شب و روز ان کے ساتھ رہتے۔ مختلف اطراف سے آئے ہوئے فقرا و درویش جوان کے والد سے ملاقات کرنے کے لیے آتے۔ تو میر کو بھی ان کی ہم نشینی اور صحبت کا شرف حاصل ہوتا اور جو میل و قال و حال ہوتی اس پر ان کو غور و فکر کا موقع ملا۔ میر کی زندگی پر سید امان اللہ کی عاشقانہ طبیعت اور درویشانہ مزاج نے بہت اثر ڈالا۔ ان کے دل میں عشق الٰہی اور صوفیانہ سوز و گداز کے سوتے بھی یہیں سے پھوٹے جو آگے چل کر بحرِ بیکراں کی صورت اختیار کر گئے میر کی عمر ابھی دس سال کے لگ بھگ تھی کہ میر امان اللہ کا انتقال ہو گیا۔ میر کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔ جسے انہوں نے بے حد محسوس کیا۔ ذکر میر میں ہے۔

"منکہ بغل پرورده او بودم۔ حوائج خود را با او می گفتم۔ با او می خوردم و با او می خفتم۔ روزہا یاد می کردم و شبہا فریاد می کردم[2]"

ترجمہ : میں ان کی گود میں پلا تھا۔ اپنی ضروریات اُن سے بیان کرتا تھا۔ انھیں کے ساتھ کھاتا اور سوتا تھا۔ اب دن بھر ان کو یاد کرتا ہوں اور رات بھر آنسو بہاتا ہوں۔

ابھی اس سانحۂ الیمہ کا زخم تازہ ہی تھا کہ میر کے والد بھی جنت کو سدھار گئے۔ منہ بولے چچا اور والد کی وفات کے بعد میر کو زندگی گزارنا اجیرن ہو گئی۔ چاروں طرف سے مصائب و مشکلات نے گھیر لیا۔ لیکن میر ایک خود دار اور غیور طبیعت کے مالک تھے۔ دستِ سوال دراز کرنا انھیں آتا ہی نہیں تھا۔ خود فرماتے ہیں ؎

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

بڑے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن نے آنکھیں دکھائیں اور اپنی سرپرستی میں لینے سے انکار کر دیا۔ بھائی کی نامہربانیوں کا شکوہ بھی ذکر میر میں ملتا ہے۔ جب آگرہ میں زندگی گزارنا دوبھر ہو گئی تو قسمت آزمائی کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ یہاں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ پھر وطن لوٹ آئے۔ وطن میں اعزہ و اقربا نے طوطا چشمی کی۔ اس بے مروتی سے تنگ آکر دوبارہ دہلی کے سفر کی ٹھانی۔ یہ دوسرا سفر ۱۱۵۲ھ ۱۷۳۹ء میں کیا اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین علی خان آرزو کے یہاں قیام کیا۔ خان آرزو متبحر عالم تھے اور ان کے ہاں اونچے درجے کے

---

۱۔ ذکر میر صفہ۱ طبع انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (۱۹۲۸ء)
۲۔ " " صفہ۵۴ " " " " ( " )

علمی مباحث پر اظہارِ خیال ہوتا رہتا تھا۔ میر نے یہاں اس راز کو پا لیا کہ جب تک خود میں قابلیت نہ ہو۔ کوئی کسی کے آڑے نہیں آ سکتا۔ چنانچہ خان آرزو کی ادبی و علمی مجالس اور شاعرانہ ماحول نے تحریک کی اور میر شب و روز اپنی اہلیت بڑھانے میں اَن تھک کوششیں کرنے لگے۔ فارسی پر عبور حاصل کیا اور زبردست قابلیت حاصل کر لی یہاں تک کہ فارسی میں شعر کہنے لگے۔ ان اشعار پر انہوں نے خان آرزو سے اصلاح بھی لی ہوگی بقول ڈاکٹر صفدر آہ یہ زمانہ تقریباً ۱۱۵۵ھ / ۱۷۴۲ء کا ہوگا۔

حصولِ علم کی منزلیں طے کرنے میں خان آرزو کے علاوہ میر نے جن قابلِ ذکر اساتذہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ ان کا ذکر بھی ذکرِ میر میں ہے۔ ان میں میر جعفر عظیم آبادی کا نام سرِ فہرست ہے۔ ذکرِ میر میں میر جعفر کو انہوں نے بڑی عزت سے یاد کیا ہے :۔

"آں ملک سیرت و آدم صورت اتفاق می افتاد و بلطف نہایتم زباں می داد یعنی دماغ خود می سوخت و مرا چیزے آموخت تا مقدورِ من نیز بالش نرم زیرِ سرِ او گذاشتم یعنی صرفِ او بود۔ آنچہ میسر می داشتم، ناگاہ خطے از وطنِ او کہ عظیم آباد بود رسید و آں مرد رختِ خود کام و ناکام بآں صوب کشید"[1]

اسی انسان فرشتے کی ملاقات اور درس و تدریس کے متعلق میر نے صاف صاف لکھ دیا کہ انہوں نے بعض درسی کتب میر جعفر عظیم آبادی سے پڑھیں۔ میر جعفر کے بعد ایک دوسرا نام بھی ذکرِ میر میں ملتا ہے وہ ریختے کے خوش گو شاعر میر سعادت علی امروہوی کا ہے۔ میر سعادت علی نے جب میر کے فطری شاعرانہ ذوق کو دیکھا تو انھیں مشورہ دیا۔

"اپنی مادری زبان میں شعر کہا کرو"

میر نے ان کے اس مشورے کو قبول کیا اور ریختے میں شب و روز محنت کرنا شروع کر دی تھوڑے ہی عرصے میں اتنی مشق بہم پہنچائی کہ دہلی میں ان کی شاعری کے چرچے ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ خود فرماتے لگے ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دوسری جگہ اسی خیال کو اس طرح کہا ہے ؎

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

میر کے اساتذہ کا مجملاً جو تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ میر نے عشق و مستی کی تعلیم دس سال تک اپنے والد اور منہ بولے چچا سید امان اللہ سے حاصل کی۔ چند درسی کتب کا مطالعہ میر جعفر عظیم آبادی سے کیا۔ خان آرزو سے بہت کچھ سیکھا۔ جس کا اعتراف انہوں نے نکات الشعراء میں کیا۔ ریختہ کہنے کی تحریک میر سعادت علی امروہوی سے ملی۔ لیکن خان آرزو کی صحبت میں انہوں نے

---

[1] میر اور میریات ص ۳۹ طبع علوی بک ڈپو بمبئی (۱۹۷۱ء)
[2] ذکرِ میر ص ۶۹ ۔

فارسی پر ایک گونہ قابو پا لیا اور شعر گوئی کے بنیادی اصول ان ہی کی صحبت میں حاصل کئے۔ یہ دور غالباً ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء تک رہا۔ اسی سال خان آرزو اور میر کے درمیان جھگڑا ہو گیا جو مختلف تذکروں میں محفوظ ہے۔ اس مناقشے کے بعد میر خان آرزو سے علٰحدہ ہو گئے اور رعایت خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ یہ ان کی پہلی ملازمت تھی۔

ان دنوں دہلی میں علم و ادب کے دریا بہہ رہے تھے۔ کہیں مشاعروں کی محفلیں تھیں کہیں لفظی بحثوں کے چرچے اور کہیں رد و قدح کے ساغر انڈیلے جا رہے تھے۔ کہیں مراختوں کی مجالس تھیں اور کہیں ہجو و طنز کا بازار گرم تھا۔ غرضکہ دہلی میں علم و ادب کی ایک دنیا آباد تھی۔ میرؔ کو جب یہ ماحول میسر آیا۔ تو انہوں نے ان محفلوں کو اپنی شاعری اور شہرت کا زینہ قرار دیا اور ان میں شرکت کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان کی شاعرانہ عظمت کو سبھی ماننے لگے اور وہ میرؔ سے میرِ مجلس قرار دیئے گئے۔ حسد کا بُرا ہو کہ چند متشاعران سے حسد کرنے لگے۔ کچھ ہم عصر بھی خار کھانے لگے۔ آخر یہ حسد و رقابت رنگ لائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مراختوں میں مقابلے اور مقابلوں میں مجادلے ہونے لگے۔ جب یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ تو میر بھی ان ہنگاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگے۔ مثنوی اجگر نامہ اسی دور کی یادگار ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے آپ کو اژدہا اور اپنے عہد کے دوسرے شعرا کو چوہا۔ بچھو، کنکھجورہ وغیرہ کہا ہے۔ "جب یہ حشرات الارض ان سے لڑنے کے لئے آتے ہیں تو اژدہا ان سب کو چٹ کر جاتا ہے[1]۔" آخر اس کا ردِ عمل ہوا اور دوسرے شاعر بھی میدان میں آ گئے اور خوب خوب دادِ سخن دینے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی تنقید کا بول بالا تھا۔ شعرا لفظی و معنوی بحثوں میں حصّہ لیتے تھے۔ غلط اور صحیح محاورے کی چھان پھٹک ہوتی تھی۔ زبان کے صحیح استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ عروضی نکات اور قافیہ کی موشگافیاں تنقید کا محور ہوا کرتی تھیں۔ تقطیع میں جب کوئی حرف گر جائے تو سرِ مشاعرہ بازپرس ہوتی تھی۔ تذکیر و تانیث پر لامتناہی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ غرضکہ مشرقی تنقید ہی شعر و ادب کے جانچنے کی ترازو تھی اور اسی کے اصول کے تحت جھگڑے چکائے جاتے تھے۔ میر کا مزاج ناقدانہ تھا۔ وہ بھی تنقید میں مشرقی طرزِ فکر کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے جو اصلاحیں دی ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہمارے بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح ہو یا اپنے کلام پر ترمیم و اصلاح ان دونوں میں بظاہر کوئی فرق نہیں۔ جو اصول انہوں نے دوسروں کے کلام پر اصلاح دینے میں اپنائے ہیں۔ وہی اصول انہوں نے اپنے کلام کے بنانے میں بھی صرف کئے ہیں۔ جن کے کچھ نمونے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | کس کو میرے حال سے تھی آگہی | نالۂ دل سب کو خبر کر گیا | نسخۂ لاہور ص۱۷۸ |
| اصلاح | " " " | نالۂ شب " " " " | نسخۂ کلکتہ ص۶۲ |
| شعر | ہم کشتہ گانِ عشق ہیں ابرو و چشم دار | سر سے ہمارے تیغ کا سایا نہ جائے گا | نسخۂ لاہور ص۱۷۵ |
| اصلاح | " " " " چشمِ یار | " " " " " | نسخۂ کلکتہ ص۳۹ |

---

[1] میر اور میریات ص۴۹۔

(نوٹ) نسخۂ لاہور سے مراد نقوش کا میر نمبر (۱) ہے اور نسخۂ کلکتہ سے مراد مطبوعہ کلیات میر کا وہ پہلا نسخہ ہے جو کلکتہ سے شائع ہوا۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | غم اس کو ساری رات سنایا تو کیا ہوا | اور روز اُٹھ کے سر کو پھرایا تو کیا ہوا | نسخۂ لاہور ص ۱۷۹ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ ״ | یا روز ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۴۰ |
| شعر | ہم ہیں اور ضعف ہے اور خاک ترے کوچے کی | اب تو بے طاقتی سے دل کا بھی مقدور گیا | ״ لاہور ص ۱۸۱ |
| اصلاح | ناتواں ہم ہیں کہ ہیں خاک گلی کی اس کے | ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۴۲ |
| شعر | تجھ بن شراب پی کے موئے سب ترے خراب | ساقی بغیر تیرے انھیں جام جم ہوا | ״ لاہور ص ۱۸۲ |
| اصلاح | ״ ״ ״ موے ״ ״ ״ | ״ ״ ״ ״ جامِ سم ہوا | ״ کلکتہ ص ۴۴ |
| شعر | گرم رو راہِ فنا کا نہیں ہو سکتا پتنگ | اس سے تو شمع صفت سر بھی کٹایا نہ گیا | ״ لاہور ص ۱۸۴ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ ״ | ״ ״ ״ نمط ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۴۶ |
| شعر | میں جو تھا صیدِ زبوں صید گہِ عشق کے بیچ | اپنے تئیں خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا | ״ لاہور ص ۱۸۵ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ ״ ״ | آپ کو ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۴۷ |
| شعر | خوفِ آشوب سے غوغائے قیامت کے کنے | خونِ خوابیدۂ عشاق جگایا نہ گیا | ״ لاہور ص ۱۹۷ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ لئے | ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۴۰ |
| شعر | نافع تھیں جو مزاج کو اوّل سو عشق میں | آخر انھیں دواؤں نے ہم کو ضرر دیا | ״ لاہور ص ۱۸۶ |
| اصلاح | ״ جو تھیں ״ ״ ״ ״ ״ | ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۴۷ |
| شعر | ایک عالم کی ہیں لگ رہی چھت سے آنکھیں | تو اے ماہ کس شب لبِ بام ہوگا | ״ لاہور ص ۱۸۸ |
| اصلاح | ہزاروں کی یاں لگ ״ ״ ״ ״ | ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۵۲ |
| شعر | مستی میں شکل ساری نقاش سے کھچی یہ | آنکھوں کو دیکھ تیری آخر خمار کھینچا | ״ لاہور ص ۱۸۹ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ | ״ ״ اس کی ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۵۳ |
| شعر | گندمی رنگ خوب رو اب نہیں | میر ہندوستان میں کال پڑا | ״ لاہور ص ۱۸۹ |
| اصلاح | خوب رو اب نہیں ہیں گندم گوں | ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۵۳ |
| شعر | مشکل بہت ہے ہم سا پیدا نہ ہم پھر | یوں مار ڈالنا تو آسان ہے ہمارا | ״ لاہور ص ۱۹۰ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ پھر کوئی ہاتھ آتا | ״ مارنا تو پیارے آسان ہے ہمارا | ״ کلکتہ ص ۶۵ |
| شعر | اے ابر اس چمن میں نہ ہوگا گلِ اُمید | یہاں تخمِ اشکِ یاس کو میں پھر کے بو دیا | ״ لاہور ص ۱۹۱ |
| اصلاح | ״ ״ ״ ״ | یہاں ״ ״ کو میں نے پھر کے بو دیا | ״ کلکتہ ص ۶۶ |
| شعر | طالع جو میر خواری خوش آئی دوست کے تئیں | پر ظلم یہ ہے مخالف دیکھیں گے سب تماشا | ״ لاہور ص ۱۹۱ |
| اصلاح | ״ ״ محبوب کو خوش آئی | ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ ״ | ״ کلکتہ ص ۶۶ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | بھڑکی ہے آتشِ غم منظور تھی جو تجھ کو | جلنے کا عاشقوں کے آ دیکھ اب تماشا | نسخۂ لاہور ص ۱۹۱ |
| اصلاح | " " " " منظور ہے جو تجھ کو | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۶۶ |
| شعر | قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا | بے چارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا | " لاہور ص ۱۹۳ |
| اصلاح | " " " " " " " | " " گریہ ناک گریباں دریدہ تھا | " کلکتہ ص ۶۷ |
| شعر | یکساں تھی قتل گہ اور اُس کی گلی مجھے تو | واں خاک میں میں لوٹا یاں خون میں نہایا | " لاہور ص ۱۹۵ |
| اصلاح | " ہے " " " " تو مجھ کو | " " " " " " " " | " کلکتہ ص ۲۸ |
| شعر | ہوتا تھا مجلس آرا گر غیر کا تجھے تو | مانند شمع مجھ کو کاہے تئیں جلایا | " لاہور ص ۱۹۵ |
| اصلاح | " " " " " " " | " " " " کاہے کے تئیں " | " کلکتہ ص ۲۸ |
| شعر | شادابی و لطافت ہرگز نہ ہو یہ اس میں | تیری مسوں پہ گرچہ سبزہ نے زہر کھایا | " لاہور ص ۱۹۵ |
| اصلاح | " " " ہوتی نہ " " | " " " " " " | " کلکتہ ص ۲۸ |
| شعر | کم فرصتی جہاں کے مجمع کی کچھ نہ پوچھو | بیٹھا بھی ہے کہوں میں اس مجلسِ رواں کا | " لاہور ص ۱۹۶ |
| اصلاح | " " " " " " | احوال کیا کہوں میں " " " " | " کلکتہ ص ۲۹ |
| شعر | پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر چڑھا ہے | چہرہ اُتر رہا ہے از بسکہ اس جواں کا | " لاہور ص ۱۹۶ |
| اصلاح | " " " نظر پڑا ہے | " " " " کچھ آج " " " | " کلکتہ ص ۳۰ |
| شعر | ہیں بندِ عشق میں ہم طالع زلیخا کے | عزیزِ مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا | " لاہور ص ۱۹۶ |
| اصلاح | قسم جو کھایئے تو " " کی | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۳۰ |
| شعر | کثرت میں ایک درد کی نکلی نہ کوئی طپش | کوچہ جگر کے زخم کا شاید کہ تنگ تھا | " لاہور ص ۱۹۸ |
| اصلاح | " " درد و غم کے نہ نکلی " " | " " " " " " | " کلکتہ ص ۳۱ |
| شعر | گورِ مجنوں سے نہ جاویں حشر تک ہم بے نوا | عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا | " لاہور ص ۱۹۸ |
| اصلاح | " " " نہ جاویں گے کہیں " " | " " " " " " " " | " کلکتہ ص ۳۰ |
| شعر | مانندِ شمع آتشِ غم سے پگھل گیا | بزمِ جہاں میں روتے ہی روتے میں گل گیا | " لاہور ص ۲۰۰ |
| اصلاح | گرمی سے میں تو آتشِ غم کی پگھل گیا | راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا | " کلکتہ ص ۳۵ |
| شعر | عرق فشاں ہے تری زلف سے نشانِ بد | بھلا نہیں ہے بہت ٹوٹنا بھی تاروں کا | " لاہور ص ۲۰۰ |
| اصلاح | عرق فشانی سے اس زلف کی ہراساں ہوں | " " " " " " | " کلکتہ ص ۳۶ |
| شعر | ظالم زمیں سے لوٹتا دامن سنبھل کے پہن | ہوگا کہیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا | " لاہور ص ۲۰۱ |
| اصلاح | " " " " اٹھا کے چل | " " " " " " | " کلکتہ ص ۳۷ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | تو بھی رونے کو بلا دل ہے ہمارا بھی بھرا | ہو جتنے اے ابر بیاباں تئیں گریباں یک جا | نسخۂ لاہور ص ۲۰۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 میں 〃 〃 ہو جے | کلکتہ ص ۵۵ |
| شعر | بیٹھ کر میر جہاں خوب نہ رویا ہووے | ایسے کوچہ میں تمہارے نہیں خوباں یک جا | 〃 لاہور ص ۲۰۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 جاناں 〃 | 〃 کلکتہ ص ۵۷ |
| شعر | افسوس میرے مردہ پر اتنا نہ کر کہ اب | پچھتاونا عبث ہے جو ہونا تھا ہو چکا | 〃 لاہور ص ۲۰۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | پچھتانا اب 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۰ |
| شعر | ممکن نہیں کہ گل کرے دل سے شگفتگی | اس سرزمین میں تخم محبت میں بو چکا | 〃 لاہور ص ۲۰۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 ویسی 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۰ |
| شعر | جی تو ایسے کئی صدقے کئے تجھ پر لیکن | حیف یہ ہے کہ تنک بھی تو پشیماں نہ ہوا | نسخۂ لاہور ص ۲۰۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 تو بھی 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۷ |
| شعر | آہ میں کب کی کہ سرمایۂ دوزخ نہ ہوئی | کون سا اشک مرا مانع طوفاں نہ ہوا | 〃 لاہور ص ۲۰۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 منبع 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۷ |
| شعر | بوئے کباب سوختہ آوتی ہے دماغ میں | ہووے نہ ہووے لے نسیم رات کسو کا دل جلا | 〃 لاہور ص ۲۰۴ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 آتی 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۸ |
| شعر | دل بے رحم لیے شیخ گیا زیر زمیں | مر گیا پر یہ کہن گبر مسلماں نہ ہوا | 〃 لاہور ص ۲۰۴ |
| اصلاح | 〃 〃 گیا شیخ لیے 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۸ |
| شعر | برگشتہ بخت دیکھ کے قاصد سفر سے میں | بھیجا تھا اس کے پاس سو میرے وطن گیا | 〃 لاہور ص ۲۰۴ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 کہ 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۸ |
| شعر | ذہن میں آج دیکھا پھر لخت میں ہیں آیا | ٹکڑا کوئی جگر کا مژگاں میں رہ گیا | 〃 لاہور ص ۲۰۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 لے 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۹ |
| شعر | سر مار کر ہوا تھا میں خاک تجھ گلی میں | سینے میں تجھ کو میرا مرکوز نقش پا تھا | 〃 لاہور ص ۲۰۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 آج دیکھا 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۶۹ |
| شعر | کیسا چمن کہ ہم تو اسیروں کو منع ہے | چاک قفس سے باغ کی دیوار دیکھنا | 〃 لاہور ص ۲۰۶ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 ہم سے 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۷۰ |
| شعر | نہ گئی تسبیح اس کی نزع میں بھی میر سے ہرگز | اسی کے نام کی سمرن تھی جب منکا ڈھلکتا تھا | 〃 لاہور ص ۲۰ |
| اصلاح | گئی تسبیح اس کی نزع میں کب میر کے دل سے | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۷۱ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | بر مجنوں میں خرد مند کوئی جا نہ سکا | عاقبت سر کو قدم کردہ دیوانا ہی گیا | نسخۂ لاہور ص۲۰۷ |
| اصلاح | " " " " " " " | " " " " دوانا " " | " کلکتہ ص۷۱ |
| شعر | جو اس شور سے میر روتا رہے گا | تو ہمسایہ کوئی کیونکے سوتا رہے گا | " لاہور ص۲۰۸ |
| اصلاح | " " " " " " | " ہمسایہ کاہے کو " " " | " کلکتہ ص۷۱ |
| شعر | بس اے اشک آنکھیں ترے کیا نہیں ہیں | کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا | " لاہور ص۲۰۸ |
| اصلاح | " " گریہ آنکھیں تری " " " | " " " " " " " | " کلکتہ ص۷۱ |
| شعر | مرا وعدہ ہی آپہنچا ترے وعدے کے آنے تک | ہوا میں موت سے سچا رہا تو مجھ سیتی جھوٹا | " لاہور ص۲۰۸ |
| اصلاح | " " " " " " " | " " " " رہا اے شوخ تو " | " کلکتہ ص۷۲ |
| شعر | نہ ٹھہرا مرے پاس دل ورنہ اب تک | اسے آپ سا ہی میں جانب نہ کرتا | " لاہور ص۲۰۹ |
| اصلاح | " " " " " | " ایسا ہی میں تو " " | " کلکتہ ص۳۰۱ |
| شعر | نہ ہوتا میں حیرت میں محتاج گریہ | جو کچھ آنسوؤں کو پس انداز کرتا | " لاہور ص۲۰۹ |
| اصلاح | " " " حسرت " " | " " " " " | " کلکتہ ص۳۰۱ |
| شعر | تسکین اس کی تب ہوئی جب ذبح میں ہوا | مت پوچھ کچھ سلوک مرے مہربان کا | " لاہور ص۲۱۰ |
| اصلاح | " " " " جب چپ مجھے لگی | " " " " " بدزبان | " کلکتہ ص۳۰۱ |
| شعر | مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہوئے گا | مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے روئیگا | " لاہور ص۲۱۱ |
| اصلاح | " " " " خندۂ ساغر " " | " " " " " " " " " | " کلکتہ ص۷۳ |
| شعر | مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبہ کا ہمسایا | یہاں اے شیخ بت خانہ ہی تو نے کیوں نہ بنوایا | " لاہور ص۲۱۲ |
| اصلاح | " " " " " " " | صنم خانہ ہی یاں اے شیخ تو نے " " | " کلکتہ ص۷۳ |
| شعر | دل تاب ہی نہ لایا ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں | اب روز عیش وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا | " لاہور ص۲۱۳ |
| اصلاح | " " " " " | " عیش روز وصل کا " " " | " کلکتہ ص۲۷ |
| شعر | بوسہ دینا نہ کر مجھے موقوف | ہے وظیفہ یہی دعا گو کا | " لاہور ص۲۱۴ |
| اصلاح | " " مجھے نہ کر " | " " " " " " | " کلکتہ ص۷۴ |
| شعر | طالع سعید دیکھ کہ دولت نہ ہوئی نصیب | سر پر مرے کروڑ برس تک ہما رہا | " لاہور ص۲۱۵ |
| اصلاح | " جو خوب تھے نہ ہوا جاہ کچھ " | " " " " " " | " کلکتہ ص۷۵ |
| شعر | سیاہ بخت ہی میرا مجھے تو کافی ہے | لیا ہے داغ میں دامن عبث سیاہی کا | " لاہور ص۲۱۸ |
| اصلاح | سیاہ بخت سے میرے مجھے کفایت ہے | " " " " " " | " کلکتہ ص۶۱۵ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | طوفِ مشہد کے تئیں جو آؤں گا | تیغِ قاتل کو سر چڑھاؤں گا | نسخہ لاہور ص۲۱۷ |
| اصلاح | 〃 〃 کو کل جو 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۶۱۵ |
| شعر | تمہارے حسن کے شعلے کے آگے اڑتا ہے | یہاں سلوک سنو میرے رنگ کا ہی کا | 〃 لاہور ص۲۱۸ |
| اصلاح | کسو کے حسن کے شعلہ 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 سلوک میر سنو | 〃 کلکتہ ص۲۱۵ |
| شعر | کن نیندوں سوتی ہے تو اے چشم گریہ ناک | مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا | 〃 لاہور ص۲۲۰ |
| اصلاح | 〃 〃 اب تو سوتی ہے اے 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۱۵۹ |
| شعر | صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی | کیا پتنگے نے التماس کیا | 〃 لاہور ص۲۲۱ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ہے | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۳۲ |
| شعر | کاش تیرے غم رسیدوں کو نہ لاویں حشر میں | ظلم ہے اک خلق پر آشوب ان کی آہ کا | 〃 لاہور ص۲۲۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 بلاویں حشر 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۳۴ |
| شعر | بن اس کے ہم آغوشی بیتاب نہیں آج ہے | مدت سے بغل میں دل آرام نہیں رکھتا | 〃 لاہور ص۲۲۴ |
| اصلاح | بے اس کے 〃 〃 〃 〃 اب ہے | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۳۴ |
| شعر | مر گیا تس پہ سنگسار کیا | نخل ماتم میرا یہ پھل پایا | 〃 لاہور ص۲۲۷ |
| اصلاح | مر گئے پر بھی 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 لایا | 〃 کلکتہ ص۶۲۱ |
| شعر | حد ہے الفت تھی تیغ سے اس کی | قتل کرتا تو لوہو جم جاتا | 〃 لاہور ص۲۲۸ |
| اصلاح | الفت اس تیغ سے تھی بے حد میر | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | اصلاح نسخہ لاہور ص۲۲۸ فٹ نوٹ |
| شعر | چمن میں گل نے جو کل دعوئ جمال کیا | جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا | نسخہ لاہور ص۲۳۰ |
| اصلاح | جو گل نے دعوئ رخ کا ترے خیال کیا | صبا نے مارے طمانچوں کے منہ کو لال کیا | نسخہ لاہور فٹ نوٹ ص۲۳۰ |
| شعر | شرمندہ ترے مونہہ سے ہے رخسار پری کا | چلتا نہیں کچھ آگے ترے کبک دری کا | 〃 لاہور ص۲۳۱ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 رخ 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 | کلکتہ ص۲۳ |
| شعر | احوال خوش انہوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے | اور حیف ہے کہ ہم نے واں تک نہ بار پایا | نسخہ لاہور ص۲۳۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | افسوس ہے کہ 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۲۸ |
| شعر | آیا تھا خانقاہ میں وہ نور دیدہ گاں کا | تہ کر گیا مصلے عزلت گزیدگاں کا | 〃 لاہور ص۲۳۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 نور دیدگاں 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۴۵ |
| شعر | جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف | اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا | 〃 لاہور ص۲۳۳ |
| اصلاح | 〃 〃 تیغ بدل 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | نسخہ لاہور فٹ نوٹ ص۲۳۳ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ | مذہبِ عشق اختیار کیا | نسخۂ لاہور صـ۲۳۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 جس 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۴۳ |
| شعر | خلش نہیں کسو خواہش کی رات دن شاید | سرشکِ یاس کے پردہ میں دل روانہ ہوا | 〃 لاہور صـ۲۳۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 رات سے شاید | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۶۷ |
| شعر | جو دل میں تھا سو وہ دل ہی میں لے چلے ہم تو | ہزار حیف سر حرف اس سے وانہ ہوا | 〃 لاہور صـ۲۳۵ |
| اصلاح | ہم اپنے دل کی چلے دل ہی میں لئے یہاں سے | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۶۷ |
| شعر | کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میرؔ | سمندِ ناز کو ایک اور تازیانہ ہوا | 〃 لاہور صـ۲۳۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 یہ اک اور تازیانہ ہوا | 〃 کلکتہ صـ۶۷ |
| شعر | دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش | گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا | 〃 لاہور صـ۲۳۶ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 گئی 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | نسخۂ لاہور فٹ نوٹ صـ۲۳۶ |
| شعر | غنچۂ گل کی طرح دیوانگی میں آپ کو | سر نکالا میں گریباں سے تو دامن میں رہا | نسخہ لاہور صـ۲۳۷ |
| اصلاح | پنجۂ گل کی طرح دیوانگی میں ہاتھ کو | گر 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۶۹ |
| شعر | گویا محاسبہ مجھے دینا تھا عشق کا | اس طرح دل سی جنس کو میں نے لگا دیا | 〃 لاہور صـ۲۳۸ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 طور دل سی چیز کو 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۷۸ |
| شعر | تجھ تک ہی شور شیں ہیں اور ملامت پر نمک | ٹک تو رہ پیری چلی آتی ہے اے عہدِ شباب | 〃 لاہور صـ۲۴۱ |
| اصلاح | ہے ملاحت تیرے باعث شور پر تجھ سے نمک | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۸۰ |
| شعر | شب سوزِ دل کہا تھا میں مجلس میں شمع سے | روئی یہاں تلک کہ بھرا ہے دہن میں آب | 〃 لاہور صـ۲۴۰ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 ہے یاں 〃 〃 لگن 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۸۰ |
| شعر | ساقی کی خبر تھی آونے کی | گزری ہمیں ساری بے خبر رات | 〃 لاہور صـ۲۴۲ |
| اصلاح | 〃 کے جو آنے کی خبر تھی | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۸۳ |
| شعر | دل خراشی ہے جگر چاکی سے کیا کیا غرض | ہوں تو ناکام مگر رہتے ہیں مجھے کام بہت | 〃 لاہور صـ۲۴۴ |
| اصلاح | دل خراشی و جگر چاکی و خوں افشانی | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۸۳ |
| شعر | تاک کی چھاؤں میں جوں مست پڑے سوتے ہوں | اینڈتی ہیں نگہیں سایۂ مژگاں کے بیچ | 〃 لاہور صـ۲۴۵ |
| اصلاح | تاک 〃 چھاؤں میں جوں مست پڑی سوتی ہے | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ صـ۸۵ |
| شعر | بیٹھیں ہم اس کے سگ کو کے برابر کیونکر | کرتے ہیں میر معاش ایسی مساوات کے بیچ | 〃 لاہور صـ۲۴۶ |
| اصلاح | بے مے و مغبچہ اک دم نہ رہا تھا کہ رہا | اب تلک میرؔ کا تکیہ ہے خرابات کے بیچ | 〃 کلکتہ صـ۲۴۷ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | ہر طرح تو ذلیل ہی رکھتا ہے میرؔ کو | کرتا ہے کوئی کس کے تئیں خوار ایک طرح | نسخہ لاہور ص۲۴۷ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | ہوتا ہے عاشقی میں کوئی خوار ایک طرح | 〃 کلکتہ ص۸۶ |
| شعر | آنکھیں موند اور سفر عدم کا کر | بس بہت دیکھا عالم ایجاد | 〃 لاہور ص۲۴۸ |
| اصلاح | موند آنکھیں سفر 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۸۹ |
| شعر | بھول جا ہے غم بتاں میں جی | آوتا ہے غرض خدا ہی یاد | 〃 لاہور ص۲۴۸ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | غرض آتا ہے پھر خدا ہی یاد | 〃 کلکتہ ص۸۹ |
| شعر | ایسا ہرزہ ہے وہ کہ اُٹھتے صبح | سو جگہ جانا اس کی ہے معتاد | 〃 لاہور ص۲۴۸ |
| اصلاح | 〃 وہ شوخ ہے کہ اٹھتی صبح | جانا سو جائے اس 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۸۹ |
| شعر | کیوں ہی پہنچے نہ خط میرا تجھ تک | میرے طالع ہیں نارسا قاصد | 〃 لاہور ص۲۵۰ |
| اصلاح | کوئی پہنچا 〃 〃 مرا اس تک | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۸۷ |
| شعر | شرمندۂ اجابت باطن میرا نہیں ہے | وقتِ سحر ہے شاہد و دستِ دعا ہے شاہد | 〃 لاہور ص۲۵۱ |
| اصلاح | 〃 اثر کچھ باطن مرا نہیں ہے | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۸۸ |
| شعر | آئی ہے پوچھیو تو بلا اپنے سر صبا | جنبش بھی اس کی کاکلِ مشکیں کو ہوئی اگر | 〃 لاہور ص۲۵۱ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | وے مشک فام زلفیں پریشاں ہوئیں اگر | 〃 کلکتہ ص۹۰ |
| شعر | نہ ہونا ہی بھلا تھا سامنے مجھ چشم گریاں کے | نظر اے ابر آب آپھی نہ آوے گا برس بہتر | 〃 لاہور ص۲۵۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 اس چشم 〃 〃 | 〃 〃 ابرِ تر 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۹۱ |
| شعر | اس دشت میں سنبھل کے قدم رکھ ٹک اے سیل | ہر سمت کو ہے تشنہ لبی کا مری خطر | 〃 لاہور ص۲۵۱ |
| اصلاح | اے سیل ٹک 〃 〃 بارے میں رکھ | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۹۰ |
| شعر | سیہ کر دوں گا دودِ دل سے گلشن باغباں میں بھی | جلا آتش میں میرے آشیاں کے خار و خس بہتر | 〃 لاہور ص۲۵۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 گلشن دودِ دل سے 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۹۱ |
| شعر | ساقی تو ایک بار تو توبہ تُڑا مری | توبہ کروں جو پھر میں تو توبہ ہزار بار | 〃 لاہور ص۲۵۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 تڑا 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۹۱ |
| شعر | کیونکر میں راہِ عشق چلوں ہے یہ ڈر مجھے | پھوٹیں کہیں نہ آبلے ٹوٹیں کہیں نہ خار | 〃 لاہور ص۲۵۳ |
| اصلاح | کس ڈھب سے راہِ عشق 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۹۱ |
| شعر | کوچے میں اس کی راہ نہ بتلا گئے میرے بعد | دل میں صبا رکھی تھی مری خاک سے غبار | 〃 لاہور ص۲۵۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 کے 〃 〃 تبلائی 〃 〃 | 〃 〃 رکھے تھی مری 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص۹۲ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | میر تلوار چلتی ہے جو چلے | خوش خراموں کی چال ہے کچھ اور | نسخہ لاہور ص ۲۵۷ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 تو | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۸۲ |
| شعر | طالع نے چشم پوشی کی یاں تک کہ ہم نشیں | چھپ جائے مجھ کو دور سے اب یار دیکھ کر | 〃 لاہور ص ۲۵۸ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 | چھپتا ہے 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۹۶ |
| شعر | اے جگر کوئی طپش ہو ہی بُرا | ایک دم کے ہو نہ پینے پر | 〃 لاہور ص ۲۵۹ |
| اصلاح | کوئی ہوتا ہے دل طپش سے بُرا | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۸۴ |
| شعر | لوحِ تربت پہ مری پہلے یہ لکھیو کہ اسے | دوست دشمن ہو گیا جان سے مار آخر کار | 〃 لاہور ص ۲۵۹ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 | یار دشمن 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۹۹ |
| شعر | اوّل کارِ محبت تو نٹھ سہل ہے میر | جی سے جاتا ہے ولے صبر و قرار آخر کار | 〃 لاہور ص ۲۶۰ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 بہت | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۰ |
| شعر | آخر عدم نے مونہ اکھاڑا میرا میاں | مجھ کو تھا دستِ غیب پکڑ لی تری کمر | 〃 لاہور ص ۲۶۰ |
| اصلاح | 〃 〃 سے کچھ بھی نہ اکھڑا مرا 〃 | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۰ |
| شعر | غیروں سے وے اشارے ہم سے چھپا چھپا کر | پھر دیکھنے ہو ایدھر آنکھیں ملا ملا کر | 〃 لاہور ص ۲۶۱ |
| اصلاح | 〃 〃 ہہ 〃 〃 〃 | 〃 دیکھنا ادھر کو 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۹۰ |
| شعر | ہوئی صبح سے شام نہ پہنچا میں داد کو | پھرتا ہوں مونہہ پہ خاک ملے جابجا ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۳ |
| اصلاح | دن رات کو کھنچا ہے قیامت کا اور میں | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۱ |
| شعر | غنچہ چمن چمن کھلے اس باغِ دہر میں | دل ہی مرا ہے جو نہیں ہوتا ہے وا ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۳ |
| اصلاح | غنچے 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۱ |
| شعر | بے بال ہوں، اسیر ہوں، کنجِ قفس میں میر | جاتی نہیں ہے سر سے چمن کی ہوا ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۳ |
| اصلاح | بے بال و پر 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۲ |
| شعر | لب پہ آئی ہے جان کب کی یہ آہ | اس کے موقوف یک اشارہ ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۴ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 ہے | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۲ |
| شعر | عوں سے آبلہ پا کے میں کب کا گزرا | شور کرتے ہیں میرے پانو پہ آخار ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۴ |
| اصلاح | کوئی تو آبلہ پا دشتِ جنوں سے گزرا | ڈوبا ہی جاتے ہے لوہو میں سر خار 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۲ |
| شعر | ایک بھی زخم کی جا تن پہ نہ ہو جس کے کہیں | کوئی دیتا بھی سنا ویسے کو آزار ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۵ |
| اصلاح | ایک بھی 〃 〃 جس کے نہ ہو تن پہ کہیں | 〃 〃 ہے 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۳ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | دل جلوں پر روتے ہیں جن کو کچھ ہے سوزِ دل | شمع کرتی ہے ہماری گور پر ماتم ہنوز | نسخہ لاہور ص ۲۶۶ |
| اصلاح | 〃 〃 روتے ہیں 〃 〃 〃 جگر | 〃 رکھتی 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۳ |
| شعر | وضع یکساں اس زمانے میں کسو کی نہیں رہی | قد ترا چوگاں رہا ہے کس طرح سے خم ہنوز | 〃 لاہور ص ۲۶۶ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 نہیں رہتی کہیں | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۳ |
| شعر | مژگاں نہ بہہ گئی مری اس سیلِ اشک میں | دریا کی موج دیکھ اور استادگی خس | 〃 لاہور ص ۲۶۶ |
| اصلاح | 〃 بھی بہہ گئیں مرے رونے سے چشم کی | سیلاب موج مارے تو ٹھہرے ہے کوئی خس | 〃 کلکتہ ص ۱۰۴ |
| شعر | ہے دل افگار اور جگر پر ریش | اک مصیبت ہے میرے تئیں درپیش | 〃 لاہور ص ۲۶۷ |
| اصلاح | دل تو افگار ہے جگر ہے 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۵ |
| شعر | سال میں ابرِ بہاری تجھ سے یکباری ہے فیض | چشم گریہ ناک عاشق سے سدا جاری ہے فیض | 〃 لاہور ص ۲۶۸ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 نم دیدہ سے عاشق کی سدا 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۶ |
| شعر | شب سے آئینہ نمط رکھتے ہیں خوباں اختلاط | ہوتے ہیں یہ لوگ بھی کتنے پریشاں اختلاط | 〃 لاہور ص ۲۶۸ |
| اصلاح | سب 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۶ |
| شعر | آہ برچھی سی لگی تھی تیر سی دل کی طپش | ہجر کی شب مجھ کو گزری غیرتِ روزِ مصاف | 〃 لاہور ص ۲۶۹ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 جو مجھ پہ گزری 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۶ |
| شعر | جانا نہ پرفشانی کو ہم اور جو ایک بار | پرواز کی چمن سے سو صیاد کی طرف | 〃 لاہور ص ۲۷ |
| اصلاح | ہم نے تو پرفشانی نہ جانی کہ ایک بار | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۶ |
| شعر | تنہا تو اپنی گور میں رہنے پہ بعدِ مرگ | مت اضطراب کر کہ یک عالم ہے زیرِ خاک | 〃 لاہور ص ۲۷۰ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 کر لو کہ 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۸ |
| شعر | ڈوبیں دریا و کوہ و شہر و دشت | تجھ سے سب ہے اے چشمِ تر نزدیک | 〃 لاہور ص ۲۷۱ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 کچھ ہے چشم 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۹ |
| شعر | شب کوتہ اور قصہ میرے حال کا دراز | القصہ اب کہا کروں تجھ سے میں کب تلک | 〃 لاہور ص ۲۷۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 میری جان 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۰۹ |
| شعر | گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل | یک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل | 〃 لاہور ص ۲۷۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 جانی دیکھی 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۱۲ |
| شعر | کس کے ہے خار ہو کر ہر شب دلِ چمن میں | اتنے لب و دہن پہ یہ نالہ ہائے بلبل | 〃 لاہور ص ۲۷۳ |
| اصلاح | کھٹکے ہے 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۱۲ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | شرط ہے ابر میں اور ہم میں کہ رو دیں گے کل | صبح کو اٹھتے ہی عالم کو ڈبو دیں گے ہم | نسخہ لاہور ص ۲۷۴ |
| اصلاح | " " " " " " " " | صبح گہ " " " " " | " کلکتہ ص ۱۱۲ |
| شعر | اللہ رے عندلیب کی آوازِ دل خراش | جی ہی نکل گیا جو سنا ہم نے ہائے گل | " لاہور ص ۲۷۴ |
| اصلاح | " " " " " | " " جو کہا " " " " | " کلکتہ ص ۱۱۲ |
| شعر | وعدۂ وصل ہوا ہے شبِ فردا پہ میر | بختِ خوابیدہ جو آرام سے سو دیں گے کل | " لاہور ص ۲۷۴ |
| اصلاح | " " رہا ہے شبِ آئندہ پہ میر | " " جو ٹک جاگتے " " " | " کلکتہ ص ۱۱۴ |
| شعر | کرو تم یاد اگر ہم کو رہے تم میں بھی اکثر دل | مثل کیا نہیں سنی تم نے کہ دنیا ہی میں دلبر دل | " لاہور ص ۲۷۵ |
| اصلاح | " " " گر ہم کو " " " " " | " مشہور ہے یہ تو کہ ہے دنیا میں | " کلکتہ ص ۱۱۵ |
| شعر | تلوار مارتے ہو تم اور دم بخود ہیں ہم | دنیا میں یہ کرے ہے کوئی درگزر کہ ہم | " لاہور ص ۲۷۵ |
| اصلاح | تلواریں تم لگاتے ہو ہم ہیں گے دم بخود | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۱۵ |
| شعر | سیکڑوں ہوں کشتنی تو لائیں کچھ تابِ نگاہ | ایک دو کام تو نہیں اسے ہونا چارہ چشم | " لاہور ص ۲۷۶ |
| اصلاح | " " " " لادیں | " " کا کام کب ہے اس سے ہونا چارہ " | " کلکتہ ص ۱۱۵ |
| شعر | مدت ہوئی کہ چاکِ قفس ہی سے اب تو میر | دکھلاوتے ہیں گل کو دل چاک چاک ہم | " لاہور ص ۲۷۶ |
| اصلاح | " " " " " | دکھلا رہے ہیں گل " " " " | " کلکتہ ص ۱۱۵ |
| شعر | آستاں پہ ترے گزر گئی عمر | اسی دروازے کے گدا ہیں ہم | " لاہور ص ۲۷۷ |
| اصلاح | " " ہی گزری " | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۱۸ |
| شعر | کام کیا آوتے ہیں معلومات | یہ تو سمجھے ہی نہ کہ کیا ہیں ہم | " لاہور ص ۲۷۶ |
| اصلاح | کام کیا آتے ہیں گے معلومات | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۱۸ |
| شعر | ہزار حیف کہ درگیر صحبت اس سے نہیں | جگر کہ آپ میں ہنگامہ کر رکھا ہے گرم | " لاہور ص ۲۷۷ |
| اصلاح | " " " " " " | " " آگ نے " " " | " کلکتہ ص ۱۱۸ |
| شعر | نہ اتنی دارو پی ظالم کہ اس خمار میں ہوں | مزاج گرم ہے تیرا د یہ دوا ہے گرم | نسخہ لاہور ص ۲۷۷ |
| اصلاح | " " " " " " | " " پھر اور یہ ہوا " " | " کلکتہ ص ۱۱۸ |
| شعر | رکھے ہے تاجِ زر کو سر پہ چمن زمانہ | نہ شگفتہ ہو تو اتنا کہ خزاں ہے یہ بہاراں | " لاہور ص ۲۷۹ |
| اصلاح | " تاج زر کو سر پہ چمن زمانہ میں گل | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۲۱ |
| شعر | جائے کیوں ہی نہ مرضِ دل تو نہیں اس کا علاج | اپنے مقدور تلک ہم تو دوا کرتے ہیں | " لاہور ص ۲۸۰ |
| اصلاح | جائے ہے نہ مرضِ دل تو " " " | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۲۲ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | فرصتِ خواب نہیں ذکرِ بتاں میں ہم کو | رات دن رام کہانی ہی کہا کرتے ہیں | نسخۂ لاہور صـ۲۸۰ |
| اصلاح | " " " " " | " " " سی " " | " کلکتہ صـ۱۲۳ |
| شعر | کہتا جاتا تھا میں دل جن نے لیا کون ہے وہ | یک بیک بول اٹھا اس طرف آ میں ہی ہوں | " لاہور صـ۲۸۳ |
| اصلاح | میں یہ کہتا تھا کہ " " " " | " " " " " " " | " کلکتہ صـ۱۲۶ |
| شعر | کہاں کی شمع، پروانے گئے مر | گئے آتش بجاں اس انجمن میں | " لاہور صـ۲۸۴ |
| اصلاح | " " " " | بہت آتش بجاں تھے " " " | " کلکتہ صـ۱۲۷ |
| شعر | آگو تُو لعل تو خطِ خوباں کے دم نہ مار | ہر چند اے مسیح دے باتیں رہیں نہیں | " لاہور صـ۲۸۵ |
| اصلاح | آگے تُو " " " " " " " | " " " " " " | " کلکتہ صـ۱۲۸ |
| شعر | ماتھا کیا ہیں صرف سجودِ درِ بتاں | مانندِ ماہِ نو کے مرے اب جبیں نہیں | " لاہور صـ۲۸۵ |
| اصلاح | " " ہے " " " | " " " " " " | " کلکتہ صـ۱۲۸ |
| شعر | میں جو آنکھیں کھول دیکھا سو غم اور چشم گریاں | کسے کہتے ہیں نہ جانا دل شاد روئے خنداں | " لاہور صـ۲۸۵ |
| اصلاح | کھلیں آنکھیں جو میں دیکھا " " " | " " " " " " " " | " کلکتہ صـ۱۲۸ |
| شعر | خوں بستہ اپنی کھول مژہ سوجھتا بھی گر | رکھ ٹک تو اپنے حال کو مدِ نظر کہیں | " لاہور صـ۲۸۶ |
| اصلاح | " " " پوچھتا " " | " " " " " " | " کلکتہ صـ۱۳۱ |
| شعر | کتنے ہی آئے لے کے سر پُر خیالِ دہر | ایسے جہاں سے گئے کہ نہ پایا اثر کہیں | " لاہور صـ۲۸۷ |
| اصلاح | " " " | " گئے کہ کچھ نہیں ان کا " " " | " کلکتہ صـ۱۳۱ |
| شعر | جہاں میں گریہ نہ پہنچا بہم مجھے دل خواہ | یوں نوح کے سے طوفاں ہزار لایا ہوں | نسخۂ لاہور صـ۲۸۷ |
| اصلاح | " " " " " " | یہ " " " " | " کلکتہ صـ۱۳۲ |
| شعر | ہم وے ہیں خوں گرفتہ ظالم جنھوں نے تیرے | ابرو کی جنبش اوپر تلواریں کھائیاں ہیں | " لاہور صـ۲۸۸ |
| اصلاح | " " " " " " " | " " جنبشوں پہ " " " | " لاہور فٹ نوٹ صـ۲۸۸ |
| شعر | جنوں تیری منت ہے مجھ پر کہ تو نے | نہ رکھا میرے ذمہ بارِ گریباں | " لاہور صـ۲۸۹ |
| اصلاح | " " " " " " | " " " سر پہ بارِ " | " کلکتہ صـ۱۳۴ |
| شعر | دنیا میں کوئی نہیں جو کرے ایک دو مقام | جو ہے رواروی ہی میں ہے اس دیار میں | " لاہور صـ۲۹۰ |
| اصلاح | " " ایک دو نہیں کرتا کوئی " | " " " " " " | " کلکتہ صـ۶۶۸ |
| شعر | بیدم ہیں صید گاہ میں یک دم تو آ کے دیکھ | پاتا نہیں ہوں دم کسی تیرے شکار میں | " لاہور صـ۲۹۱ |
| اصلاح | " " دام گاہ میں اک تو چل کے " | " " " " " " | " کلکتہ صـ۶۶۸ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | معلوم نہیں ہے میری غزل خوانی میر جی | ایک عندلیب کیا ہے پرندوں میں ہزار ہیں | نسخہ لاہور ص ۲۹۱ |
| اصلاح | شور اب چمن میں میری غزل خوانی کا ہے میر | اک " " " کہوں " " " " | " کلکتہ ص — |
| شعر | میرے آگو نہ شاعر نام پاویں | قیامت کو مگر عرصے میں آویں | " لاہور ص ۲۶۶ |
| اصلاح | " آگے " " " " | " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۳۸ |
| شعر | چلے تو ہی ہے اے جانِ المناک | ٹک ایک رہ جا ہمیں رخصت ہو آویں | " لاہور ص ۱۹۲ |
| اصلاح | چلے ہے تو، تو " " " " | " " " کہ ہم " " | " کلکتہ ص ۱۳۸ |
| شعر | ایک دم پر ہے بنا تیری سو آیا کہ نہیں | ایسا کچھ زندگی میں کر جو تجھے یاد کریں | " لاہور ص ۲۹۴ |
| اصلاح | " " " " " | وہ کچھ اس زندگی میں کر کہ " " " | " کلکتہ ص ۱۴۰ |
| شعر | بوئے گل اور رنگِ گل اللہ ہی اللہ ہے نسیم | ٹک بقدر یک نگاہ دیکھئے تو وفا نہیں | " لاہور ص ۲۹۵ |
| اصلاح | " " " دونوں ہیں دلکش اے نسیم | " " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۱ |
| شعر | آتا رقیب خانہ پر انداز سے سلوک | جب آتے ہیں ہم تو سنتے ہیں کہ گھر نہیں | " لاہور ص ۲۹۸ |
| اصلاح | " " " " | جب آ نکلتے ہیں تو سنتے ہیں " " " | " کلکتہ ص ۱۴۲ |
| شعر | سگِ کو میر ہیں اس شیر حق کا ہوں کہ جسکے تئیں | نبی کا خویش و بھائی حیدر کرار کہتے ہیں | " لاہور ص ۲۹۹ |
| اصلاح | " " " " " کہ جس کو سب | " " " " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۳ |
| شعر | گردش فلک کی کیا ہے جو دورِ قدح میں ہوں | دیتا رہوں گا چرخ ہمیشہ آسماں کو میں | " لاہور ص ۳۰۰ |
| اصلاح | " " " ہے " " " | " " " مدام " " | " کلکتہ ص ۱۴۶ |
| شعر | دیکھ اسے بے دید ہو آنکھوں نے کیا دیکھا ندیم | دل بھی بد کرتا ہے مجھ سے تو بھلا کرتا نہیں | " لاہور ص ۳۰۱ |
| اصلاح | دیکھا اسے " ہوں " " دیکھا بھلا | " " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۵ |
| شعر | یرا کہنا بھی خوش نہ آیا اس کے تئیں ورنہ | تسلی یہ دلِ ناشاد ہوتا ایک گالی سے | " لاہور ص ۳۰۲ |
| اصلاح | " " میرا " " " " کو تو ورنہ | " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۷ |
| شعر | میرے استاد کو فردوس اعلیٰ میں ملے جاگہ | نہ سکھلایا بغیر از عشق مجھ کو خورد سالی میں | " لاہور ص ۳۰۲ |
| اصلاح | " " " " " | پڑھایا کچھ نہ غیر از عشق " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۷ |
| شعر | خلاف ان اور خوباں کے یہ آنکھوں ہی بھر آتا ہے | یہی تو میر ایک خوبی ہے معشوقِ خیالی میں | " لاہور ص ۳۰۲ |
| اصلاح | " " " سدا یہ جی میں رہتا ہے | " " " " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۷ |
| شعر | کوئی سسکتا ہے کوئی مرتا ہے | ہر طرف ظلم ہو رہا ہے یہاں | " لاہور ص ۳۰۳ |
| اصلاح | اک " " ایک " " | " " " " | " کلکتہ ص ۱۴۸ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | رہی سہی بھی گئی عمر تیرے پیچھے یار | اے عمر رفتہ تیرا کب تک انتظار کریں | نسخہ لاہور ص۳۰۴ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ | یہ کہہ کہ آہ تیرا ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۴۹ |
| شعر | اک تنکا بھی نہیں رہا شرمندگی ہے جو | گر پڑ کے برق پاوے میرے آشیاں سے تئیں | ″ لاہور ص۳۰۴ |
| اصلاح | تنکا بھی اب رہا نہیں ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۰ |
| شعر | ہے امر سہل چاہت لیکن نباہ مشکل | پتھر کرے جگر کو تب کوئی کرے وفائیں | ″ لاہور ص۳۰۵ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ ″ ″ تب تو کرے وفائیں | ″ کلکتہ ص۱۵۲ |
| شعر | ایک عالم گیا جان سے لیک شوخ | نہ تجھ سے گئیں یہ دل آزاریاں | ″ لاہور ص۳۰۶ |
| اصلاح | گیا جان سے اک جہاں ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۱ |
| شعر | خط و زلف و کاکل کہاں تک کہوں | ہوئیں دام رہ صد گرفتاریاں | ″ لاہور ص۳۰۶ |
| اصلاح | خط و کاکل و زلف و انداز و ناز | ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۱ |
| شعر | صد تمنا سے یار رکھتے ہیں | تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں | ″ لاہور ص۳۰۷ |
| اصلاح | آرزوئیں ہزار ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۲ |
| شعر | نہ نگہ نے پیام نے وعدہ کیا | نالو کو ہم بھی یار رکھتے ہیں | ″ لاہور ص۳۰۷ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ | نام ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۲ |
| شعر | ہر دم نہ کھینچ تیغ کہ اک دن نہیں ہیں ہم | ظالم قباحتیں ہیں بہت امتحان میں | ″ لاہور ص۳۰۹ |
| اصلاح | کھینچا نہ کر تو تیغ کہ ″ ″ ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۲۷ |
| شعر | تجھے گر چشم عبرت میں ہے تو آندھی بگولے سے | تماشا کر غبار افشانی خاک عزیزاں کو | ″ لاہور ص۳۱۲ |
| اصلاح | تجھے گر چشم عبرت ہے تو ″ ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۴ |
| شعر | دل و اندوہ و بیتابی الم بے طاقتی حرماں | کہوں اے ہم نشیں کب تک غم ہائے فراواں کو | ″ لاہور ص۳۱۳ |
| اصلاح | غم و ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ ″ ″ تا چند غم ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۵ |
| شعر | صدائے آہ جی کے پار ہوئے تیر سی شاید | کسو بے درد نے کھینچا کسی کے دل سے پیکاں کو | ″ لاہور ص۳۱۴ |
| اصلاح | ″ ″ جیسے تیر جی کے پار ہوتی ہے | ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۵ |
| شعر | ہنستا ہی میں پھروں جو مرا کچھ ہو اختیار | پر کیا کروں میں گریۂ بے اختیار کو | ″ ص۳۱۵ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ ″ ″ دیدہ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۶ |
| شعر | خوش آوتی ہے تجھ بن گلگشت باغ کس کو | صحبت رکھے گلوں سے اتنا دماغ کس کو | ″ لاہور ص۳۱۵ |
| اصلاح | اچھی لگے ہے تجھ بن ″ ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۱۵۹ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | از خویش رفتہ ہر دم رہتے ہیں ہم جو تجھ بن | کہتے ہیں لوگ ہر دم اس وقت تم کہاں ہو | نسخہ لاہور ص ۳۱۷ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 اکثر 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۵۸ |
| شعر | صد چشم، داغ آہیں دل پر مرے ہیں وہ ہوں | دکھلاؤنے ہے لالہ تو اپنا داغ کس کو | 〃 لاہور ص ۳۱۷ |
| اصلاح | 〃 〃 داغ آہیں 〃 〃 〃 | دکھلا رہا ہے لالہ تو 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۵۹ |
| شعر | زخم تشبیہ تو دیتے ہیں یہ ناشاعر لیک | سیب کچھ اس ذقن آگے جو مزا رکھتا ہے | 〃 لاہور ص ۳۱۹ |
| اصلاح | اس سے تشبیہ 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۶۲ |
| شعر | دیکھتا ہوں دھوپ ہی میں جلنے ہی کے آثار کو | دور لے گئیں مجھے پر نہیں سایۂ دیوار کو | 〃 لاہور ص ۳۲۱ |
| اصلاح | دیکھتا ہوں دھوپ ہی میں جلنے کے آثار کو | لے گئی ہیں دور تڑ بیں 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۶۶ |
| شعر | دل خراشی و جگر چاکی و سینہ کاوی | اپنے ناخن میں ہیں سب اور ہنر مت پوچھ | 〃 لاہور ص ۳۲۲ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 | 〃 ناحق 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۶۸ |
| شعر | نہ ہو تند ناصح نپٹ ناتواں ہوں | کہاں بات اٹھانے کی طاقت ہے مجھ کو | 〃 لاہور ص ۳۲۳ |
| اصلاح | نہ کر شور ناصح بہت 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۷۲ |
| شعر | تھے اسباب مرنے کے سب تیرے غم میں | جیا کیوں کے اب تک میں حیرت ہے مجھ کو | 〃 لاہور ص ۳۲۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | جیا اب تلک کیونکہ 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۷۲ |
| شعر | بجا ہے گر فلک پہ فخر سے پھینکے کلاہ اپنی | کہے جو اس زمیں میں میر یک مصرع ہو برجستہ (حاشیہ) | 〃 لاہور ص ۳۲۸ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 یک مصراع برجستہ | 〃 کلکتہ ص ۱۷۱ |
| شعر | کرے ہے جس کو ملامت جہاں، وہ میں ہی ہوں | بلاکشیدہ جفا دیدہ اضطراب زدہ | 〃 لاہور ص ۳۳۰ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | اجل رسیدہ 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۷۴ |
| شعر | کس گنہ کا ہے پس اے مرگ یہ عذرِ جاں سوز | پائے ہر شمع ہے مجلس میں سر پروانہ | 〃 لاہور ص ۳۳۱ |
| اصلاح | | پانوں پہ شمع کے پاتے ہیں سر پروانہ | 〃 کلکتہ ص ۱۷۶ |
| شعر | شب کے خوں گرمی سے گریہ کی مری آنکھوں کی آہ | گوشۂ دامن میں میر آخر کو پرکالے پڑے | 〃 لاہور ص ۳۳۳ |
| اصلاح | گرم جوشی سے مرے گریہ کی شب 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۰ |
| شعر | آنسو تو تیرے دامن پونچھے ہے رونے میں بھی | ہم نے نہ رکھی مونہہ پر اے ابر آستیں بھی | 〃 لاہور ص ۱۳۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 پونچھے ہے وقتِ گریہ | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۲ |
| شعر | نکلتی ہے کوئی بات دشوار مونہہ سے | کبھی تو بھی تو سن کسی جاں بلب کی | 〃 لاہور ص ۱۳۴ |
| اصلاح | کوئی بات نکلے ہے 〃 〃 〃 | ٹک اک تو بھی سن 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۳ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | ترا ابرام[1] اس کی سادگی پر میر میں جانا | بھلا ایسا ہی ناداں ہے وہ عیاری کو کیا جانے | نسخہ لاہور ص ۳۳۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | بھلا 〃 جو ناداں ہو 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۴ |
| شعر | اس واسطے کانپوں ہوں کہ آہ بیٹھ سرد | یہ بادِ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے | 〃 لاہور ص ۳۳۷ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | یہ باد 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۵ |
| شعر | کہہ حدیث آونے کی اس کے جو کیا شادی مرگ | نامہ بر کیا چلی تھی ہم کو خبر کرنے کی | 〃 لاہور ص ۳۳۷ |
| اصلاح | 〃 〃 آنے 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۵ |
| شعر | جلایا طور کے تئیں جس تجلی جلوہ نے ہمدم | اُسی آتش کے پرکالے نے ہم سے بھی شرارت کی | 〃 لاہور ص ۳۳۸ |
| اصلاح | جلایا جس تجلی جلوہ گر نے طور کو ہمدم | 〃 〃 〃 〃 〃 | نسخہ کلکتہ ص ۱۹۸ |
| شعر | لڑتی ہے چشم شوخ اس کی جہاں | ایک آشوب وہاں سے اٹھتا ہے | 〃 لاہور ص ۳۳۹ |
| اصلاح | 〃 〃 اس کی چشم شوخ 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۷۶ |
| شعر | تلوار کا بھی مارنا حسد رکھے ہے ظالم | اتنا تو ہو کوئی گورِ غریباں میں درآوے | 〃 لاہور ص ۳۴۰ |
| اصلاح | 〃 〃 مارا خدا 〃 〃 〃 | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۱۹۷ |
| شعر | تری گلی کے ہر اک سگ نے استخواں توڑے | یہ مری لاش کی شب خوب پاسبانی کی | 〃 لاہور ص ۳۴۳ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | ہماری لاش 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۰ |
| شعر | ابھی اک عمر رونا ہے نہ کھوؤ اشک اے آنکھو! | کرو کچھ سوجھتا اپنا تو بہتر ہے کہ دنیا ہے | 〃 لاہور ص ۳۴۴ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 آنکھوں تم | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۲ |
| شعر | کہیں آشفتگاں سے کام دل ہوتا بھی ہے حاصل | تری زلفیں جو درہم ہیں میرا بھی کام برہم ہے | 〃 لاہور ص ۳۴۵ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 میر مقصد ہوئے ہے حاصل | جو زلفیں اس کی درہم ہیں 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۴ |
| شعر | لاتے نہیں نظر میں غلطانی کو گہر کی | ہم معتقد ہیں اپنے آنسو ہی کی ڈھلک کے | 〃 لاہور ص ۳۴۸ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 غلطانی گہر کو | 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۶ |
| شعر | طاقت نہیں ہے جی کو نے اب جگر رہا ہے | اور دل ستم رسیدہ ایک ظلم کر رہا ہے | 〃 لاہور ص ۳۴۹ |
| اصلاح | 〃 〃 جی میں 〃 〃 〃 | پھر 〃 〃 اک 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۷ |
| شعر | کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے تب کیا تھا شیخ | ہم حرم میں بھی ہمیشہ ترے داماد رہے | 〃 لاہور ص ۳۵۰ |
| اصلاح | 〃 〃 〃 〃 〃 〃 | 〃 〃 رہے تو تھے 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۹ |
| شعر | نہیں خرابات کی خرابی سہل | محتسب اک جہاں جاتا ہے | 〃 لاہور ص ۳۵۱ |
| اصلاح | کیا خرابی ہے میکدہ کی 〃 | 〃 〃 〃 〃 | 〃 کلکتہ ص ۲۰۸ |

| | | | |
|---|---|---|---|
| شعر | شب دیکھی ہے زلف اسکی اب صبح کرتے ہیں یار | اس خواب کی کیا دیکھئے تعبیر کریں گے | نسخہ لاہور ص۳۵۳ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ بحر دامِ اسیری | کیا یار اب اس خواب کی تعبیر کریں گے | ″ کلکتہ ص۲۲۴ |
| شعر | عرضِ وفا ہے میر عبث شوق دہر میں | یہاں ایسی جنسِ بد کا خریدار کون ہے | ″ لاہور ص۳۵۷ |
| اصلاح | بازارِ دہر میں ہے عبث میر عرضِ مہر | یاں ″ ″ کا تو ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۲۸ |
| شعر | خوفِ تنہائی نہیں کر تو جہاں سے تو سفر | ہر جگہ راہِ عدم میں ملیں گے یار گئی | ″ لاہور ص۳۵۸ |
| اصلاح | ″ ″ کر تو ″ ″ | ″ ″ ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۲۸ |
| شعر | ہوئی ہیں فکریں پریشاں اس زمانے میں | حواس خمسہ کرے جمع سو نظامی ہے | ″ لاہور ص۳۵۹ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ میر یاروں کی | ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۳۰ |
| شعر | بس اے سپہر سعی سے تیری تو روز و شب | غم ہے ستاوے ہم کو جلاونے کو عشق ہے | ″ لاہور ص۳۶۵ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ ″ | یہاں غم ستانے کو ہے جلانے ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۱۱ |
| شعر | میدانِ غم میں قتل ہوئی آرزو سے وصل | رہ گئی تھی خاندانِ تمنا میں ایک یہی | ″ لاہور ص۳۷۰ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ ″ ″ | تھی اپنے خانمانِ تمنا ″ اک ″ | ″ کلکتہ ص۱۸۴ |
| شعر | چھوڑے جاتے ہیں دل کو تیرے پاس | یہ ہمارا نشان ہے پیارے | ″ لاہور ص۳۷۲ |
| اصلاح | چھوڑ جاتے ″ ″ ″ ″ | ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۱۴ |
| شعر | اے شب ہجر راست کہہ تجھ کو | بات کوئی صبح کی بھی آتی ہے | ″ لاہور ص۳۷۳ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ | بات کچھ صبح کی بھی آتی ہے | ″ کلکتہ ص۲۱۸ |
| شعر | اب خدا مغفرت کرے اس کو | صبر مرحوم تھا عجب کوئی | ″ لاہور ص۳۷۴ |
| اصلاح | ہاں ″ ″ ″ | ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۱۹ |
| شعر | حال کہہ میں جو چپ رہا بولا | کس کا قصہ تھا کہے جابھی | ″ لاہور ص۳۷۸ |
| اصلاح | ″ ″ ″ | ″ ″ ہاں ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۲۲ |
| شعر | جس سے کھوئی تھی نیند میر نے کل | پھر شروع آج وہ کہانی کی | ″ لاہور ص۳۸۵ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ ″ | ابتدا ہے وہی ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۳۷ |
| شعر | تیرے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس | ہزار جان گئی طبع بدگماں میری | ″ لاہور ص۳۹۰ |
| اصلاح | ″ ″ ″ ″ ″ | ہزار جائے گی ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۴۱ |
| شعر | دلبر و دل سے چراوتا ہر دم | یوں کہیں اعتبار رہتا ہے | ″ لاہور ص۳۹۲ |
| اصلاح | دلبر و دل چراتے ہو ″ | ″ ″ ″ ″ | ″ کلکتہ ص۲۴۳ |

میرؔ کی اصلاحوں کے جو نمونے اوپر درج کئے گئے ہیں۔ ہم نے ان کو کلامِ میر کے دو نسخوں سے مرتب کیا ہے پہلا نسخہ جو ہمارے پیشِ نظر ہے وہ رسالہ نقوش کا "میر نمبر (۱)" ہے جسے ادارۂ فروغِ اردو لاہور نے ۱۹۸۰ء میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔ جواب "نسخۂ لاہور" کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نسخہ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری صاحب کے مرتبہ نسخۂ محمود آباد مخطوطہ ۱۲۰۳ھ پر مبنی ہے۔ دوسرا نسخہ جس سے ہم نے استفادہ کیا ہے وہ کلیاتِ میر کا وہ نسخہ ہے جو ۱۲۲۶ھ میں پہلی مرتبہ کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ ہم نے جو شعر نسخۂ لاہور سے منتخب کیا ہے اُسی شعر کی تبدیل شدہ صورت نسخۂ کلکتہ سے لے کر پہلے منتخبہ شعر کے نیچے لکھ دی ہے۔ تاکہ میرؔ نے جو اصلاح یا ترمیم کی ہے۔ فوراً سمجھ میں آجائے۔ جو شعر نسخۂ لاہور یا نسخۂ کلکتہ سے لیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ صفحہ بھی لکھ دیا ہے تاکہ تلاش کرنے میں دقت پیش نہ آئے۔ مضمون کیونکہ بہت طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے طوالت کے خوف سے ہم وجہِ اصلاح نہ لکھ سکے۔ وہ پھر کبھی سہی!

---

# میر کی فارسی سخن گوئی

## برصغیر کے تہذیبی پس منظر میں

مظفر علی سیّد

ریختہ کے فن میں کوئی ایسا صاحبِ کمال، ہندوستان کی خاک سے نمودار نہیں ہُوا۔ فلکِ پیر سالہا سال چکر کاٹتا رہے تب کہیں ایک ایسے شخص کو معرضِ عمل میں لے کر آتا ہے۔ اُردو شاعری کو اس نے، دوسرے ریختہ کہنے والوں کے مقابلے میں، ایسی پاکیزگی اور نفاست عطا کی ہے کہ فارسی کہنے والوں کے دلوں میں' اس کے ریختہ کا رُتبہ دیکھ کر، رشک سے خون بھر آیا بلکہ اکثر موزوں طبع لوگوں نے جب سے اس کا ریختہ سُنا ہے اور اس زبان کے مزے سے' اس کے کلام کے ذریعے، آشنا ہوئے ہیں، تو انھوں نے فارسی گوئی کو بالائے طاق رکھ کر ریختہ کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دی ہے۔ فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے عہد میں، پایۂ تخت کے بیشتر ارکانِ سلطنت اَور وہ لوگ جو شعر و سخن سے مناسبت رکھتے تھے، دوسروں سے کہیں زیادہ، اس کی عزت و توقیر کیا کرتے تھے۔ اور اب کہ اس ویرانے میں کوئی باقی نہیں رہا اور زمانہ قدر دانوں سے بالکل خالی ہوگیا ہے، تو اس نے عیال داری کے باوجود توکل اختیار کر رکھا ہے اور (لکھنؤ کے) اِن نَو دولتوں کے سامنے بے نیازی کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ابنائے زمانہ میں سے وہ کسی کو اپنا صحیح مخاطب نہیں سمجھتا اور ہر اَیرے غیرے سے بات نہیں کرتا۔ اِسی بنا پر یار لوگوں نے اُسے کج خلق، بر خود غلط اور انصاف دشمن مشہور کر رکھا ہے۔ اس کی سخن وری کا شہرہ، ہندوستان میں ہر طرف چھایا ہوا ہے اور ریختہ میں اس کی شاعری ہر چھوٹے بڑے کی نوکِ زبان پر ہے۔ آنے جانے والے اس کا کلام ایک سے دوسرے دیس میں بطور سوغات کے لے کر جاتے ہیں۔ چونکہ ریختہ کے فن میں' اسے شروع ہی سے ناموری حاصل ہو چکی تھی، اس لیے اپنی فارسی شاعری پر اسے اتنا فخر نہیں، اگرچہ اس کا فارسی کلام ریختہ سے کم رتبہ نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ (زندگی میں ایک مرتبہ) دو برس تک ریختہ کا شغل موقوف کر رکھا تھا تو اس زمانے میں قریباً دو ہزار فارسی اشعار پر مشتمل ایک دیوان تیار ہو گیا تھا۔

(مصحفی کے تذکرۂ "عقدِ ثریا" سے ترجمہ)

میر کی فارسی سخن گوئی، چاہے ہم اس کا کوئی بھی مرتبہ معین کریں، اُردو شاعری میں میر کے مقام، اپنے دور میں اس کی مقبولیت (اور اس کے علاوہ اب تک اس کے تسلسل و تواتر سے الگ ہو کر نہیں دیکھی جا سکتی۔ اس لیے کہ میر کی اردو شاعری پچھلے دو سو برس کے عرصے میں بار بار پڑھی گئی ہے اور ہر دور نے اس پر استصواب کیا ہے جبکہ اس کا فارسی دیوان جس کے دنیا بھر میں چار پانچ ہی قلمی نسخے موجود ہوں گے، اب کہیں جا کر طبع ہو رہا ہے اور وہ بھی ایک ایسے زمانے میں جب فارسی کا مطالعہ اور اس کا مذاقِ سخن پرانے دفتروں کی داستان بن چکے ہیں۔ پھر بھی ہم مصحفی جیسے آدمی کی رائے کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس نے دوسرے کمالات کے ساتھ اپنے معاصر فارسی گو شعرائے ہند و ایران کا ایک عمدہ تذکرہ مرتب کیا تھا اور جو خود بھی نہ صرف یہ کہ فارسی زبان کا ایک اہم شاعر تھا (اگرچہ اس کے تینوں فارسی دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہیں) بلکہ جب برصغیر کے فارسی ادب کو بارھویں صدی ہجری میں ایک مرتبہ مرنے کے بعد لکھنؤ میں حیاتِ نو نصیب ہوئی تو اس کے مسیحاؤں میں مرزا قتیل کے بعد اُسی کا نام سب سے پہلے زبان پر آتا ہے۔

بے شک یہ بات ناقابلِ تسلیم ہے کہ میر کی فارسی میر کے ریختہ کی ہم رُتبہ ہو سکتی ہے، اِن معنوں میں کہ اُردو شاعری میں میر کا جو مرتبہ ہے وہ تو فارسی میں حافظ کے سوا کسی کو حاصل نہیں جو ایران میں بھی ایک ہی ہوا ہے۔ مگر مصحفی کی بات کا یہی ایک مفہوم کیوں لیا جائے جو ممکن ہی نہ ہو اور جو کوئی بھی تسلیم نہ کر سکتا ہو؟ یہ تو ایسے ہوگا جیسے شعر العجم کی پانچویں جلد میں (جس کسی نے وہ لکھی ہے) فارسی کے ایک چھوٹے سے (اگرچہ نفیس) شاعر وآلی دشت بیاضی کو اپنی طرزِ ادا اور سوز و گداز کی بنا پر، فارسی زبان کا میر تقی میر قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی شاعر نہ صرف اپنی زبان میں بلکہ پوری انسانیت کی تاریخ میں کسی اور شاعر کے مماثل نہیں ہو سکتا مگر پوری مماثلت نہ سہی، ایک نہ ایک لحاظ سے تقابل اور مشابہت کا امکان تو پھر بھی قائم رہتا ہے۔ یہ بھی اگر کوئی کہے کہ دنیا کا کوئی بھی شاعر ایک سے زیادہ زبانوں میں برابر کا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ غالب اور اقبال بھی نہیں تو اس کا بھی یہ مفہوم نہیں کہ ایک سے زیادہ زبانوں میں شاعری کرنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے کہ ملٹن کی لاطینی نظموں، شیخ سعدیؒ کے عربی قصید سے اور ہمارے زمانے میں فیض صاحب کے پنجابی کلام کو ''نوادرات'' میں شمار کرنا چاہیے مگر یہ بات ہر اُس شاعر کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی جس نے دو زبانوں میں شاعری کی ہو، خصوصاً ایک ایسی تہذیبی صورت حال میں جیسی کہ صدیوں تک برصغیر میں رہی ہے۔ یہاں بھی شاعروں کا عمل اور ردِ عمل ایک ہی قسم کا نہیں رہا۔ فیضی سے لے کر گرامی تک صرف فارسی میں شعر کہنے والے بھی اس سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔ بیدل اور خان آرزو سے جو بہت تھوڑے سے اردو اشعار منسوب ہیں وہ شاید تبرکاً کہے گئے ہوں گے۔ پھر ذوق اور آتش ایسے شاعر بہت ہیں جنہوں نے فارسی جاننے کے باوجود صرف اردو کی طرف توجہ کی ہے۔ اسی قسم کی صورتحال علاقائی زبانوں کے شعرا میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

بہرحال اب میر کا فارسی دیوان ہمارے سامنے ہے تو ہمیں طے کرنا ہو گا کہ انھیں آخر دو برس تک اردو کو چھوڑ کر صرف فارسی میں شعر کہنے کی کیا ضرورت پڑی؟ اور یہ ضرورت خارجی تھی یا داخلی یا دونوں قسم کی؟ اور انہوں نے اس سے پہلے اور اس کے بعد کیا واقعی فارسی کو ہاتھ نہیں لگایا؟ اور اب ہم انھیں غالب اور اقبال کی طرح دونوں زبانوں کا اہم شاعر سمجھیں یا ان کے

فارسی کلام کو بس اتنی اہمیت دیں جتنی کہ سودا اور انشا اور حالی کے فارسی کلام کو دی جاتی ہے یا اقبال کے معاصرین میں فانی اور جگر کی فارسی کو۔ اس سے آگے چلیں تو کیا ان کو یگانہ کی طرح اردو زبان کا ایک ایسا زبردست شاعر کہا جائے جس نے فارسی میں بھی دو ایک اچھی غزلیں کہہ رکھی ہیں یا ان کو خواجہ میر درد کی طرح فارسی کا بس ایک صاحب دیوان شاعر کہہ دیا جائے اور اردو کلام کے ضمن میں فارسی کے چند ایک اشعار کو بھی تھوڑی سی داد دی جائے؟

غرض مسئلہ یہ ہے کہ ہم میر کے فارسی دیوان کو سنجیدہ توجہ کا مستحق سمجھتے ہیں یا محض ان کا تبرک۔ شروع میں مصحفی کی جو تہائی تحسین نقل ہوئی ہے اس کے پہلو بہ پہلو مولوی عبدالباری آسی کی رائے کو رکھا جائے تو اس سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مولوی صاحب کا ارشاد ہے:

> "میں نے (میر کا) مکمل (فارسی) دیوان قلمی دو مرتبہ دیکھا۔ ... مولوی سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانہ کا موجودہ نسخہ بھی نگاہ سے گزرا ..... میر صاحب کی فارسی نثر نہایت بہتر ہے اگرچہ مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے فارسی کے بعض محاورات میں ان سے لغزشیں ہوئی ہیں مگر اس کے باوجود بھی ان کی طرز خاص، روانی اور شگفتگی عبارت داد کے قابل ضرور ہے اور کیا تعجب ہے اگر فارسی دیوان میں بھی وہی دلکشی، وہی خاص ترکیبیں اور محاورات، وہی سوز و گداز وہی میر کی ریختہ گوئی کا انداز موجود ہو۔ اسی وجہ سے نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہہ دینا چاہیے کہ وہ اگرچہ میر کے انداز ریختہ گوئی سے کچھ گرا ہوا ہے لیکن دیکھنے والے کے لیے جاذب توجہ ضرور ثابت ہوتا ہے اور اسی لئے اگرچہ میر صاحب کو ہندوستان کے بعض مشاق فارسی گویوں کی صف اعلیٰ میں جگہ نہیں دی جا سکتی پھر بھی وہ قابل ذکر ضرور رہیں۔ گو میر صاحب فارسی کو قابل اعتنا نہ جانتے تھے اور جانتے کیونکہ شاعری جذبات قلبیہ کے ہیجان کا نتیجہ ہے مگر جب شعر صرف تفنن طبع کی نیت سے کہا جائے تو پھر اس کا کوئی خاص درجہ نہیں رہتا۔ میر صاحب نے بھی یہ دیوان خانہ پری کے لئے کہا تھا۔"

اس کے بعد انہوں نے مصحفی کی رائے سے اتنا اقتباس دیا ہے کہ میر صاحب کو "فارسی شاعر ہونے کا دعویٰ نہیں مگر ان کی فارسی بھی ریختہ سے کم نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک سال (مصحفی: دو سال) میں نے ریختہ گوئی موقوف کر رکھی تھی تو اس حال میں دو ہزار اشعار کہہ کر مدون کر لئے۔"

پھر بھی ان کا خیال ہے کہ مصحفی کی رائے ان کی "سراسر تائید کرتی ہے۔" اب جیسا کہ ہر کوئی دیکھ سکتا ہے مصحفی نے نہ تو میر پر "تفنن طبع" کے لیے فارسی گوئی کا الزام لگایا ہے اور نہ ان کے دیوان کو "خانہ پری" قرار دیا ہے بلکہ میر کی فارسی کو ریختہ سے کم نہ کہنے کا یہ مفہوم بھی نہیں ہو سکتا کہ ان کے فارسی کلام کو ہندوستان کے مسلّم الثبوت صف اوّل کے فارسی گو شعرا کے ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ مولوی صاحب نے بعض جگہ قیاس سے کام لیتے ہوئے کہا ہے کہ کیا تعجب ہے یوں ہو مگر اگلے ہی سانس میں اس کو

یک قلم "خانہ پری" قرار دے دیا ہے۔ پھر بھی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ "جو اصل حقیقت اور قدر و قیمت ہے وہ میر صاحب کے اشعار سے معلوم کرنا چاہیے"۔

اس کے بعد ۵۰ ایک صفحوں کا انتخاب ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ تمام اشعار الف کی پٹی یعنی دیوان کے ابتدائی چند صفحات سے لئے گئے ہیں حالانکہ جب کسی بھی قدیم شاعر کا فارسی دیوان دیکھنا ہو تو الف (اور 'ی') کی پٹی کے علاوہ 'ت' 'د'، 'میم' اور 'ش' کی پٹیوں کو بھی کم سے کم جھانک کے ضرور دیکھ لینا بہتر ہوتا ہے کہ فارسی دیوانوں کا بیشتر حصہ انہی پر مشتمل ہوتا ہے مثلاً میر کے یہاں الف کی پٹی میں ۲۷ پوری غزلیں، ت کی پٹی میں ۴۰ سے زیادہ، دال میں ۸۰، شین میں دس گیارہ، میم میں ۴۴ اور 'ی' کی پٹی میں ۲۵ ایک غزلیں موجود ہیں اور ایک ایک، دو دو، تین تین اشعار کی نا تمام غزلیں ان کے علاوہ۔ صاف ظاہر ہے کہ میر کی قدر و قیمت کو خود ان کے اشعار سے معلوم کرنے کی کوشش کہاں تک کی گئی ہے۔

اس سے بھی زیادہ ستم کی بات یہ ہے کہ سرکاری مطبوعات میں سے برصغیر کے فارسی شعرا کا جو انتخاب "ارمغان پاک" کے نام سے چھاپا گیا ہے اس میں آسی کے مختصر اور غیر نمائندہ انتخاب سے ہی دو شعر لے کر میر صاحب کو ٹرخا دیا گیا ہے اور ۱۴ جلدی "تاریخ ادبیات پاکستان" میں فارسی ادب سے تعلق رکھنے والی جو دو جلدیں ہیں، ان میں میر صاحب کو اس سے زیادہ اہمیت نہیں دی گئی کہ ان کے بارے میں ایک سطر لکھی ہے اور کسی تذکرے سے ان کا بس ایک ہی شعر نقل کیا گیا ہے۔ یہ انتخاب در انتخاب کچھ تو اس وجہ سے ہوا کہ اصل دیوان فارسی ہمارے یہاں کسی کی دسترس میں نہیں تھا۔ اور جو شعر کہیں سے ملے ان میں سے ایک دو نمونے کے لئے رکھ لئے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ آپ نے میر صاحب کو تو دیکھا ہی نہیں۔ ایک چیز البتہ ان سب میں مشترک ہے۔ آسی صاحب تک محض برائے نام قسم کا انتخاب (چاہے الف کی پٹی سے ہی سہی) دے کے رہ جاتے ہیں اور کلام کی خصوصیات پر کوئی بحث نہیں کرتے۔ تھوڑا یا زیادہ انتخاب اپنی جگہ مگر یہ بھی تو کہیے کہ وہ کیا چیز ہے جو "جاذب توجہ" ہے اور یہ تو ضرور بتایئے کہ "کیا تعجب ہے" والے "تحیر اور دلکشی، سوز و گداز، تراکیب و محاورات" والی توقعات کا کیا بنا؟ کیا دیوان فارسی کا مکرر سہ کرر مطالعہ ان کا متحمل نہیں ہو سکا یا اس کلام ہی میں کوئی ایسی بات تھی جو قابو میں نہ آ سکی؟

میر با ما آشنائی مشکل است
در نزاکت چوں مزاجِ دلبریم

(۲)

سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعر میر ہے سحر
زبانِ خلق کو کس طرح کوئی بند کرے

میر صاحب بھلے کو اپنی فارسی شاعری پر فخر نہ کرتے ہوں (آخر ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ غالب بھی تو اردو کلام کو اپنے لئے "ننگ" سمجھتے تھے تو کیا ان کی یہ خود رائی بھی تسلیم کر لینی چاہیے؟) مگر اس کے شواہد موجود ہیں کہ جب کبھی وہ کسی عزیز یا نوجوان پر مہربان ہوئے ہیں تو انہوں نے اردو کے چند ایک دیوان عطا کرنے کے ساتھ اپنا فارسی دیوان بھی ضرور پڑھنے کو دیا ہے اور

جس کسی نے اپنے "تذکرہ شعرائے اردو" میں ان کا حال لکھا ہے تو فارسی کا ذکر ضرور کیا ہے مصحفی نے اپنے فارسی شعرا کے تذکرے میں جو کچھ میر کے بارے میں لکھا وہ اوپر نقل ہو چکا ہے مگر "تذکرۂ ہندی گویاں" میں انھوں نے یہ کہہ کر کہ "فارسی میں صاحب دیوان ہیں مگر فارسی گو شعرا میں شمار نہیں ہوتے" ذرا سا مغالطہ پیدا کر دیا ہے۔ کیوں شمار نہیں ہوتے؟ اس لئے کہ اس وقت اردو اور فارسی پر توجہ مرکوز کرنے والے الگ الگ گروہوں میں بٹ چکے تھے۔ ایک طرف شمس الدین فقیر، واقف بٹالوی، قمرالدین منت اور پھر مرزا قتیل ایسے لوگ تھے جو بیدل، غنی اور ناصر علی کے بعد بھی فارسی میں اختصاصی کمال حاصل کرنے پر مُصر تھے (اسی گروہ میں سراج الدین علی خان آرزو اور مرزا مظہر کو بھی شامل سمجھنا چاہیے جو اگرچہ نوجوان اردو شعرا کی سرپرستی فرماتے تھے اور تھوڑی بہت ریختہ گوئی بطورِ تبرک میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے مگر اس نئے تجربے پر اپنا تن من دھن داؤں پر لگانے کو تیار نہیں تھے یا پھر یوں کہہ لیجے کہ وہ فارسی کی ہوا کو گرتے ہوئے تو دیکھ رہے تھے مگر اپنی عادت سے مجبور تھے)۔ دوسری طرف میر و سودا، یقین، تاباں درد اور میر حسن، قائم اور مصحفی، جرأت و انشا اور پھر ناسخ و آتش تھے جن کے ہاتھوں اردو شاعری کو وہ رتبہ نصیب ہوا جو کبھی فارسی کو حاصل تھا۔ اس کے باوجود کہ ان میں سے اکثر کو فارسی میں فاضلانہ تحصیل کا موقع ملا تھا اور چند ایک تو (میر کے علاوہ، درد اور مصحفی) فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے مگر اردو شاعری کی دیوی نے ان کو اپنی پرستش میں زیادہ مصروف رکھا۔

یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ اُس وقت حافظ محمود شیرانی کے الفاظ میں، بارھویں صدی (ہجری) کی لسانی تحریک (یعنی فارسی کو چھوڑ کر اردو میں لکھنے کی اجتماعی ضرورت) اپنے عروج پر تھی۔ اس سے پہلے برصغیر کے مشہور صوفی بزرگ شیخ سعد اللہ گلشن جو خود فارسی میں شعر کہتے تھے اور بیدل کے شاگرد تھے۔ ولی کو یہ نصیحت کر چکے تھے کہ یہ سب مضامین جو فارسی میں بیکار پڑے ہیں انھیں کام میں لاؤ، کون تم سے محاسبہ کرے گا؟ (اور ولی کے بارے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ ناصر علی سرہندی کو طنز و تعریض کا نشانہ بناتا تھا جسے فارسی میں "آبروئے ہندوستان" کہا جاتا تھا اور جو پورے ایران کو للکارتا تھا کہ میری غزل کا جواب پیش کرو حالانکہ اس فخر و مباہات کے باوجود، بقولِ خانِ آرزو، اس کی فارسی زبان دانی، تغافل اور تساہل کا نمونہ پیش کرتی تھی)۔ بہرحال یہ لسانی تحریک یا جو کچھ بھی اسے کہیے، بقول میر "زبان اردوئے معلائے بادشاہ ہندوستان" (یعنی شاہجہانی لشکر کی زبان) کے استعمال پر اصرار کرتی تھی، جس کا مفہوم محض لسانی نہیں ہو سکتا۔ مغل بادشاہوں میں سب سے پہلے شاہجہان نے (جیسا کہ قندھار کی مہم سے واضح ہوتا ہے) ایران سے سیاسی علیحدگی بلکہ فوجی تصادم کا آغاز کیا تھا اور تب سے لیکر دہلی میں نادر گردی اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کی متعدد مہمات کے دَور تک، ایک ایسی سماجی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی جس کے تحت دونوں ملکوں کے درمیان کسی مضبوط تہذیبی تعاون یا کم از کم پُرامن مسابقت کا امکان بھی بہت کم ہو گیا تھا۔

اس کے باوجود، علیحدگی کے اس رجحان کے ساتھ ساتھ، یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ ریختہ، اپنی زبان میں اس شاعری کا نام ہے جو فارسی کی طرز پر ہو۔ یعنی جہاں تک تخلیقی معیار کا تعلق ہے تو وہ محض بیکار پڑے ہوئے مضامین کو اپنی زبان میں منتقل کرنے سے

پوری نہیں ہو سکتی، نہ دکن کے پرانے شاعروں کے انداز پر مقامی رنگ پیدا کر کے (یہاں سے بقول میر، ایک بھی "شاعر مربوط" نمودار نہیں ہوا تھا)، اور نہ اس دور میں برج بھاشا کی کوتاہ کی نقل میں کی جانے والی ایہام گوئی کے ذریعے۔ اگرچہ یہ سب چیزیں تھوڑی بہت میر و سودا اور درد کے یہاں بھی موجود ہیں (یعنی وہ بھی کسی فارسی شعر کا مضمون اڑا لیتے ہیں، یا اپنے کلام میں مقامی عناصر لانے کی کوشش کرتے ہیں یا لفظوں سے کھیلنے لگ جاتے ہیں)، مگر اردو زبان کے ان کلاسیکی اساتذہ کے یہاں جو چیز مشترک ہے وہ اپنی واردات قلب اور اجتماعی صورت حال کا ایک ایسا ابلاغ ہے جو فارسی شاعری کے تہذیبی اور فنی معیاروں کے لحاظ سے کسی طرح فروتر نہ ہو — یعنی میر کے لفظوں میں ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا۔

سیاسی اور لسانی علیحدگی کے ساتھ ساتھ، فکر و نظر کا تسلسل — یہ اجتماعی جدلیات کے متقابل پہلو ہیں جن کا باہمی توازن کوئی آسان کام نہیں۔ میر کی اردو شاعری کو دیکھیے تو جہاں اس میں زبان کی سہولت اور طبیعت کی روانی نظر آتی ہے، وہاں اس چیز پر بھی اصرار ہے جسے میر صاحب کبھی صناعی اور کبھی تہ داری کا نام دیتے ہیں۔

گویا بارھویں صدی کی تحریک کو حقیقی عروج اس وقت حاصل ہوا جب ہمارے تخلیقی فن کار، جمالیاتی اعتماد اور عزت نفس کے اس مقام تک پہنچے جہاں انسان محض علیحدگی پسندی یا تصادم کی بجائے متحارب قوتوں کے درمیان توازن اور توافق پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دکنی دور میں ذہن و احساس کا یہ رابطہ یعنی تخلیقی قوت اور تنقیدی صلاحیت کا یہ اتحاد شاید چند ایک اشعار میں، ایک آدھ غزل میں یا کسی مثنوی کے دو مناظر میں جھلکتا ہو مگر کسی ایک خلاق شخصیت کے پورے ادبی کمال کی صورت میں یہ کیفیت تو ولی اور سراج کے یہاں بھی کہیں کہیں ملتی ہے جبکہ میر، سودا اور درد اپنے اپنے انداز میں دراِیک دوسرے کی شرکت کے ساتھ اس مقام کے عروج تک پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ولی اور سراج سے قطع نظر، اس مرتبے کو تو میر و سودا کے ادبی پیشوا خان آرزو بھی نہیں پہنچتے حالانکہ علم و فضل کی حد تک وہ ایک بے مثال شخصیت تھے۔ پھر بھی سودا کو جو نصیحت انہوں نے کی ہے، اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کتنی دور تک دیکھ سکتے تھے۔ سودا سے انہوں نے کہا تھا:

> "کلام فارسی کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور ہماری تمہاری زبان ہندی ہے۔ لہذا ہندوستان کے لوگ فارسی کی تحصیل میں ہزار بلندیاں حاصل کر لیں مگر استادانِ سلف اور (شاعرانِ) ایران زمین کے سامنے جن کی یہ زبان ہے، زیادہ سے زیادہ سورج کو چراغ دکھا سکتے ہیں۔ جبکہ ریختہ گوئی میں اب تک کسی نے شہرت نہیں پائی چنانچہ اپنی زبان میں مشق کرو تو شاید فطرت کے فیضان سے اس دیار میں درجۂ امتیاز حاصل کر لو۔"
>
> (ترجمہ از "نشترِ عشق" عاشقی بحوالہ حواشی دستور الفصاحت)
>
> مرتبہ مولوی امتیاز علی عرشی مرحوم

خانِ آرزو کا احترام سدِ راہ نہ ہو تو آج کے اردو شعرا کو یہ نصیحت کی جا سکتی ہے کہ "ستارۂ امتیاز" کی تمنا ہو تو اردو کو چھوڑ کر علاقائی زبانوں میں مشق کرنے سے یہ موقع زیادہ آسانی سے مل سکتا ہے۔ احترام کے باوجود کم سے کم اتنا تو ماننا ہی پڑے گا کہ نئے

مستقبل کی اس نشان دہی میں کوئی نہ کوئی پہلو، اپنے تجربات سے مایوسی کا اور ہزیمت خوردگی کا ایک شائبہ سا ضرور موجود ہے جو مثلاً امیر خسرو سے لے کر فیضی بلکہ بیدل تک کی فارسی شاعری میں، یا فارسی گوئی کے بارے میں ان کے رویّے سے معلوم نہیں ہوتا۔ بیدل پر بات کرتے ہوئے ان کے انداز میں جو ایک قسم کی جارحیت ہے شاید وہ اسی احساسِ شکست کا دوسرا رُخ ہو:

"چونکہ اس نے قدرت بیان کی بنا پر فارسی میں نمایاں تصرفات کئے ہیں تو ولایت (یعنی فارسی بولنے والے علاقے) کے لوگ اور ان کے کاسہ لیس جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، اس بزرگوار کے کلام پر باتیں بناتے ہیں جبکہ فقیر کو ہندوستان کے صاحبان قدرت کے تصرف کی صحت پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ میں تو اس بات کا قائل ہوں (ملاحظہ ہو میرا رسالہ "دادِ سخن") اگرچہ احتیاط کی بنا پر میں خود (اپنے کلام میں) تصرف سے کام نہیں لیتا۔"

(ترجمہ از مجمع النفائس مطبوعہ خدا بخش لائبریری جرنل شمارہ ۳ ۱۹۷۷ء)

تصرف سے مراد اگر زبان کا تخلیقی اور اجتہادی استعمال ہے تو یقیناً آرزو کا اس پہ اصرار درست ہے بشرطیکہ فنی اجتہاد کی شرائط جو دینی اجتہاد کی طرح علم کے عصری اطلاق سے عبارت ہیں) پوری ہوتی ہوں اگرچہ یہ بات پھر بھی کھٹکتی ہے کہ خان آرزو، اپنے تمام علم و فضل کے باوجود، خود کیوں اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ جب وہ بھی بیدل کے ایک آدھ شعر میں "دخل" اور اصلاح سے کام لیتے نظر آتے ہیں تو ہمیں سوچنا پڑتا ہے کہ "اہلِ ولایت" اور ان کے ہندوستانی "کاسہ لیس" بیدل کے اجتہادی "تصرفات" پر جو اعتراض کرتے ہیں تو کہیں ان کا "تعصب" اور قدامت پسندی کسی حد تک درست تو نہیں؟ (جبکہ ناصر علی کے سلسلے میں خانِ آرزو کو بھی معذرت کی ضرورت محسوس ہوتی ہو)

محمد حسین آزاد کے نزدیک ناصر علی "نازک خیالی اور معنی یابی میں بے عدیل تھا مگر مشکل یہ ہے کہ خیال کرتے کرتے ایسا خیال میں غرق ہوا ہے کہ بعض جگہ بالکل شیخ خیالی ہو گیا ہے اور اکثر معنی کی تلاش میں ایسا ڈوبا ہے کہ بے معنی ہو گیا ہے۔ بزرگوں سے آزاد نے یہ بھی سنا تھا کہ "فخر شعرائے ایران زمین" شیخ محمد علی حزیں کہا کرتے تھے کہ "ناصر علی کے اشعار اور بیدل کی نثر ذرا بھی میری سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر کبھی ایران جانا نصیب ہوا تو دوستوں کی تفریح طبع کے لیے اس سے بہتر کوئی سوغات نہ ہوگی۔"

یہی شیخ علی حزیں جب بقول مرزا علی لطف کے "شاہجہان آباد میں تشریف لائے تو اس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں نے جس قدر اخلاق کہ مناسب ان کے حال کے پایا، شیخ نے ادا فرمایا لیکن اس بزرگزادے نے (یعنی خان آرزو نے) نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی اور ناحق اپنی طبیعت اس سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھہرائے۔" (گلشنِ ہند) اس وقت خان آرزو اپنے شاگردِ خاص رائے رایاں آنند رام مخلص کے اثر و رسوخ کے باعث شاہی منصب، جاگیر اور خطاب ملک الشعرائی سے بہرہ ور ہو چکے تھے، یقیناً نو وارد شیخ سے جن کی نازک مزاجی خود آرزو کے الفاظ میں "کمر خوباں سے خراج طلب" تھی، خان موصوف کی تعظیم میں کوتاہی ہوئی ہوگی اور ان کے علمی و ادبی مقام سے بھی کما حقہٗ آگاہی نہ ہوگی۔ پھر بھی "تنبیہ الغافلین در اعتراضات بر اشعار حزیں" کو محض ایک ذاتی پرخاش کی پیداوار سمجھنے کی بجائے نقد ادب

کے ایک نمونے کے طور پر دیکھنا بہتر ہوگا۔ چونکہ اس کتاب کا ایک اچھا خاصا حصہ، والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ" ریاض الشعراً" میں شامل کر کے اسی زمانے میں ایران بھجوا دیا تھا اس کے بارے میں ایرانی ادیبوں کا ردعمل بھی، جو عموماً آرزو کے حق میں ہے، ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے اپنے دور کے ایک اہم ایرانی شاعر اور ناقد ڈاکٹر شفیعی کدکنی (م۔ سرشک) نے اسے فارسی زبان میں نقد ادب کے بہترین نمونوں میں سے قرار دیا ہے اور آرزو کے بعض اعتراضات کو حق بجانب تسلیم کیا ہے۔ بقول آرزو، ایک ایرانی شاعر پر ایک ہندوستانی کے اعتراضات کی کیا اہمیت ہوتی مگر اس دور میں بھی والہ داغستانی اور قزلباش خاں امید ایسے "منصف مزاج" اور "بے تعصب" ایرانیوں نے آرزو کی تنقید کو بے دلیل نہیں سمجھا۔ اگرچہ خان آرزو کے اس دعوے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ کسی مغل یا ہندوستانی سے اس کا جواب بن نہ پڑا (آزاد بلگرامی نے اسی دور میں اور مولوی امام بخش صہبائی نے بعد میں آرزو کے کئی ایک اعتراضات پر حزیں کے حق میں فیصلہ دیا ہے) مگر خود والہ داغستانی کو جو خانِ آرزو کا مداح اور ان کے ممدوح اور ہم پیشہ معلم ادب شمس الدین فقیر کا شاگرد ہے، آرزو کے یہاں "ستم ظریفی" بھی نظر آتی ہے اور وہ جائز اعتراضات کے باوجود سمجھتا ہے کہ "در حقیقت آج روئے زمین پر اس شیخ ایسا کوئی سخندان وجود نہیں رکھتا۔"

ہمارے اپنے مصحفی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ آرزو کے اعتراضات محض ایک ظاہری شورش تھے ورنہ شیخ کے مرتبے کو وہ بھی خوب پہچانتے تھے۔ "تنبیہ الغافلین" کے آغاز میں آرزو نے شیخ کی نسبت یہ الفاظ استعمال کئے ہیں: "بقیۃ السلف، حجۃ الخلف، نخبہ متقدمین و خاتم متاخرین"۔ بہرحال آرزو نے کلام حزیں پر اس قسم کے اعتراضات وارد کئے ہیں: تکرار مطالب، حشو و زوائد کا استعمال، بے محاورگی، بے ربطی، تصرفات (جو بیدل کیلئے تو جائز تھے مگر حزیں کے لئے نہیں) مہمل نویسی وغیرہ۔ بعد میں اسی قسم کے اعتراضات بہت سے ایرانی علما و ادبا نے برصغیر کے اکثر فارسی شعرا پر (ماسوا مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے) بلکہ ان ایرانی شعرا پر بھی جو یہاں مقیم ہو گئے تھے، وارد کئے ہیں، یہاں تک کہ فارسی کے ایک خاص انداز تحریر کا نام ہی "سبکِ ہندی" رکھ دیا گیا جسے جملہ اعتراضات کا خلاصہ کہنا چاہیے (اگرچہ بعد میں جب معلوم ہوا کہ اس قسم کا اندازِ تحریر پہلے سے ایران میں شروع ہو چکا تھا تو پھر اسے "سبک اصفہانی" قرار دے کر اس کی بعض خوبیوں کی دریافت بھی شروع ہو گئی) ملک الشعرا بہار کی مشہور کتاب "سبک شناسی" میں جو بالعموم نثری اسالیب سے بحث کرتی ہے (مگر بیچ میں کہیں کہیں شاعری کا حوالہ بھی آجاتا ہے) برصغیر کے فارسی لکھنے والوں پر یہ عمومی تبصرہ کیا گیا ہے:

> "ہندوستان کے علما فضلا، ایران کے منشیوں اور ادیبوں کی نسبت، اپنے علم و فضل کی بہت نمائش کرتے رہے ہیں۔ ان خطوط اور اعلان ناموں سے جن میں ہندوستان کے اشخاص نے ایرانی اشخاص کو مخاطب کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صاحبانِ تحریر کے یہاں اپنی فضیلت کا اظہار زیادہ ہے اور مطلب کی بات بہت کم۔ اور یہ بھی تو اپنا مطلب کاغذ پر منتقل کرنے کی بجائے لگتا ہے جیسے در و دیوار سے باتیں ہو رہی ہوں۔ وہ ایسے الفاظ ڈھونڈ کے لاتا ہے جو اس کے علم و فضل کو نمایاں کر کے دکھائیں نہ کہ وہ الفاظ جو اس کے نفسِ مطلب کے لئے مناسب ہوں یہی صورت ہندوستان کی (فارسی) شاعری میں نظر آتی ہے اور ایک صائب کو چھوڑ کر جو واقعیت کو موضوع سخن بناتا ہے، باقی شعرا خصوصاً بیدل اور غنی قسم کے

متاخرین ایسی عبارت آرائی کرتے ہیں جو صنعت گری اور مضمون سے لگا کھاتی ہو نہ کہ ایسے مقصود تحریر سے! وہ مقصود تحریر اکثر اوقات ان کے یہاں ہوتا بھی نہیں تھا۔"

(ترجمہ از "سبک شناسی" جلد سوم)

ملک الشعرأ بہار کی اقبال دوستی اور پاکستان نوازی ہمارے لیے ہمیشہ تشکر و امتنان کا باعث رہے گی مگر "سبک ہندی" کی جس بنیادی خرابی "فضل فروشی" کی طرف انہوں نے توجہ دلائی ہے وہ صفوی اور مغل بادشاہوں کے درمیان یا ان کی درباری شخصیتوں کے مابین سفارتی خط و کتابت کی ایک ایسی خصوصیت ہے جس کا تعلق اس وقت کی سیاسی صورت حال سے ہے جو مثلاً مغل بادشاہوں اور مرکزی ایشیا کے ازبک حکمرانوں کے باہمی تعلقات سے بہت مختلف تھی (عبداللہ خان ازبک کا یہ قول مشہور ہے کہ میں اکبر کے تیروں سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا ابوالفضل کے قلم سے) پھر یہاں صائب تبریزی کا نام لینے اور پھر اسے مستثنیٰ قرار دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اگر یہ نام زبان پر آ ہی گیا تھا تو مرزا صائب کی بیاض میں درج شدہ برصغیر کے شعرا کا منتخب کلام بھی سامنے ہوتا تو بہتر تھا، خصوصاً وہ محبت و عقیدت جو صائب کو غنی کشمیری کے کلام سے تھی، بحث میں ضرور آنی چاہیے تھی۔ اور متاخرین میں سے بیدل سے زیادہ ناصر علی سرہندی کا ذکر ہوتا تو مناسب تر تھا۔ پھر آخری فقرے میں "مضمون" کا لفظ جس طرح "مقصود" کے مقابل لایا گیا ہے اس سے ان دونوں کا امتیاز واضح نہیں ہوتا اور یوں لگتا ہے جیسے ملک الشعرأ کی نظر میں "مضمون شعر" کا تعلق "مقصود تحریر" سے نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کسی کو بیدل یا غنی کی شاعری کتنی ہی ناپسند کیوں نہ ہو، یہ کہنا تو قرین انصاف نہیں ہو سکتا کہ ان کا کوئی مقصود شاعری سرے سے تھا ہی نہیں۔

ہندوستان کے فاضل ڈاکٹر امیر حسن صاحب عابدی نے "میر کا سبک فارسی" کے زیر عنوان یہ مقالہ لکھا ہے (مشمولہ نقوش میر نمبر ۲) اس میں ملک الشعرأ بہار کے عمومی تبصرے کو ایک حتمی تنقیدی معیار بنا کر انہوں نے میر کے اسلوب نثر کو بھی زیادہ تر مصنوعی قسم کی تحریر قرار دے دیا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو شاید میر کا فارسی دیوان بھی غنی اور بیدل کا ضمیمہ ٹھہرے مگر اس پر گفتگو سے پہلے برصغیر کی فارسی شاعری پر ایک اور ایرانی عالم کے خیالات کو دیکھ لیا جائے۔ یہ ہیں ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا:

"اس طرز کی بنیاد ہے نازک افکار کے بیان پر اور باریک و دشوار اور ذہن سے دور مضامین کی ایجاد پر جن کو سادہ روزمرہ اور عام لوگوں کی زبان میں ادا کیا گیا ہو۔ اس طرز کے شاعروں کی توجہ اس بات پر مرکوز رہتی ہے کہ غزل کے ہر شعر میں اچھوتے اور نرالے مضامین لائے جائیں اور عام طور پر ان مضامین کے ساتھ خیال کی باریکی، احساسات کی نزاکت اور ذہن سے دور تصورات موجود ہوں اصل میں یوں کہنا چاہیے کہ شاعر کا مقصود خاطر بھی مبہم شاعرانہ تخیلات اور تصورات زیادہ ہیں، بہ نسبت زبان کے اور محاورہ کے صحیح استعمال کے اور کلام کی متانت برقرار رکھنے کے۔ اسی وجہ سے ہندوستانی طرز کے اکثر ادبی کارناموں میں دلکش اور خوبصورت اور نازک معانی، نامناسب اور ڈھیلے ڈھالے لفظوں میں چھپے ہوتے ہیں۔

ان شاعروں میں جنہوں نے اس طرز کو نبھانے میں اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا ہے۔

عرفی (م ۹۹۹ھ = ۱۵۹۰ء) اور فیضی (م ۱۰۰۴ھ = ۱۵۹۵ء) اور
طالب (م ۱۰۳۶ھ = ۱۶۲۶ء) اور کلیم (م ۱۰۶۱ھ = ۱۶۵۰ء) اور
صائب (م ۱۰۸۸ھ = ۱۶۷۷ء) کا نام لیا جا سکتا ہے

اس طرز کے شاعروں نے ایرانی شاعروں کی روایت سے، جہاں تک الفاظ کی پاسداری کا تعلق ہے، جس بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا ہے وہی اس امر کا باعث ہوا کہ بارھویں صدی کے اواخر (یا اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر) سے اس طرز کی مخالفت شروع ہوئی۔ اس مخالفت کی پہلی آواز اصفہان کی ایک ادبی انجمن میں سنائی دی جسے چند ایک خوش ذوق کہنے والوں نے ترتیب دیا تھا۔ اس انجمن کے اراکین یعنی مسرور طالقانی (م ۱۱۶۸ھ = ۱۷۵۷ء) مشتاق اصفہانی (م ۱۱۹۲ھ = ۱۷۷۸ء) آذر بیگدلی (م ۱۱۹۲ھ = ۱۷۷۸ء) ہاتف اصفہانی (م ۱۱۹۸ھ = ۱۷۸۳ء) عاشق اصفہانی (م ۱۱۸۱ھ = ۱۷۶۷ء) اور صباحی کاشانی (م ۱۲۰۶ھ = ۱۷۹۱ء) کا عقیدہ یہ تھا کہ کلیم اور صائب ایسے شاعروں کی پیروی کرنے کی بجائے جنہوں نے ان کے نزدیک فارسی کو زوال کے رستے پر ڈال دیا تھا اور فصاحت کے زیور سے محروم کر دیا تھا، لازم ہو گیا تھا کہ قدیم تر فصیح شاعروں کی طرف (جن کے آخر میں حافظ کا شمار ہوتا ہے) لوٹا جائے۔ یہاں سے فارسی شاعری کا وہ خاص دور شروع ہوا جسے "بازگشت کی تحریک" کہا جاتا ہے کیونکہ اس دور کے فارسی شعرا، غزل میں ہو یا قصیدے میں، یہ کوشش کر رہے تھے کہ خراسان اور عراقِ عجم کے قدیم شاعروں کی تجدید کر کے رکھ دیں۔"

(ترجمہ از دیباچہ "گنج سخن" جلد اول)

اس طویل اقتباس میں فیضی کے سوا، برصغیر کے کسی شاعر کا نام نہیں، پھر بھی قرائن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تحریک "بازگشت" کے اراکین کی بغاوت کا تعلق عرفی اور فیضی اور طالب کے بعد آنے والے شعراء کے خلاف ردعمل سے ہے جن میں صائب اور کلیم ایسے ایرانی شعرا اس لئے شامل کر لئے گئے ہیں کہ وہ برصغیر کے شعراء کے ہم نظر اور ہم خیال ہو گئے تھے اور ان کے بعد آنے والے ہندوستانی شعراء نے انہی کی مثال کو آگے بڑھانے کی کوشش کی تھی، گویا غنی سے لے کر بیدل بلکہ ناصر علی تک کی نازک خیالیاں، مضمون آفرینیاں اور معنی یابیاں، صائب اور کلیم کے انداز تحریر پر مبنی تھیں بلکہ صائب کے ذریعے اس میں اُن ایرانی شعراء کے اثرات بھی کام کر رہے تھے جو کبھی ہندوستان نہیں آئے، جیسے مرزا جلال اسیر، حکیم شفائی اور شوکت بخاری۔ اس لیے اس طرز کو ہندوستان سے مخصوص کرنا اور "زبان کے زوال" کی بات کرنا ایک ارتجاعی عمل تھا جس کا نتیجہ تخلیقی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لئے ڈاکٹر صفا کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ شروع شروع میں "بازگشت" کا نتیجہ افسوسناک نقالوں کی صورت میں ہوا۔ اور قردغی بسطامی کے سوا (م ۱۲۷۴ھ = ۱۸۵۷ء) جو ہمارے غالب کا ہمعصر ہے، اس تحریک کے حرف داروں میں جن لوگوں کا نام لیا جاتا ہے۔ جیسے مجمر، نشاط، قاآنی اور یغما ـــ ان کے یہاں "خوبصورت"

دلنشین اور نئی قسم کی غزل" کا وجود ثابت کرنے کے لئے ذوقِ سخن سے زیادہ حُبِ وطن کی ضرورت پڑتی ہے جس کی کسی جگہ کوئی کمی نہیں ہوتی۔

بہر حال اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ جس وقت ہمارے یہاں میر و سودا کا دور دورہ تھا۔ اور ہمارے شعراء بیدل اور ناصر علی کے راستے پر چلنے کی بجائے اپنے لئے ایک الگ راستہ، ریختہ میں فارسی کے کلاسیکی اساتذہ (یا متقدمین) کا معیارِ سخن قائم کرنے کی کوشش کر رہے تھے، عین اسی زمانے کے ایرانی شعراء اپنے کلاسیکی شعراء کی نقالی میں مصروف تھے۔ اس معیار کی طرف آخر اُن کی نظر کیسے پہنچی؟ خان آرزو کی رہنمائی سے؟ مرزا مظہر کی مثال سے؟ یا شاہ گلشن کی ہدایت سے؟

اس سلسلے میں ہمارے مورخینِ ادب سب سے زیادہ خان آرزو کا نام لیتے ہیں۔ مگر اول تو ان کے یہاں ایک ہزیمت خوردہ آدمی کا معذرتی لہجہ ہے جو میر و سودا کے اعتماد سے بہت دور ہے، دوسرے ان کا اپنا فارسی کلام (جو ابھی شائع نہیں ہوا) اور ریختہ کے تھوڑے سے معمولی قسم کے اشعار کوئی ایسی مثال پیش نہیں کرتے جس سے آئے کوئی راستہ نکلتا ہو۔ حتیٰ کہ علوم ادب میں ان کا تدریسی انداز، نقدِ ادب میں ان کا رویہ اور ایران کی معاصر شاعری سے ان کی بے اعتنائی (جو ان کے تذکرہ شعرای فارسی سے نمایاں ہے) ایسی چیزیں ثابت نہ ہو سکیں جن کی بنیاد پر کسی مستحکم تخلیقی تحریک کی تعمیر ہو سکے۔ ان سے ہمارے بڑے شاعروں نے جو کچھ بھی سیکھا ہو۔ جب تک وہ ان کے حلقۂ اثر سے آزاد نہیں ہو سکے، اُن کی خود مختار نشو و نما نہیں ہو سکی اور اپنے معاصرین میں میر کا سب سے پہلا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے خان آرزو سے بغاوت کی، چاہے اس کے محرکات ذاتی اور خاندانی ہی کیوں نہ ہوں۔

(۴)

"خان آرزو سے اس کو تلمذ کی نسبت ہے مگر نخوت کی بنا پر جو اس کے سر میں جاگزیں ہو چکی ہے وہ اس امر سے جو فی الحقیقت اس کے لئے باعثِ فخر ہے، کلی طور پر انکار کرتا ہے۔" قدرت اللہ قاسم

"خان آرزو کے پاس انہوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی۔" آزاد

"میں تو میر صاحب کی نثرِ فارسی یا نظمِ اردو کو دیکھتا ہوں تو خان آرزو کی کوششوں کی ایک مجسم تصویر نگاہ میں پھر جاتی ہے۔" ——— عبدالباری آسی

(خان آرزو کے زیرِ سایہ) "ان کی تربیت اور شاگردی کی روایت فسانے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔"

——— مولوی عبدالحق

خانِ آرزو محض ایک شخص کا نام نہیں، ایک نہایت اہم علمی شخصیت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی جگہ ایک سماجی ادارے کی حیثیت بھی رکھتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نادر شاہ کے حملۂ دہلی (۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۹ء) کے دوران جب میر کے مربی صمصام الدولہ کا انتقال ہو گیا تو انہیں بامر مجبوری اپنے "سوتیلے ماموں" کا احسان مند ہونا پڑا۔ (ذکرِ میر کے الفاظ میں "منت ہائے بے منتہا" کا بوجھ اٹھانا پڑا۔) وہ کہتے ہیں کہ کچھ دیر ("چندے") ان کے پاس رہا اور چند ایک کتابیں شہر کے لوگوں سے پڑھیں (یعنی اب وہ خان آرزو کی علمی حیثیت سے فیض یابی کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ نہ ان کے پاس مدتِ قیام کی صراحت کرتے ہیں۔ نخوت کی بجائے یہ انکار خفگی کا مظہر معلوم ہوتا ہے) جب

اس قابل ہوا کہ کسی سے بات کہہ سکوں تو جناب اخوان پناہ (بڑے اور سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن، خان آرزو کے سگے ہمشیر زادے) کی طرف سے ایک خط موصول ہوا (اس کی خبر میر کو کہاں سے معلوم ہوئی یہ نہیں لکھا۔ غالباً کسی گھر کے بھیدی نے یہ راز کی بات بتائی ہوگی)۔ خط میں میر کو "فتنۂ روزگار" قرار دے کر اس کی تربیت جاری رکھنے سے منع کیا گیا تھا۔ گویا واقعی تربیت شروع ہو چکی تھی مگر یہ معلوم نہیں کہ منقطع ہونے سے پہلے کتنا وقت گزر چکا تھا اور تحصیل کا درجہ کہاں تک پہنچا تھا۔ "نوادر الکملا" نام کی نایاب کتاب سے جو عبارت عموماً نقل کی جاتی ہے اس کی رو سے میر نے خان آرزو کے گھر میں رہ کر "علوم عقلی و نقلی" کی تکمیل کی تھی اگرچہ خان آرزو صرف علوم ادب کے استاد تھے اور ان کی مبلغ کتابیں اور رسالے بھی اسی موضوع پر ہیں) اور کسی دوسری جگہ سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ادب کے علاوہ کن کن علوم دینی اور علوم حکمی سے دلچسپی رکھتے تھے یا ان کی تدریس کر سکتے تھے۔ جناب حبیب الرحمٰن خان شروانی اور مولوی عبدالباری آسی نے میر کی علمی قابلیت کا اندازہ ان کی نثر سے لگانے کی کوشش کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ان کو فارسی میں استعداد کامل تھی اور درسیات عربیہ پر بھی عبور تھا۔ قائم نے خان آرزو سے تھوڑی بہت دانش اندوزی ("لختی دانش اندوختہ") سے زیادہ نہیں کہا۔ اگرچہ خان مذکور کی فضیلت اور کمال ان کے نزدیک ایسا ہے کہ اس سے بالاتر کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور اُن کی خوبیوں کا شمار ایسے ہے جیسے کوئی بارش کے قطرے گننے بیٹھ جائے یا افلاک کی سیاحت پر نکل کھڑا ہو۔ تاہم قائم کو یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ "ایسے شخص کا دماغ ریختہ سے وفا نہیں کرتا۔"

ریختہ تو ریختہ، میر صاحب جو اس وقت ریختہ گوئی کے فن میں ایک جوہر قابل کے طور پر نمودار ہو رہے تھے ان کو تو جہاں تک محسوس ہوا، کہ خان صاحب ایک عالم و فاضل سے زیادہ بڑے دنیا دار قسم کے شخص ہیں اور ان سے وفا کی توقع عبث ہے۔ گردیزی نے جسے میر سے کوئی ہمدردی نہیں، خان آرزو کی خُردہ گیری، معاصر شعرا سے ستم ظریفی اور سب سے زیادہ ان کی "اَنا وَلا غیری" کی بانگ بلند کا ذکر کیا ہے۔ خود اپنے تذکرے میں آرزو نے تقریباً ہر زندہ شاعر کو اپنا شاگرد ظاہر کرنے اور اپنے خوانِ کرم کا زلہ رُبا قرار دینے کی حد کر دی ہے حالانکہ ان میں سے کسی ایک نے محض ان کی خدمت میں اپنا دیوان پیش کیا تھا (شروانی، اس کے مقابلے میں، کہتے ہیں کہ میر نے اپنے تذکرے میں کسی کے لیے "شاگرد" کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ جو تھے بھی، ان کو ہر جگہ دوست ہی لکھا ہے۔ آرزو[۵]

وحشت آموزِ غزالانم من
"شہر استادِ" بیابانم من

بہرحال میر، خان آرزو کے علم و فضل سے کبھی انکار نہیں کرتے، بلکہ اس سلسلے میں سب سے بڑا خراج تحسین تو نکات الشعرا ہی میں موجود ہے وہ ان کو میدانِ فصاحت کا پہلوان شاعر اور قادر سخن قرار دینے کے علاوہ ایک ایسا عالم و فاضل سمجھتے ہیں "جیسا کہ اب تک ہندوستان جنت نشاں کو نصیب نہیں ہوا بلکہ ایران میں بھی مشکل سے ہی ملے تو ملے"۔ وہ ان کو "سخن فہمی میں طاق" ہی نہیں "استاد و پیر و مرشدِ بندہ" بھی لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پرستش اور عقیدت کی زبان ہے حالانکہ اس وقت انھیں خان آرزو کا گھر چھوڑے ہوئے مدت ہو چکی تھی مگر ابھی ان کی ہمسائگی میسر تھی اور اس وجہ سے کوئی نہ کوئی واسطہ و رابطہ ان سے ضرور قائم تھا یا کم از کم کوئی توقع اب بھی ان کی ذات سے وابستہ تھی۔

مولوی عبدالحق صاحب نے ان دو متناقض روایتوں میں یوں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ "تذکرہ جو مقبول ہونے والی چیز تھی،

ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جانے والی، اس میں انہوں نے ناگوار اور بدنما ذاتی اور خانگی جھگڑے کو کھنا مصلحت نہ سمجھا ..... لیکن جب وہ آپ بیتی لکھنے بیٹھے تو رہا نہ گیا۔"

مولوی عبدالباری آسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیس برس پہلے کا دکھڑا رونے کے بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی مگر معلوم نہیں انہوں نے ذکرِ میر کی تخ نوائی (جو آرزو کی موت پر بھی کم نہیں ہونے پاتی) اور شدتِ احساس پر توجہ کیوں نہیں کی۔ ایک بار آدمی کسی کو اپنا "استاد و پیر و مرشد" تسلیم کرلے اور پھر اسی کے ہاتھوں سخت گیری، بے مروتی بلکہ میر کے الفاظ میں "سلاخی" (یا تصابیت) کا شکار ہو تو لامحالہ اس کا ردِ عمل بھی اتنا ہی شدید ہوگا۔ اور یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ میر کو خان آرزو سے دو مرتبہ شکایت پیدا ہوئی پہلی مرتبہ جب اپنے بھانجے کے کہنے پر انہوں نے میر سے عداوت کا رویہ اختیار کرلیا، اٹھتے، بیٹھتے، ڈانٹتے پھٹکارتے لگے اور "بداندیشی" کے ساتھ میر کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنے لگے (یہاں فارسی عبارت میں "ہر روز چشمش بہ دُنبالِ من می بود" کے نیچے میر نے یہ حاشیہ لگایا ہے کہ "یعنی خرابیِ من می خواست"۔ محاورے کی دوسری معنویت تسلیم، مگر کیا میر یہاں چھپاتے چھپاتے بھی کچھ کہتے ہوئے نظر نہیں آتے؟

آسی صاحب کا خیال ہے کہ تذکرہ "بہارِ بے خزاں" کے مطابق، اپنے وطن یعنی آگرہ کی ایک پری تمثال عزیزہ سے جوان کا واقعہ گزر چکا تھا (اور جس کے کئی برس کے بعد وہ خان آرزو کے یہاں اقامت پذیر ہوئے تھے) خان آرزو کو جو ایک قدیم وضع کے بزرگ تھے یہ "آوارگی اور بد چلنی" پسند نہیں آسکتی تھی اور اسی وجہ سے وہ "تلخ نوایانہ نصائح" پر مجبور ہوئے ہوں گے۔ مگر یہ توجیہ اطمینان بخش نہیں کہی جاسکتی، نہ میر کے مجنونانہ ردِ عمل کا باعث یہاں سے معلوم ہوسکتا ہے۔

"بہارِ بے خزاں" ایک بہت بعد کا تذکرہ ہے اور میر کے "در پردہ عشق" کو آگرہ کے ابتدائی برسوں (اور میر کے بچپن) سے متعلق کرنا مشکل ہے شاید اسی لئے ڈاکٹر اکبر حیدری اسے "دہلی سے واپسی" کے بعد کا واقعہ بتلاتے ہیں گر یہ درست ہو تو میر کے جنون کی کرنی اور تاویل کرنی پڑے گی۔ جو کچھ بھی تھا۔ میر کو اس رنجش کے بعد خان آرزو کا گھر چھوڑنا پڑا اور اس کے کئی برس بعد جب وہ صحت یاب ہو کر اردو شاعری میں اپنے لئے ایک نام اور مقام پیدا کر چکے تھے اور شاید آرزو کی طرف سے بھی پرانی سخت گیری کا کچھ نہ کچھ تدارک ہو چکا تھا، تو میر نے نکات الشعرا لکھتے ہوئے آرزو کو "استاد و پیر و مرشد" کی حیثیت سے پھر قبول کر لیا اور یہ صورتِ حال اس وقت تک قائم رہی جب تک کہ میر کو دوبارہ اپنے گھر بلا کر بُرا بھلا نہیں کہا گیا اور وہ ان کی ہمسائیگی ترک کرنے پر مجبور نہیں ہوگئے۔ یہ جو "ذکرِ میر" میں پہلی رنجش کے سلسلے میں درج ہے کہ انہوں نے جیسا سلوک مجھ سے کیا اور رنج و روح پہنچائے اگر ان کی "سلاخی" کا ماجرا تفصیل سے لکھوں تو ایک الگ دفتر درکار ہوگا، تو غالباً اس تاثر میں دوسرے واقعے کا اثر بھی بڑا ہوگا جو اس وقت تک گزر چکا تھا۔ (ذکرِ میر کا آغاز ہی اس کے پانچ برس بعد ہوتا ہے جب خود آرزو بھی انتقال پا چکے تھے) کہا گیا ہے کہ نکات الشعراء ۱۱۶۵ھ کے اوائل میں مکمل ہوا تھا اور اسی سال کے چند مہینے بعد آخری بار جدائی کا واقعہ پیش آیا تھا اس لئے نکات الشعراء میں کسی قسم کی رنجش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ رنجش تو خیر ابھی پھر سے پیدا نہ ہوئی ہوگی مگر نکات الشعراء ہی کے چند ایک مقامات پر آنے والے واقعات کا سایہ نہ سہی تو کم سے کم بالواسطہ قسم کی ہلکی سی چھیڑ چھاڑ ضرور ملتی ہے۔

چند ایک تنقیدی تفاصیل جو آرزو کے شاگردوں کے سلسلے میں درج ہیں مثلاً یقینؔ کے ایک شعر کو مخلص کے ایک شعر سے ماخوذ بتلانے کے بعد لکھا ہے:

"طرفہ تر یہ کہ وہ بھی سرقے کے فن میں فرد تھا، اب معلوم نہیں اصل مضمون کس کا ہے۔"

ٹیک چند بہار کی تصانیف سے "بے دماغی" کا اظہار یوں کیا ہے کہ بہت ہیں۔ فہرست کی فرصت نہیں۔ خان آرزو کے مہربان دستوں کا (جن میں سے اکثر امرائے سلطنت تھے) یا تو ذکر ہی نہیں کیا اور چند ایک کو یہ کہہ کے ٹال دیا ہے کہ ان کے حالات خان صاحب کے تذکرے میں لکھے ہیں۔ اپنے دوست نجم الدین سلام کے والد شرف الدین پیامؔ کو فارسی کے "شاعر قرار داد" (یا تسلیم شدہ شاعر) مانا ہے جب کہ خان آرزو نے انھیں اپنا بچپن کا دوست اور ہم سخن بتا کر یہ بھی لکھا ہے کہ "اس سلسلے میں عاجز سے کوئی امداد بھی ظہور میں آئی ہو تو عجب نہیں" مگر میرؔ اس قسم کی کوئی بات نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ یہ کہ آخر میں اپنے کلام کا انتخاب دیتے ہوئے یہ دو شعر بھی لکھے ہیں جن میں ردیف کی دُہری معنویت توجہ کی مستحق ہے اور "خانِ آرزو" کا صوتی ایہام بھی:

آنکھوں سے دل تلک ہیں چلے خوانِ آرزو
نومیدیاں ہیں کتنی ہی مہمانِ آرزو
اس مجھلے کو سیر کرو دل کب تلک کہ ہے
دستِ ہزار حسرت و دامانِ آرزو

ممکن ہے ان کا اضافہ دوسری رنجش کے فوراً بعد کیا ہو اور پھر ان کو وقتی ابال سمجھ کر خود ہی نظر انداز کیا ہو۔ مگر ان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ خانِ آرزو کی شفقت سے مایوس ہو کر، حسرت کی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔

نکات الشعرا اور ذکرِ میرؔ سے قطع نظر، خانِ آرزو کی شخصیت تو ان کا شاعری کا بھی موضوع بنتی ہوئی نظر آتی ہے (ہجو کا نہیں بلکہ غزل کا اور وہ بھی غزل کی ایمائی اور اشارتی زبان میں) اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے اس لئے کہ خان آرزو سے جو ان کو عقیدت پیدا ہوئی تھی اور جتنا بڑا صدمہ ان کی ذات سے پہنچا تھا وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ہمہ جہت نفسی اور روحانی تجربہ ہے۔ جس کے ان گنت پہلو کسی نہ کسی شکل میں ان کی اردو اور فارسی شاعری میں موجود ہیں۔ مثلاً یہ غزل جو بظاہر محبوب سے مخاطب ہے، کیا خانِ آرزو کی شخصیت کا پرتو بھی اس میں نہیں؟

ہر صبح و شام تو پئے ایذائے میرؔ ہو
ایسا نہ ہو کہ کام ہی اس کا اخیر ہو
ہوتے ہیں میکدے کے جواں شیخ جی بُرے
پھر ور گزر یہ کرتے نہیں گو کہ پیر ہو
کس طرح آہ خاکِ مذلت سے میں اٹھوں
افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو

(یعنی محبوب جو مجھے سنبھال سکتا تھا، اس کی اپنی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب ہے)

حد سے زیادہ جور و جفا خوشنما نہیں
ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
تسکینِ دل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس
انصاف کر یہ کب تئیں مخلص حقیر ہو
اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میرؔ صاحب و قبلہ فقیر ہو

ہمارے یہاں غزل کو اجتماعی اور نفسیاتی تاریخ کے حوالے سے دیکھنے کا کچھ ایسا رواج نہیں ہو سکا (اور ہمارے معظم، استاذ الاساتذہ خواجہ منظور حسین صاحب مدظلہ العالی نے اس نقطۂ نظر سے دو کتابیں لکھیں بھی تو انھیں خود ہی اس نقطۂ نظر کا دفاع کرنا پڑا حالانکہ کوئی اُن کی دوسری کتاب "اردو غزل کا خارجی روپ اور بہروپ" کا مختصر پیش لفظ اور میر و سودا کے دور پر لکھے ہوئے شروع کے ساٹھ ستر صفحے ایک بار ہمت کر کے پڑھ جائے تو پھر غزل کی تہ داری خصوصاً کلامِ میر کی تہ داری کو تسلیم کرنا پڑے گا) ۔ بہر حال خواجہ صاحب کے سینئر شاگرد، اور ہمارے محترم خواجہ تابش، جناب آل احمد سرور نے میر اور خان آرزو کے بگاڑ کے اسباب کو سمجھنے کی اہمیت پر لکھا ہے :۔

" دلی میں انھیں خان آرزو جیسے سنجیدہ اور ثقہ آدمی کی صحبت مل مگر خان آرزو کی شفقت انھیں نصیب نہ ہوئی ۔ قصور خان آرزو کا زیادہ ہے یا میر کا، اس کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خان آرزو، میر کے اطوار سے خوش نہ تھے ۔ یہ اطوار اخلاقی اعتبار سے کتنے ہی قابلِ اعتراض کیوں نہ ہوں، ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے بہت اہم ہیں ۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک عالم اور ایک رند کے مزاج میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ یہاں موجود تھا ۔ اس فرق نے اپنا رنگ دکھایا ۔ میر خان آرزو سے رخصت ہوئے ۔ ایک گھنے سایہ دار درخت کا سایہ ان کے لئے عذاب ہو گیا ۔ انہوں نے کڑی دھوپ میں آزادی پسند کی اور اس سایہ میں جو چوٹیں ان کے دماغ کو لگی تھیں انھیں ساتھ لئے ہوئے اپنی انانیت کے سہارے زندگی کے خارزار میں مردانہ وار چل کھڑے ہوئے۔"

(میر کے مطالعے کی اہمیت مشمولہ نقوش میر نمبر ۱)

اس جدائی کا ردِ عمل اُردو کلیات میں جا بجا ملتا ہے ؎

اب جو نصیب میں ہو، سو دیکھ لوں گا میں بھی
تم دستِ لطف اپنا سر سے مرے اٹھا لو
اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے، کوئی مہرباں نہیں

مفت آبروئے زاہد علامہ لے گیا
اک مغبچہ اتار کے عمامہ لے گیا

سب خوبیاں ہیں، شیخ مشیخت پناہ میں
پر ایک حیلہ سازی ہے اس دستگاہ میں

فارسی دیوان میں بھی یہ مضمون خصوصی طور پر کئی بار آتا ہے، اگرچہ کسی قدر زیادہ تلخی کے ساتھ، شاید اس لئے کہ اس وقت زخم ابھی تازہ تھا، پھر بھی کئی جگہ غزلیت کا لہجہ تہ داری کے ساتھ چلتا ہے:

مسلّم این کہ دارد عیب ہا میرؔ
بحمداللہ کہ چوں تو بے وفا نیست

کارِ واعظ فقط نہ ترخانی ست
این بحر مجمع کمالات است

(ترخانی یعنی امارت اور شاہی منصب داری، یہاں خانی بھی ہے اور وعظ و نصیحت بھی)

از عصا و سبحہ و سجادہ و صوم و صلوٰۃ
رہنمائے عالمے شد شیخ و خود آدم نشد

با شیخ شہر و واعظِ مسجد مرا چہ کار
من میرؔ دست بیع جوانانِ سادہ ام

("دست بیع" ہاتھ فروخت کیا ہوا)

صحبتِ شیخ و منِ رند چساں در گیرد
عشق راہ دگر و عقل طریق دگر است

(یہ مصرع تو عین مین اقبالؔ کا مصرع معلوم ہوتا ہے شاید توارد ہو۔)

شیخنا، این ہمہ سامانِ تو بے چیزے نیست
دستگاہے شدہ ای شانِ تو بے چیزی نیست

(ہمارے شیخ صاحب کا سر و سامان اور شان و شوکت اسٹیبلشمنٹ کا حصہ ہے)

ناصح، جنوں زیادہ شد آخر ز پندِ تو
نفعے نکرد، داروے ناسودمندِ تو

وید کش پر بے وفا و خود غرض     خود نما و خود ستا و خود غرض

حرفے مگو بہ زاہدِ مغرورِ خود ستا
معقول را نمی شنوَد، این خرف خر است

———

طبع تو گر بہ شیخ نسازد بعید نیست
صحبت برآرِ میرؔ ز کودن نمی شود

———

گر قدرِ گردِ راہِ تو نشناخت، بد مبر
معذور بود شیخ کہ چشمش غبار داشت

———

جملہ تن گوش شو کہ واعظِ شہر
بر زبان ہا زِ گفتگو افتاد

———

حرفِ بے فائدہ ای، میرؔ، ز راہم می بُرد
خوب شد از سرِ ہم آں ہادیِ باطل واشد

(یہاں ڈرامائی طور پر اپنے سر الزام لے کر بیکار نصیحت کو ہدایت باطلہ قرار دیا ہے)

شاید ان اشعار میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو جو شیخ، واعظ، ناصح اور زاہد کے بارے میں محض روایتی انداز کا رویہ پیش کرتا ہو۔ اول تو ان اشعار میں ذاتی واردات کا زور محسوس ہوتا ہے، پھر ان میں چند ایک تخصیصات (مثلاً زاہدِ علامہ، رہنمائے عالم۔ ہادی، مجمعِ کمالات، سامان و دستگاہ وغیرہ) ایسی ہیں جو روایتی زاہد کی خصوصیات پر اضافہ معلوم ہوتی ہیں اور صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کسی چھوٹے، معمولی اور رسمی قسم کے ناصح یا واعظ پر گفتگو نہیں ہو رہی۔ میرؔ کے اردو اور فارسی کلام میں اس موضوع پر اور بھی بہت سے اشعار ہیں جن میں اس کردار کی ریاکاری، خلوت میں کارِ دگر، محفلِ رنداں میں اس کی مضحکہ خیزی اور مستی میں آ کر خفیف الحرکتی بیان کی گئی ہے۔ یہاں بھی کہیں کہیں چند ایک ایسے پہلو آ جاتے ہیں جو اتنے روایتی نہیں:

حدیثِ درد، بزاہد مگو، نمی داند
گرانِ اشکِ ریائی بہ آب می راند

(ریاکاروں کی جذباتیت میں مرعوب کرنے اور بہائے جانے کی صلاحیت ہوتی ہے)

کیفیتِ زہد و ورعِ میرؔ میرسید
بدتر بُوَد از بادہ کشی صوم و صلاتش

(یہاں بھی اپنے سر لے کر بات کی ہے اور کیسا زور پیدا کیا ہے!)

شیخ در عشق پائے گیر شدہ
ایں ہوس کشتہ مفت اسیر شدہ

---

شیخ داری بکف "عصا شمشیر"
اے مخنث، تو نیز مرد شدی

(عصا شمشیر کا مرکب لفظ اس لاٹھی یا چھڑی کے لیے مخصوص ہے جس میں تلوار چھپی ہو)

ندارد ہر کہ فکر برگ عشرت
برآرد از ندامت چوں شجر، شاخ

(شاخ برآوردن، وہی مفہوم رکھتا ہے جو انگریزی محاورے میں "سینگ اُگنے" سے مراد لئے جاتے ہیں، اسی بات کو دوسرے لفظوں میں بھی کہا ہے)

دل قوی دارید، زندان شیخ شاہد باز شد
عاقبت، ایں بے حقیقت، قلتبانے می شود

ایک غزل میں، جو رباعی کے وزن میں لکھی ہے، شیخ صاحب سے دل لگی خالص تفریح کا انداز اختیار کر لیتی ہے:۔

در منع شراب گر کنی کوتاہی
واعظ، خورش وخواب حرامت بادا
گر کفش تو اے شیخ بمسجد گم شد
اندوہ مخور، سرت سلامت بادا

بہرحال یہ سب نسوخیاں، ایک ہی شخص واحد کو نشانۂ طنز بنا کر تو نہیں کی گئیں مگر وہ شخص ایک ادارہ ہو اور طنز کرنے والا بھی اس کے مقابل ایک دوسرے ادارے سے رشتہ جوڑ رہا ہو تو بات دُور تک پہنچتی ہے اور لفظوں کو پر لگ جاتے ہیں۔

(۴)

در رہِ شعر گم رہنما نیست، اگر
حرفے چند است بیادم ز سخنداننے چند

میر کا دیوان فارسی، بیسویں صدی کی سب سے بڑی ادبی دریافت نہ ہو تو ایک اہم دریافت ضرور ہے۔ مصحفی سے لے کر عبدالباری آسی تک سب اس کا ذکر کرتے آئے ہیں اور ہمارے زمانے میں اس کے دو مختلف قلمی نسخوں کو دیکھ کر جناب اختر تلہری اور ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ان کا جائزہ لینے کی کوشش بھی کی ہے اور میر کے چند ایک مشہور اور منتخب اردو اشعار کو اُن سے ذرا ملتے جلتے فارسی اشعار کے مقابل رکھ کر ہر جگہ اردو کو ترجیح دی ہے۔۔ ان دونوں مضامین میں اور ایک آدھ اور جگہ پر پہلی نظر میں دیکھے ہوئے پندرہ بیس اشعار

سے آگے بات نہیں بڑھتی جب کہ موازنے کے لیئے۔ اس سے بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت ہے کیونکہ اگر اتنی ہی بات تھی تو میر نے واقعی آسی کے الفاظ میں خانہ پُری کی ہے یا محض تفنن طبع سے کام لیا ہے۔ محترم ڈاکٹر جمیل جالبی کے خیال میں یہاں میر نے ایک تجربہ کیا تھا جو ناکام ہوا اور اس لئے انہوں نے فارسی گوئی ترک کر دی۔ تجربے کی نوعیت یا ناکامی کی کوئی تخصیص انہوں نے بیان نہیں کی (خیر الکلام ماقل و دل۔ قلت توجیہ موجود ہے مگر دلیل بھی چاہیے)۔ ہاں اگر فارسی میں شعر کہنے کو ہی ایک تجربہ سمجھ لیا جائے تو الگ بات ہے۔

اصل میں مصحفی نے خود میر کا جو قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے دو سال تک صرف فارسی میں لکھا اور یوں ایک دیوان مرتب ہو گیا۔ تو اس بات کو سو فیصدی لفظی معنوں میں لینا غالباً درست نہیں۔ یہاں تک تو مانا جا سکتا ہے کہ فارسی دیوان کا غالب حصہ یعنی تقریباً تین ہزار میں سے دو ہزار اشعار ایک مختصر مدت میں لکھے گئے تھے مگر اس سے پہلے اور بعد میر نے کبھی فارسی میں نہیں لکھا یہ بات تسلیم کرنا مشکل ہے ڈاکٹر جالبی صاحب نے محض اس بنیاد پر کہ میر نے نکات الشعرا میں اپنے فارسی کلام کا ذکر نہیں کیا، ان کی فارسی گوئی کا آغاز ۱۱۶۵ھ سے کیا ہے مگر میر تو یہاں اپنے بارے میں بس اتنا لکھا ہے کہ " اس نسخے کا مؤلف، فقیر حقیر میر محمد تقی میر، اکبر آباد کا متوطن ہے اور گردش لیل و نہار کے باعث، کچھ دیر سے شاہجہان آباد میں ہے۔"

اگر اس جگہ فارسی شاعری کا ذکر نہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس سے پہلے کبھی انہوں نے فارسی میں کچھ کہا ہی نہیں۔ بہرحال یہ مسئلہ محققین کرام کی توجہ کا مستحق ہے جن میں راقم کا شمار کسی طرح نہیں ہو سکتا اور نہ دوسروں کے کام میں دخل دینے کی مجھے کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تنقید لکھنے والوں کے لئے تحقیق اسی حد تک اہم ہے جب وہ ان کے تنقیدی سوالوں پر کوئی روشنی ڈال سکے یا ضروری معلومات اور متن فراہم کر سکے۔ اگر کوئی خلا اس سلسلے میں موجود ہو تو ناقد زیادہ سے زیادہ اس کی نشان دہی کرتا ہے تاکہ تحقیق کے متخصص اس پر توجہ صرف کر کے صورتحال کو واضح کر سکیں اور جہاں تک ہماری تحقیق پہنچ چکی ہو اس سے مستفید ہو کر تنقیدی نتائج مرتب کرنا بھی لازم ہے۔ افسوس کہ ہمارے دور میں یہ بات کسی سکہ بند نقاد نے نہیں کہی، اگرچہ خوشی کی بات ہے کہ ایک تخلیقی فنکار کو اس کا احساس ہوا ہے:۔

> ادب میں تحقیق منتہا نہیں ہوتی یا کم از کم اسے منتہا نہیں ہونا چاہیے۔ ایک گم شدہ تحریر کو دریافت کر کے چپ ہو جانا ایک کارِ عبث ہے۔ اس صورت میں تو وہ تحریر پھر رفتہ رفتہ پردۂ گمنامی میں چلی جائے گی۔ تحقیق کے بعد کی منزل یہ ہے کہ جس تحریر کو دریافت کیا گیا ہے اسے جانچا پرکھا جائے اور اس کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ اس طور پر اس تحریر کو زندہ ادبی روایت میں مقام ملے گا۔ پھر وہ ادبی شعور کی تربیت میں حصہ لے گی اور ادب پر اثر انداز ہوگی۔
>
> (انتظار حسین: پیش لفظ، انشاء کی دو کہانیاں)

چنانچہ میر کے دیوانِ فارسی کی دریافت بھی ہمارے لئے عبث ہوگی اگر ہم اس کی ادبی قدر و قیمت کے تعین، یا دوسرے لفظوں میں ارزیابی کے فریضے سے عہدہ برآنہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں البتہ، چند ایک دشواریاں ایسی ہیں جن کی نشان دہی بے محل نہ ہوگی۔ ایک تو ہمارے زمانے میں فارسی زبان بلکہ ہماری پوری تہذیبی روایت کی جو بھی ارزش ہے۔ محض رسمی اعلانات کرنے اور اخباری بیان دینے تک محدود ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں، کم سے کم کالج کی سطح پر اسے کوئی حیثیت حاصل نہیں چنانچہ یونیورسٹی کی سطح پر

بھی اس کی بقا کا انحصار بڑی حد تک نمود و نمائش کی ضرورت پر ہے، ایسے میں برصغیر کے فارسی ادب سے ہمارے دانشوروں اور ناقدینِ ادب تک کو خال خال ہی کوئی دلچسپی ہو تو حیرت کی بات نہیں۔ مثلاً ہمارے زمانے میں جن لکھنے والوں نے میر کے فارسی کلام پر رائے زنی کی ہے، یا تو انھیں میر کا فارسی دیوان دیکھنے کو ملا ہی نہیں اور کسی کو تھوڑی دیر کے لیے کوئی قلمی نسخہ دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہو تو فارسی ادب سے کوئی خاص دلچسپی رکھے بغیر اس پر کوئی ایسا فیصلہ صادر کر دیا ہے جس سے فقط اُردو زبان اور میر کے اُردو کلام کے ساتھ ان کی رغبت کا اظہار ہوتا ہے، جا ہے وہ بھی اپنی جگہ رائج الوقت درسیاتی نقطۂ نظر سے آگے نہ بڑھ سکے۔ گویا ہم میر کو نہیں، میر کی شہرت کو دیکھتے ہیں خصوصاً اُردو غزل اور کسی حد تک مثنوی کے فن میں انھیں جو مقام حاصل ہو چکا ہے، اس میں کوئی توسیع یا ترمیم ہمیں گوارا نہیں۔

چنانچہ میر کی ہجویات اور واسوخت، مناقب و مراثی، فارسی نثر بلکہ رباعیات اور دیگر چھوٹی بڑی مثنویوں کو بھی ہم محض ضمنی اہمیت دے کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ پورے فن کار کو اپنے جملہ کمالات کے ساتھ نہ دیکھنے کی وجہ سے اُن کی غزل اور دو ایک مثنویاں جو عموماً موضوعِ گفتگو بنتی ہیں ہم اُن کی گہرائیوں میں بھی نہیں اُتر سکتے۔ ایسے میں ایک نئی دریافت کی ارزیابی ہمارے لئے اور بھی دشوار ہو جاتی ہے اگرچہ یہاں میر کی ادبی شخصیت، نفسیاتی نشو و نما اور کمالِ فن کے بعض ایسے پہلو واضح طور پر موجود ہیں جو اس دریافت سے پہلے معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔

اس کی ایک وجہ تو حیات میر کے وہی دو سال ہیں جبکہ انہوں نے ریختہ گوئی موقوف کر رکھی تھی اور جس وقت ان کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ، یعنی اپنے "استاد و پیر و مرشد" سے اُن کی علیحدگی اور بقول آل احمد سرور، زندگی کی کڑی دھوپ میں ان کی آزادی کا دور شروع ہوا تھا۔ اسی دور میں انہوں نے اپنا زیادہ تر فارسی کلام کہا اور ساتھ ہی جینے کا وہ حوصلہ پیدا کیا جس کے بغیر وہ نوے سال کی عمر تک ایک پُر آشوب دَور کے شدائد کا مردانہ وار مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ گویا میر کے فارسی دیوان کو ان کی تاریخی صورتِ حال اور کمالِ فن دونوں کے لحاظ سے ان کی ادبی شخصیت کی تعمیر میں کلیدی اہمیت حاصل ہے۔

درست ہے کہ کلام کی ارزیابی، کلام ہی کے قریبی مطالعے سے ہونی چاہیے مگر چند ایک اہم حقائق ہمارے سامنے ہوں اور تخلیقی فنکار کے ممتاز تر مراحلِ سفر کا علم ہو تو ہمارے مطالعے میں وہ تیسری سمت پیدا ہو جاتی ہے جس کے بغیر کوئی بھی تحریر محض ایک دو سمتی کاغذ کا ٹکڑا ہے جس کی گہرائی میں اُترنے کا راستہ ہمیں معلوم نہیں۔

(۵)

بے تأمل کے شناسی طرزِ گفتار مرا

دیدہ نازک کُن کہ فہمی حرفِ تہ دارِ مرا

یوں تو میر کے اردو کلام کو سمجھنا بھی کوئی آسان کام نہیں (اور یہ بات انہوں نے خود ہمیں بتا رکھی ہے، پھر بھی ہم کہ اپنی سہولت پسندی کی وجہ سے میر کو ایک ہی عالم میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ اکثر یہ تنبیہ بھول جاتے ہیں) مگر ان کے فارسی کلام کا مطالعہ، زبان کی نزاکتوں کے علاوہ جن کے بغیر شاعری کے فن کا تصور بھی نہیں ہو سکتا، ہمارے اپنے مزاج میں ایک ایسی "تہ داری" کا تقاضا کرتا ہے جس کے بغیر ہم وصولِ حالِ

تقریریں کرنے والوں اور "شیخ" قسم کے علمائے ظاہر کے سامنے دب کر رہ جاتے ہیں۔ بقول عرفی:

خروش و ولولۂ عالمانِ شہر آشوب

گناہِ حوصلۂ تنگ و حرفِ بے تہ ماست

عام طور سے عمل اور تامل ایک دوسرے کی ضد کہے جاتے ہیں مگر فکر و تامل جو میر کا پیغام خاص ہے ہمیں نقدِ حیات کا وہ حوصلہ عطا کرتا ہے جس کے بغیر نہ ہم عمل کی غرض و غایت کو سمجھ سکتے ہیں، نہ اس کے نتائج و عواقب کو۔ چنانچہ ہمارے عملی اقدام اس "اعتماد" سے محروم ہوتے ہیں جس کے بغیر، میر کے الفاظ میں کوئی "اتحاد" ممکن نہیں۔ ہم میر سے اتحادِ نظر پیدا کرنا چاہیں تو ہمیں میر پر بھی اعتماد کرنا ہوگا اور خود اعتمادی سے بھی کام لینا ہوگا۔

فی الحال ہم اتنا سمجھ لیں کہ میر نے بلا وجہ ریختہ گوئی کو موقوف کر کے فارسی زبان پر توجہ مرتکز نہیں کی۔ یوں تو انہوں نے پہلے بھی فارسی میں کچھ نہ کچھ ضرور کہا تھا، چاہے وہ اُردو کلام میں فارسی کے مصرعے اور اشعار شامل کرنے کی حد تک ہو (جن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے) چاہے فارسی بولنے والے دوستوں اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ہو۔ نوجوانی میں ان کو، شیخ علی حزیں کی طرف، اپنے استاد خانِ آرزو کی مخالفت کے باوجود، کچھ کشش محسوس ہوئی تھی (یہی کوشش سودا کو بھی شیخ کے پاس لے کر گئی تھی) اور "تذکرہ خوش معرکہ زیبا" کے مؤلف سعادت خاں ناصر کے بقول میر صاحب خود کہتے تھے کہ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تو مجھ سے میرا ایک ہی شعر سننے کی فرمائش کرتے، وقت رخصت ایک اشرفی انعام میں دیتے اور یہ اتفاق ایک ہفتے میں دو روز ہوتا تھا۔ تذکرے میں یہ شعر یوں لکھا ہے:

رُوئے ترا اشگاف درے گر نظارہ کرد

اے یار رشک ہیں کہ دِلم پارہ پارہ کرد

اُس زمانے میں شیخ، نواب امیر خاں انجام کی حویلی میں رہتے تھے اور کئی برس کے بعد جب امیر خان انجام دربار کی سازشوں سے شہید ہو چکے تھے اور یہ شیخ بنارس میں جا کر بیٹھ گئے تھے تو میر کو بے خانماں ہونا پڑا اور اسی حویلی میں ان کو پناہ ملی۔ امیر خاں انجام بقول میر، محمد شاہی دور کے بہت بڑے امیر تھے اور سلطنت کی رگِ خواب ان کے ہاتھ میں تھی، ان کی خوش سلیقگی اور طلاقتِ لسانی ضرب المثل تھی، (اس کے علاوہ ایران کے مشہور صوفی بزرگ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد سے تھے اور اہل علم و ادب کے بہت بڑے سرپرست بڑی مشکلوں سے ان کو الٰہ آباد کی صوبہ داری سے بُلا کر عمدۃ الملک بنایا گیا تھا اور تین ایک برس امورِ سلطنت میں دخیل ہونے کے بعد) میر کے الفاظ میں قلعہ شاہی کے دروازۂ خاص کے بالمقابل اپنے ایک نوکر کے ہاتھوں کٹار کا زخم کھا کر شہید ہو گئے تھے۔ یہ واقعہ ۱۱۵۹ھ کا ہے اور میر کے دیوان اوّل کا یہ اردو شعر ان ہی کے بارے میں ہو سکتا ہے:

غیر نے ہم کو ذبح کیا ہے، طاقت ہے نے یارا ہے

اس کُتّے نے کر کے دلیری، صیدِ حرم کو مارا ہے

فارسی دیوان میں بھی ایک رباعی اسی واقعے سے متعلق ہے مگر اس میں اور اردو شعر میں ایک اہم فرق ہے، جسے محسوس کرنے

سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ انجام کا قاتل بھی وہیں مارا گیا تھا اور بقول مؤلف "گلشنِ ہند":

"اکثر اربابِ فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا ہے اور امر جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام (نوکر) کی لاش کو اٹھواتے ہیں بادشاہ نے نہایت کرم فرمایا۔ پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا۔"

اب میر کی رباعی دیکھیے اور اردو شعر سے اس کا موازنہ کیجئے:

دیرے ست کہ غیر را تو بنواختہ ای
وزکیں بہ منش دلیر تر ساختہ ای
اے تُرکِ سیاہ چشم، شرمت بادا
آہوئے حرم پیشِ سگ انداختہ ای

اب یہ کتّا نودولیہ نہیں۔ دلیر بنایا گیا ہے اور مرنے والا بھی ایک صیدِ حرم نہیں، آہوئے حرم ہے جسے کتے کے آگے ڈالا گیا ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اس طرح کے کام بہت دونوں سے ہو رہے ہیں اور خود "ترکِ سیاہ چشم" کو جسے شرم آنی چاہیے، اپنے لائق اور نیک نفس عمائدِ سلطنت بلکہ خود عامۂ خلائق سے بغض و کینہ محسوس ہوتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میر کا ہر فارسی شعر جو کسی اردو شعر سے تھوڑی بہت مماثلت رکھتا ہے، اسی درجۂ "تہ داری" کا حامل ہے۔ یہ تو متعلقہ اشعار کا دقتِ نظر سے موازنہ کرکے ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ مختلف مواقع پر کیا صورتِ حال ہے۔ ڈاکٹر جالبی صاحب کا کہنا ہے کہ "میر کی فارسی شاعری کا رنگ اردو شاعری جیسا ہے۔ اکثر اشعار اردو اشعار کا چربہ یا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد انہوں نے دس ایک متقابل اشعار دیئے ہیں جن میں سے ایک کے سوا باقی سب پر جناب اختر علی تلہری اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس سے پہلے فیصلہ صادر کر چکے ہیں۔ پہلے جالبی صاحب والا ایک شعر دیکھ لیں:

منعم نے، بنا ظلم کی رکھ، گھر تو بنایا
پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا

اتفاق سے یہ شعر بھی پہلے کی طرح "دیوان اوّل" میں سے ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی شعر غالباً اس کے بعد ہی کہا گیا ہوگا:

منعم، اے خانہ خراب، ایں ہمہ شوقِ تعمیر!
سالہا ساختہ ای جا و مکاں آخر ہیچ!

جالبی صاحب کو ایسے متقابل اشعار میں "گہری مماثلت" نظر آتی ہے اور "وہی موضوعات"۔ جہاں تک مماثلت کا تعلق ہے تو وہ سطح پر تو یقیناً موجود ہے، سطح کے نیچے دونوں شعروں میں بہت فرق ہے اور اس بنا پر ان کا "موضوع" ایک ہی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر کو ایک بات سوجھی تھی مگر اردو اور فارسی میں الگ الگ اس کو لکھتے ہوئے وہ بات کہیں سے کہیں پہنچ

گئی اور یہ محض ہئیت کا یا غزل کی زبان کا فرق بھی نہیں (اگرچہ یہاں بھی ماننا پڑے گا کہ اُردو شعر میں صراحت زیادہ ہے اور فارسی میں مقابلتہً ایما و کنایہ سے کام لیا گیا ہے) پھر بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ فارسی کا شعر میر صاحب سے زیادہ بیدل کا معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے اور اُردو شعر سے اس کی مماثلت چند الفاظ تک محدود ہے۔ دونوں الگ الگ موضوعات پر ہیں، جہاں اُردو شعر کی تاکید طلسم کی ناپائیداری پر ہے، وہاں فارسی شعر شوقِ تعمیر میں سالہا سال صرف کرنے کی بے حاصلی پر زور دیتا ہے۔ ایسے میں جالبی صاحب کا یہ کہنا کہ "میر کا اردو کلام پڑھ کر جب فارسی کلام پڑھتے ہیں تو اس میں وہ گھلاوٹ، سوز اور نشتریت محسوس نہیں ہوتی جو میر کے اُردو کلام کا خاصہ ہے۔" نشتریت سے مراد اگر کاٹ دار لہجے میں کوئی صریح بات کہنا ہے تو یقیناً وہ اس خاص اُردو شعر میں واضح طور پر موجود ہے مگر "سوز اور گھلاوٹ" کے لفظ یہاں اتنے مناسب معلوم نہیں ہوتے، چاہے اور مقامات پر کتنے ہی برمحل کیوں نہ ہوں۔

اب ذرا دوسروں کے نشان زدہ متقابل اشعار بھی ایک نظر میں دیکھ لیجیے، پہلے ابواللیث صاحب ؎

جس شعر پر سماع تھا کل خانقاہ میں
وہ آج میں سُنا تو ہے میرا کہا ہوا

بر ہر غزلِ من اجتماع است    در مجلسِ صوفیاں سماع است

اردو کا ایک اور شعر فارسی سے قریب تر ہے:

ہے مری ہر اک غزل پر اجتماع
خانقہ میں کرتے ہیں صوفی سماع

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ واضح طور پر اُردو شعر کمزور ہے اور اگر کسی ایک کو "چربہ یا ترجمہ" کہا جا سکتا ہے تو اسی کو۔ ظہری صاحب نے پہلے اردو کا شعر کا تقابل ایک اور فارسی شعر سے کیا ہے اور وہ مناسب تر ہے۔

دوش بر شعرِ ترے در رقص آمد جانِ ما
چوں نظر کردیم، بُود آں شعر در دیوانِ ما

اس میں اور اُردو شعر میں "جذب و کیف" کا جو فرق محسوس کرنا چاہیے وہ اس نکتے پر مبنی ہو گا کہ فارسی میں رقصِ جاں بھی شاعر کو ہوتا ہے اور بعد میں اپنا دیوان دیکھنے پر وہی شعر ملتا ہے تو حیرانی بھی اسی کو ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو شعر کا اہم نکتہ یہ ہے کہ ہم تو خود کو اہلِ قال سمجھتے تھے مگر اہلِ حال کو اپنے شعر پر وجد کرتے سُنا تو حقیقتِ امر معلوم ہوئی۔ اُردو میں اپنے شعری کمال کی اجتماعی توثیق ہے جبکہ فارسی میں غیر شعوری طور پر اپنے ہی کلام پر تواجد کا پہلو۔ دونوں اشعار الگ الگ کیفیات کے حامل ہیں اور ان کا تقابل صرف ظاہری مماثلت کی بنیاد پر نہیں ہو سکتا۔

رفتہ شوق شو و دیر و حرم را بگذار
طوف کن میر بہر در بسجود آمدہ را

یہاں ڈاکٹر صاحب کو اُردو کا یہ بے نظیر شعر یاد آتا ہے:

دیر و حرم سے گزرے اب دل ہے گھر ہمارا
ہے ختم اس آبلے پر سیر و سفر ہمارا

فارسی دیوان کو ذرا زیادہ توجہ سے دیکھا جاتا تو اس کے مثال ایک دوسرا شعر مل جاتا:

رہ بدل بُردم و فارغ شدم از دیر و حرم
ختم گردید بر این آبلہ سیر و سفرم

یقیناً یہ اُردو شعر جو دیوان اول میں ہے، پہلے کہا گیا ہوگا اور فارسی شعر اس کا ترجمہ ہوگا مگر اُردو میں ردیف کے حسن اور افعال کے یا محاورہ استعمال کا فارسی ترجمہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

آہوں کے شعلے جس جا اٹھتے تھے میر سے شب
واں جا کے صبح دیکھا، مشتِ غبار پایا

دراں جائے کہ سر میزد شب از من شعلۂ آہے
نشد معلوم آنجا صبح دم غیر از کفِ خاکے

اسی اردو شعر کا تقابل ظہری صاحب نے ایک دوسرے فارسی شعر سے کیا ہے:

میر جائے کہ بہ نیرانِ محبت می سوخت
صبح دیدیم بجا ماندہ کفِ خاک آں جا

جن لوگوں نے میر کے سب اردو دیوان تفصیل سے پڑھے ہیں وہ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہوں گے کہ میر نے اردو میں بھی قریب المعنی اشعار خاصی تعداد میں کہے ہیں اور ہر جگہ ایک سی کیفیت نہیں۔ ایسے میں کوئی فارسی شعر بھی کسی خاص اردو شعر کی نسبت کمزور معلوم ہو تو اس میں اردو فارسی کی تخصیص نہیں، ایک قلبی واردات ہے۔ جو کبھی گرفت میں آجاتی ہے، کبھی نہیں آتی۔

از راہِ طلب خبر نداریم
مائیم و ہمیں شکستہ پائی

رہِ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی
شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

چند مشترک لفظوں کے باوجود، اُردو شعر میں بالکل اُلٹ بات کہی گئی ہے جو اس لئے خوب صورت ہے کہ اس میں شکستہ پائی کی مدد سے سنبھلنے کی صورت پیدا ہوئی جب کہ فارسی شعر میں افتادگی محض کا مضمون ہے۔ بدیہی طور پر سنبھلنے کے بعد جو شعر کہا گیا اس میں لطف کا ایک پہلو شامل ہو گیا ہے مگر افتادگی کی واردات اس سے مختلف تھی۔

دل کہ در سینۂ من قطرۂ خونے بود است
چوں بچشم آمد از و شیوۂ طوفاں دیدم

جگر ہی میں اِک قطرہ خوں ہے سرشک
پلک تک گیا تو تلاطم کیا

یقیناً اردو شعر کا دوسرا مصرع بڑے کمال کا ہے مگر دونوں مصرعوں کا ربطِ باہم فارسی میں نسبتاً مضبوط ہے۔

من چہ دانم رسم و راہِ خانقاہ
عمرِ من در خدمتِ میخانہ رفت

سرنشینِ رہِ میخانہ ہوں، میں کیا جانوں
رسم مسجد کے تئیں، شیخ، کہ آیا نہ گیا

خانقاہ اور مسجد کا فرق بہت بڑا فرق ہے اور دونوں اشعار کا لہجہ بھی مختلف معانی کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایسے بنیادی امتیاز کے ہوتے ہوئے کسی ٹکڑے کو دوسرے کا بدل قرار دینا ظاہر پرستی ہوگا۔

ہر چند گفتہ اند کہ اے میرؔ روزِ حشر
دیدار عام می شود، اما نمی شود

موقوف حشر پہ ہے سو آتے بھی وہ نہیں     کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا

ڈاکٹر صاحب خود کہتے ہیں کہ اسی خیال کو ایک اور فارسی شعر میں نظم کیا ہے اور اس میں مضمون ان دونوں اشعار سے زیادہ شوخ اور رنگین ہوگیا ہے۔

دیدنِ او بہ حشر ہم رمزیست
طبعِ شوخش بہانہ خو افتاد

مفروضہ شاید یہ ہے کہ ان اشعار کا موضوع علمِ کلام کا مسئلہ رویتِ الٰہی ہے۔ اسی بنیاد پر جناب نثار احمد فاروقی نے میرؔ کو معتزلی مسلک کا حامل قرار دے دیا ہے مگر شاید ایک اور شعر ان کی نظر سے نہ گزرا ہو:

بحث با منکرانِ رویت نیست
ہر کرا چشم نیست معذور است

ایسی بحثوں پر بہترین تبصرہ خود میرؔ صاحب کر چکے ہیں:

سہل ہے میرؔ کا سمجھنا کیا
ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

بہر حال میرؔ کے جملہ احوال و مقامات میں سے کسی ایک ہی میں اس کو دائمی طور محصور سمجھنا، میرؔ کی طویل حیاتِ ادبی اور گوناگوں تجرباتِ افکار پر کوئی نہ کوئی لیبل لگانے کی کوشش سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر ابو اللیث صاحب نے چند ایک اور اشعار اور مصرعے بھی تقابل کے لئے لکھے ہیں مگر ان کی آپس میں کوئی نسبت نہیں البتہ

یہ بات انہوں نے بہت اصرار کے ساتھ کہی ہے کہ میر کی فارسی شاعری میں انکسار کا لہجہ ہے جب کہ اردو شاعری میں اپنی ہستی کی اہمیت کا احساس۔ انکسار کو وہ اپنی "کمزوری کا اعتراف" کہتے ہیں مگر انھیں شاید یاد نہیں رہا ہوگا کہ فروتنی اور انکسار کے اشعار تو میر نے اردو میں بھی کہے ہیں:

کب اور کیا ہوتا عوض ریختے کے کاش
پچھتائے بہت میر ہم اس کام کو کر کے

---

اے میر، شعر کہنا، کیا ہے کمالِ انساں　　یہ بھی خیال سا کچھ خاطر میں آ گیا ہے

---

نقصان ہوگا اس میں نہ ظاہر کہاں تلک　　ہو دیں گے جس زمانے کے صاحب کمال ہم

اسی طرح تعلی اور تفاخر کے اشعار فارسی کلام میں بھی موجود ہیں:-

گذشت نوبت قدسی و صائب و طغرا
دریں زماں ہمہ دیوانِ میر می خوانند

---

پہلوانم بفنِ شعر اے میر
ہر کہ شد رو بکشم، بر و افتاد

---

دریں فن گرچہ کم گو بودہ ام میر
ولیکن عالمے شد قائلِ من

دعوائے کمال اور اپنے زمانے میں کمال کا احوال، اردو اور فارسی دونوں میں ملتا ہے اور کسی ایک کی تخصیص، زبان سے نہیں۔

جناب اختر علی تلہری نے چند ایک مزید اشعار کا تقابل کر کے ان پر محاکمہ کیا ہے اور دو تین مقامات پر انصاف کا تقاضا ہے کہ ان سے اختلاف مشکل ہے مثلاً

دل می کشد بہ صحرا ہنگام کار آمد
شوریست در سرِ من، شاید بہار آمد

---

اک موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی　　شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

---

پھر نہ دیکھا کچھ، بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک میں نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

---

سحر گہ بر سرِ پروانہ رفتم　　کفِ خاکسترے گرمے بجا بود
ندیدم میر را در کوئے او یک　　غبارِ ناتوانے با صبا بود

---

نہ دیکھا، میر آوارہ کو لیکن　　غبار اک ناتواں سا کو بکو تھا

قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار
تیرا تو میرؔ غم سے عجب حال ہو گیا

عمل: ذوالفقار تابش

آخری شعر کی ترجیح انہوں نے اس بنیاد پر کی ہے کہ "غبارِ ناتوانے" کو مرکب اضافی بھی سمجھا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ مسئلہ طرزِ املا کا ہے اس کو غبارے ناتوانے لکھا جائے تو باعثِ ترجیح قائم نہیں رہتا۔ شعر تو یقیناً یہاں اردو ہی کا بہتر ہے مگر اس کی بہتر توجیہ شاید "کو بکو" کی ترکیب استعمال کرنے سے ہو سکتی ہو۔

"ملہری صاحب کے محاکموں کا جو بقول ان کے "بعض اشعار" کے تقابل پر مبنی ہے، عمومی نتیجہ بہت وسیع ہو گیا ہے جبکہ انہوں نے اس بات کا خیال نہیں رکھا کہ اردو شعر میر کے کون سے دیوان میں ہے اور وہ فارسی شعر کا نقشِ اول ہے یا نقشِ ثانی نظاہر ہے کہ کون کس کا ترجمہ ہے اور کیا ہے، اس کے بعد ہی سطے کیا جا سکتا ہے۔ پھر ترجیح کا رویہ اردو کے متحد المضمون اشعار کے بارے میں بھی اختیار کرنا ہو گا۔

بہر حال میر کے فارسی اردو اشعار کی مشابہت انہی پندرہ بیس مثالوں پر ختم نہیں ہو جاتی (اور مفرد اشعار سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ چند ایک فارسی غزلوں کی مشابہت اردو غزلوں کے ساتھ بھی نمایاں طور پر موجود ہے اور ایسی غزلوں میں کئی ایک شعر بہت زیادہ قریب آجاتے ہیں) یہ سب شعر اور متقابل غزلیں سامنے ہوں تو محاکمہ مضبوط بنیاد پر کیا جا سکتا ہے۔ طوالت کا خوف نہ ہو تو ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر چند ایک نتیجہ خیز اور نمائندہ مثالوں پر اکتفا کرنا بہتر ہو گا۔ پہلے کچھ مزید مفرد اشعار:

یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے (دیوان اوّل)

دور از اں سرمایۂ جاں ہیچ لطفِ زیست نیست
ہر کہ رفت است از درش گوئی ز دنیا رفتہ است

اردو شعر مختصر اور بلیغ ہونے کے علاوہ، اپنے ذاتی تجربے کو (جو انہیں حال ہی میں حاصل ہوا تھا) بے ساختگی سے بیان کرتا ہے اور "در" کی نسبت "گلی" کا لفظ بھی 'جہاں' کے مقابل برمحل اور بہتر معلوم ہوتا ہے۔

اب خرابہ ہوا جہان آباد ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

بس کہ در ہر کوچہ از جورِ کسی بیداد شد
عاقبت شہرِ جہاں آباد جور آباد شد

"ہر قدم پہ گھر" ہونا رونق کی بجائے ازدحام کی تصویر بناتا ہے اور خرابہ ہونے کی کوئی توجیہ شعر کے اندر موجود نہیں۔ جہاں آباد اور جور آباد کا تقابل لفظی سہی مگر تبدیلیِ احوال کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

یک بیاباں برنگِ صوتِ جرس مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی (دیوان اوّل)

کستم فریاد رس جز بیکسی نبود دریں وادی
کہ چوں صوتِ جرس بسیار دور از کارواں ماندم

فارسی شعر میں ضرورت سے زیادہ توجیہ اور اطناب ہے اگرچہ اردو شعر کا پہلا مصرع کسی فارسی شعر کا مصرع بھی ہو سکتا تھا۔

اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا
آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا (دیوان دوم)

در موج خیز دہر، حبابی، بخود مناز
تا چشم وا کنی کہ یک بار نیستی

اردو شعر فارسی کے ترجمے کی کوشش معلوم ہوتا ہے مگر فارسی کے دوسرے مصرعے کا ترجمہ نہیں ہو سکا اور شاید مطلع کی شکل میں ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ "چشم" اور "نیستی" کا لطف آنکھیں، اور خواب سے ادا نہیں ہوتا۔

کاش اس اے میر زباں بند رکھا کرتے ہم      صبح کے بولنے نے ہم کو گرفتار کیا (دیوان دوم)

کاش میداشتم اے میر زباں را در کام
آخر ایں زمزمۂ صبح گرفتارم کرد

فارسی شعر میں غزلیت کا لہجہ غالب ہے جبکہ اردو میں بول چال کی عام زبان کا انداز ہے۔ فارسی شعر لگتا ہے اصل ہے اور اُردو شعر اس کا با محاورہ ترجمہ۔

خانقہ کا تو نہ کر قصد ٹک اے خانہ خراب
یہی اک رہ گئی ہے بستی مسلمانوں کی (دیوان اوّل)

جانب خانقہ اے کافر بدکیش مرو      رحم بنمای بہ احوال مسلمانے چند

فارسی شعر میں غزلیت کی کمی "کافر بدکیش" کی صراحت سے پیدا ہو گئی ہے۔ اُردو کے دوسرے مصرعے میں رحم کی اپیل نہیں پھر "بستی" میں جو واقعیت ہے وہ "مسلمانے چند" میں نہیں۔ "مرو" کی نسبت "قصد نہ کر" طویل سہی مگر عصری صورتحال کے خطرات کی نشان دہی کرتا ہے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں      ساری مستی شراب کی سی ہے (دیوان اوّل)

میرس اے میرؔ از اندازِ چشمِ نیم بازِ او
قیامت تشنہ ام جامِ شرابِ نیم رس دارم

فارسی شعر میں پھر ضرورت سے زیادہ توجیہ اور اطناب ہے جبکہ اُردو شعر میں "ساری" اور "شراب کی سی" کہہ کر بے ساختگی پیدا کی ہے۔ حالانکہ شعر میں متعدد صنائع کا استعمال ہوا ہے مگر زبان کی سادگی سے احساس نہیں ہوتا۔

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے (دیوان چہارم)

کے پیشِ منعمانِ جہاں می شود دراز
بالینِ زیرِ سر شدہ دستِ گدائے او

غالباً اردو شعر فارسی شعر کے بعد کہا گیا ہے اور اس میں اصل بات کو بہت ترقی دے کر اور ذاتی بنا کر کہا گیا ہے۔ "دستِ گدا" کا محاورہ فارسی میں "دستِ گدائی" کے لیے درست ہے مگر "دستِ طمع" کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "ہاتھ کا" بالین زیرِ سر" ہونا" سرہانے دھرے" سو جانے کی نسبت "تدریجی عمل کو پیش نہیں کرتا۔ "منعمانِ جہان" کی جگہ صرف "کسو" سے کام لینا جزالت کا کرشمہ ہے۔

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی　　تجھے میر سمجھا ہاں کم کسو نے

خرامت بطرزے کلامت بطورے　　ترا کم کسے میر فہمیدہ باشد

اُردو شعر میں واقعیت اور فارسی میں غزلیت زیادہ ہے۔ "سمجھا ہے" کی نسبت "فہمیدہ باشد" کا صیغہ استعمال کرنے کا محل مناسب ہے کہ مستقبل غیر معین رہتا ہے۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب

آیا نہیں یہ لفظ تو ہندی زباں کے بیچ　　(دیوان چہارم)

خرمی معلوم شد لفظِ زبان دیگر است

ایں لغت جائے نمی یابند در فرہنگِ ما

شعر کا بنیادی نکتہ تو وہی ہے اگرچہ "لفظ" اور "زبان" کے سوا سب کچھ بدل گیا ہے۔ "خرمی" فارسی ہی کا لفظ ہے مگر اس کی صوتی نشست کچھ ایسی عمدگی سے باندھی گئی ہے کہ دوسرے مصرعے کا غیر حقیقی نتیجہ بھی قابلِ قبول ہو جاتا ہے۔

آ کر بکھیرے پھول مری مشتِ خاک پر　　مرغِ چمن اگر حقِ صحبت ادا کرے　　(دیوان پنجم)

حقِ صحبت نہ طیروں کو رہا یاد　　کوئی وہ پھول اسیروں تک نہ لایا　　(دیوان ششم)

بلبل! حقِ صحبت مگرت یاد نبود ست

کز باغ گذشتیم و تو آواز ندادی

یہاں بھی ترجمہ بہت آزاد ہے مگر بنیادی نکتہ نہیں بدلا۔ اُردو شعر میں اسیری کے اضافے سے قلب ماہیت ہو گئی مگر فارسی شعر میں ذاتی واردات جھلکتی ہے۔

ہم نے یہ مانا کہ واعظ ہے مَلک　　آدمی ہونا بہت مشکل ہے میاں!　　(دیوان سوم)

از عصا و سبحہ و سجادہ و صوم و صلوٰۃ

رہنمائے عالمے شد شیخ و خود آدم نشد

"میاں" کے تلفظ میں روزمرہ کی لذت ہے مگر جو کاٹ فارسی شعر میں ہے، وہ اُردو میں موجود نہیں۔

اب کچھ مثالیں ایسی بھی دیکھ لیں جن میں کوئی مضمون ایک زبان میں مختلف طریقوں سے آزمایا گیا مگر دوسری زبان میں اس کی تکمیل یافتہ صورت موجود ہے۔ ؎

صنعتِ گریاں ہم نے کیں سینکڑوں یاں لیکن

جس سے کچھ وہ ملتا ایسا نہ ہنر آیا　　(دیوان دوم)

صنعت گریاں بہتیری کیں لیک دریغے، ہزار دریغ
جس سے یار بھی ملتا ہم سے ایسا وہ نہ ہُنر آیا (دیوان پنجم)

---

مرا بدست بصد صنعت آمدی و شدی
نصیب آں کہ تو اش چوں ہُنر بدست آئی

ہُنر کی طرح ہاتھ آنا، ایک ایسا تصور تھا جو اُردو میں منتقل نہ ہو سکا۔

اخلاص ہمدگر بہ جہاں رسم کہنہ بود
بیبے شُدست عشق ہمیں در زمانِ ما

---

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروّت کو کیا ہوا (دیوان اوّل)

---

آگے تو رسم دوستی کی تھی جہاں کے بیچ
اب کیسے لوگ آئے زمیں آسماں کے بیچ (دیوان پنجم)

---

کیا زمانہ تھا وہ جو گزرا میر
ہمدگر لوگ چاہ کرتے تھے (دیوان ششم)

ایک بنیادی فکر جس نے شاعر کو ساری عمر سرگرداں رکھا اور ہر بار اس کے شعری قالب میں تازگی برقرار رہی۔

اور آخر میں ایک ایسا خیال جو ہمارے دور میں آن کے فیضؔ کے ہاتھوں پھر سے تازہ ہوا اور جس کا آخری نمونہ ان کو پسند بھی ہے۔

نخلِ عشقت رسید چوں براد حلق ہائے بُریدہ بار آورد
منصور کی نظر تھی جو دار کی طرف سو پھل وہ درخت لایا آخر سر بریدہ (دیوان سوم)
موسم آیا تو نخلِ دار میں میرؔ سرِ منصور ہی کا بار آیا (دیوان ششم)

اس میں کوئی کمی رہ گئی تو وہ شاید کسی ایسے قلمی نسخے کی دریافت سے پوری ہو جائے جس میں "نخلِ دار میں" کی بجائے "نخلِ دار پہ" لکھا ہو۔ جیسے فیضؔ نے ایک جگہ حافظے کی مدد سے درج کیا ہے۔

(۶)

ریختہ کاہے کو تھا اس رتبۂ اعلیٰ میں میرؔ جو زمیں نکلی اسے تا آسماں میں لے گیا
تا بودہ ام ز دقتِ خود آگاہ بودہ ام دستم بکار بود و دلِ من بسیار بود

"تہ داری" کے بعد میر کے معیارِ سخن میں "مربوط گوئی" کا تصور شاید سب سے اہم ہے۔ نکات الشعرا کی تنقیدوں میں اور خود میر کے اشعار میں یہ اصطلاح کچھ اس طرح استعمال ہوئی ہے کہ ایک جمالیاتی اور اجتماعی قدر بن گئی ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہی میر جس کو دوسروں کے جستہ جستہ شعر کہنے پر اعتراض تھا، جو مصرع سے مصرع اور شعر سے شعر ایسے پیوست کرتا تھا کہ غزل کے الگ الگ شعروں میں بھی ایک نازک سا رشتہ پیدا ہو جائے۔ جونہی سے نئی زمینیں نکالتا تھا اور اس تعین کے امکانات کا دائرہ سا کھینچ کر اس میں گل بوٹے لگاتا تھا، ہم اس کے چھوٹے بڑے انتخاب کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کے بہتر نشتر تلاش کرتے پھرتے ہیں اور حالانکہ یہ کام ایک زمانے سے ہو رہا ہے، ہمیں اس کی بے حاصلی کا خیال بھی نہیں آتا۔ ہاں کوئی صاحبِ علم تعلیمی مقاصد کے لیے یا کوئی نقاد کسی فراموش شدہ پہلو پر توجہ دلانا چاہے تو اس کا حساب دوسرا ہے۔ جہاں تک غزل کی مجموعی صورت کا تعلق ہے۔ میر نے اردو اور فارسی دونوں میں چند ایک ساتھیوں اور کچھ پیشرو باکمالوں کی زمینیں بھی استعمال کی ہیں اور چند ایک کو ادنےٰ تغیر کے ساتھ اپنایا ہے یعنی کہیں قافیہ ذرا سا بدل دیا ہے، کہیں ردیف میں خفیف سی تبدیلی کردی ہے یا وزن کو چھوٹا بڑا کر دیا ہے، اس کے باوجود جتنی نئی زمینیں میر نے نکالی ہیں، شاید ہی اردو کے کسی اور شاعر نے نکالی ہوں۔ فارسی میں انہوں نے سعدی اور حافظ سے لے کر عرفی اور نظیری، صائب اور کلیم بیدل اور ناصر علی اور شیخ علی حزیں اور آنندرام مخلص تک کی زمینوں کو برتا ہے مگر یہاں بھی اچھی خاصی تعداد ایسی زمینوں کی ہے جو غالباً اس کی اپنی ایجاد ہیں۔ ان میں بعض کو اس نے فارسی میں بھی برتا ہے۔ اور بعینہٖ یا ادنےٰ تغیر کے ساتھ اردو میں بھی۔ ایسی مشترک زمینوں میں چند ایک اشعار از خود ترجمہ بھی ہو گئے ہیں اور اغلب یہی ہے کہ پہلے انھیں فارسی میں لکھا گیا تھا اور پھر اردو میں۔ ان سب زمینوں کا اور ان میں شامل شعروں کا باہمی تقابل تو اس طویل مقالے کو اور بھی طویل کر دے گا اس لئے یہاں صرف چند ایک اہم مثالوں کی نشان دہی کافی ہو گی:

پہلے وہ غزلیں دیکھیے جن میں یا کوئی ردیف نہیں تھی، یا کوئی ایسا فارسی لفظ تھا جو اردو میں بھی برتا جا سکتا تھا یا آسانی سے بدلا جا سکتا تھا اور قافیے دونوں زبانوں کے لائے جا سکتے تھے:

آمارچ قست تربتِ اہلِ وفا ہنوز — (غزل شمارہ ۳۰۱ - ۴ شعر)
ہوتا نہیں ہے بابِ اجابت کا وا ہنوز — (دیوان اوّل - ۹ شعر)
(ایک اضافی شعر نکات الشعرا میں)
اس شوخ نے سنا نہیں نامِ صبا ہنوز — (دیوان دوم - ۱۰ شعر)

---

باقی ست بعدِ مرگ ہم آثارِ ما ہنوز — (غزل شمارہ ۳۰۲ - ۲ شعر)
ہے میرے لوہو رونے کا آثار سا ہنوز — (دیوان دوم - ۷ شعر)

---

برہش گذار می کن وے اے صبا نہ چنداں — (غزل شمارہ ۴۴۱ - صرف مطلع)
تو گلی میں اس کی جا آوے اے صبا نہ چنداں — (دیوان اول - ۷ شعر)

---

نشہ شور مزاج امسال از تدبیر ہم آخر (غزل شمارہ ۲۸۵ - ۳ شعر)
جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر (دیوان دوم - ۷ شعر)

دونوں غزلوں کے مقطعوں میں" بیابان مرگ" ہونے کی پیش بندی کی گئی ہے اور یہ وہی خطرہ ہے جس سے میر کو راجہ ناگر مل نے روکا تھا (بحوالہ ذکر میر)

---

بہ اُمیدے کہ می نالی خموشی اے جرس بہتر (غزل شمارہ ۲۹۱ - ۲ شعر)
نہ ہو ہرزہ درا اتنا، خموشی اے جرس بہتر (دیوان اول - ۸ شعر)

---

با خلق چہرہ گشتم از آشنائی دل (غزل شمارہ ۳۴۷ - ۹ شعر)
پوشیدہ کیا رہے ہے قدرت نمائیِ دل (دیوان دوم - ۷ شعر)

اردو غزل کے مقطعے میں "کس سے لگائیے دل" کا اردو قافیہ برتا ہے۔

---

روئے سخن بوصف رُخت نیست سوئے گل (غزل شمارہ ۳۴۱ - ۳ شعر)
زنہار گلستاں میں نہ کر منہ کو سوئے گل (دیوان ششم - ۵ شعر)

---

رحمے بکن، تا کے ستم، آخر جفا کار، این قدر (غزل شمارہ ۲۸۲ - ۴ شعر)
کر رحم ٹک، کب تک ستم، مجھ پر جفا کار، اس قدر (دیوان اول - ۷ شعر)
کر لطف، عارض مت چھپا، عاشق سے اے یار اس قدر (مشمولہ شکار نامہ ۲ - ۹ شعر)

---

یک غنچہ خوں نخوردہ چنیں بیشتر کہ (غزل شمارہ ۲۷، ۵ شعر)
کیا بلبلِ اسیر ہے بے بال و پر کہ ہم (دیوان اول ، ۷ شعر)

غالباً اردو غزل پہلے لکھی گئی، فارسی کے چند ایک اشعار میں استفہامی انداز اتنا واضح نہیں ہوتا (اسی زمین میں سودا کی غزل بھی ہے جس میں ردیف کو بعض جگہ ذرا سا بدل دیا ہے۔)

---

یکدست سبزۂ تر از خاک من دمیدہ (غزل شمارہ ۴۵۸ - بے ردیف - ۷ شعر)
ٹک پاس آ کے کیسے صرفے سے ہیں کشیدہ (دیوان دوم - بے ردیف - ۹ شعر)

کب تک رہیں گے یارب ہر دم ہم آب دیدہ (دیوان سوم - قافیہ آب خواب - ۴شعر)
اب کچھ مزے پر آیا شاید وہ شوخ دیدہ (دیوان پنجم - بے ردیف - ۱۱شعر)

---

تا چند اضطراب کند، درکنار، دل (غزل شمارہ ۸۸ - صرف مطلع)
رہتا نہیں ہے کوئی گھڑی اب تو یار، دل (دیوان اول - صرف مطلع مصرع ثانی مشترک)
مدت تو وا ہوا ہی نہیں غنچہ وار دل (دیوان دوم - ۱۲شعر)
کھنچتا ہے اس طرف کو ہی بے اختیار دل (دیوان چہارم - ۵شعر)

ایک آدھ غزل کو چھوڑ جس میں فارسی اشعار کی تعداد زیادہ ہے۔ اکثر زمینیں ایسی ہیں جو اردو میں اپنانے کے بعد سیر حاصل ہو گئی ہیں اور بعض تو کئی برس کے بعد پھر سے آزمائی گئی ہیں۔ لگتا ہے کہ نئی زمین نکالنے یا کسی کلاسیکی زمین کو آزمانے کا آغاز فارسی میں پہلے ہوا ہے اور اسے کسی ترمیم کے ساتھ یا ترمیم کے بغیر اردو بنانے کا کام میں بعد میں کیا گیا ہے، ماسوا ایک آدھ صورت کے۔ چند ایک کا مجموعی لہجہ اور انداز تحریر فارسی سے مشابہ ہی رہا ہے مگر اکثر میں اُردو پن کا غلبہ ہو گیا ہے۔

ان کے علاوہ چند ایک ایسی غزلیں بھی ہیں جن کی ردیف بالکل فارسی تھی مگر اس کا اردو ترجمہ یا ترمیم کر کے ایک بالکل نئے سانچے کی زمین نکل آئی ہے:

گر دیدہ ایم کوی بکو شہر ناز را (غزل شمارہ ۳۷ - ۷شعر)
کرتا ہے کب سلوک وہ اہلِ نیاز سے (دیوان دوم - ۷ شعر)

---

گر سنگ زدن بر سر، گہ پارہ جگر کردن (غزل شمارہ ۴۳۷ - ۴شعر)
سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا (دیوان پنجم - ۳شعر)

اُردو زمین میں سیر حاصل غزل کا امکان تھا اور خالص اردو قافیوں کا امکان بھی مگر ان سے بہت کم استفادہ کیا گیا۔

---

شیخ در عشق بلائے گیر شدہ (غزل شمارہ ۴۶۸ - ۴شعر)
ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے (دیوان اول - ۸شعر)
خم ہوا قد کمال ما، پیر ہوئے (دیوان ششم - ۹شعر)

اُردو اشعار سے فارسی زمین کا گمان بھی نہیں گزرتا اور ان میں میر کے چند ایک مشہور شعر بھی شامل ہیں مگر فارسی غزل میں کم سے کم ایک شعر ایسا ہے جس کا کوئی ترجمہ یا بدل ممکن نہیں ہوا:

دید ہر کس نزاری من گفت      ایں جواں را چہ شد کہ پیر شدہ

ان کے علاوہ چند ایسی ٹپیوں میں جو عموماً دیوان مکمل کرنے کے لئے شامل کی جاتی ہیں، مختصر غزلیں مشترک یا مشابہ زمینوں میں ہیں، ان میں "اختلاط"، "اخلاص" اور "حیف" ردیف والی مختصر غزلیں ہیں اور یہ بھی:

من و ز سوئے تو عزم سفر، دروغ دروغ (غزل شمارہ ۳۳۱ - ۲ شعر)

ہم اور، تیری گلی سے سفر، دروغ دروغ (دیوان اوّل - ۴ شعر)

اور پھر بحر و قافیہ بدل کر، اپنے محبوب وزن میں اسی ردیف کے ساتھ شعر کی غزل دیوان پنجم میں لکھی ہے۔

ہم کو شہر سے اس مر کے ہے عزم راہ دروغ دروغ

یہ حرکت تو ہم نہ کریں گے خانہ سیاہ، دروغ دروغ

ان سب کے علاوہ بھی کئی ایک غزلیں ایسی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی تبدیلی کر کے اردو میں ایک نئی قسم کی زمین نکال لی ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ فارسی شعر کہنے کے مصروف زمانے میں ان کے تجربات حیات اور ان سے عہدہ برآ ہوتے کا جو طریقہ انہوں نے دریافت کیا تھا، اسے اُدل بدل کے ساری عمر مختلف انداز سے ادا کرتے رہے۔ شاید جیمز جائس کا یہی مفہوم تھا جب اس نے کہا کہ "ہم ساری عمر ایک ہی کہانی (ایک ہی عشائی نظم یا غزل) لکھتے رہتے ہیں جو ایک ہی انسانی تجربے کے گرد گھومتا ہے مگر یہ دیکھئے کہ کیسے گھومتا ہے۔" اور میر کی ایسی ملتی جلتی غزلوں کا، اُردو اور فارسی دونوں میں مقابلہ کریں تو بنیادی انسانی تجربے کے مختلف روپ ہمارے سامنے آتے ہیں۔

(۷)

در رہِ شعر کسے راہنمائیست مگر
حرفے چندے ست بیادم زسخندانے چند

یہی سو سوا سو مفرد اشعار جو میر کے اُردو اشعار سے پہلو مارتے ہوئے گذرتے ہیں یا وہ بیس پچیس غزلیں جو اُردو غزلوں سے مشابہ نظر آتی ہیں، میر کے دیوانِ فارسی کی ارزیابی میں حائل ہو سکتی ہیں، اگر ان کی مشابہت کے ساتھ ساتھ ان کے امتیازات بھی مدنظر نہ ہوں۔ مگر تین ہزار ابیات کے دیوان کا زیادہ سے زیادہ دسواں حصہ اُن پر مشتمل ہے اور باقی جو کچھ بھی ہے یقینی طور پر نہ تو آسی کے الفاظ میں خانہ پُری تفنن طبع کے لئے کہا گیا اور نہ بقول ڈاکٹر جالبی صاحب کے "رواج زمانہ کے مطابق معاشرے کی نظر میں اپنا رتبہ بڑھانے کے لیے۔" ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاشرے کی نظر میں میر کا رتبہ ان کی اردو شاعری کی وجہ سے ایسا بن چکا تھا کہ خود فارسی والوں کے لئے قابلِ رشک تھا۔ اس کے علاوہ فارسی کے متاخرین یعنی بیدل، ناصر علی وغیرہ، میر کی جوانی تک اپنے انجام کو پہنچ چکے تھے اور اب ان کے شاگرد جو ریختہ گوئی کی طرف مائل نہ ہوئے تھے شاعری سے زیادہ علم و فضل، نعت نویسی اور محاورات و اصطلاحات کی گرد آوری کی طرف راغب ہو چکے تھے۔ اسی تہذیبی صورت حال میں میر کا عمر عزیز کے کم سے کم دو سال فارسی گوئی پر صرف کرنا محض خارجی عوامل کی بنا پر نہیں ہو سکتا۔ شاعری کسی کی بھی زبان کی ہو، مادری زبان میں، قومی زبان میں یا اس سے بڑھ کر تہذیبی اور روایتی زبان میں، جب تک اس کی تخلیق شاعر کے لیے داخلی طور پر ناگزیر نہ ہو اس وقت تک اس میں

قدر و قیمت کا کوئی خاص پہلو شامل نہیں ہو سکتا۔

شیخ و زاہد اور اپنے وقت کے سیاسی حالات پر میر کے تبصرے سے جو اوپر گذر چکا ہے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، ان کا ذاتی مسئلہ تھا اور جس طرح کہہ رہے تھے اس وقت ویسے ہی کہنے کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا، بلکہ ایسا کر کے وہ یہ بھی سیکھ رہے تھے کہ ان باتوں کو اردو میں کہنا پڑے تو کون سا عنصر بجنسہٖ برقرار رکھنا ہوگا اور کون سا جُزو بدلنا پڑے گا۔ یقیناً میر نے فارسی گوئی کا آغاز ۱۱۶۵ھ سے بہت پہلے کیا ہوگا اور صرف حزیں کو ایک شعر سنانے اور انجام کی شہادت پر ایک رباعی کہنے تک محدود نہیں رہے ہوں گے "خوان آرزو" والے دو اردو اشعار جو نکات الشعراء سے اوپر نقل ہو چکے ہیں، ان کا مقطع بھی اب ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی کوشش سے دریافت ہو چکا ہے:

پامالِ یاس آہ کہاں تک رہوں گا میر
سر مشق کیوں بنایا تھا دیوان آرزو

یعنی اُن کو ابھی سے معلوم ہو چکا تھا کہ دیوان آرزو کو سر مشق بنانے کا نتیجہ پامالِ یاس ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اس پر نادم تھے (یہ شعر کی ایک سطح ہے دوسری سطح کا تعلق شاعری کی بجائے میر کی ذات سے ہے مگر دونوں کو الگ الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں)

دیوانِ آرزو جسے خود آرزو "دیوانِ کلاں" کا نام دیتے ہیں ابھی تک تمام و کمال کہاں؟ اس کا کوئی انتخاب بھی نہیں چھپا۔ بلکہ وہ ساڑھے سات سو شعر جو انہوں نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس کے لیے خود منتخب کئے تھے، عابد رضا بیدار صاحب نے "مجمع النفائس" میں سے معاصر اور قریب العصر شاعروں کا احوال چھاپتے ہوئے ان میں سے بھی صرف ۴۶ شعر شامل کئے ہیں محض ان کی روشنی میں آرزو کی شاعری پر کوئی عمومی تبصرہ نہ ممکن ہے اور نہ اس کی ضرورت۔ انہوں نے خود بتایا ہے کہ جوانی میں شفیعائے اثر شیرازی کے سارے دیوان کا جواب "قصیدہ بہ قصیدہ اور غزل بہ غزل" انہوں نے چند مہینوں میں کہہ کے رکھ دیا تھا۔ مجمع النفائس کے نسخۂ رامپور میں بحوالہ مولوی امتیاز علی مرحوم) انہوں نے بتایا ہے کہ اب میں پیرانہ سری میں فغانی کے دیوان کا تتبع کر رہا ہوں یعنی اس کی ہر غزل پر غزل لکھ رہا ہوں اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ لوگوں نے اس کی چیدہ چیدہ زمینوں کا تو بہت اقتفاء اتباع کیا ہے (یا جسے ایرانی "استقبال" اور ہم طرح گوئی کہتے ہیں) مگر پورے دیوان کا تتبع مجھ سے پہلے شانی تکلو (ایک ہراتی شاعر) کے سوا کسی سے بن نہیں پڑا (گویا یہ کام بھی کوئی اور ان سے پہلے کر چکا تھا)

چنانچہ میر نے جب دیوان آرزو کو سر مشق بنایا ہوگا، تو صرف اس میں سے ریختہ کے لئے مناسب زمینیں تو نہیں نکالی ہوں گی۔ یقیناً ان کی طبیعت کے تخلیقی پہلو نے، آرزو کے اتباعی انداز، اجتہادی تصرفات سے احتیاط، مولویانہ نقطۂ نظر، بارد تمثیلوں اور عربیت کے مظاہروں سے (جو ۴۶ شعروں کے انتخاب میں بھی جا بجا موجود ہیں) بیزاری محسوس کی ہوگی اور اس زمانے میں جو کچھ فارسی میں کہا ہوگا اسے اپنے دیوان میں شامل نہیں کیا ہوگا، ماسوا ایک غزل کے:

ہست ایں جوابِ آں غزلِ آرزو کہ گفت ـــ "در ہر قدم ز آبلہ انجیر می خورم"

یہاں بھی لہجہ اتباع و اقتفا کا نہیں، جواب دینے کا ہے (از آبلہ انجیر خوردن اس قسم کے محاوروں میں سے جو آرزو اور ان کے شاگرد جمع کیا کرتے تھے۔ یہاں دیوان میں چھپے ہوئے لفظ "زنجیر" کی بجائے حاشیے میں دیئے ہوئے "انجیر" کو بہتر سمجھا گیا ہے)

اسی غزل میں یہ شعر بھی دیکھیے کہ اس کا روئے سخن کدھر ہے:

موشد سفید و طفل مزاجی ہماں کہ بود
چون صبح پیر گشتہ ام و شیری خورم

اس کے مقابلے میں میر کا اپنا حال بھی ایک ایسے محاورے کی مدد سے واضح ہو سکتا ہے جو "چراغ ہدایت" میں بھی ہے اور ترمیم کے ساتھ میر کے ایک مقطع میں بھی۔ "غورہ اکش مویز شد" مویز، منقے کو کہتے ہیں اور غورہ کچے انگور کو، یعنی فلاں شخص ابھی پختگی کو نہیں پہنچا تھا کہ منقے کی طرح لگنے لگا۔ میر صاحب کہتے ہیں:

میر در غورگی مویز شدم
میوۂ خام چیدہ را مانم

اسی غزل کے کچھ اور شعر بھی دیکھیے:

| | |
|---|---|
| بے تو، شاخ بُریدہ را مانم | تازہ آفت رسیدہ را مانم |
| نیست بیش از خیال ہستی من | صورتِ ناکشیدہ را مانم |
| شُدرہ آشیاں فراموشم | طائرِ نو پریدہ را مانم |
| من ادب دانِ بزمِ دہر نیَم | طفلِ صحبت نہ دیدہ را مانم |
| رفتم از جا و نیستم جائے | رنگے از رُخ پریدہ را مانم |

متاخرین کے بیاض نما دیوان اگر آپ نے دیکھے ہوں تو یہ "تازہ خیالی اور مربوط گوئی آپ کو اس سے بالکل الگ معلوم ہو گی اور ایسی بہت سی غزلیں دیکھنے کے بعد آپ کو میر کا یہ تقاضا نامناسب نہیں لگے گا:

بیا انصاف اگر داری بدستم بوسہ دِہ، دشمن
کہ من در فنِ شعر و شاعری دستِ دگر دارم

یہ "دستِ دگر" کی شاعری خود آرزو کو تو میسر نہ ہو سکی اور شاید اسی لیے "مجمع النفائس" کے ابتدائی نسخوں میں (جن میں سے ایک کو جناب عابد رضا بیدار "کامل ترین" کہتے ہیں مگر کئی ایک ایسی چیزیں جو بقول عرشی مرحوم بعد میں بڑھائی گئیں اور نسخہ رامپور میں موجود ہیں، یہاں سے غائب ہیں)۔ میر کا کوئی ذکر نہیں (البتہ درد اور ان کی فارسی رباعیات کی تحسین موجود ہے، جو نکات الشعرا میں بھی درج ہے) لیکن بالآخر "مجمع النفائس" کے آخری نسخے میں جو آرزو نے اپنی وفات سے تھوڑی دیر قبل بقول عرشی صاحب مرحوم ۱۱۶۰ھ میں دہلی چھوڑتے وقت مکمل کیا تھا، میر کا احوال بھی شامل کر لیا گیا۔ یہ اضافہ ۱۱۶۷ھ یا ۱۱۶۸ھ میں کیا

گیا ہو گا (بحوالہ مقدمہ دستور الفصاحت) اس کی عبارت بلا ترجمہ یوں ہے:

"میر تقی میر...... در اول مشق اشعار ریختہ کہ بزبان اردو شعریست بطرزِ فارسی، توغل بسیار نمودہ، چنانچہ شہرۂ آفاق است۔ بعد آں بگفتن اشعارہ فارسی بطرزِ خاص گرویدہ، قبولِ خاطرِ ارباب سخن و دانایانِ ایں فن گشت طبعش بمضامین تازہ و غیر مبتذل معنی پرواز است و اشعارا و بلطافت ادا و انداز۔ از بسکہ ذہنِ مناسب و طبعِ ثاقب یافتہ، در ابتدائے شعر، رتبۂ سخن را بپایۂ اشتہار سانید ..... ہر چند دیوان مختصر دارد اما غزلہائے دردمندانہ و عاشقانہ می گوید"

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کو یہ اضافہ آرزو کی طرف سے نہیں لگتا۔ (جبکہ متن اور اضافے جو اسی نسخے میں موجود ہیں، ان سے انھیں کوئی سروکار نہیں اور کم سے کم ایک جس میں آرزو نے اپنے آخرِ عمر کے حالات لکھے ہیں اور جو پٹنہ والے نسخے، مرتبہ عابد رضا بیدار، میں بھی نہیں، کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) اور چونکہ یہ نسخہ میر کے (اس وقت کے مربی) راجہ ناگرمل کے لیے ۱۱۶۷ھ میں تیار ہوا تھا، جالبی صاحب کو گمان ہے کہ درج بالا عبارت غالباً میر کے ایما پر بڑھائی گئی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کی طرزِ انشا، میر کی طرزِ انشا سے مشابہ ہے (میر اور آرزو کی طرزِ انشا کے امتیازات کی تفصیل کو انہوں نے غیر متعلق سمجھ کے خارج از بحث کر دیا ہے جب کہ مشابہت اس سے زیادہ نہیں کہ دو جملوں میں ہلکا سا قافیہ استعمال ہوا ہے جسے میر کی خصوصیت قرار دینا اس عہد کی عام فارسی خصوصاً آرزو کی فارسی سے واقفیت کی دلیل نہیں۔ اس سے زیادہ مقفّیٰ نثر تو "تنبیہ الغافلین" کے دیباچے ہی میں مل جائے گی اور نثری قافیے کا اتنا خفیف سا استعمال جو آج بھی کئی ایک لکھنے والوں کے قلم سے بلا ارادہ نکل جاتا ہے ایسی کون سی بات ہے کہ میر سے مخصوص ہو) بہرحال افسوس ہے کہ آرزو نے تو اپنی "روشِ مدعیانہ" کی تلافی کر دی اور ہمیں میر سے اتنا سوئے ظن ہے کہ ہم اس کو بھی ان کے کھاتے میں ڈالتے ہوئے ذرا نہیں ہچکچاتے اور یہ سب کچھ لکھنے کے بعد اگر "یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا" تھا تو پھر اتنے بڑے سوئے ظن کا فائدہ؟

بہرحال چند ایک الفاظ و تراکیب پر توجہ لازم ہے — طرزِ خاص، مضامین تازہ و غیر مبتذل، لطافتِ ادا و انداز — اور آخر میں "دردمندانہ اور عاشقانہ" غزلیں جن کا وجود میر کے دیوان فارسی میں اتنا نمایاں ہے کہ ان کے لیے فارسی گوئی کی شدید داخلی ضرورت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ یہاں پوری غزلیں نقل کرنے کی بجائے چند ایک مطلعے اس خیال سے لکھے جاتے ہیں کہ دیوان سامنے ہے تو نشان دہی سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے

لختِ دل ہر شب پدا مانم، نمی دانم چرا
ہر سحر سر در گریبانم، نمی دانم چرا

---

بہ شکستن رسید حالا شب　　　باقیِ داستاں، بہ فردا شب

---

طور ہا شد مختلف دور زمانِ دیگر است　　آں زمیں بربار فت ایں آسمانِ دیگر است

---

از دلِ من تا غمِ جاناں نہ رفت　　رونقِ سرتا سرِ آں خانہ رفت

---

بے حجابانہ یار من برخاست　　پردہ از روئے کار من برخاست

---

بوالہوس را بہ بزمِ ما جا نیست　　عاشقی است ایں تماشا نیست

---

تا بدا من پاکشیدم اہلِ دردے برنخاست
خوں دے، مژگاں ترے رخسار زردے برنخاست

---

فتنہ و آفت و آشوب و بلا می گویند
چشمِ بیمار ترا شوخ چہا می گویند

---

چند پرسی کہ محبت بہ من زار چہ کرد　　چہ بگوئیم کہ سیلاب بہ دیوار چہ کرد

---

سرگزشتِ من ادا از ہر زبانے می شود　　ایں حکایت رفتہ رفتہ داستانے می شود

---

در محبت محنت بسیار می باید کشید　　بہر یک نظارہ صد آزار می باید کشید

"بزم تیموریہ" میں "اقبال نامہ جہانگیری" کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک بار عبدالرحیم خانخاناں، حاجی کی اس طرح پڑ بہر یک گل محنتِ صد خار می باید کشید" غزل لکھ رہے تھے تو جہانگیر نے دیکھا اور فی البدیہہ کہا:

ساغرے بر روئے گلزار می باید کشید
ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

اس کے بعد میر کی غزل دیکھیں تو صاف نظر آتا ہے کہ جہانگیر کے دور میں اور میر کے دور میں کیا فرق پڑ چکا ہے۔

---

عنقریب است کزیں بے سرو ساماں چند　　دامنے چند بیابند و گریبانے چند

---

بہ گلشن بسے آنکہ گردیدہ باشد      گُلِ نازکے چوں تو کم دیدہ باشد

---

مشو غافل، اوقات را در نظر دار      کہ وقت است چوں سیفِ قاطع خبردار

---

او چہ داند کہ گل داغ پنجہ است ہنوز
غنچہ اسے ہست دہوایش نرسیدہ است ہنوز

---

در دہر چوں تو ظلم شعارے ندید کس
تا آشناتر از تو نگارے ندید کس

---

می گشت بادِ صبح گہے گردِ خانہ اش
زد آتشم بدل روشِ محرمانہ اش

---

فراموشت نخواہم کرد تا در جسم جاں دارم
چو مرغِ دوست حرفِ دوست اکثر بر زباں دارم

---

با غم جاودانہ ساختہ ام      چہ کنم، با زمانہ ساختہ ام

---

بندۂ بوتراب گردیدم      ذرۂ آفتاب گردیدم

---

چہ شد گر فقر دارد خاکِ راہم      شکستے ہست در طرفِ کلاہم

---

من کہ از خود خبرے یافتہ ام      از فقیراں نظرے یافتہ ام

---

یا بیا تلخِ او گوارا کن      یا برو ترکِ ایں تمنا کن

---

محبت پیشہ‌ام دارم جگر خوں　　دلِ من می تپد بسیار در خوں

---

یارب چہ روز بود کہ دل گشت یارِ او
تا زندگی دگر نشدم من دُچارِ او

---

یکدست سبزۂ تر از خاکِ من دمیدہ
وقت است اگر بیاید آں آہوئے رمیدہ

---

سر کن کہ در خزاں بہ چہ دل ہا، نہادہ ای
اے عندلیب، دیر بدستم فتادہ ای

---

بر چہ امید دل زجا رفتی　　سوختی، خوں شدی و وا رفتی

---

خوش است اے بے وفا گر چند روئے خود بگردانی　　زنی حرفی بہ ابرو تا کجا در رُو بگردانی

ذکرِ میر میں بایزید درویش کے ساتھ تیسری اور آخری ملاقات کا جو احوال لکھا ہے اس کے دوران درویش حالت نزع میں حکیم شفائی کا یہ بے نظیر شعر پڑھتا ہے :

پرستاری ندارم بر سرِ بالینِ بیماری
مگر آہم ازیں پہلو بآں پہلو بگرداند
نہیں بیمار کی بالیں پہ اب تیمار گر کوئی
ہمارا درد ہی اُٹھ کر ذرا کروٹ بدل ڈالے　　(ترجمہ راقم)

شفائی میر کے محبوب شاعروں میں سے ہے شاید اس لیے کہ اس نے بول چال کی زبان میں دانش و حکمت کے مضامین ادا کئے ہیں۔ اُردو میں بھی ایک غزل کا مطلع ہے :۔

ہے غزل میر یہ شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

میر حسن کہتے ہیں کہ میر کا طرزِ کلام شفائی سے مشابہ ہے مگر جیسا کہ اس غزل کی زمین میں ترمیم سے معلوم ہو سکتا ہے، میر شفائی کو پسند کرنے کے باوجود، فارسی میں بھی اس سے ذرا مختلف ہی رہنا چاہتے ہیں۔ ثراں ریکا کے خیال میں شفائی کو دعوٰے ہے کہ وہ کوئی نیا طرز اختیار

کر رہا ہے جب کہ اس کی شاعری، بابا کی ذرا ترمیم شدہ صورت ہے۔ بہرحال شفائی کی طرف میر کی کشش کا یہی باعث کافی ہے کہ اس نے متاخرین کے امام بابا فغانی کو بھی ترمیم شدہ حالت میں قبول کیا ہے۔ عرفی و نظیری اور صائب و کلیم سے بھی کہیں کہیں متاثر ہونے کے باوجود میران کو "درلبست" قبول کرتے نظر نہیں آتے اور غنی، بیدل اور ناصر علی کے لیے ایک نرم گوشہ رکھنے کے باوجود ان کے راستے پر نہیں چلتے۔ ناصر علی کا ایک شعر بغیر نام کے ذکرِ میر میں ایک جگہ آتا ہے۔

دیدہ ام در علم صحبت ہائے رنگیں صد کتاب
کردہ ام یک مصرعِ تنہا نشینی انتخاب

رنگا رنگ کتابیں دیکھیں علمِ صحبت داری میں
دل کو ہمارے بھایا لیکن اک مصرع تنہائی کا (ترجمہ راقم)

متاخرین میں سے میر کو کوئی شاعر دل سے پسند آیا ہے تو وہ آرزو کے مدِمقابل شیخ علی حزیں ہیں، محض آرزو کی ضد سے نہیں، محض اس لیے بھی نہیں کہ وہ اس وقت کے برصغیر میں دستیاب بہترین معاصر ایرانی شاعر ہیں (حزیں کے باغی شاگرد والہ داغستانی کے خیال میں تو اس وقت ایسا شاعر روئے زمیں پر موجود نہیں) حزیں کی نازک مزاجی اور استغنا نے بھی میر کو متاثر کیے بغیر نہ چھوڑا ہوگا مگر اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ بقول بہار "سلیس اور پختہ" اسلوبِ نثر کے حامل تھے اور بقول ڈاکٹر صفا کے، ان کا کلام حدِ فاصل ہے، مبینہ "سبک ہندی" اور تحریکِ "بازگشت" کے مابین۔ شعر العجم کی جلد پنجم میں لکھا ہے کہ بارھویں صدی کے آخر میں جو "انقلاب" ایرانی شاعری میں آیا ہمارے یہاں کے لوگ اس سے بے خبر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مصحفی کے "عقدِ ثریا" لکھنے تک بازگشت کا منشور یعنی تذکرہ "آتشکدۂ آذر" برصغیر میں نہیں پہنچا تھا مگر آذر، مشتاق، عاشق اور ہاتف کا کلام مصحفی کے وقت تک یہاں آ چکا تھا اور اس سے اہم بات یہ ہے کہ "بازگشت" کا صور پھونکنے سے بہت پہلے شیخ علی حزیں نے یہی رویّہ اپنے نقدِ ادب میں اور اس سے زیادہ خود اپنے کلام کے ذریعے عام کر دیا تھا چنانچہ بعد میں جب قتیل ایران سے ہو کر آئے اور لکھنؤ میں ایرانی اثرات کا مرکز پیدا ہوا تو وہاں بڑے زوروں سے "بازگشت" کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ مگر جیسا کہ ڈاکٹر صفا نے بھی تسلیم کیا ہے۔ بازگشت کے شعرا بہت دیر تک محض قدما کی نقالی کرتے رہے اور یہی صورت لکھنوی بازگشت میں بھی قائم رہی (ملاحظہ ہو تذکرہ "مخزن الغرائب")۔ مگر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ میر صاحب کی زندگی ہی میں اردو فارسی کے مخلوط مشاعرے منعقد ہونے لگے میر کے آخری ایام میں مرزا قتیل نے جو ایک مشاعرے کا احوال قلم بند کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "میر کے حلق سے آواز بڑی مشکل کے ساتھ نکلتی تھی مگر میں اور میرا خدا، ان کی غزلیں بہت اچھی کہی ہوئی تھیں" تو واضح نہیں ہوتا کہ غزلیں فارسی کی تھیں یا اردو کی۔ ہو سکتا ہے فارسی کی ہوں کیونکہ قتیل کو اردو سے رغبت بہت کم تھی۔

ایسے میں اگر میر یہ لکھتے ہیں:

بہ ایراں می روم دہ پانزدہ بیتم عنایت کن
رہ آورد سے ست میر اشعارِ تو اہلِ صفاہاں را

تو اس کا شمار ناصر علی کے اس کھو کھلے دعوے کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا:

یا ایں شوخی غزل گفتن علی از کس نمی آید
بہ ایراں می فرستم تا کہ می گوید جوابش را

میر کا رویہ اس قسم کی" بازی بازی بار یش بابا ہم بازی" کا نہیں۔ وہ تو اپنے معاصر ایرانی شاعروں کے کمال سے بھی آشنا نظر آتے ہیں، چنانچہ آذر کی غزل "تو نہ فہمی زبان دیگر است" کو اس انداز سے بدلتے ہیں :۔

بکذب ہر کس راشعار و حرف ہر یک پیچ دار
مانمی فہمیم گویا ایں زبان دیگر است

اوپر میر کی جن خاص غزلوں کے مطلعے درج ہیں ان میں سے کئی ایک تفصیلی تجزیے کے متقاضی ہیں اور ہو سکتا ہے ایک دو زمینیں تھوڑی بہت تبدیلی سے اُردو میں بھی منتقل ہو سکیں (یعنی جن کو میر نے خود ترجمہ یا ترمیم کے ذریعے اردو نہیں بنایا) مگر اصل نکتہ جو یہاں دیکھنے کا ہے وہ یہ کہ میر اپنی فارسی گوئی کے بارے میں پُر اعتماد نظر آتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا اعتماد بے جا نہیں لگتا۔ وہ اپنی سرگزشت کہہ رہے ہیں اور عاشقانہ مضامین دردمندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ فارسی زبان کے کلاسیکی ضبط کے ذریعے "اپنے ناقابلِ برداشت نفسیاتی تجربے کو برداشت کرنا سیکھ رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ زندگی کے اس مرحلے پر جو کوئے یار کی جدائی سے شروع ہوا، اگر وہ ریختہ گوئی موقوف کر کے فارسی پر اپنی توجہ مرکوز نہ کرتے تو پھر سے کف در دہاں، سنگ بدست دیوانے ہو جاتے اور ان کو دوبارہ" زندانی و زنجیری" کرنا پڑتا۔ اس بہانے جہاں انھوں نے اپنے دل کو سنبھالا اور خود آگہی کی منزل تک پہنچے، وہاں متاخرین کے مقلدین کی بے رس اور بے سوز شاعری کی جگہ ہمیں اپنی تازہ واردات کی لذت سے بھی آشنا کر گئے :

ز تازہ کاریِ من در خزاں، عجب مکنید
ز چوب خشک، گلِ تر اگر تراشیدم

(۸)

ماگر بجہانِ آب و گلِ می گردیم | با طبعِ لطیف متصل می گردیم
جُز نکتہ رسے کسے نیاید مارا | ما لذتِ شعریم، بہ دل می گردیم

میر کی رباعیات فارسی میں بھی اُردو کی طرح سو سے کچھ اوپر ہیں اور اس صنفِ سخن سے بھی ان کی مناسبت کا یہاں سے اندازہ کرنا چاہیے کہ ذکرِ میر کے انتہائی کربناک مقامات پر انھیں کوئی نہ کوئی " رباعیِ استاد" یاد آتی ہے اور ایک بار تو اپنی بھی :

وقت است کہ رو بہ مرگ یکبارہ کنیم
آں درد نداریم کہ ما چارہ کنیم
بیماری صعبِ عشق دارد دلِ ما
گر جامہ گذاریم، کفن پارہ کنیم

(دیوان میں "وقت ست" کی جگہ "بگذار" لکھا ہے، پھر بھی "وقت است: بر وقت معلوم ہوتا ہے)

آ پہنچا ہے وقت، موت سے کیا باک کریں
وہ درد ملا ہے کہ دوا خاک کریں
کچھ روگ لگا عشق میں ایسا جی کو
اُترے جو لباسِ تن، کفن چاک کریں (ترجمہ راقم)

آسی صاحب نے اُردو رباعیات کے ضمن میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس صنف کے مصرفِ صحیح یعنی "فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات" کے اظہار کی چونکہ پابندی نہیں کی اس لیے ان کی رباعیاں قیام، عطار، ابوسعید ابوالخیر اور سحابی وغیرہ کے درجے کو نہ پہنچ سکیں (اس فہرست میں عطار کا نام شاید احتراماً شامل ہے اور سحابی استر آبادی کی رباعیات پر متاخرین کی مرعوبیت چھائی ہوئی ہے، حتیٰ کہ خواجہ ابوالخیر رحمتہ اللہ علیہ سے منسوب رباعیات ہر علمائے ادب کے شکوک و شبہات کو بھی درخورِ اعتناء نہیں سمجھا۔ رباعی میں مولانا روم اور بیدل کا نام لینا ضروری ہے مگر شاید ان سے اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑتا)۔ ان کے نزدیک خواجہ میر درد نے اردو اور فارسی میں جس قدر رباعیاں کہیں وہ اس وقت کے لحاظ سے (!) بہترین نمونہ ہیں اور یہ بھی کہ "دورِ موجودہ میں اردو میں چند رباعی کے کہنے والے ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کے سامنے پچھلے لوگوں کی رباعیاں دیکھنے کو جی بھی نہیں چاہتا۔"

یہ آخری فقرہ جو ۱۹۴۰ء کا لکھا ہوا ہے جوش، فراق بلکہ یگانہ تک کی رباعیوں کے بارے میں نہیں ہوسکتا، نہ شاید آسی صاحب کو شاید بعد میں ہی ان شاعروں کی رباعیات سے کوئی ربط محسوس ہوا ہو۔ ان سے پوچھا جاتا تو جگت موہن لال رواں اور امجد حیدرآبادی کا نام لیتے اور اگر حالی و اکبر بلکہ انیس و دبیر تک کا ذکر ہوتا تو وہ بھی تیر کے ساتھ محشور ہو جاتے۔ معاصر شعراء کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے لئے جب کہ آپ خود بھی شعر کہتے ہوں، خاصے حوصلے کا کام ہے اگرچہ یہاں افراط کا درجہ بھی وہی ہے جو تفریط کا۔ صرف رباعیات کا ہو کے رہ جانا اور بات ہے اور رباعیات میں اچھی شاعری کرنا اور بات۔ پھر جہاں تک خواجہ میر درد کا تعلق ہے تو آپ انہیں ایک اچھا رباعی نگار شاعر چاہے تسلیم کریں یا نہ کریں، یہ "اس وقت کے لحاظ سے" تو بس لحاظ کی بات ہے۔ یہاں میر کی اردو رباعیوں سے بحث نہیں فارسی کی دو تین رباعیاں اوپر آچکی ہیں، ان کے علاوہ کئی ایک رباعیاں ایسی ہیں کہ اس صنف پر "فلسفیانہ، حکیمانہ اور صوفیانہ" مضمون کی پابندی ہو (جو ایک بے جا پابندی ہے اور صنف رباعی کی تاریخ کا صرف ایک رُخ پیش کرتی ہے جب کہ دوسرا رُخ جسے ہم "نکتہ آفرینی" یا EPGRAMATIC QUALITY کا نام دیں گے، رباعی کی صنف سے الگ کردیں تو خیام کی بھی آدھی خوبیاں کافور ہو جاتی ہیں) تب بھی میر کی کئی فارسی (اور چند ایک اردو) رباعیاں غور و فکر کی متقاضی نظر آئیں گی:

بودہ آنچہ ندیدنی، دیدہ دیدیم — کرہ وہ کشیدیم و بلا دیدیم
اکنوں اے میر چشم باید پوشید — دنیا دیدیم و اہلِ دنیا دیدیم

اور یہ رباعی تو عالم اسلام کے بہت سے ممالک کی سیاحت کے دوران اکثر یاد آئے گی:

شرمے کن و ترک کن خدادانی را — بردار چنیں بساطِ ایمانی را
تسبیح بکف چند بہ میخانہ روی — رسوا مکن اے میر مسلمانی را

اور یہ خود شناسی اور عصری آگہی کا ملاپ بھی دیکھنے کے قابل ہے:

اے میر گر از اہلِ وفا می بودی — شائستۂ انواعِ جفا می بودی
ابنائے زماں زار ترا می کشتند — تا حال درایں عرصہ کجا می بودی

اور یہ اپنی شبیہ (سیلف پورٹریٹ) بھی دیکھیے کیسی متحرک ہے:

شگم بستر از جورِ فلک می بارد — بر بستر آرام تحشک می بارد
از چشم من آب شور آید ہر دم — یعنی کہ ز گریہ ام نمک می بارد

اور "مسائل" پر یہ تبصرہ:

بر بحث علوم میر مائل گشتم — یعنی بسیار بر مسائل گشتم
کارے نکشود از نزاعِ لفظی — بستم لب ہای خویش و قائل گشتم

اس میں شک نہیں کہ میر کی زیادہ تر رباعیاں بھی اس کی غزل کی طرح "عشقیہ اور دردمندانہ" ہیں مگر ان کا عشق اور درد نہایت تہ دار ہے اور اس میں ہر طرح کے عصری و فکری مشاہدات و افکار کی گنجائش موجود رہتی ہے، بعض اوقات تو وہ سیدھے سبھاؤ ایسی حکیمانہ بات کہہ جاتے ہیں کہ صاحبانِ افکار منہ تکتے رہ جائیں:

ہر لحظہ چو موج اضطرابے داری — ہر دم رفتارِ تند آبے داری
صرصر گوئیم یا کہ برقت خوانیم — اے عمرِ عزیز بس شتابے داری

———

شیب آمد ناگاہ بباید رفتن — زیں منزلِ خوش آہ، بباید رفتن
پیری بسیار جائے خوف است اے میر — ایں جا بہ عصا راہ بباید رفتن

———

ایں بود و نمود یک نفس ہم چو حباب — در دیدۂ ہوشمند نقشے ست بر آب
ہر لحظہ چو موجِ بحر رفتن داریم — زاں پیش کہ جوئی و نیابی، دریاب

———

دل را کہ دمے بہ رنج نگذاشتہ ایم — او شد ہمہ خون و دست برداشتہ ایم
ویں چشم کہ چشمۂ روانے بود است — از خاکِ سرِ راہِ تو انباشتہ ایم

———

نکتہ آفرینی کی بہترین مثال وہ رباعی ہے جس میں انہوں نے، موجودہ ایران کے پبلک حماموں کی طرح، اپنے زمانے کے حمام کے زنانہ اوقات کو استعارہ بنایا ہے:

| | |
|---|---|
| یک بار مجرّدان و فرداں رفتند | از دائرۂ سپہر گرداں رفتند |
| آفاق ز طالبانِ دنیا پُر شد | تمام زمانہ گشت و مرداں رفتند |

میرؔ نے یہ رباعی نہیں کہی، اپنی عصری صورتحال کا کتبہ لکھا ہے۔

(۹)

| | |
|---|---|
| اے صبا گر سوئے دہلی بگذری | ہم چو صرصر آہ مگذر سرسری |
| بوسہ دہ بر ہر قدم از سوئے من | بود بر آں خاک عمرے روئے من |
| بر مقابر آیۂ رحمت بخواں | در مساجد خدمتے از من رساں |
| ہم بکن پیدا جبینِ تازہ لے | سجدہ لے بر ہر سرِ دروازہ لے |
| وقفہ لے بر ہر سرِ گوشہ ساعتے | بدر و بامش نگاہِ حسرتے |

یہ ۱۶ اشعر کی ایک مثنوی کے ابتدائی اشعار ہیں جسے میرؔ نے کوئی نام نہیں دیا مگر جسے "خضر و شاہ" یا "انقلاب دوراں" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ وطن سے دور افتادہ شاعر پہلے اپنے چھوڑے ہوئے شہر کو یاد کرتا ہے اور اس کے سر پہ گزری ہوئی مصیبتوں اور بے دریغ قتل و غارت کرنے والوں کے جور و جفا کا تصور کرتا ہے پھر ایک کہانی بیان کرتا ہے جس میں ایک درویش جسے خضر کی ملاقات کا شرف حاصل ہے، جب اس کے روحانی کمال کی شہرت ہو جاتی ہے تو وقت کے بادشاہ کو بھی حضرت خضر کی زیارت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ وہ درویش سے فرمائش کرتا ہے اور اس کی لیت و لعل پر اسے جان کی دھمکی دے ڈالتا ہے۔ ناچار درویش خضر سے امداد طلب کرتا ہے:

| | |
|---|---|
| گو مپئیت شہ در پئے جانِ من است | خضر می داند بفرمانِ منست |
| بہرِ تو سر بر سرِ من داشتہ | ہمتے بر گشتنم بگماشتہ |
| من ندانستم کہ ربطِ تو بلاست | خضر راہے ظلمت آبادِ فناست |
| اختلاطت گر بدیں رنگ است ہئے | دائے بر اخلاص مندانِ توئے وائے |

خضر اسے تسلی دیتا ہے اور شاہ کو اپنی زیارت کراتا ہے۔ دیکھتے ہی بادشاہ خضر سے ہدایت کا خواہاں ہوتا ہے اور کوئی پرانی کہانی سننا چاہتا ہے۔ خضر کہتا ہے کہ میں نے ایک شہر دیکھا ہے، نہایت مرفہ حال، پر رونق، سرسبز و شاداب اور ہر قسم کی انسانی سرگرمیوں سے بھرا ہوا جس میں حسن و عشق اور نائے و نوش اور جذب و کیف میں ڈوبے ہوئے لوگوں کی فراوانی ہے۔ تھوڑے دن کے بعد میرا وہاں جانا ہوا تو شہر کی جگہ ایک دشتِ ہولناک تھا اور وہاں شکار کرنے والے اپنے جال بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ کچھ مدت کے بعد پھر وہاں کا پھیرا لگا تو کیا دیکھتا ہوں نہ شہر ہے نہ صحرا، ایک بحرِ بے کنار ہے جس کا کوئی کنارہ نظر نہیں آتا اور سخت طوفان کی حالت میں وہاں کچھ لوگ بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ میں نے پوچھا وہ دشت کیا ہوا اور جال والے کدھر گئے کہ اب تو جہاں تک نظر کام کرتی ہے پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے۔ سب لوگ میرے سوال پر حیران ہوتے اور کسی سے کوئی جواب نہ ملا۔ اور پھر جو اس مرتبہ وہاں سے گذرا

ہوں تو مجھے عجیب طرح کی حیرانی ہوئی ہے۔ شہر آباد ہے اور ہر طرف عیش و عشرت کے خم پر خم لنڈھائے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد بادشاہ سے کہتا ہے:

حالیا ایں شہر و شاہی از تو شد     چند روزے کج کلاہی از تو شد

مملکت زیرِ نگیں آمد تمام     سکہات بر زر زدند اما بہ نام

ایں جہاں شاہا کہن ویرانہ ایست     رونق و آبادیش افسانہ ایست

زندگانی کن چناں با ہر کسے

کز پس رفتن بیاد آئی بسے

اس کے بعد خضر رخصت ہو جاتا ہے اور بادشاہ دنیا سے دل برداشتہ ہو کر خود درویش بن کے بیٹھ جاتا ہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی کے سبحان اللہ کلیکشن میں جو میر کے دیوان فارسی کا ایک مخطوطہ موجود ہے اس میں غزلیات اور "چند رباعیات" کے علاوہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب نے ایک "ناتمام مثنوی" کی نشان دہی کی ہے شاید وہ اسی مثنوی کا حصہ ہو یا مختصر ہونے کی وجہ سے "ناتمام" محسوس ہوئی ہو۔ اختر علی تلہری صاحب نے بھی جو اس کے مخطوطہ لکھنؤ کا حوالہ دیتے ہیں، اس کے ابتدائی اشعار اپنے مقالے میں درج کئے ہیں۔ مگر قصے کا ذکر نہیں معلوم نہیں وہاں بھی مکمل متن موجود ہے یا نہیں۔ بہر حال اور کسی جگہ جس قدر بھی ہو اب مطبوعہ شکل میں یہ مثنوی مکمل ہی معلوم ہوتی ہے۔ قصہ نہایت مختصر ہے اور ابتدائیہ خاصا بڑا ہے (۱۱۶ میں سے ۴۲ اشعار)۔ میر کی اردو کی مثنویات میں قصے اور آغاز قصہ کا یہ تناسب بالعموم نہیں ہوتا، اس کا سبب فکر و احساس کی وہی کیفیت ہو سکتی ہے جو یادِ وطن اور احوالِ وطن سے میر کے دل پر گزری ہوگی۔ پھر بھی اصل قصہ نہایت عمدگی اور جزالت کے ساتھ لکھا ہے اور جیسے ہی ایک سے دوسرا منظر بدلتا ہے تو میر کا قلم، دو چار نشانِ قلم (STROKES) لگا کر طلسمِ ماہیت کا اثر پیدا کر دیتا ہے۔ عیش و عشرت میں غرق اہلِ شہر، جال والے اور ماہی گیر متحرک تصویروں کی طرح سامنے آتے ہیں اور آخر میں خضر کی زبان سے صرف دو شعروں میں پند و موعظت کو تمام کر کے ایک ہی شعر میں بادشاہ کی دل برداشتگی کا خلاصہ کر دیا ہے۔ اس مثنوی کا شمار میر کے عمدہ ترین شعری کارناموں میں ہونا چاہیے۔

اس کے علاوہ دیوان میں ایک دوازدہ بند کی منقبت ہے جس میں ہر مربع بند کے بعد ایک شعر ترجیع (REFRAIN) کے طور پر دُہرایا جاتا ہے ؎

یا مرتضیٰ علی کرمت بے نہایت است

ہنگام دست گیری و وقتِ عنایت است

معلوم ہوتا ہے کہ میر انتہائی کرب کے عالم میں اپنی مشکلات کا حل چاہتے ہیں۔ وہ ایک "ہنگامۂ عجیب" کا شکار ہیں اور گردِ ملال سے اَٹے ہوئے، وطن اور اہلِ وطن سے بچھڑے ہوئے، تلاشِ رزق میں سرگرداں ہیں، ایک ایسے دور میں جب اُن کے سخن کا کوئی جوہر شناس نظر نہیں آتا:

کس را دریں زمانہ خیالِ کمال نیست     داریم اضطراب و کسے را خیال نیست

یاری گری ز اہلِ جہاں احتمال نیست      ایں یک دو روزہ مہلتِ ما جز وبال نیست

وہ ایک "کرہ وقار" میں جواب خار و خس کا مضمون ہے اور ہر کس و ناکس کے دروازے پر روزی کی تلاش میں پھیرے لگا رہا ہے۔ اگر اس آزمائش سے میر کو تنبیہ کرنا مقصود تھا تو اب کافی ہو چکا:

از اضطرابِ دل، ز نظرہا فتادہ ام
بر خاکِ آستانِ خساں سر نہادہ ام
تو خود سوارِ دولتی و من پیادہ ام
مپسند پائمالِ حوادث چو جادہ ام

اردو دیوان میں میر کے بہت سے مناقب شامل ہیں اور ان میں بھی درد و کرب کا مضمون، عنایت مرتضوی کی درخواست کے ساتھ، ادا ہوتا ہے مگر وہ سب غالباً اس فارسی منقبت سے مؤخر ہیں اور یہاں جو اشارات پائے جاتے ہیں وہ میر کے سفر مصائب اثر "ننگ نامہ" کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ شاید یہ وہی منقبت ہو جس کا ذکر مثنوی "معاملات عشق" میں آیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میر کی دعا جلد ہی مستجاب ہو گئی ہو گی۔

فارسی کلام کا یہ نقطۂ عروج، میر کی داستان غم کی انتہا کو پیش کرتا ہے اس کے بعد وہ میر جو فارسی شاعری کے آغاز میں سخت دل شکستہ تھا، اب تازہ دم ہو کے زندگی کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا کر چکا ہے۔

(۱۰)

بغیر حوصلہ یک جرعہ میر نتواں خورد
ازاں شرابِ محبت کہ در سبو دارم

میر کا فارسی دیوان اگر آج کوئی ایرانی نقاد پڑھے تو کیا محسوس کرے گا؟ پہلی بات تو یہ کہ ایران میں شاید ہی کوئی نقاد حافظ اور زیادہ سے زیادہ جامی کے بعد کی غزل پڑھتا ہو۔ وہ ایک شاعر نقادوں جیسے امیری فیروز کوہی، ڈاکٹر شفیعی کدکنی اور محمد حقوقی نے صائب اور کسی حد تک حزیں کو اس تنقیدی قتلِ عام سے بچانے کی کوشش کی ہے اور کبھی کبھار کوئی عالم یا شاعر، طالب آملی یا ابوطالب کلیم کے حق میں ایک آدھ کلمۂ خیر کہہ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ خود معاصر ایران کے سب سے اہم غزل گو شاعر محمد حسین شہریار کو بھی نئی نظم کے بالمقابل کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ یقیناً انقلاب کے بعد ادب میں "غرب زدگی" کا یہ بخار اتر رہا ہوگا، اگرچہ تہذیبی استعمار کا طلسم، سیاسی اور معاشی استعمار سے زیادہ سخت جان ہوتا ہے۔ تاہم اگر میر کے کلام کو، میر کے معاصرین کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو ہمارے "مسلّم الثبوت" فارسی شعرا مثلاً شمس الدین فقیر، مرزا فاخر مکین، قمر الدین منت اور خود آرزو سے زیادہ میر کی قبولیت کا امکان قوی تر ہے اور اگر اس دور میں ایران کے تازہ وارد شعرا کو دیکھا جائے جیسے موسوی خاں فطرت، قزلباش خاں امید اور والہ داغستانی تو معلوم ہوگا کہ یہ تو ہمارے شاعروں سے بھی زیادہ متاخرین پرستے ہوتے ہیں۔ شاید ان لوگوں میں سے، جو حزیں سے بلاواسطہ متاثر ہونے والوں میں شامل نہیں، بقول آرزو، ایک آدھ دارالسلطنت سے دور

افتادہ واقف بٹالوی بکل آئے جس کی زبان متقدمین کے مطالعے پر مبنی ہو اور اس بنا پر "بازگشت" سے مرعوب ذہنیت اسے قبول کرلے (مشہور ہے کہ نادر شاہ کی فوج میں شامل میرزا ایان دربار واقف کے دیوان کی نقل حاصل کرکے ہرات لے گئے تھے جہاں کچھ دیر اس کی شہرت رہی) بیدل کی شاعری کے بارے میں حزیں کی رائے معلوم نہیں (اگرچہ یہ معلوم ہے کہ انھیں بیدل کی نثر ناپسند تھی جس کا یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے کہ شاعری کے بارے میں خیال مختلف ہوگا)۔ بہرحال بیدل کوئی ایسا شاعر نہیں کہ کسی ایک فارمولے سے شکست کھا جائے۔ چاہے وہ سادگی وصفائی کا فارمولا ہو یا خوش محاورگی وطرز ادا کا فارمولا۔

میر کا فارسی کلام جا بجا خوش محاورگی کے نمونے پیش کرتا ہے۔ البتہ ذکر میر میں محاورات کی کثرت کی جو شکایت ہمارے فارسی جاننے والے ناقدین کو پیدا ہوئی ہے یا بعض جگہ صنائع کے استعمال میں مبالغے کا گلہ جو چند ایک کی زبان پر آیا ہے، یہ بات میر کی فارسی شاعری کے سلسلے میں کہنی مشکل ہے۔ ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو میں خود کو "میر صاحب" کہتے کہتے، کہیں کہیں فارسی میں بھی یونہی لکھ جاتے ہیں۔ ایک آدھ جگہ مصدر کے ساتھ یائے قابلیت (خوردنی، ناکردنی) لگاتے لگاتے یائے تنکیر بلکہ یائے زائد بھی لگا جاتے ہیں۔ ایک آدھ غزل میں تو ردیف اور قافیے بھی ایسے باندھ گئے ہیں۔ شاید چند ایک ترکیبیں اور اصطلاحیں خالصتہً مقامی بھی ہوں مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی۔ ہاں ماضی شکیہ اور تمنائی کا استعمال اور یائے مجہول کا قافیہ صرف یائے مجہول سے باندھنا، یہ ایسے خصائص ہیں جو مثلاً حزیں تک کے کلام میں پائے جاتے ہیں (اور ملک الشعرا بہار نے تو یائے مجہول اور نون غنہ کا استعمال بھی جائز قرار دے دیا ہے) میر کا دیوان ہمارے یہاں کے مروج رسم خط میں چھاپا گیا ہے اس لئے ایرانیوں کو لامحالہ اس کا پڑھنا مشکل ہوگا مگر کوئی انتخاب میر خصوصی طور پر "فارسی زبان" قارئین کے لیے ایران میں چھپ سکے تو محسوس ہوگا کہ فارسی زبان میں ہمارے یہاں بیدل اور غالب کے درمیانی دور میں اس پائے کا کوئی اور شاعر نہیں ہوا۔ اور ایران میں بھی حزیں اور فروغی کے درمیان تقریباً ایک صدی کے وقفے میں کم ہی کوئی ایسا غزل گو موجود ہوگا۔

مگر ہمارا مسئلہ ایک اور بھی ہے۔ میر نے دیوان مرتب کرنے کے بعد فارسی شاعری بالکل چھوڑ دی یا بہت کم دی، اس کا ان کی اُردو شاعری کو کیا فائدہ ہوا؟

حالی صاحب کہتے ہیں کہ دیوان اول کے بعد میر کے یہاں فارسی تراکیب کم ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی اس لئے کہ بعد کے دواوین میں تو فارسی ردیفوں تک کی بھرمار ہے: تاچند، گاہ باشد، در پیش، زبان زد وغیرہ وغیرہ اور بقول مولوی عبدالحق "اُردو مثنویوں میں فارسی ترکیبیں، فارسی محاوروں کے ترجمے اور ایسے فارسی الفاظ جن کی (آج کے معیار فصاحت سے) اب اُردو زبان متحمل نہیں ہوسکتی بلاشبہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔" مراثی میں اور ترکیب بندوں ترجیع بندوں میں فارسی کی ٹیپ کئی جگہ دکھائی دیتی ہے۔ قصائد اور ہجویات میں فارسیت قدرے زیادہ ہے بلکہ فارسی ترکیب کی وہ صورت بھی جس میں فارسی کے حروف اور افعال استعمال ہوتے ہوں اور جسے میر صاحب نے "قبیح" قرار دیا ہے، کئی جگہ مثلاً میر کے قسم کھانے کے انداز میں متعدد بار استعمال ہوئی ہے۔ نعت ومنقبت میں کئی ایک پورے پورے مصرعے فارسی کے آجاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ غزل میں ایسی صورت قدرے کم ہے مگر ہے ضرور۔ میر پر ایک پرانا اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ بعض جگہ دیہات کا کوئی لفظ استعمال کر جاتے

ہیں اور بعض جگہ خالص قاموسی قسم کا لفظ۔

درحقیقت زبان کا تخلیقی اور اجتہادی استعمال ایک قسم کی لسانی جدلیات کا مظہر ہوتا ہے یعنی زبان کے دو مختلف ذرائع کا آپس میں ٹکراؤ اور ان کا تال میل۔ کبھی ایک عنصر غالب ہوتا ہے کبھی دوسرا۔ اور بہترین تخلیقات میں دونوں عناصر گھل مل جاتے ہیں۔ فارسی شاعری میں یہ جدلیاتی صورت عربی الفاظ و تراکیب سے پیدا ہوتی ہے (اور میر کے فارسی کلام میں بھی اس کے نمونے پائے جاتے ہیں، اگرچہ ذرا کم) دوسری طرف بقول انشاء اللہ خاں میر کی زبان میں کہیں کہیں "بھاکا پن" نکلتا ہے جس کی توجیہ ان کے اکبر آبادی ہونے سے کی گئی ہے۔ (یہ دیہاتی لفظ استعمال کرنے والا الزام ہے)۔ یہی عنصر زیادہ منجھ کر "اُردو پن" کی شکل اختیار کر لیتا ہے مگر میر کوئی آرزو لکھنوی نہیں کہ سُریلی بالسری بجاتے رہیں، انھیں بہت سی تلخ و ترش باتیں کہنی ہیں، آگ اور خون کا کھیل کھیلنا ہے، بچوں کی طرح شہد نہیں چاٹنا، زہرابِ حیات کو رگ رگ میں اتارنا ہے اس لئے ان کی زبان یک سُری نہیں ہو سکتی۔ البتہ وہ صاحبان جو میر کی تہ داری کو سہل پسندی میں بدلنا چاہتے ہوں، میر کی زبان پر بحث کرتے ہوئے یہاں تک بھی جا سکتے ہیں:

"اپنی اپنی زبانوں میں مشاہیر نے جو بہترین باتیں کہی ہیں اس سے زیادہ مانوس و معصوم لہجے میں میر نے اپنی باتیں کہی ہیں (بڑی خوشی کی بات ہے مگر یہ کہیں اس وجہ سے تو نہیں لگتا کہ ان مشاہیر کی زبانیں ہمیں ذرا کم ہی آتی ہوں؟) میر کا انداز و لہجہ یہی نہیں کہ دوسرے اردو شاعروں کو نصیب نہیں ہوا بلکہ شاید ایشیا اور یورپ کے کسی زبان کے شاعر کو میسر نہیں آیا (حضور، اتنی ساری زبانیں تو ہمیں نہیں آتیں کہ اُن سب کا مقابلہ کر سکیں، یوں کوئی ایسا ثابت کر سکے تو ہم سے زیادہ کون خوش ہوگا؟) یہ گھلاوٹ کہیں نظر آتی ہے تو برج بھاشا کی شاعری میں یا قدیم ہندی کے شاعروں سورداس، تلسی داس اور میرا بائی کے یہاں نظر آئیں گی (آئے گی؟ اور یہاں "یا" کا مصرف معلوم نہیں۔ کیا برج بھاشا ہی کو قدیم ہندی کہا ہے یا آپ کو شک سا ہوا ہے کہ ان میں سے کسی نے کہیں دوسری کوئی بولی نہ برتی ہو۔) مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر قدیم ہندی ادب سے غیر معمولی حد تک مانوس و متاثر تھے! ان کا لہجہ برج بھاشا کی بہترین شاعری سے ماخوذ ہے (!!) اس کے ساتھ ہی ساتھ میر کی شخصیت اتنی بڑی ہے کہ برج بھاشا کی بہترین شاعری اس کا احاطہ نہیں کر سکتی (وعقیدہ وادا) اور نہ عربی و فارسی کی بہترین شاعری"۔ (واللہ اعلم بالصواب!)

(فراق گورکھپوری: میر کی شاعری کے کچھ پہلو)

میر تو میر، ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ خود فراق صاحب برج بھاشا سے اور (یا) قدیم ہندی شاعری سے کس حد تک مانوس تھے، متاثر ہونا تو بعد کی بات ہے اور جہاں تک میر کے لہجے کا کسی اور جگہ سے ماخوذ ہونے کا تعلق ہے تو اس کی شہادت محض محسوس ہونے سے زیادہ ہو تو بہتر ہے۔ ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ میر اکبر آباد کے رہنے والے تھے جو برج بولی کے علاقے میں شمار ہوتا ہے مگر اس زبان کی شاعری سے ان کی واقفیت سرسری سے آگے ہو اس کا امکان اتنا ہی بعید ہے جتنا کہ فراق صاحب کا پشتو شاعری سے مانوس اور متاثر ہونے کا، چاہے

اُنہوں نے ردِعمل لکھنؤ میں جنم لیا ہوتا۔

اس قسم کی خوش گمانیوں کی وجہ اصل میں ہمارے ذہنوں کی سہولت پسندی ہے اس لیے کہ میر کی شخصیت اور ان کی شاعری میں جدلیات کے کئی ایک مظہر بیک وقت موجود ہیں، داخلی اور خارجی حقیقت کی جدلیات، لفظ و معنی کی جدلیات، علم اور عمل کی جدلیات، آدمیت اور الوہیت کی جدلیات فکر و احساس کی جدلیات اور ان کے علاوہ اُردو پن اور فارسیت کی جدلیات۔ میر کی ذات اور ان کے کمالات میں یہ سب مظاہر واضح طور پر موجود ہیں اور برصغیر کی شاعری اور تاریخ میں یہی ان کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ شاید جب فراقؔ صاحب نے میر کو اپنے دور کی سب سے بڑی شخصیت قرار دیا تھا تو ان کی مراد اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرنا تھا مگر اس کے بعد وہ میر کے کمال کو محدود سے محدود کرتے چلے گئے اور بالآخر انھیں ایک ایسی تنگنا میں محصور کر دیا جہاں سے ان کا کوئی تعلق ہوگا بھی تو بہت دُور کا۔

بہر حال اس جدلیاتی شخصیت اور اس کے اظہار کی تکمیل میں ان کے فارسی کلام نے ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ وہ یہ کام نہ کرتے تو شاید شعور کے ساتھ جنوں کرنے کا حوصلہ ان میں پیدا ہی نہ ہوتا۔ میر جس جامعیت کا نام ہے اس کا تصور بھی فارسی زبان کی تعلیم و تحصیل اور نظم و نثر میں اس کے تخلیقی اور اجتہادی استعمال کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ یہ ان کے جدلیاتی کمال کا صرف ایک رُخ تھا مگر وہ آدمی جس کا ادبی نصب العین یہ تھا:

طرفیں رکھے ہے ایک سخن چار چار میر
کیا کیا کہا کریں ہیں زبانِ قلم سے ہم

اپنے فارسی کلام کے بغیر اتنا "تہ دار" نہ ہو سکتا۔

ان کے ابتدائی "استاد و پیر و مرشد" اور بعد کے "مدعی اور ستم شریک" خان آرزو نے بھی یہ آرزو کی تھی:

بُوَد مشکل گر انساں نسخۂ جامع بدست اُفتد
گذرد تا آدمے پیدا، بسے افلاک می گردد

اور میر کا المیہ یہ تھا کہ ان کی جامعیت کو وہ بھی نہ سمجھ سکے جن کے ساتھ انہوں نے ایک مدت بسر کی تھی ؎

نیست چوں من نسخۂ جامع ہزار افسوس، میر
دیر پیشت ماندم و ہرگز نہ فہمیدی مرا

———